سی انجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ
آتش فشاں
حصّہ 8

آتش فشاں

اس کا نام وجدان رکھا گیا مگر زمانے کی سختیوں اور حالات کی چیرہ دستیوں نے اُسے آتش فشاں بنادیا۔ اُس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا۔ وہ اپنے دُشمنوں کو خوب جانتا تھا اور اُنہیں ''انصاف'' کے ترازو میں تولنے کا خواہاں تھا۔ یہی خواہش اُسے ایک ایسی تربیت گاہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اُس کی دنیا ہی بدل گئی۔ شاؤلن نیمپل میں فنونِ حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اُس گوشت و پوست کے انسان میں پارا بھر کر اُسے آتش و آہن کا ایک بے مثال شاہ کار بنادیا۔ اُس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ پاؤں کسی برقی مشین سے زیادہ فعال ہوگئے۔ وہ ایک ایسے طوفان کا رُوپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی، تلواروں کی جھنکار اور چیتے کی للکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا اور اُنہیں حرف غلط کی طرح مٹاتا چلا گیا۔

ظلم و جبر کی فضا میں سانس لینے والے ایک سرا پا انتقام، چھلنی کلیجا شخص کی لرزہ خیز داستان

قاضی سلطان منتظر نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ میں اپنے بارے میں اسے تفصیلاً بتاؤں۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سائیں! جب تک مجھے یہ پتا نہیں چلے کہ آپ کی بیٹی نے آپ کو ہمارے بارے میں کیا کچھ بتایا ہے اس وقت تک میں کیا کہہ سکتا ہوں!''

وہ چند لمحے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے تکتا رہا پھر گمبھیر آواز میں بولا ''ممتاز نے مجھے بتایا کہ ڈاکو منگل سنگھ اسے اغوا کر کے کنری میں اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا۔ یہ بات تو تمہارے علم میں بھی آچکی ہے کہ اس خطرناک ڈاکو نے ممتاز کی واپسی کے لیے مجھ سے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کیا تھا۔ بہرحال، کنری میں پولیس آپریشن کے بعد منگل سنگھ اپنے ایک ساتھی گنڈا سنگھ کے ساتھ ممتاز کو کنری سے عمرکوٹ لے گیا۔ ممتاز نے مجھے بتایا ہے کہ ڈاکوؤں کی باہمی گفتگو سے اس نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے اغوا کی واردات وڈیرا اکبر سومرو کے ایما پر کی تھی۔ اکبر مجھ سے دشمنی نکالنے کے لیے ڈاکوؤں کو استعمال کر رہا تھا۔''

میں نے چونک کر قاضی سلطان کو دیکھا۔ یہ میرے لیے واقعی حیرت کی بات تھی کہ ممتاز نے اپنے باپ کو اس قسم کی معلومات فراہم کی تھیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''یہ بات تو میں جانتا ہوں کہ اکبر سومرو نہ صرف ڈاکوؤں اور دیگر مجرموں کو پناہ دیتا ہے بلکہ باقاعدہ ان کی پشت پناہی بھی کرتا ہے۔ اس جیسے بھوتار وڈیرے سے کچھ بھی بعید نہیں۔ خیر، منگل سنگھ نے چند روز بعد عمرکوٹ سے میرپور خاص کی طرف جانا چاہا پولیس کو بروقت پتا چل گیا اور انہوں نے شادی پلی کے سرحدی مقام پر ناکا لگا لیا۔ ممتاز نے کہا کہ ڈاکوؤں کو اس ناکے کی خبر ہوگئی تھی اور انہوں نے اپنا روٹ تبدیل کر کے عمرکوٹ سے ''سامارو'' کی جانب رخ پھیر لیا۔ وہ سامارو سے آگے ایک کچے راستے سے میرپور خاص میں داخل ہونا چاہتے تھے کہ ریلوے کراسنگ کے قریب ان کی جیپ خراب ہوگئی اور یہیں سے تمہارا کردار شروع ہوتا ہے۔''

وہ ایک لمحے سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''تم نے نہایت جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ممتاز کو ڈاکوؤں کے قبضے سے نکالا پھر تم اسے اپنی گاڑی یعنی وڈیرے کی پجارو میں اس طرف لا رہے تھے تو وڈیرا تمہارا تعاقب میں لگ گیا۔ سامارو کے نزدیک تم لوگوں میں ایک خوفناک معرکہ ہوا اور تم ان دونوں کو باندھ کر یہاں آئے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ تارا نامی اس بدمعاش سے تمہاری کوئی ذاتی دشمنی چل رہی ہے۔ وڈیرا چوں کہ اس کا

دوست ہے اس لیے وہ تمہارا بھی دشمن بن گیا ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا "مگر یہ جانتے کے لیے بے تاب ہوں کہ تم دونوں کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور تارا سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "قاضی سائیں! آپ ایک جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ آدمی ہیں۔ میرے ساتھ آپ کا رویہ مشفقانہ ہے آپ ایک پرخلوص دوست کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ویسے بھی "دوستی دشمنی" کے بین الاقوامی اصولوں کے تحت ہم دوست ہیں کیوں کہ وڈیرا اکبر سومرو ہم دونوں کا مشترک دشمن ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں تاکہ دوستی کے اس رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جا سکے۔ میں سندھ کی سرزمین سے اگر کچھ تلخ احساسات لے کر جا رہا ہوں تو اس کے ساتھ ساتھ میرے پاس یہاں کی شیریں یادوں کا سرمایہ بھی ہونا چاہیے۔"

وہ ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "ممتاز نے بلاوجہ تمہاری تعریف نہیں کی۔ تم اچھے دکھتے ہی نہیں بلکہ بہت اچھا بولتے بھی ہو۔"

قاضی سلطان کے اس جملے میں غور طلب صرف ایک بات تھی اور وہ یہ کہ ممتاز نے اپنے باپ کے سامنے میری تعریف کی تھی مگر کیوں؟ اس وقت میرا ذہن یہ گتھی سلجھانے سے قاصر تھا۔ ممتاز حد سے بڑھ کر ہماری حمایت پر تلی ہوئی نظر آتی تھی۔ میرے حق میں اس کی وکالت بڑی معنی خیز تھی۔ میں یہی سب سوچ رہا تھا کہ قاضی سلطان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"وجدان! میں ایک بارسوخ آدمی ہوں۔ صرف اس علاقے میں نہیں بلکہ خیرپور سے کراچی تک میرا اثر رسوخ ہے۔ میں پاکستان میں اور پاکستان سے باہر بھی تمہاری ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ میری دوستی تمام تلخیوں کو صاف کر دے گی۔"

قاضی سلطان کے لہجے سے سچائی ٹپکتی تھی۔ میں نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تاہم اس سلسلے میں' میں نے کچھ ایسی باتوں کو چھپا لیا تھا جو سراسر میری ذاتی تھیں اور ان کے کبھی کھلنے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ خاص طور پر اپنی صلاحیتیں وغیرہ۔

میری کہانی ختم ہوئی تو قاضی سلطان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیا پھر جذبات سے معمور لہجے میں بولا "آج سے تم میرے ایک سچے دوست کی طرح ہو۔"

اس کے جذبات کی سچائی اور خلوص کی گہرائی کو محسوس کر کے مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے دکھتے ہوئے دل سے سوچا' میں نے اتنے سچے' پرخلوص اور ایثار پیشہ شخص سے کیوں دروغ گوئی کی؟ مجھے وہ باتیں بھی بتا دینا چاہیے تھیں جو میں نے دانستہ چھپا لی تھیں۔ اگر قاضی سلطان کو یہ پتا چل جاتا کہ میں بے پناہ جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کا مالک ہوں تو کون سی قیامت آ جاتی۔ یا اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ میں سونے کا منٹا نمٹانے پاکستان آیا ہوں تو کیا وہ مجھ سے وہ سونا چھین لیتا؟ ہرگز نہیں! وہ ایک صاحب ثروت شخص تھا۔

میں کچھ دیر تک اسی طرح جذباتی انداز میں سوچتا رہا پھر معتدل ہو گیا۔ میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ مناسب موقع دیکھ کر رفتہ رفتہ اسے سب کچھ بتا دوں گا۔ فی الحال تو مجھے اس تمام کھٹ راگ سے نکل کر کراچی پہنچنا تھا۔ یہ بات میں نے قاضی سلطان کو بڑے واضح الفاظ میں سمجھا دی تھی۔ اسے میرے کراچی جانے پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔

اس نے کہا "میں تمہیں اس کہانی سے بڑی خوبصورتی سے کٹ کروں گا۔ تم کل صبح چاہو تو کراچی جا سکتے ہو۔ ویسے میں تو یہی چاہوں گا کہ تم چند روز کے لیے میرے پاس رک جاؤ تاکہ ہم ایک دوسرے کو اور اچھی طرح سمجھ لیں۔"

"زندگی رہی تو ہماری بہت جلد ملاقات ہو گی۔" میں نے کہا "فی الحال فوری طور پر میرا کراچی جانا ضروری ہے۔ کچھ اہم کام نمٹانے ہیں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" وہ خوش دلی سے بولا "میں تمہیں اپنے دوست کا پتا دے دوں گا۔ وہ کراچی کا ایک معروف پبلشر ہے۔ وہاں سے شام کا اخبار نکالتا ہے۔ تم جانتے ہی ہو' اخبار کے مالک کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ کراچی میں تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو گی۔ میرا وہ دوست تمہارا ہر مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل کر دے گا۔"

میں نے تشکرانہ انداز میں کہا "آپ نے تو میری بہت بڑی پریشانی دور کر دی۔"

"دوست اور کس لیے ہوتے ہیں۔" وہ فراخ دلی سے بولا "سچی دوستی خوشیوں کو ضرب دیتی ہے اور پریشانیوں کو تقسیم کرتی ہے۔ تم قاضی سلطان کی دوستی کو یاد کرو گے۔"

"آپ تو میرے بزرگ ثابت ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"دوست صرف دوست ہوتا ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا "دوستی کی کوئی عمر نہیں ہوتی اس لیے بزرگ یا بچے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا "آپ نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اس صحرائی کہانی سے آپ مجھے بڑی خوبصورتی سے کٹ کر دیں گے۔ وہ کس طرح قاضی صاحب؟"

وہ سنجیدگی سے بولا "میری بات دھیان سے سنو وجدان!" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس نے کہا "میں اپنے سالے کی مدد سے ممتاز کو تلاش کروا ہی رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میرے آدمی ممتاز کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ایس پی صاحب اپنے محکمے کے توسط سے ڈاکوؤں کے قبضے سے ممتاز کو چھڑانے میں مصروف تھے' انہوں نے شادی پلی کی سرحد پر ان کی گرفتاری کے لیے ناکا بھی لگا رکھا تھا مگر ڈاکوؤں کو بروقت خبر ہو گئی اور انہوں نے اس طرف رخ نہیں کیا۔ ڈاکوؤں کی بدقسمتی شروع ہو گئی تھی۔ وہ شادی پلی کی طرف جاتے تو ڈی ایس پی انہیں پکڑ لیتا۔ انہوں نے روٹ تبدیل کر کے سامارو کے راستے میرپور خاص میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو میرے آدمیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ریلوے کراسنگ پر میرے آدمیوں نے ڈاکوؤں کی جیپ پر فائرنگ کی۔ ڈاکوؤں کو بہ مشکل اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ وہ اپنی "زخمی" جیپ کو بھی وہیں سڑک کے کنارے چھوڑ گئے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

قصہ ادھورا چھوڑ کر قاضی سلطان نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا "یہ تو وہ کہانی ہے جو میں نے بھانک والے بوڑھے ملازم انور علی کو بچانے کے لیے گھڑی تھی۔ سراسر فرضی کہانی!"

"میں تمہاری تیار کی ہوئی کہانی ہی استعمال کروں گا کیوں کہ تم پلاٹ بہت جان دار بُنتے ہو۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "بس فرق صرف اتنا ہو گا کہ تم کہانی میں سے "کٹ" ہو جاؤ گے۔ تمہاری جگہ میرے آدمی آ جائیں گے جو قرب و جوار میں تن دہی سے ممتاز کو تلاش کر رہے تھے۔ تم نے بھانک والے کو یہی سمجھایا تھا کہ ایک دوسری پارٹی نے فائرنگ کر کے لڑکی کو ڈاکوؤں کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ سمجھ لو' وہ دوسری پارٹی میرے آدمی ہی تھے۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ قاضی سلطان بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "اس کے بعد کے واقعات بالکل ویسے ہی رہیں گے جیسے پیش آئے' بس نہ پہلے کہیں تمہارا ذکر آیا ہے اور نہ بعد میں آئے گا۔ تمہاری تو ہو گئی چھٹی۔ میں نہیں جانتا' وجدان اور ساحل کون ہیں!"

"میں آپ کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔" میں نے کہا "مگر کچھ باتیں اب بھی الجھی ہوئی ہیں۔"

اس نے پوچھا "مثلاً کون سی باتیں؟"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "مثلاً یہ کہ ممتاز کی واپسی آپ کے سالے ایس پی صاحب سے پوشیدہ تو نہیں رہے گی۔ وہ لڑکی کاماموں ہے اور اس کی بازیابی کے لیے چارہ جوئی میں لگا ہوا ہے۔ کیا آپ اس کے سامنے بھی میرا ذکر گول کر دیں گے۔ ایس پی کے عہدے پر فائز شخص بہت ذہین اور قابل ہوتا ہے بلکہ اسے کائیاں کہنا چاہیے۔ وہ آپ کے اس جھوٹ کو پکڑ لے گا یا نہ بھی پکڑ سکا تو بعد میں یہ بات کھلنے کے امکانات بہرحال موجود ہیں۔ اس طرح آپ کی رشتے داری میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ تائیدی انداز میں بولا "لیکن میں واضح کر دوں کہ میں اپنے سالے سے جھوٹ نہیں بول سکتا بلکہ تم سمجھ لو کہ میں نے تمہیں یہاں بلانے سے پہلے ایس پی صاحب سے فون پر تفصیلی بات کر لی ہے۔"

یہ میرے لیے ایک انکشاف تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "آپ نے ایس پی صاحب کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ میرا مطلب ہے' میری کارگزاری کے بارے میں؟"

"میں نے کہا نا' میں اپنے سالے سے جھوٹ نہیں بولتا ہوں۔"

"پھر انہوں نے کیا کہا؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ آج رات کے کھانے پر ہمارے پاس ہوں گے۔"

قاضی سلطان نے بتایا "انہوں نے تمہارے کارنامے کو سراہا ہے اور کہا ہے کہ وہ تم جیسے بہادر شخص سے ملے بغیر تمہیں کہیں جانے نہیں دیں گے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں تمہیں ان کی آمد تک اپنے پاس روکے رکھوں۔"

"کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی؟" میں نے تشویش ناک انداز میں پوچھا۔

وہ بولا "کیسی گڑبڑ؟"

میں نے کہا "ایس پی صاحب ایک اعلیٰ افسر ہیں۔ وہ مجھے آسانی سے جانے نہیں دیں گے۔ اگر وہ بیانات اور گواہیوں کے چکر میں پڑ گئے تو مجھے کئی روز یہاں رکنا پڑے گا۔ میرے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ میں خوامخواہ کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"میں نے انہیں تمہاری بہادری کی کہانی سنائی ہے۔" قاضی سلطان نے کہا "وہ رات کو جب یہاں آئیں گے تو انہیں "کٹ والی کہانی" بھی سنا دوں گا۔ وہ میری بات مانتے ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔

تمہیں کسی قسم کی قانونی کارروائی کے پیشِ نظر یہاں نہیں روکا جائے گا۔"

مجھے اطمینان ہوگیا۔ میں نے کہا "اگر آپ اپنے سالے صاحب کو یہ نکتہ سمجھا سکیں تو پھر ٹھیک ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے سوال کیا "قاضی صاحب! کیا آپ ایس پی صاحب کو میری حقیقت بھی بتادیں گے؟"

"اگر تم ایسا نہیں چاہتے تو بالکل نہیں بتاؤں گا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "ہماری دوستی کا تقاضا تو یہی ہے کہ تمہارے جذبات کا میں احترام کروں۔ دوستی دراصل دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے کا ہی نام ہے۔"

"میں نے کہا "میں چاہتا ہوں' اس موقع پر ایس پی صاحب کو میرے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے پھر بعد میں کبھی ان سے تفصیلی بات کی جاسکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے' جیسے تمہاری خوشی۔" وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "یہ بات ابھی اپنی بیٹی سے بھی آپ نہ ہی کہیں تو اچھا ہے۔"

"ہاں' میں سمجھ رہا ہوں۔ ممتاز اپنے ماموں کی بہت لاڈلی ہے۔" وہ بولا "میں اس سلسلے میں احتیاط کروں گا۔"

میں نے قاضی سلطان سے پوچھا "آپ ان دونوں "سورماؤں" کا کیا کریں گے؟" میرا اشارہ اکبر سومرو اور تارا کی طرف تھا۔

وہ بولا "ان میں سے ایک تمہارا دشمن ہے اور ایک میرا دشمن۔ ہم چونکہ دوستی کے رشتے میں بندھ چکے ہیں اس لیے وہ ہمارے مشترکہ دشمن ہیں۔ ان کے بارے میں ہمیں مشترکہ طور پر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔"

"مجھے تو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" میں نے حتمی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "آپ ان کے ساتھ جو بھی سلوک کریں' مجھے منظور ہے۔"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا "ممتاز نے مجھے بتایا ہے کہ منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ نے اکبر سومرو کے اشارے پر اسے اغوا کیا تھا اس حوالے سے وڈیرا اکبر سومرو ڈاکوؤں کا پشت پناہ یا سرغنہ ہوا۔ میں نے ایس پی صاحب کو بتایا ہے کہ جب تم نے ممتاز کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑالیا تو ان کے باوا آدم اکبر سومرو نے تمہارا تعاقب کیا۔ اس سے وڈیرے کا جرم اور بھی واضح ہوگیا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اکبر سومرو اور اس کے ساتھی تارا کو پولیس کے حوالے کروں گا۔ باقی کے جرائم وہ خود اگلوالیں گے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ممتاز نے اتنے حتمی انداز میں قاضی سلطان کو کیوں بتایا کہ منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ وڈیرا اکبر سومرو کے کارندے تھے۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وڈیرے کے رویّے سے میں ضرور بھانپ لیتا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ممتاز نے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔ وڈیرے اکبر سومرو کو پھنسانے اور ہماری پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے مگر وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ اس سوال کا جواب مجھے کہیں نہیں مل رہا تھا۔ میں نے اکبر سومرو کو ڈرانے کے لیے ایک جھوٹی کہانی اسے سنائی تھی جس کے مطابق ممتاز کے اغوا میں اسی کا ہاتھ تھا۔ میں نے اکبر سومرو کو خوف زدہ کرنے اور اسی کی جھوٹی کہانی کے جواب میں وہ قصہ گھڑا تھا۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں آرہا تھا کہ کیا ممتاز میری باتوں کو بالکل سچ سمجھی تھی اور اس نے اپنے باپ کو بھی وہی کہانی سنادی تھی۔ ایک اور بات قابلِ غور تھی۔ ممتاز نے قاضی سلطان کو جو کہانی سنائی اس میں ٹویوٹا ہائی لکس کے الٹنے اور اسے دوبارہ سیدھا کرنے کا ذکر نہیں تھا۔ وہ میرے اس کارنامے کو اپنے باپ سے چھپا رہی تھی؟ میں جیسے جیسے سوچ رہا تھا' الجھتا جا رہا تھا۔ مدھوری ڈکشت سے مشابہ وہ لڑکی بڑی گہری ثابت ہو رہی تھی!

"کس سوچ میں پڑ گئے وجدان!" قاضی سلطان کی آواز نے مجھے چونکا دیا "کیا میرا پروگرام تمہیں پسند نہیں آیا؟"

"نن... نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کا پروگرام فل اینڈ فائنل ہے۔ اس میں مجھے کوئی خرابی نظر نہیں آرہی لیکن....."

میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ قاضی سلطان نے پوچھا "لیکن کیا وجدان؟"

میں نے کہا "میں نے وڈیرا اکبر سومرو کی زبان کھلوانے کے لیے اسے ممتاز کے حوالے سے ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی۔ میں نے منگل سنگھ کو اس کا چیلا گردانتے ہوئے اس پر الزام لگایا تھا کہ ممتاز کو اس کے اشارے پر اغوا کیا گیا تھا۔ کیا آپ کی بیٹی میری انہی باتوں کی بنا پر اکبر سومرو کو قصوروار ٹھہرا رہی ہے یا کوئی اور بات ہے؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "ہمیں اس الجھن میں نہیں پڑنا چاہیے کہ ممتاز کے اغوا میں اکبر سومرو کا ہاتھ ہے یا نہیں۔ اس وقت وہ ہمارے قبضے میں ہے اور حالات سراسر اس کی مخالفت میں جا رہے ہیں۔ ممتاز نے مجھے بچارو میں تمہاری اکبر سومرو سے ہونے والی گفتگو کے بارے

میں تفصیلاً بتایا ہے۔ وہ تمہیں آٹھ دس افراد کے قتل میں ملوث کرنا چاہتا تھا' جواباً تم نے ممتاز کے اغوا کا سارا ملبا اس پر ڈال دیا۔ اب جو بھی ہو' ہماری اس فائنل کہانی کے مطابق اصل مجرم وڈیرا اکبر سومرو ہی ہے البتہ اس کے کارندے منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ممتاز کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ میں نے دونوں ڈاکوؤں کو از خود جانے دیا تھا' وہ فرار نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات صرف میری ساتھی ساحل اور میر بخش کو معلوم تھی اور وہ دونوں بھروسے کے آدمی تھے۔

میں نے کہا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اکبر سومرو نے ممتاز کو اغوا کروایا تھا یا نہیں۔ اس نے ممتاز جیسی درجنوں لڑکیوں کو اغوا کروایا ہوگا' لاتعداد لڑکیوں اور عورتوں کی عزتوں کو برباد کیا ہے اس نے۔ وہ ایک بھوتار وڈیرا ہے۔ اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ کسی نہ کسی مظلوم کی آہ تو اثر دکھائے گی' کسی نہ کسی بے گناہ مقتول کا خون تو رنگ لائے گا۔ وہ چھری تلے آہی گیا ہے تو اسے پوری طرح "فٹ" کردینا چاہیے۔"

"تم فکر نہ کرو وجدان۔" قاضی سلطان نے گہری سنجیدگی سے بولا "میں اس کا بڑا مناسب "بندوبست" کرنے والا ہوں۔"

میں نے کہا "قاضی صاحب! ایک بات ذہن میں رہے۔ ہم جس گاڑی میں یہاں پہنچے ہیں وہ بچارو وڈیرے کی ہے جب کہ ہماری فائنل کہانی کے مطابق آپ کے آدمی اپنی گاڑی میں دونوں مجرموں کو ڈال کر آپ کے پاس لائے ہیں۔ وڈیرے کے ساتھ ساتھ اس کی "زخم خوردہ" بچارو کا بھی کوئی معقول بندوبست ہونا چاہیے۔"

"ہو جائے گا۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا "ڈاکوؤں کی ٹویوٹا فورو ویل ڈرائیو ریلوے کراسنگ پر کھڑی ہے۔ وڈیرا اکبر سومرو نے جس ٹویوٹا ہائی لکس میں میرے آدمیوں کا تعاقب کیا وہ سامارو کے نزدیک صحرا میں موجود ہے۔ میرے وفادار آدمی اپنی اپنی جیپ میں ممتاز اور ان دونوں مجرموں کو بٹھا کر حویلی تک لائے ہیں۔ بچارو بالکل آؤٹ۔ ٹھیک ہے' گاڑی اب کسی کو حویلی کے اندر یا باہر نظر نہیں آئے گی۔ تم اس سلسلے میں مطمئن ہو جاؤ۔"

میں واقعی مطمئن ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد قاضی سلطان سے رخصت لے کر مہمان خانے کی طرف آگیا۔ اس وقت شام ہو چلی تھی۔ میں نے

ڈاکٹر جی ایم نازکی
شہرۂ آفاق کتاب
ازدواجی نفسیات
قیمت 40 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
❖ زندگی کے ساتھی کا آئیڈیل
❖ منگنی اور آئیڈیل
❖ ازدواجی ہم آہنگی
❖ ازدواجی زندگی کا جنسی پہلو
کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ' منی آرڈر یا کراسڈ چیک ارسال روانہ کریں
خط و کتابت کا پتہ
kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میر بخش کے کمرے میں جھانکا۔ وہ کمرا ہمارے کمرے کے برابر ہی تھا۔ میر بخش بیڈ پر دراز تھا۔ اس نے ایک بازو اپنی آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ سو رہا ہوگا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔

ساحل بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ میرے اندر داخل ہونے پر اس نے کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا جب میں اس کے بیڈ کے قریب پہنچا تو میں نے اس کی گہری گہری سانسوں کی آواز سنی۔ ہم تینوں گزشتہ پوری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکے تھے۔ نیند تو مجھے بھی آرہی تھی تاہم میں ابھی سونے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ قاضی سلطان نے ایس پی کی متوقع آمد کی اطلاع دے کر مجھے الرٹ کردیا تھا۔ اب میں اس سے ملاقات کے بعد ہی سونے کے بارے میں سوچتا۔

میں ساحل کو سوتا چھوڑ کر واش روم میں گھس گیا اور وہاں نصب کھونٹیوں کو دیکھ کر مجھے چونکنا پڑا۔ قاضی سلطان کے ملازم فقیر علی نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ساحل کی نارنجی بنارسی ساڑی اور میری پینٹ شرٹ صاف ستھری اور استری شدہ حالت میں ہینگرز پر وہاں ٹنگی نظر آرہی تھی۔ میر بخش کا شلوار قمیص بھی یقینی طور پر اس کے باتھ روم میں پہنچا دیا گیا ہوگا۔

میں واش روم سے فارغ ہونے کے بعد صوفے پر دراز ہوگیا اور خود کو پیش آنے والے حالات پر غور و فکر کرنے لگا۔ قاضی سلطان نے مجھے ایک کاغذ پر اپنے کراچی والے دوست کا پتا لکھ کردیا تھا۔ اس شخص کا نام منہاس باقر تھا۔ وہ کراچی سے سب سے پوش علاقے کلفٹن میں رہتا تھا۔ ایڈریس والے کاغذ پر اس کے بنگلے اور دفتر کے فون نمبرز بھی درج تھے۔ اسی کاغذ کے ایک کونے میں قاضی سلطان نے اپنا فون نمبر بھی لکھ دیا تھا اور مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے یہاں سے رخصت ہوتے ہی وہ منہاس باقر کو میرے بارے میں اطلاع دے دے گا۔

تھوڑی دیر بعد میر بخش میرے پاس آگیا۔ وہ اپنے کندھے کے زخم میں خاصی بہتری محسوس کر رہا تھا۔ میرے نزدیک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا "سائیں! قاضی صاحب کا ڈاکٹر تو کمال کا بندہ ہے۔ درد بالکل غائب ہوگیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا بازو زخمی ہوا ہی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "یہ اس پین کلر انجیکشن کا کمال ہے۔ ممکن ہے، آٹھ دس گھنٹے بعد تمہیں ہلکا پھلکا درد پھر سے ہونے لگے مگر میں مطمئن ہوں۔ ڈاکٹر نے جس مہارت سے تمہاری مرہم پٹی کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ دو چار دن میں تم بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔ ایک پٹی ہم کراچی پہنچ کر کروالیں گے۔"

"ہم یہاں سے کب روانہ ہو رہے ہیں؟" میر بخش نے پوچھا۔

"انشاءاللہ کل صبح۔" میں نے بتایا۔

"قاضی سلطان سے آپ کی بات ہوگئی ہے؟"۔

"صرف بات ہی نہیں ہوئی۔" میں نے کہا "باقاعدہ تفصیلی بات چیت ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم کل صبح کراچی روانہ ہو جائیں۔ وہ یہاں کے حالات کو خود ہی سنبھال لے گا۔"

"آخر کیوں نہیں" میر بخش نے ایک خاص انداز سے کہا "قاضی سائیں کا سالا ایس پی لگا ہوا ہے۔ اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہوگا۔ میں نے قاضی سلطان کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔ وہ بہت پہنچ والا وڈیرا ہے۔ یہ اچھا ہوا سائیں! آپ سے اس کی دوستی ہوگئی۔ وہ ایس پی سے بات کرکے ہمیں ڈی ایس پی والے چکر سے نکال سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ایس پی سے اس کی بات ہوگئی ہے۔ ایس پی آج رات کے کھانے پر یہاں آرہا ہے۔ وہ ہم سے 'خاص طور پر' مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میری کارکردگی نے اسے خاصا متاثر کیا ہے۔"

میر بخش نے مبہم انداز میں کہا "سائیں! کوئی انعام وغیرہ کا چکر تو نہیں!"

"کیسا انعام؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"سائیں! منگل سنگھ ایک خطرناک ڈاکو ہے۔ حکومت کی جانب سے اس کی گرفتاری پر کوئی انعام تو ضرور مقرر ہوگا نا۔" میر بخش نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

میں اس کی بات کی تہ میں اتر گیا۔ میں نے کہا "میر بخش! اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو ہمیں انعام کیسے مل سکتا ہے۔ ہم نے ڈاکوؤں کو گرفتار کروانے کے بجائے جانے کی اجازت دے دی تھی۔"

"پھر بھی سائیں، ممتاز کی واپسی کے لیے ڈاکوؤں نے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رکھا تھا۔" میر بخش نے کہا "مغویہ کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچانے کے سلسلے میں تو ہم نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے نا! ممتاز، ایس پی کی چہیتی بھانجی ہے۔ میں اس حوالے سے بات کر رہا تھا۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "تم کسی بھی حوالے سے کوئی بھی بات کہہ رہے ہو، اس کو بھول جاؤ۔ یاد رکھنے کی صرف یہ بات ہے کہ ہم نے منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ کو از خود جانے نہیں دیا بلکہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ ہر جگہ تمہارا یہی بیان ہونا چاہیے۔ کم از کم جب تک ہم بہ حفاظت کراچی نہیں پہنچ جاتے، اس نکتے کو ذہن نشین رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔"

"سمجھ گیا سائیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "یہ اچھا ہوا، ممتاز اور ریلوے پھاٹک والے انور علی بھی نہیں جانتے کہ ڈاکو فرار ہوئے تھے یا ہم نے انہیں نکلنے کا موقع دیا تھا۔ آپ نے انور علی اور ممتاز کو یہی بتایا تھا کہ وہ دونوں جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔"

"میں نے قاضی سلطان کو بھی یہی کہانی سنائی ہے۔" میں نے کہا "بلکہ ہماری ملاقات سے پہلے ہی ممتاز اپنے باپ کو تمام باتیں بتا چکی ہے۔"

پھر میر بخش کے استفسار آمیز اشتیاق پر میں اسے قاضی سلطان سے ہونے والی ملاقات کی تفصیل سنانے لگا۔ اس دوران میں ہماری باتوں کی آواز سن کر ساحل کی آنکھ کھل گئی۔ ظاہر ہے، پھر وہ بھی ہماری گفتگو میں شامل ہوگئی۔ میں نے انہیں قاضی سلطان سے ہونے والی بات چیت کا احوال سنانے کے بعد ہر نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہ کردیا۔

ایس پی نے ڈنر پر آنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ نہیں آیا۔ کچھ انتظار کے بعد ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا۔ دن کا کھانا خاصی تاخیر سے کھایا گیا تھا اس لیے ڈنر زیادہ رغبت سے نہ کیا گیا۔ ہم ڈرائنگ روم سے واپس اپنے کمروں کی طرف آنے لگے تو ساحل نے کہا۔

"وجدان! تھوڑی دیر تک حویلی کے احاطے میں ٹہلتے ہیں۔"

اس کی تجویز معقول تھی تاہم میر بخش نے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کرے گا۔ ہم اسے اس کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر مہمان خانے کے سامنے وسیع و عریض دالان میں چہل قدمی کرنے لگے۔ رات آہستہ آہستہ بھیگنے لگی تھی۔ فضا میں خنکی تھی اور آسمان پر درمیانی تاریخوں کے لگ بھگ پورا چاند طلوع ہو چکا تھا۔ کھلی فضا کا صاف شفاف آسمان تاروں سے بھرا دکھائی دے رہا تھا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے مجھے تھپکنا شروع کردیا۔ میر بخش اور ساحل تو ایک نیند لے چکے تھے مگر میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھ نہیں لگائی تھی۔ کچھ دیر کی ٹہل قدمی کے بعد میں نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا "ساحل، مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ آنکھوں میں جلن سی ہو رہی ہے۔"

وہ بولی "یہ مسلسل بے آرامی اور رت جگے کا نتیجہ ہے۔"

"ہاں، اس میں تھکن اور کھانے کا خمار بھی شامل ہوگیا ہے۔" میں نے ایک اور جماہی لی۔

"چلو، کمرے میں چلتے ہیں۔" وہ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کمرے کی جانب قدم اٹھا دیے۔ ساحل کے ہاتھ کا نازک لمس میرے احساس میں ایک گدگدی سی جگا رہا تھا۔ ہم اپنے کمرے کے نزدیک پہنچے تو قاضی سلطان کا ملازم فقیر علی اچانک اندھیرے سے نمودار ہو کر ہمارے سامنے آگیا۔

اس جگہ اگرچہ اندھیرا نہیں تھا تاہم فقیر علی جس رخ سے ہمارے سامنے آیا، اس طرف گہری تاریکی تھی۔ میں نے فقیر علی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے مودبانہ بلکہ خادمانہ انداز میں کہا۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

ایک ایسے نوجوان کی داستانِ عبرت

جو حالات کے جال میں پھنس کر جرائم کی دلدل میں پھنستا چلا گیا

انعام یافتہ مشہور مصنف جبار توقیر کا منفرد انداز تحریر

کتابی شکل میں تیار ہے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23
74200 کراچی

فون 5872952-5869512

kitabiat1970@yahoo.com

رعایتی نرخ: 3 تا 63 کتابیں منگوانے پر 11 فیصد، 64 تا 100 کتابیں منگوانے پر 15 فیصد، 101 تا 200 کتابیں منگوانے پر 20 فیصد رعایت دی جائے گی۔ کراچی 75500

"سائیں! آپ کو قاضی سائیں نے حویلی میں بلایا ہے۔"

"کیوں، خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "خیریت ہی ہوگی سائیں۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ مالک نے کہا، آپ کو بلا لاؤں میں آپ کے پاس آگیا۔"

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم کمرے میں چلو۔ میں قاضی سلطان کی بات سن کر آتا ہوں۔"

تھوڑے تامل کے بعد وہ کمرے میں چلی گئی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ بھی میرے ساتھ حویلی کے اندر جانا چاہتی تھی مگر بہرصورت یہ ممکن نہیں تھا اس لیے میں اکیلا ہی فقیر علی کی راہ نمائی میں قاضی سلطان کے پاس پہنچ گیا۔

قاضی سلطان نے مجھے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے سالے ایس پی کا فون آیا تھا۔ اس نے پہلے تو ڈرتے ڈرتے نہ پہنچ سکنے کی معذرت کی پھر بتایا کہ کسی محکمہ جاتی مصروفیت کے باعث وہ آج پوری رات مصروف رہے گا اس لیے اب اس سے کل صبح ہی ملاقات ہو سکے گی۔ قاضی سلطان نے مزید بتایا۔

"وجدان! ایس پی صاحب نے تاکید کی ہے کہ ان کے آنے سے پہلے آپ لوگوں کو جانے نہ دیا جائے اس لیے ممکن ہے، تم لوگوں کو رخصت ہوتے ہوئے دوپہر ہو جائے۔"

میری چھٹی حس نے بتایا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں نے قاضی سلطان سے اس حوالے سے سوال کیا تو اس نے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا "ایس پی صاحب نے اپنی محکمہ جاتی مصروفیت کے بارے میں تو کچھ بتایا ہوگا!"

"نہیں، انہوں نے کسی قسم کی تفصیل نہیں بتائی۔" وہ بولا "بس یہی کہا ہے کہ آج کی رات ان کا عمرکوٹ میں موجود رہنا ضروری ہے۔ اوپر سے احکام آئے ہیں۔" پھر وہ مجھے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "تم کیوں پریشان ہو رہے ہو وجدان۔ کل صبح اور دوپہر میں کیا فرق ہے۔ تم دوپہر کو بھی یہاں سے نکلے تو بہ آسانی شام سے پہلے کراچی پہنچ جاؤ گے اور ویسے بھی تم نے کون سا پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا ہے۔ میں یہاں سے تمہیں اپنی لینڈ کروزر میں روانہ کروں گا۔ ایک ماہر ڈرائیور اور دو مسلح گارڈز تمہارے ساتھ ہوں گے۔" پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا "قاضی سلطان صرف دوستی کرنا ہی نہیں بلکہ دوستی نبھانا بھی جانتا ہے۔"

"میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسی شخصیت سے دوستی ہو گئی۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "مجھے امید ہے کہ آپ میرے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔"

"پھر تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے متامل انداز میں کہا "میں ڈی ایس پی کے بارے میں سوچ کر الجھ رہا ہوں۔ ہم نے شادی پلی میں اس کے ساتھ جو "شان دار سلوک" کیا ہے۔ وہ اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارے خلاف کوئی بھی خطرناک چال چل سکتا ہے۔"

میں نے اپنے اندیشے کا کھل کر اظہار کر دیا۔ قاضی سلطان نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "وہ رشوت خور بدعنوان ڈی ایس پی میرے سالے کے حکم کا غلام ہے۔ میں ایس پی سے کہہ کر اس کی ہر کمینی چال کو اسی پر لوٹا دوں گا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا "پھر میں بھی تو یہاں بیٹھا ہوں۔ کوئی معاملہ مجھ سے باہر تھوڑی ہے۔ تم کمرے میں جا کر آرام سے نیند پوری کرو اور اگر کسی مخصوص شے کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دو۔ یہاں تمہیں کوئی بھی کمی محسوس نہیں ہوگی۔"

اس نے "مخصوص شے" کے الفاظ ادا کرتے ہوئے خاصا زور استعمال کیا تھا۔ میں سمجھ گیا، اس کا اشارہ "ڈرنکس" کی جانب تھا۔ یہ آفر اس نے مجھے اس لیے کی تھی کہ وہ میرا بے تکلف دوست بن چکا تھا مگر میں نے بڑی خوبصورتی سے اس کی پیش کش مسترد کر دیا۔

"قاضی صاحب! اس سلسلے میں تو میں معذرت چاہوں گا۔" میں نے کہا۔

"اس معذرت کی کوئی خاص وجہ؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں نے کبھی اس شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"شاباش!" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "قاضی صاحب! شاباش کا لفظ ذو معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ میں اسے اپنی تعریف سمجھوں یا آپ کی حیرت... یا پھر...؟"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

"وجدان! میں نے سچے دل سے تمہاری تعریف کی ہے۔ اگر تم نے ابھی تک اس خانہ خراب کو ہاتھ نہیں لگایا تو تمہارے لیے میرا مشورہ یہ ہوگا کہ آئندہ بھی کبھی اسے ہاتھ

نہ لگانا، اس سے دور رہنے کی کوشش کرنا کیوں کہ یہ کمبخت بہت وفادار ہے، بے انتہا محبت کرنے والی ہے۔ ایک مرتبہ کسی کا ہاتھ تھام لے تو زندگی بھر ساتھ نبھاتی ہے۔ اس سے چاہے جتنی بھی بے وفائی کر لو، یہ جان نہیں چھوڑتی، اس کو ایک بار اختیار کرنے کے بعد چھوڑنا ممکن نہیں۔"

"یا یوں کہہ لیں کہ یہ کمبخت چھوٹتی نہیں؟" میں نے تیکھی نظر سے قاضی سلطان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ شدت سے اثبات میں گردن ہلانے لگا "ٹھیک کہہ رہے ہو، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

کچھ دیر بعد میں حویلی کے اندرونی حصے سے واپس اپنے کمرے میں آگیا۔

ساحل بستر پر لیٹ چکی تھی تاہم وہ جاگ رہی تھی اور اس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ باتوں کے موڈ میں ہے مگر اس وقت میری آنکھیں نیند کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں اور میں فوری طور پر سونے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے کمرے میں آکر زیرو پاور کا بلب روشن کیا اور ٹیوب لائٹ کا بٹن آف کر دیا پھر بستر کی جانب بڑھتے ہوئے کہا "لگتا ہے، ابھی کا سویا مدت بعد ہی اٹھوں گا۔ تھکن اور نیند سے جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔"

"تم نے صحرا میں مہم جوئی بھی تو بہت کی ہے۔" ساحل نے تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے بستر پر چت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ میرے لائٹ آف کرنے سے ساحل یہ تو سمجھ گئی کہ میں سونے کے موڈ میں ہوں مگر وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر مجھ سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

"وجدان! تم نے کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک نہیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہم اس وقت ایک اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے درمیان ہیں۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولی "ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم دروازے کو اندر سے بولٹ ضرور کر لیں۔"

میں نے بہ دستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ قاضی سلطان سے میں نے دوستی گانٹھ لی ہے۔ اس وقت ہم اجنبی لوگوں میں نہیں بلکہ ایک دوست کی حویلی کے مہمان خانے میں ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔" وہ سنجیدگی سے بولی "بے شک قاضی سلطان تمہارا دوست بن چکا ہے مگر ابھی دوستی کسی ایک بھی آزمائشی مرحلے سے نہیں گزری۔ ہم جن سنگین حالات سے گزر رہے ہیں..."

میں نے ساحل سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا "ٹھیک ہے۔ تم آخر دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دو۔"

وہ خاموشی سے اٹھی اور دروازے کو بولٹ کر کے واپس بستر پر آگئی۔ میں نے کہا "اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا ہوگا۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں تھوڑی نیند لے لوں؟"

"ضرور... ضرور۔" وہ روا روی میں بول گئی مگر عادت کے مطابق اس نے بات بھی جاری رکھی "وجدان! ہم کس حد تک قاضی سلطان پر بھروسا کر سکتے ہیں؟"

"ان حدود کا تعین صبح اٹھ کر کریں گے۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

وہ بولی "وجدان! اس وقت ہمیں کہیں ٹھہرنے کا موقع ملا ہوا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم مجھے "چی" کی بیداری کے لیے مخصوص مشق کے بارے میں کچھ بتا دو۔ مجھے تو نیند نہیں آرہی، سوچ رہی ہوں، کچھ پریکٹس ہی کر لوں گی۔"

"تمہیں نیند اس لیے نہیں آرہی کہ تم نے تین چار گھنٹے سو لیا ہے۔" میں نے چمک کر کہا "لیکن میں اس وقت نیند کی شدید طلب محسوس کر رہا ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ روٹھنے والے انداز میں بولی "تم سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ ہی جائے گی۔"

اس کے روٹھنے کی ادا مجھے بھا گئی۔ میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور کہا "منہ کیوں پھلا رہی ہو؟"

"میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا!"

"تم جو بھی کرتی ہو اس سے بے خبری ہی ظاہر کرتی ہو!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا "مگر تمہارا چہرہ چغلی کھا جاتا ہے۔"

وہ اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے بولی "پتا نہیں، تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟"

"میری باتوں کو سمجھنے کے لیے چہرے کو انگلیوں سے مت ٹٹولو۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "انگلیاں بھی تمہاری ہی ہیں۔ وہ تمہیں کیا بتائیں گی۔"

"پھر کیا کروں؟" وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "آئینے میں جا کر اپنی صورت دیکھو۔ تمہارے چہرے کے تاثرات دل کی کہانی کھول دیں گے!"

"کس کے دل کی؟" وہ بنتے ہوئے بولی۔

"تمہارے دل کی' اور کس کے دل کی؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

بے اختیار اس کی نظر جھک گئی۔ یہ اس کا عین فطری ردِعمل تھا۔

میں نے اپنے بستر سے نیچے آتے ہوئے کہا "چی کی باقاعدہ مشق کرنے کے لیے کھلی فضا کی ضرورت ہوتی ہے یا پھر کوئی ایسا کمرا ہو جس کی کھڑکی شمال کی سمت کھلتی ہو کیوں کہ مشق کے دوران میں ایک مخصوص طریقے سے بریتھنگ کرنا ہوتی ہے جس کے لیے تازہ اور شفاف ہوا زیادہ مفید رہتی ہے۔ اس مشق میں دماغ کے سیلز کو زیادہ سے زیادہ آکسیجن ملنا چاہیے۔"

"یہ بریتھنگ کیا چیز ہے؟" ساحل نے پوچھا۔

میں نے بتایا "بریتھنگ (BREATHING) دراصل سانس لینے کا عمل ہے۔ اس میں سانس کھینچنا (INHALE) اور سانس چھوڑنا (EXHALE) دونوں شامل ہیں۔ چی کی مشق کے دوران میں یوگا کی مخصوص تکنیک سے سانس لی جاتی ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا اور کہا "اور میرے خیال میں یہ کمرا اس مشق کے لیے مناسب ہے اور نہ ہی یہ وقت موزوں۔"

"کمرا تو سمجھ میں آرہا ہے۔" ساحل نے کہا "مگر وقت موزوں کیوں نہیں' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

اس دوران میں وہ بھی بستر چھوڑ کر نیچے آگئی تھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "بریتھنگ کے لیے سب سے زیادہ مناسب' موثر اور موزوں وقت علی الصباح کا ہے۔ یعنی صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیان کا وقفہ۔ اس دوران میں فضا میں موجود آکسیجن سب سے زیادہ معطر اور صاف شفاف ہوتی ہے۔ لہٰذا فائدہ بھی کئی گنا زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ ماسٹر ہنگ پائی نے شاؤلن ٹیمپل میں مجھے بتایا تھا کہ فضا میں آکسیجن کا مالیکیول مختلف اوقات میں اپنی طاقت بدلتا رہتا ہے۔ سورج کی موجودی میں یہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ غروبِ آفتاب سے صبح کاذب تک یہ انتہائی کمزور حالت میں رہتا ہے جب کہ صبح کاذب سے صبح صادق کے درمیانی وقفے میں یعنی طلوعِ آفتاب سے چند لمحے پہلے تک یہ اپنی طاقت کے عروج پر ہوتا ہے۔ میں نے کیمسٹری نہیں پڑھی اور نہ ہی میں کوئی سائنس داں ہوں۔ میں اپنے استاد ماسٹر ہنگ پائی کے الفاظ تم تک پہنچا رہا ہوں۔ ویسے یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیانی وقفے میں یوگا کی مشقیں کرنے کا ایک اپنا ہی لطف ہے۔ لگتا ہے' کوئی نہایت ہی لطیف قوت قلب و روح کو سرشار کر رہی ہو۔" میں سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس وقت تمہیں اس لیے بھی "چی" کی مشق نہیں کرنا چاہیے کہ کھانا کھائے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری۔ کھانے کے کم از کم پانچ گھنٹے بعد سانس کی مشق کرنا چاہیے۔"

ساحل خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے پوچھا "وجدان یہ شمال رخ کھڑے ہو کر مشق کرنے کی کیا مصلحت ہے؟"

"یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔" میں نے کہا "اس وقت تم صرف مشق کے لیے کھڑے ہونے کا انداز سیکھ لو۔"

پھر میں نے اسے "ہارس پوزیشن" میں کھڑے ہونا سکھایا۔ یہ ایک گھڑسوار کی پوزیشن ہوتی ہے۔ جس طرح گھڑسوار گھوڑے پر بیٹھتا ہے بالکل اسی انداز میں پاؤں پھیلا کر زمین پر کھڑے ہونا ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں پر ایک مخصوص پوزیشن میں رکھا جاتا ہے۔ گھٹنوں میں ہلکا سا خم اور کمر بالکل سیدھی' سینہ باہر کو نکلا ہوا۔

کھڑے ہونے کا یہ انداز اچھی طرح سمجھانے کے بعد میں نے ساحل سے کہا "اب میں سونے جا رہا ہوں۔ تم بھی جب تھک جاؤ تو سونے کی کوشش کرنا۔"

وہ میرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پریکٹس کرنے لگی۔

میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا "اور ہاں' ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کمرے میں ہمارے لیے۔ کوئی بھی شے نقصان دہ نہیں ہے۔ خاموشی سے اپنے بستر پر سو جانا۔ شب بہ خیر!"

پھر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ ساحل نے کچھ نہیں کہا۔ یقیناً وہ مجھے گھور کر رہ گئی ہوگی۔ میری ہدایت کا مطلب وہ یہ خوبی سمجھ گئی تھی' اور عمر کوٹ کے ہوٹل میں گزاری ہوئی وہ رات اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئی ہوگی جب اس نے ڈر اور درد کی آڑ میں میرا قرب حاصل کیا تھا۔

میں سونے سے پہلے ممتاز کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس لڑکی نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا نام اس کی شخصیت سے لگا کھاتا تھا۔ وہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں خوبصورت لڑکیوں میں ممتاز نظر آنے والی ہستی تھی۔ اس کی آنکھیں بولتی تھیں اور سامنے والے کو اس کے حسن کی تعریف میں بولنے پر مجبور کرتی تھیں۔ وہ بلاشبہ ایک ذہین اور معاملہ فہم لڑکی تھی۔

ممتاز کی معاملہ فہمی اپنی جگہ لیکن اس نے اپنے بابا کو جو بیان دیا تھا' اس میں سے چند باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں مثلاً اس نے قاضی سلطان کو بتایا کہ ڈاکوؤں کی باہمی گفتگو سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اسے اکبر سومرو کے اشارے پر اغوا کر کے اپنے ڈیرے پر لے گئے تھے۔ میں نے پجارو میں وڈیرے کو ڈرانے دھمکانے کے لیے جو جھوٹی کہانی تخلیق کی تھی' وہ ممتاز کے بیان سے مصدقہ ہو جاتی تھی مگر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وڈیرا اس اغوا میں ملوث نہیں تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ممتاز اس کو پہلی نظر دیکھتے ہی ہمیں بتا دیتی کہ منگل سنگھ وغیرہ نے اسی کے ایما پر اغوا کی واردات کی تھی جب کہ اس وقت ممتاز نے نہایت ہی تحمل سے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ وڈیرے کو اس حوالے سے جانتی ہے کہ وہ اس کے بابا قاضی سلطان کا دیرینہ دشمن ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اکبر سومرو کو دیکھ کر ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ بھی ممتاز کی بہت سی "ادائیں" قابلِ غور اور جواب طلب تھیں۔ میں نے سوچا' صبح ممتاز سے ضرور ملاقات کروں گا تاکہ مجھے میرے سوالوں کے تسلی بخش جواب مل سکیں۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے بدن کو ڈھیلا چھوڑا' دو چار گہری سانسیں لے کر دماغ کو خیالات سے خالی کیا اور بہ آہستگی نیند کی وادی میں اتر گیا۔

رات کے آخری پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرا ایک مخصوص مہک میں بسا ہوا تھا۔ مجھے اپنے اوپر کسی بوجھ کا احساس ہوا۔ میں بیڈ پر چت لیٹا تھا۔ دباؤ کے احساس نے میرے ہاتھوں کو بے اختیار میرے سینے پر پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گردن اٹھا کر اس طرف دیکھا اور میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوگئی۔ ساحل میرے اوپر لدی ہوئی تھی۔

میں نے اسے اپنے اوپر سے اتارنے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دی تو وہ کسمسائی اور جذبات سے بوجھل آواز میں اس نے صرف اتنا کہا "اوں ہوں۔"

اس کا انداز منع کرنے والا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "یہ کیا کر رہی ہو ساحل!" اس کے ساتھ ہی میں نے اسے ہٹانے کے لیے زور لگایا۔

وہ اسی مخمور آواز میں بولی "میں ساحل نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہو؟" غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔

"اب پہچاننے سے بھی انکار کرو گے؟" اس کے لہجے میں گہری شکایت تھی۔

میں ایک دم سناٹے میں آگیا۔ میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ ملکۂ حسن کی مالک ہمالیہ کی پراسرار شکتی نیلگری کی آواز تھی۔ اب میری سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ اس کمرے میں جو بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی' وہ نیلگری کے دم قدم سے تھی۔ نیند سے اچانک بیدار ہونے کے سبب میں اس کی آواز اور مخصوص مہک کو پہچان نہیں سکا تھا۔

میں نے پوچھا "تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

اس کے ساتھ ہی میں نے اسے اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش بھی جاری رکھی مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہستی ہمالیہ کا وزن لے کر میرے اوپر سوار ہوئی ہو۔ میرے سوال کے جواب میں نیلگری نے کہا۔

"وجدان! میں نے اپنی اصل شکل و صورت میں تم سے آخری ملاقات میں تمہیں بتایا تھا کہ جب بھی کوئی عورت تمہاری تنہائی میں آئے گی تو میں تمہیں اس کے اندر ملوں گی۔ تمہارا قرب حاصل کرنے کے لیے میں یہی راستہ اپنا سکتی ہوں کیوں کہ تم نے اپنا چاپ مکمل نہیں کیا اور ..... نہ ہی کبھی کرو گے۔"

میں نے قدرے سختی سے کہا "ساحل تو دوسرے بستر پر تھی۔ تم نے میرے قریب آنے کے لیے اس کا بدن کیوں استعمال کیا؟"

"تمہیں نہیں معلوم کیوں کہ تم اس وقت گہری نیند میں تھے۔" وہ بوجھل آواز میں بولی "تم یہی سمجھتے ہو' ساحل اپنے بستر پر سو رہی تھی لیکن....."

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ اپنے ہاتھوں سے میرے چہرے کو ٹٹولنے لگی میرے پورے وجود میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ میں عجیب صورتِ حال سے دوچار تھا۔ جسمانی طور پر وہ سو فیصد ساحل تھی مگر اس کے اندر نیلگری بول رہی تھی۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ساحل' نیلگری کی آڑ میں کوئی ڈراما کر رہی ہو۔ میں نیلگری کی آواز' اس کے لب و لہجہ اور اس کے وجود کی مخصوص مہک کو بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔

نیلگری کے ادھورے جملے کے جواب میں' میں نے پوچھا "لیکن کے آگے بھی تو کچھ بولو۔"

وہ اپنی انگلیوں کو باقاعدہ حرکت میں رکھتے ہوئے بولی "ساحل تھوڑی دیر پہلے اپنے بستر سے اٹھ کر تمہارے پہلو میں آگئی تھی۔ شاید وہ تمہاری پسلیوں کے راستے دل میں گھسنا چاہتی تھی۔"

مجھے ساحل کی اس حرکت پر غصہ تو نہیں آیا تاہم اس کے توسط سے نیلگری میرے ساتھ جو کچھ کر رہی تھی' وہ میرے حواس مختل کردینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے فوری طور پر اس کا کوئی سدباب نہ کیا تو نیلگری مجھ پر حاوی آجائے گی اور میں..... اس کے سامنے چت نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اپنے حصول کو آسان بنانا مجھے پسند نہیں رہا۔

میں نے نیلگری سے نمٹنے کے لیے چی کی قوت کو آزمانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ خود مجھ سے الگ ہوگئی پھر ہوا میں تیرتے ہوئے وہ جاکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ سجی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ میں کیا کرنے والا ہوں!

"وجدان!" اس نے شیرینی سے معمور آواز میں کہا "تم میری اس حرکت کا برا نہ ماننا۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

"دل کے ہاتھوں!" میں نے تعجب کا اظہار کیا "نیلگری! تم تو ہمالیہ کی ترائیوں میں بسنے والی ایک عظیم پراسرار قوت ہو۔ یہ دل کے معاملات.....؟"

میں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑی۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ایک مہان شکتی ہونے کے ساتھ ساتھ میں طبعاً' مزاجاً اور فطرتاً ایک عورت ہوں۔ میرے شریر میں ہر وہ انگ موجود ہے جو کسی عورت میں ہو سکتا ہے۔ جب میرے سینے میں دل ہے تو دل میں جذبات بھی ہوں گے۔ جذبات ہیں تو معاملات بھی ہوں گے۔ میں انہی معاملات کے ہاتھوں مجبور ہوں۔" اس وقت وہ ایک مکمل عورت نظر آرہی تھی۔

میں نے نرمی سے پوچھا "مجھ سے تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں تم سے کچھ نہیں چاہتی بلکہ تمہیں چاہتی ہوں؟"

"تمہاری یہ چاہت میری سمجھ سے باہر ہے نیلگری!" میں نے کہا۔

وہ بولی "چاہت سمجھ میں آنے والی شے نہیں۔"

میں خاموشی سے اپنے سامنے بیٹھی ساحل کو دیکھنے لگا جس کے اندر اس وقت نیلگری سمائی ہوئی تھی۔ وہ اچانک بہت افسردہ اور ملول نظر آنے لگی پھر ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔

"وجدان! میری خواہش تھی کہ تم اپنا جاپ مکمل کرکے میرے جسم و جاں کے مالک بن جاتے۔ میں ساری زندگی ایک داسی بن کر تمہارے چرنوں میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر یہ نہیں ہو سکا اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ پتا نہیں' تم سے اتنا بھاگتے کیوں ہو؟"

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو نیلگری۔" میں نے وضاحتی آمیز لہجے میں کہا "تم سے اس قسم کی قربت سے گریز کی ایک خاص وجہ ہے۔"

وہ شاکی انداز میں بولی "اور وہ وجہ یہ ہے کہ تم نے کبھی مجھے عورت تسلیم نہیں کیا اور اس انداز میں نہیں سوچا۔"

"تم میرے دل کی بات کہہ رہی ہو۔" میں نے اثبات میں سرہلایا "میں نے ہمیشہ تمہیں ایک مہان شکتی سمجھا ہے مثبت سوچ رکھنے والی ایک پراسرار قوت۔ میری نظر میں تمہارا مقام بہت بلند ہے۔"

"عورت کا مقام صرف مرد کے دل میں ہوتا ہے!" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

میں نے قدرے چڑ کر سوال کیا "تم خود کو ایک عورت ثابت کرنے کے لیے اتنی بے ضد کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ میں بنیادی طور پر ایک عورت ہی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی "میرے سوا کوئی اور عورت تمہاری قربت کو برداشت نہیں کرسکتی۔ جو بھی عورت حدود پھلانگنے کی کوشش کرے گی' پھڑک کر جان دے دے گی۔"

میں نے چونک کر ساحل کے اندر موجود نیلگری کو دیکھا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مجھے لگا' شاید میری سماعت نے دھوکا کھایا ہے۔ میں نے اضطرابی لہجے میں اس سے پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو نیلگری۔ ماضی میں بہت سی لڑکیاں میری قربت میں رہی ہیں۔ میری قربت ان کے لیے ہلاکت خیز ثابت نہیں ہوئی؟"

"میں نے حدود پھلانگنے کی بات کی ہے۔" وہ اپنے لبوں پر ملکوتی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ "ایسا موقع تمہاری زندگی میں آج تک نہیں آیا۔ گولڈن ٹرائی اینگل کے سفر کے دوران میں سونیا نامی ایک لڑکی نے یہ خطرناک حدود عبور کرنے کی کوشش کی تھی مگر تم نے اپنی مضبوط قوت ارادی سے اس کی کوشش ناکام بنادی۔ وہ ایک محفوظ حد تک محدود رہی تھی تاہم تمہیں آج تک اس محدودی کا بھی ملال ہے۔"

میں چشم تصور سے وہ منظر دیکھنے لگا جب گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جاتے ہوئے ایک پہاڑی سلسلے کے چٹانی غار میں سونیا نے مجھے حاصل کرنے کے لیے اپنے جذبات کے سرکش گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیا تھا مگر میں نے اپنے پایۂ استقامت میں جنبش نہیں ہونے دی تھی۔ میں اس منظر کو سوچ کر جھرجھرا جاتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر نیلگری نے کہا "وجدان! تم ابھی تک کورے ہو۔ تمہاری زندگی کی کتاب کا ہر ورق صاف شفاف ہے۔ جو بھی عورت اس پر اپنا نام لکھنے کی کوشش کرے گی۔ اسے جان سے جانا ہوگا۔ وہ گویا اپنے پروانہ موت پر دستخط کرے گی۔"

"کیا اس دوشنی کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہوگا؟" میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا "تم ہر اس عورت کو جان سے مار ڈالو گی جو میری قربت کی حدود کو پھلانگنے کی کوشش کرے گی؟"

"میں نہیں' بلکہ تم اس کی جان لے لوگے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مم..... میں!" میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا "نیلگری! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"تم پوری دنیا کی خبر رکھتے ہو اور خود سے بے خبر ہو!"

"میں سمجھ نہیں پارہا' تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

وہ گمبھیر آواز میں ٹھہر ٹھہر کر مجھے بتانے لگی "شاؤلن ٹیمپل میں جب تم مارشل آرٹس کی تربیت لے رہے تھے تو ماسٹر ہنگ پائی نے تمہیں اپنی نگرانی میں چند مخصوص مشقیں بھی کروائی تھیں۔ یاد کرو مختلف بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تمہیں مخصوص جڑی بوٹیوں کا رس بھی پلایا گیا تھا۔ انہی بوٹیوں میں ایک ایسی جڑی بھی شامل تھی جس نے تمہیں ہر قسم کے زہر سے محفوظ کردیا ہے۔" وہ سانس لینے کو رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"تم اس واقعے کو تو نہیں بھولے ہوگے جب گنگولی چوہدری نامی ایک ڈاکو تمہاری ساتھی لڑکی بلا کو اغوا کرکے سارسکا کے جنگلات میں لے گیا تھا۔ تم نے جرات اور بہادری کو کام میں لاکر گنگولی کے قبضے سے بلا کو چھڑا لیا۔ واپسی میں' جنگل ہی میں ایک بلیک کوبرا نے تمہیں ڈس لیا تھا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا مگر وہ کوبرا فوراً مرگیا تھا۔"

نیلگری کی مدھر آواز مجھے تخیلات کی دنیا میں لے گئی۔ ایک ایک منظر کسی فلم کی طرح میری نگاہ کے سامنے روشن ہونے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"وجدان! سارسکا ہی میں تمہاری ساتھی عورت رانی روپ متی کو خون کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ تمہارا اور روپ متی کا بلڈ گروپ ایک ہی ہے۔ تم اس موقع پر روپ متی کو اپنا خون دینا چاہتے تھے مگر تم اس خیال سے باز رہے کیوں کہ تمہارا خون روپ متی کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا۔ راجو نامی ایک غریب شخص نے روپ متی کو اپنا خون دیا

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

کتابی صورت (گیارہ حصوں میں) تیار ہے

نجاشی

قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف

کتابسیلیکے

تھا۔"

نیلگری پے در پے مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔ واقعی اس طرف کبھی میرا دھیان نہیں گیا تھا کہ میں ایک خطرناک آدمی بن چکا ہوں۔ ایسا سوچتے ہوئے میں اپنے وجود میں سنسناہٹ محسوس کرنے لگا۔

نیلگری میرے چہرے کے تاثرات سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی "تلکو قبیلے میں شیواگ نامی ایک بدمعاش سے تمہاری ٹھن گئی تھی۔ شیواگ نے تمہاری برتری ماننے کے لیے تمہیں ایک آزمائش سے گزارا تھا۔ کیا تم دوشاخہ زبان والے نیلے کوبرے کا تجربہ بھی بھول گئے۔ یہ تو ابھی تھوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے؟"

"مجھے یاد ہے' سب کچھ یاد ہے۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہا "مگر کبھی میں نے اس بارے میں غور نہیں کیا تھا۔"

وہ ایک ادائے دل ربائی سے بولی "اسی لیے تو میں تمہیں غور و فکر کا موقع دے رہی ہوں۔ تم سوچو' جب تمہارا خون کسی دوسرے انسان کے جسم میں پہنچ کر اس کی جان لے سکتا ہے اور خطرناک سانپ تمہیں ڈستے ہی ہلاک ہو جاتا ہے تو پھر تمہاری قہرت کی نازک حدود کو پھلانگنے والی عورت کا کیا حشر ہو گا؟"

نیلگری کا یہ سوال سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں اس کی بات کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ اس نے ایک حقیقت بیان کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی تک کسی انسان کی جان لینے کا ذمے دار نہیں ٹھہرا تھا۔ نیلگری کے انکشافات نے میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑا دی تھی۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا "نیلگری! ایک بات تو بتاؤ۔ ہماری پہلی ملاقات کھٹمنڈو کے رتنا پارک میں ہوئی تھی اور میں تمہارے کرسٹل کے مجسمے کو اٹھا کر اپنی ایک دوست نرس مایا متی کے گھر لے گیا تھا۔ اس سے پہلے ہم کہیں نہیں ملے تھے مگر تم تو میری زندگی میں پیش آنے والے اس سے پہلے کے واقعات کو بھی جانتی ہو۔ میں نے تو کبھی تم سے ان واقعات کا ذکر نہیں کیا۔ تمہاری معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟"

"مجھے ایک مہان شکتی بھی مانتے ہو اور میرے ذرائع پر بات بھی کرتے ہو۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی "میں تو تمہیں وہاں تک جان گئی ہوں جب تم صرف دو ماہ کی عمر کے تھے اور اپنی ماں شگفتہ کا دودھ پیتے ہوئے پاکستان سے سنگاپور پہنچے تھے۔"

میں نے گھبرا کر اسے دیکھا اور کہا "نیلگری! تم تو بہت خطرناک باتیں کر رہی ہو!"

"جس کو اپنے من میں بسالیں اس کے بارے میں پوری جانکاری تو رکھنا ہی پڑتی ہے نا!" ساحل کے اندر موجود نیلگری نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے اس سے پوچھا "ساحل کو کب آزاد کرو گی؟"

"یہ نام تم نے خوب رکھا ہے' مجھے پسند آیا۔" وہ تبسم ریز آواز میں بولی "اس مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساگر اور ساحل کا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن۔۔۔"

میں نے پوچھا "تم رک کیوں گئیں۔ ابھی تمہاری بات تو مکمل نہیں ہوئی۔۔۔"

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

وہ کوئی نہایت ہی اہم بات کہتے کہتے رک گئی۔ میں سمجھ گیا' اب وہ اس سلسلے میں لب کشائی نہیں کرے گی۔ میں نے کہا "تم نے بتایا نہیں' ساحل کو کب آزاد کر رہی ہو؟"

وہ اضطرابی نظر سے مجھے دیکھنے لگی پھر میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے کہا۔ "وجدان! میں اس وقت تمہارے پاس ایک خاص کام سے آئی ہوں۔ تم نے مجھے باتوں میں لگا لیا۔"

باتوں میں تو اس نے مجھے لگایا تھا تاہم میں نے کوئی جرح کیے بغیر پوچھا "کس کام سے آئی ہو؟"

"تمہیں ابھی اور اسی وقت اس حویلی سے نکلنا ہے۔" اس نے میری سماعت پر دھماکا کیا۔

میں نے تعجب خیز نظر سے اسے دیکھا اور کہا "کیوں نیلگری! کیا یہاں کوئی زلزلہ آنے والا ہے؟"

"زلزلہ نہیں بلکہ قیامت آنے والی ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی "یہاں بھی اور ادھر کراچی میں بھی۔"

میں نے کہا "پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو۔ کھل کر بات کرو۔"

"تم نے شادی بلی میں ڈی ایس پی کے بنگلے پر جو کارنامہ انجام دیا ہے' وہ مرتشی تونديلا ڈی ایس پی اس واقعے کو آسانی سے بھولنے والا نہیں۔ وہ تمہاری تلاش میں کسی شکاری کی طرح سرگرداں تھا اور بالآخر اس نے تمہارا سراغ پا لیا ہے۔" نیلگری نے بتایا "ریلوے کراسنگ پر کھڑی ڈاکوؤں کی جیپ اور ساماروں کے نزدیک پائی جانے والی ہائی لکس نے اس کا کام آسان کر دیا ہے پھر بھانک والے انور علی نے بھی اس کی

دھونس میں آ کر ڈاکوؤں اور ممتاز والی حقیقت اسے بتا دی ہے۔ ڈی ایس پی اگرچہ مغویہ کے ماموں سے جونیئر ہے مگر وہ ایس پی سے بہت خار کھاتا ہے۔ اس نے اپنے اعلیٰ افسر کو اپروچ کر کے کہانی الٹ دی ہے۔ اس نے ڈی آئی جی کو بتایا ہے کہ تم لوگ ڈاکوؤں کے ساتھی ہو۔ تم پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا بھی الزام ہے۔ ڈی ایس پی براہِ راست ایس پی کے معاملے پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا اس لیے اس نے اوپر سے دباؤ ڈلوایا ہے۔ ایس پی اسی لیے رات کے کھانے پر نہیں آ سکا۔ اونچے پیمانے پر میٹنگ ہو رہی ہیں۔ کل صبح ڈی ایس پی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس حویلی میں پہنچ جائے گا' تمہیں اس سے پہلے پہلے وادی سندھ سے نکلنا ہے۔ ایس پی اور قاضی سلطان کی حمایت سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گا' البتہ جب تم حویلی میں نہیں پائے جاؤ گے تو تمہاری پوزیشن صاف ہو جائے گی۔ قاضی سلطان اور ایس پی تم سے لاتعلقی اور تمہارے بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کر کے حالات سنبھال لیں گے۔ تارا اور اکبر سومرو قاضی کی قید میں ہیں۔ تمہارے غیاب کی صورت میں سارا ملبا ان دونوں پر آن گرے گا اور تمہاری کہانی کے ہٹ ہونے کے امکانات سو کا ہندسہ کراس کر جائیں گے۔"

نیلگری کی باتوں میں بہت وزن تھا۔ میں خود بھی کل رات سے ایس پی اور ڈی ایس پی کے حوالے سے بہت بے چین اور الجھا ہوا تھا۔ میں نے نیلگری سے پوچھا "تم نے بتایا ہے کہ کراچی میں بھی کچھ ہونے والا ہے؟"

وہ بولی "اس ہونے والے کو تم ہی روک سکتے ہو اور اس کام کے لیے تمہیں دوپہر گیارہ بجے سے پہلے کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچنا ہو گا۔"

میں الجھن زدہ انداز میں اسے دیکھنے لگا "وہاں ریلوے اسٹیشن پہ ایسا کیا ہونے والا ہے جسے میں روک سکتا ہوں؟"

نیلگری نے ایک گہری سانس خارج کر کے پوچھا "بوٹا سنگھ کو تو تم اچھی طرح جانتے ہو؟"

بوٹا سنگھ کا نام نیلگری کی زبان سے سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے اس شخص کا نام اور پتا اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا تھا۔ بوٹا سنگھ لاہور کے ایک محلے اچھرہ میں' سلطان احمد روڈ پر رہتا تھا۔ بوٹا سنگھ' چچا خشونت سنگھ کا دوست تھا۔ خشونت سنگھ نے آنجہانی ہونے سے پہلے میرے والد کی ذاتی ڈائری بوٹا سنگھ کو امانتاً لاہور بھجوا دی تھی۔ اس ڈائری میں گم شدہ بھاری مالیت کے سونے کا راز رقم تھا۔ نیلگری کے سوال نے میرے وجود میں ہل چل مچا دی۔ میں نے بے تابی سے اسے دیکھا اور کہا "ہاں' میں بوٹا سنگھ کو جانتا ہوں۔"

وہ بولی "ملک نوازش علی کے آدمیوں نے بوٹا سنگھ کو ٹریس کر لیا ہے اور یہ خبر ملک نوازش تک پہنچ چکی ہے' تم لاہور میں بوٹا سنگھ کے پاس قیام کرنے والے ہو۔ چودھری نوازش ڈائری کے راز سے بھی واقف ہو چکا ہے' بوٹا سنگھ کی روپوشی نے اسے ریڈ الرٹ کر دیا ہے۔ بوٹا سنگھ اپنی جان اور تمہاری ڈائری کو بچانے کے لیے لاہور سے کراچی آ رہا ہے۔ وہ جس ٹرین میں سوار ہے وہ لگ بھگ گیارہ بجے کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے گی۔ ملک نوازش کو تم کوئی عام سا چوہدری نہ سمجھو۔ وہ بہت ہی طاقت ور اور بارسوخ ہے۔ کراچی میں بھی اس کا اپنا ایک نیٹ ورک موجود ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو خبردار کر دیا ہے کہ بوٹا سنگھ اسٹیشن سے نکل کر گارڈن کے علاقے تک نہ پہنچنے پائے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "بوٹا سنگھ کراچی میں رہائش پذیر' اپنے ایک دوست کے پاس آ رہا ہے۔ اس کا دوست گارڈن ویسٹ کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتا ہے۔ اب تم خود اندازہ لگا لو کہ حالات کی سنگینی کس رخ کو جا رہی ہے؟"

میں ہاتھ ملتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نیلگری کی انکشاف انگیز باتوں نے مجھے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اس وقت خود کو تشویش ناک صورتِ حال سے دوچار پا رہا تھا۔

نیلگری نے کہا "وجدان! ملک نوازش نے اپنے کارندوں کو صرف دو ہدایات جاری کی ہیں۔ نمبر ایک' سونے کے رازوالی ڈائری کو بوٹا سنگھ سے حاصل کر کے فوراً اس کے پاس "رکھاں والی" پہنچایا جائے' چاہے اس ڈائری کے حصول کے لیے بوٹا سنگھ کی جان ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ نمبر دو' وہ لوگ تمہیں لاہور نہیں آنے دیں' کم از کم اس وقت تک جب تک وہ اپنے گمشدہ سونے کو بازیاب نہ کر لے۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ ملک نوازش تم سے سخت خوف زدہ ہے۔"

میں نے نیلگری سے یہ سوال نہیں کیا کہ اس نے یہ ساری معلومات کس طرح حاصل کی ہیں کیوں کہ میں جانتا ہوں' وہ ایسا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میں پہلے بھی اس کی پراسرار شکتیوں کے کئی مظاہرے دیکھ چکا تھا۔ البتہ میں نے اس سے یہ ضرور کہا۔

"نیلگری! تم تو بہت عظیم شکتی ہو۔ جس کام کے لیے تم مجھ سے کہہ رہی ہو' وہ تمہارے ایک اشارے پر ہو سکتا ہے پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتی ہو؟"

اس کے جواب نے مجھے لاجواب کردیا۔ وہ گمبھیر آواز میں بولی "میں مانتی ہوں' میں ایک شکتی ہوں مگر میں سب کچھ نہیں ہوں۔ میرے اوپر بھی کوئی موجود ہے جس کو میں جواب دہ ہوں۔ میں سپر شکتی نہیں ہوں۔ میرے اختیارات کی ایک حد ہے۔ اس جہان کا کاروبار ایک مربوط نظام کے تحت جاری ہے۔ آکاش پر جو فیصلے ہوتے ہیں وہ اٹل ہیں۔ انہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ مقدس چرمی کتابوں کے پنّوں پر درج ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے اپنا کام کردیا۔ اب تم اپنے کام کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وجدان۔ واش روم میں تمہارا لباس موجود ہے' اسے پہن لو۔"

لباس کے ذکر پر میں نے ساحل کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہ نارنجی بنارسی ساڑی میں ملبوس تھی۔ پتا نہیں کیوں' میں اب تک اس کے لباس پر دھیان نہیں دے سکا تھا؟ میں کوئی سوال کیے بغیر واش روم میں گھس گیا۔

میں نے پانچ منٹ کے اندر لباس تبدیل کیا پھر باہر آکر ساحل کے اندر موجود نیلگری سے استفسار کیا "ہم یہاں سے جائیں گے کیسے؟"

اس نے بتایا "حویلی کے گیٹ پر بیدار انجن والی ایک جیپ تمہارا انتظار کررہی ہے۔"

میں چونکے بغیر کمرے سے نکل آیا۔ ساحل بھی میرے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔ میں نے میر بخش والے کمرے سے جانا چاہا تو نیلگری نے کہا "تمہارا ساتھی اس وقت جیپ میں موجود ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہمارے اس راز میں شریک ہو اس لیے میں نے میر بخش کو نیند ہی کی حالت میں جیپ میں پہنچا دیا ہے۔ وہ وہاں آرام سے ایک سیٹ پر پڑا سو رہا ہے۔ ساحل کو بھی کچھ پتا نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ بھی سارے راستے سوتی رہے گی۔ کراچی کی شہری حدود میں داخل ہونے کے بعد یہ دونوں بیدار ہو جائیں گے پھر تم جس طرح چاہو' ان کی تسلی تشفی کرتے رہنا۔ میں تم سے صرف یہی کہوں گی کہ ہمارا یہ راز ہم دونوں کے بیچ میں رہنا چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

آخری جملہ نیلگری نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ میں اس کی بات کی تہ تک پہنچ کر سنسنا اٹھا۔ میرے رگ و پے میں اضطراب چٹکیاں لینے لگا۔ میں نے اس کے استفسار کا جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اس کی معیت میں قدم اٹھانے لگا۔

ہم دونوں بہ سہولت حویلی سے باہر آگئے۔ کسی بھی پہرے دار یا مسلح محافظ نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں لگتا تھا' نیلگری نے کوئی طلسم پڑھ کر اس حویلی پر پھونک دیا تھا۔ وہاں کا ماحول اور فضا اس کے ٹرانس میں تھے۔ وہ اس وقت ایک ساحرہ لگ رہی تھی۔

مجھے کھٹمنڈو کی وہ رات یاد آگئی جب میں نے رتنا پار کر میں ملنے والی نیلگری کے کرشمئی مجسمے کے دو ٹکڑوں کو ملایا تھا' مجسمے کے گھر پہنچایا تھا۔ اس رات میں وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا لیکن نیلگری نے مصنوعی بارش برسا کر مجھے رکنے پر مجبور کردیا تھا' اس نے اپنی شکتی سے میری گاڑی کو بھی فلیٹ کردیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں وہاں رکوں اور اس کے ٹوٹے ہوئے مجسمے کی "مرہم پٹی" کردوں۔ وہ جو چاہتی تھی' کر بھی گزرتی تھی۔ بس ایک میں ہی ایسا تھا جس پر اس کا طلسم کھلا بس نہیں چلتا تھا۔ وہ مجھے ایک خاص معاملے میں زیر نہیں کرپائی تھی۔

حویلی کے باہر تھوڑے فاصلے پر سیاہ تیشوں والی ایک ایئر کنڈیشنڈ لینڈ کروزر موجود تھی۔ جیپ کا انجن اسٹارٹ تھا۔ نیلگری نے مجھ سے پسنجر سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ میں یہی سمجھا کہ ڈرائیونگ وہ کرے گی مگر تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے بتا چکی تھی کہ ساحل گاڑی میں پہنچتے ہی گہری نیند میں چلی جائے گی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' جیپ کے اسٹیرنگ پر ڈرائیور موجود ہے۔

نیلگری لینڈ کروزر کے پچھلے حصے میں سوار ہونے لگی تو میں بھی پسنجر سیٹ والا دروازہ کھول کر جیپ کے اندر بیٹھ گیا پھر جیسے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص پر میری نگاہ پڑی' میں چکرا کر رہ گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور میں تعجب بھری بے یقینی سے اسے تکنے لگا۔

اسی وقت نیلگری کی مدھر سرگوشی نے میری سماعت پر دھیرے سے بوسہ ثبت کیا "وجدان! میں جارہی ہوں....."

میں نے بے ساختہ پلٹ کر نیلگری کی طرف دیکھا۔

پچھلی نشست پر ساحل بڑی پرسکون نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا' وہ کوئی بہت حسین خواب دیکھ رہی ہے' گویا وہ اس وقت نیلگری کی تحویل میں نہیں تھی۔ نیلگری اس کے اندر سے نکل کر جاچکی تھی۔ اب وہ صرف اور صرف ساحل تھی۔

میری نگاہ لینڈ کروزر کی آخری نشست کی جانب اٹھ گئی۔ وہاں میر بخش موجود تھا۔ نیلگری نے غلط نہیں کہا تھا۔ میر بخش گہری نیند میں تھا۔ اس کے مدھم خراٹوں کی آواز وقفے وقفے سے ابھر رہی تھی۔ میں گردن موڑ کر ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"منگل سنگھ! تم یہاں؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ لینڈ کروزر کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "ہاں سائیں۔ یہاں۔"

اس کے مختصر سے جواب نے میری تشفی نہیں کی بلکہ تجسس کو مزید بڑھا دیا۔ میں نے سنسنی آمیز لہجے میں پوچھا "منگل سنگھ! ہم نے تو تمہیں ساماردو سے اس طرف ریلوے کراسنگ پر چھوڑا تھا پھر تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا "بڑی عجیب کہانی ہے سائیں۔ میں ابھی تک خود بھی سمجھ نہیں پایا ہوں۔"

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ منگل سنگھ حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ میں کل صبح اس سے اچھی خاصی گفتگو کرچکا تھا اور اس کا انداز و لب و لہجہ ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس وقت وہ چت کبرا منگل سنگھ جس روپ کا مظاہرہ کررہا تھا' وہ اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں ہے۔ ٹرانس کے حوالے سے میرے خیالات کا گھوڑا پلک جھپکتے میں نیلگری کی طرف چلا گیا۔ اس ہستی سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ اس آپریشن کو کمانڈ کررہی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ منگل سنگھ اسی کے "اشاروں" پر ناچ رہا ہو!

میں نے اپنے خیالات کی تصدیق کے لیے پوچھا "تمہاری کہانی جتنی بھی عجیب ہے اس چکر میں نہ پڑو اور مجھے بتاؤ' کل صبح سے لے کر اب تک تمہارے ساتھ کیا حالات و واقعات پیش آئے ہیں۔ جو بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی' ممکن ہے میرا ذہن اس تک پہنچ جائے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں پر پائی جانے والی سنجیدگی اور گمبھیر تا بدستور موجود تھی۔ میں نے کہا "کل صبح تو اپنے ساتھی گنڈا سنگھ کے ہمراہ تم ہم سے رخصت ہوئے تھے۔ اس وقت تم اکیلے نظر آرہے ہو۔ تمہارا وہ نوجوان ساتھی کہاں ہے؟"

میرے ذہن میں اس قدر تجسس جاگا ہوا تھا کہ میں نے چت کبرے منگل سنگھ سے کئی سوالات کرڈالے۔ وہ چہرے کے تاثرات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی لائے بغیر بولا "سائیں! آپ بہت مہمان ہستی ہو اس لیے میں آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ کو سب کچھ بتادوں گا۔"

وہ خاموش ہو کر لینڈ کروزر کی ونڈ اسکرین کے پار گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ گاڑی کے باہر چہار سو اندھیرے کا راج تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس ایک مخصوص فاصلے تک سڑک اور اس کے گرد و پیش کو روشن رکھے ہوئے تھیں۔ اس تاریکی میں جس قدر کم رفتار اور محتاط ڈرائیونگ کی ضرورت تھی' منگل سنگھ اس کا خیال نہیں رکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لینڈ کروزر کی رفتار حد سے زیادہ تھی۔

منگل سنگھ نے ٹرانس کی سی کیفیت میں بولنا شروع کیا "سائیں! یہ سوال آپ نے بہت اچھا کیا کہ میرا ساتھی گنڈا سنگھ کہاں گیا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ اگر وہ میری بات مان لیتا تو شاید آپ سے دوبارہ ملاقات نہ ہوتی۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ ہم نے وہاں سے سیدھا عمر کوٹ پہنچنا تھا لیکن کچھ دور جاکر گنڈا سنگھ نے ایک عجیب بات کی۔

"منگل سنگھ! ہم عمر کوٹ نہیں جائیں گے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس وقت ہم ایسے راستے سے گزر رہے تھے جو مین روڈ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس پورے علاقے میں ہماری تلاش کا کام جاری تھا اس لیے ہم کھلم کھلا سفر نہیں کرسکتے تھے۔

میں نے گنڈا سنگھ سے پوچھا "اگر ہم عمر کوٹ نہیں جائیں گے تو پھر کہاں جائیں گے؟"

"ہم یہاں سے سیدھے کنری جائیں گے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کنری کیوں۔" میں نے پوچھا "وہاں اب ہمارے لیے کیا رکھا ہے؟"

"کچھ رکھا ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں منگل سنگھ۔"

"مجھے بھی تو پتا چلے!" میں نے کہا۔

وہ بولا "میں ایک ضروری کام سے وہاں جانا چاہتا

ہوں۔"

"مجھے بتاؤ' کیا کام ہے۔"

"وہیں جاکر بتاؤں گا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

گنڈا سنگھ کا انداز مجھے حیرت میں مبتلا کررہا تھا۔ میں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار تھا۔ گنڈا سنگھ بھی دوسرے ڈاکوؤں کی طرح میرا حکم مانتا تھا۔ سائیں' آپ سے ملاقات کے بعد میں نے اپنا پیشہ ترک کرکے شریفانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس مرحلے پر گنڈا سنگھ میرے سامنے ضدی لہجے میں بات کررہا تھا۔ کنزی میں ہمارے ڈیرے پر پولیس نے ریڈ کرکے وہاں کی ایسی کم تیسی کردی تھی۔ میں بھول کر بھی ادھر کا رخ کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا اس لیے میں نے دوٹوک انداز میں گنڈا سنگھ سے کہا۔

"میں تو کسی قیمت پر بھی کنزی نہیں جاؤں گا۔"

"تو پھر ہمیں سے ہماری راہیں الگ ہوجائیں گی۔" گنڈا سنگھ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"گنڈا سنگھ!" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "میں تمہارا سردار ہوں۔ تم مجھ سے کس انداز میں بات کررہے ہو؟"

وہ بدستور روکھے پھیکے لہجے میں بولا "منگل سنگھ! تم سردار تھے۔ اب نہیں ہو۔"

"کیا مطلب!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "اب میں سردار نہیں ہوں۔ کیوں؟"

"اس لیے کہ تم نے ایک مسئلے کی باتوں میں آکر اپنا بہت سا نقصان کرلیا ہے۔" وہ برہمی سے بولا "تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔ گنڈا سنگھ آپ کی طرف اشارہ کررہا تھا سائیں۔ میں نے آپ کی باتوں سے متاثر ہوکر جرم اور گناہ کی راہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور نقصان سے اس کی مراد مغوی ممتاز تھی۔ گنڈا سنگھ کا خیال یہ تھا کہ میں نے ممتاز کو آپ کے حوالے کرکے گویا پچاس لاکھ روپے گنوا دیے تھے۔ اس رقم کا مطالبہ ہم نے تاوان کی صورت میں' مغوی کے باپ قاضی سلطان سے کیا تھا۔

میں نے گنڈا سنگھ سے کہا "تمہاری باتوں سے بغاوت کی بو آرہی ہے۔ لگتا ہے' تمہارا دماغ ابھی تک وہیں ہے' لوٹ مار اور ڈاکازنی میں!"

"ظاہر ہے' ایک ڈاکو لوٹ مار اور ڈاکازنی ہی کرے گا۔"

"میں نے یہ قبیح پیشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تم نے چھوڑا ہوگا' میں نے تو نہیں چھوڑا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے افسوس بھری نظر سے اسے دیکھا اور کہا "پھر واقعی ہمارے راستے جدا ہوجائیں گے۔ تم کنزی جاؤ یا کہیں بھی' مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تو عمرکوٹ جارہا ہوں۔"

"ایسے کیسے چلے جاؤ گے تم عمرکوٹ' منگل سنگھ؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

وہ بولا "تمہارے پاس ایک بھاری رقم موجود ہے۔ اس رقم پر ہم دونوں کا برابر حق ہے' پہلے رقم کا بٹوارا ہوگا' پھر ہر اپنا اپنا راستہ پکڑیں گے۔"

میں نے اسے یاد دلایا "وجدان سائیں نے یہ رقم ہمیں اس لیے دی تھی کہ ہم اپنی اصلاح کریں۔ برائی کی راہ چھوڑ کر سیدھا راستہ اختیار کریں۔"

"یہ رقم ہمیں اس مسئلے وجدان نے نہیں دی منگل سنگھ۔" گنڈا سنگھ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا "یہ رقم تو ہماری ہی تھی۔ ٹویوٹا فور ڈبلیو ڈی کے ایک خفیہ خانے میں تم نے چھپا رکھی تھی۔ مجھے بھی اسی وقت معلوم ہوا تھا۔" وہ تھوڑی دیر تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے تکتا رہا پھر بولا "اس میں وجدان کا کیا کمال ہے' ہماری رقم ہمارے پاس آگئی۔ تم نے اگر واقعی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنے پیسے کو چھوڑ دو گے تو چھوڑ دو۔ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ مجھے اپنے ڈاکو ہونے پر ہی فخر ہے۔ تم آدھی رقم میرے حوالے کرو اور جاکر کسی مسجد میں بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔"

گنڈا سنگھ کل تک آنکھ ملا کر مجھ سے بات نہیں کرتا تھا اور آج مجھے ہی آنکھیں دکھا رہا تھا۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر کہا "تم ایک بات بھول رہے ہو گنڈا سنگھ۔ اور وہ یہ کہ اس رقم پر صرف اور صرف میرا حق ہے' تمہارا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ میری ذاتی رقم ہے۔"

"ہم ایک گروہ کی صورت میں لوٹ مار کرتے رہے ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "اس لیے لوٹ کے مال پر ہم سب کا برابر حق بنتا ہے۔ اگر تم نے کچھ رقم چھپا کر جیب کے خفیہ خانے میں رکھ دی تھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی تم اب ایک نیک اور پرہیزگار آدمی بننے جارہے ہو۔ تمہیں دولتِ دنیا سے کیا کام۔ شکر کرو' میں بقیہ آدھی رقم کا مطالبہ کررہا ہوں۔ مجھے چاہیے کہ ساری رقم ہم سے حاصل کرکے چلتا بنوں۔"

گنڈا سنگھ کے تیور' خیالات اور عزائم نہایت ہی خطرناک نظر آرہے تھے۔ میں نے اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور اس رقم میں سے آدھے روپے اس کو دے دیے پھر ہماری راہیں واقعی جدا ہوگئیں۔ وہ کنزی گیا یا نہیں گیا' مجھے نہیں معلوم البتہ میں چھپتے چھپاتے عمرکوٹ پہنچ گیا۔

میں نے خاص طور پر یہ خیال رکھا کہ کسی جاننے والے سے ٹکراؤ نہ ہو۔ اس علاقے کے چپے چپے پر ہماری تلاش جاری تھی۔ میں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ رات مجھے عمرکوٹ ہی میں گزارنا تھی۔ میں نے خود کو دوسروں کی نظر سے زیادہ پوشیدہ رکھنے کے لیے ایک چارپائی ہوٹل کا انتخاب کیا۔ رات کے کھانے کے بعد میں جلد ہی سوگیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس وقت گھبراہٹ محسوس کررہا تھا۔ میں نے چارپائی چھوڑی اور ٹہلنے کے لیے ایک طرف نکل گیا۔

ابھی رات کا پہلا پہر تھا۔ میں ٹہل قدمی کرتے ہوئے کافی دور نکل آیا۔ میں اس سڑک پر اکیلا ہی تھا' میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اندھیرے میں کیوں ٹہل رہا ہوں البتہ میری گھبراہٹ قدرے کم ہوگئی تھی۔ میں اپنی کیفیت پر غور کررہا تھا کہ مجھے اپنے سامنے کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس نظر آئیں۔ میں نے چونک کر گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سیاہ گاڑی میرے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔

وہ گاڑی یہی لینڈ کروزر تھی' اس وقت ہم جس میں سفر کررہے ہیں۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی براجمان تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میں مبہوت ہوکر رہ گیا۔ ایسا حسن میں نے کہیں سنا نہ دیکھا تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتی تھی۔ اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی گردن میں پڑی ہوئی مالا تھی۔ میں نے ایسی مالا بھی اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھی تھی۔"

منگل سنگھ یہاں تک پہنچ کر رک گیا۔ اس کی کہانی نے مجھے بے چین کردیا۔ کسی خوب صورت' جوان لڑکی اور نادر الوجود مالا کے ذکر پر آپوں آپ میرا دھیان نیلگری کی طرف چلا گیا۔ میں نے منگل سنگھ سے پوچھا "اس مالا کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

وہ بتانے لگا "سائیں! وہ بڑی عجیب و غریب مالا تھی۔ میں نے بڑی توجہ سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اکیس سیاہ چمکیلے پتھروں والی مالا تھی جس میں درمیانی پتھر ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن جتنا بڑا تھا۔"

یہ وہی مالا تھی جو کبھی نیلگری نے مجھے تحفتاً دی تھی لیکن پاک بھارت سرحد عبور کرتے ہوئے وہ مالا ریگستان میں کہیں گم ہوگئی تھی پھر ایک ملاقات پر نیلگری نے مجھے بتایا کہ مالا دوبارہ اس کے پاس پہنچ چکی تھی۔

منگل سنگھ بدستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے مجھے بتانے لگا کہ سیاہ لینڈ کروزر والی اس حسین لڑکی نے اس سے کہا کہ کچھ بندوں کو "نئی سر" سے لینا ہے' تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ منگل سنگھ کسی معمول کی طرح کوئی سوال کے بغیر لینڈ کروزر میں بیٹھ گیا۔ رات کے آخری پہر وہ "نئی سر" پہنچ گئے۔ منگل سنگھ کے بقول' اس حسینہ نے گاڑی ایک حویلی سے کچھ فاصلے پر روک دی اور اس سے کہا کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آجائے' وہ حویلی میں سے بندوں کو لینے جارہی ہے۔ منگل سنگھ نے ان بندوں کو کراچی پہنچانا ہے۔ جیپ اسٹارٹ تھی' منگل سنگھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر "بندوں" کا انتظار کرنے لگا۔ اس حسین ساحرہ نے گاڑی سے نکلتے ہوئے منگل سنگھ کو ہدایت دی کہ جن بندوں کو کراچی پہنچانا ہے وہ اس کے لیے اجنبی نہیں ہیں اور یہ کہ وہ خود ان کے ساتھ نہیں جائے گی۔ منگل سنگھ کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو کراچی پہنچا کر واپس عمرکوٹ آجائے' پھر وہ اسے ان خدمات کے صلے کے طور پر کوئی انعام دے گی۔ منگل سنگھ اس کے سحر میں اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ کوئی سوال کیے بغیر اس کے احکام کی تعمیل کرتا چلا گیا۔

منگل سنگھ کی کہانی نے واضح کردیا کہ نیلگری نے اسے ٹریپ کیا تھا۔ وہ ہمیں قاضی سلطان کی حویلی سے نکال کر کراچی پہنچانا چاہتی تھی۔ اسی مقصد کے لیے اس نے یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا تھا۔ میں نے منگل سنگھ سے سوال کیا "تم نئی سر کی طرف آنے کے لیے کس طرح تیار ہوگئے۔ یہاں کے قاضی سلطان کی بیٹی کو تم لوگوں نے اغوا کیا تھا؟"

"وجدان سائیں! مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے پوچھا "اب کیسا محسوس کررہے ہو؟"

"آپ سے بات چیت کرنے کے بعد میں خود کو خاصا آزاد محسوس کررہا ہوں۔" اس نے کہا "لگتا ہے' میں اس لڑکی کے سحر سے نکل آیا ہوں۔"

میں نے نیلگری کے بارے میں اسے بتانا ضروری نہ سمجھا۔ سارا کھیل میری سمجھ میں آچکا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر منگل سنگھ نے پوچھا "سائیں! کیا آپ اس جادوگرنی کو

جانتے ہو؟"

"کون جادوگرنی!" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"میں اسی ہستی کا ذکر کررہا ہوں سائیں جس کے حکم پر میں آپ کو کراچی پہنچانے جارہا ہوں۔" منگل سنگھ نے کہا "وہ کسی جادوگرنی سے کم نہیں۔ میں اب تک خود کو اس کے اثر میں محسوس کررہا ہوں۔"

میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا "میں نے تمہاری زبان سے پہلی مرتبہ اس کا ذکر سنا ہے۔"

وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا "سائیں! آپ بہت گہرے آدمی ہو۔ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ مجھے تو یہ کوئی بہت بڑا چکر لگتا ہے۔"

"مثلاً کیسا چکر؟" میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "آپ نے مغوی ممتاز کو ہمارے قبضے سے چھڑایا اور نبی سر میں آپ کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اس لڑکی کو یہاں پہنچایا ہے۔ آپ کے اس کارنامے پر قاضی سلطان کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے لیکن جس طرح آپ اس کی حویلی سے رخصت ہوئے ہیں' اس سے لگتا ہے کہ یہاں کے حالات آپ کے لیے سازگار نہیں رہے پھر اس جادوگرنی کا کردار اور عمل بھی بہت ماورائی سا ہے۔ میں اس کے زیر اثر عمرکوٹ سے یہاں پہنچا اور اب آپ کو کراچی پہنچانے جارہا ہوں۔ وہ جادوگرنی ہمارے ساتھ نہیں آئی بلکہ وہیں حویلی میں رہ گئی ہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے۔"

"اس لیے تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اس بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "آپ کے دونوں ساتھیوں کا رویہ بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"انہوں نے کیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "پہلے آپ کا ساتھی مرد گاڑی میں داخل ہوا اور آتے ہی پچھلی سیٹ پر سو گیا پھر آپ اس لڑکی کے ساتھ آئے ہو۔ لڑکی بھی گاڑی میں آتے ہی گہری نیند سو چکی ہے۔ صرف آپ جاگ رہے ہو۔ یہ تمام باتیں کچھ عجیب سی نہیں ہیں۔ اس پراسرار ہستی نے آپ لوگوں کو کراچی پہنچانے کے لیے میرا انتخاب ہی کیوں کیا؟ وہ خود بھی تو یہ کام کرسکتی تھی۔ یہ ساری باتیں الجھانے والی ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا سائیں!"

وہ مشش و پنج کی کیفیت میں مبتلا نظر آنے لگا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرکے صورتِ حالات پر غور کرنے لگا۔

ہم جن حالات سے گزر کر یہاں پہنچے تھے' وہ خاصے تشویش ناک تھے پھر ڈی ایس پی اور ایس پی کی باہمی دشمنی چپقلش نے انہیں مزید گمبھیر بنادیا۔ نیلگری نے بروقت مجھے حالات کی سنگینی سے آگاہ کردیا ورنہ صبح ہوتے ہی ہم دھر لیے جاتے۔ ڈی ایس پی کے ساتھ میں نے جو شاندار سلوک کیا تھا' وہ اس کے لیے ناقابلِ فراموش کی حیثیت رکھتا تھا' وہ مجھے بڑی سے بڑی مصیبت میں گرفتار کرسکتا تھا۔

نیلگری نے ایک طرف مجھے حالات کی نزاکت سے باخبر کیا' دوسری جانب وہ منگل سنگھ کو گھیر گھار کر ہمارے پاس لے آئی تاکہ ہم یہ آسانی کراچی پہنچ سکیں۔ منگل سنگھ پر نیلگری کے طلسماتی اثرات بہت واضح تھے۔ وہ پوری طرح اس کا مطیع و فرماں بردار نظر آتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ہمیں کراچی پہنچانے کے بعد سیدھا عمرکوٹ جاتا۔ اس بات میں بھی کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ نیلگری اسے کسی انعام سے نوازتی۔ وہ ایسی ہی ہستی تھی' پراسرار شکتیوں کی مالک۔ جب جو چاہتی تھی' کر گزرتی تھی۔ پتا نہیں' یہ لیفٹیننٹ کروز اس نے کہاں سے حاصل کی تھی۔ گاڑی ایئر کنڈیشنڈ اور سیاہ شیشوں والی تھی۔ یہ انتظام ہماری سہولت اور حفاظت کی خاطر کیا گیا تھا۔ مجھے نیلگری کے کمالات کے اچھے تجربے اور مشاہدے ہوچکے تھے کہ میں نے اب اس کی باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

نیلگری کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اس کے سنسنی خیز انکشافات بھی یاد آنے لگے۔ اس نے میرے زہریلے پن کی طرف توجہ دلا کر مجھے ریڈ الرٹ کردیا تھا۔ زندگی کی ہنگامہ خیزیوں میں اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا اور شاید کبھی بھی نہ جاتا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے ڈسنے والا زہریلے سے زہریلا جان دار بھی پلک جھپکتے میں موت کے منہ میں چلا جاتا تھا۔ میں کسی ضرورت مند کو اپنا خون نہیں دے سکتا تھا۔ ان حقائق کو جھٹلانا حقیقت کی طرف سے آنکھیں

بند کرلینے کے مترادف تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ پہلی فرصت میں کسی ماہر ڈاکٹر سے اس سلسلے میں مشورہ کروں گا اور اپنے اس زہریلے پن کو ختم کرکے نارمل انسان کی سی زندگی گزاروں گا۔

پھر میرا دھیان نیلگری کی دستگیری کی طرف چلا گیا۔ اس نے نہ صرف ہمیں قاضی سلطان کی حویلی سے نکال کر پولیس والوں سے محفوظ کردیا تھا بلکہ بوٹا سنگھ اور ڈائری کے بارے میں معلومات بہم پہنچا کر میرا کام آسان بنادیا تھا۔ وہ چوہدری نوازش علی کی نظر میں آچکا تھا۔ ڈائری کے حصول کی خاطر چوہدری کے بندے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم نامہ وصول کرچکے تھے۔ وہ بے چارہ ہائی رسک پر تھا۔

نیلگری نے میرے اور ساحل کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ اس کے انداز نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کردیا۔ میں اس کے جملے کو واضح معنی پہنانے سے ہچکچا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں' میں اس انداز میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ نیلگری نے ساحل کے نام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ نام تم نے خوب رکھا ہے' مجھے پسند آیا۔ اس مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساگر اور ساحل کا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن۔۔۔؟

لیکن کے بعد اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اگر پوری دیانت داری سے اس ادھورے جملے کو مکمل کیا جاتا تو اس میں یہ الفاظ درج کیے جاتے۔ لیکن تمہارا ساتھ پائیدار نہیں۔ تم جلد یا بدیر جدا ہونے والے ہو۔

اس طرف دھیان جاتے ہی میں ذہن کو جھٹک دیتا۔ شاید میں یہ حرکت کسی لاشعوری جذبے کے تحت کررہا تھا۔ میں ساحل کو خود سے علیحدہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا اسی لیے اس بارے میں سوچنے سے گریز کررہا تھا۔ انسانی نفسیات کی گتھیاں بھی عجیب ہیں۔ جتنی کھولو' اتنی ہی بندھتی چلی جاتی ہیں۔ میں اس وقت نفسیات سے زیادہ حالات کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا اس لیے میرا دھیان بوٹا سنگھ کی طرف چلا گیا۔

بوٹا سنگھ کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔ یہ نام مسلمانوں اور سکھوں میں مشترک ہے۔ اگر سنگھ ہٹا کر شروع میں محمد کا اضافہ کردیا جائے تو یہ مسلمانوں والا نام ہوجائے گا۔ پاکستان کے دیہاتوں خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں میں یہ نام سننے میں آتا ہے۔

بوٹا سنگھ کی رہائش اچھرہ لاہور میں تھی۔ وہاں اس نے مسلم کو اپنا نام بوٹا ہی بتایا ہوا تھا۔ بوٹا سنگھ مونا سکھ تھا اس لیے بھی وہاں کی آبادی میں وہ بہ آسانی گھل مل گیا تھا۔ اگر وہ سکھوں کے روایتی حلیے میں ہوتا تو اس کے لیے مشکلات کھڑی ہوجاتیں۔

جب تک خوش قسمتی اس کا ساتھ دیتی رہی' وہ محفوظ رہا اور اب اس کی بدقسمتی کا دور شروع ہوچکا تھا۔ چوہدری نوازش علی کے خوں خوار کتے اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ لاہور میں رہنا اس کے لیے ممکن نہ رہا تو اس نے کراچی کا رخ کیا مگر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کے "استقبال" کا بڑا "شان دار" بندوبست کیا جاچکا تھا۔

مجھے ہر صورت بوٹا سنگھ کو بچانا تھا۔ میں اس کا احسان مند تھا۔ اس نے میرے باپ کی قیمتی ڈائری کو اپنے پاس محفوظ رکھا تھا اور اس کی حفاظت کے لیے اپنی جان پر کھیل کر لاہور سے کراچی کی طرف آرہا تھا۔ میں نے بوٹا سنگھ کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے حلیے سے واقف تھا۔ بس اتنا جانتا تھا' وہ ایک مونا سکھ ہے یعنی کلین شیو اور مخصوص جوڑے سے بے نیاز۔ سنگاپور میں آں جہانی خشونت سنگھ کی بیٹی ارملا کور کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے باپ کی یادداشتوں والی ڈائری لاہور میں رہائش پذیر بوٹا سنگھ کو امانتاً بھجوا دی گئی ہے۔ میرے ذہن میں بوٹا سنگھ کی لاہور والی رہائش گاہ کا ایڈریس محفوظ تھا لیکن موجودہ صورتِ حالات میں وہ پتا بے مصرف ہوکر رہ گیا تھا۔

نیلگری خلوص نیت سے میری مدد کررہی تھی۔ میں نے اسے گوتم بھوش کے چنگل میں پھنسنے سے بچایا تھا' شاید وہ اس احسان کا بدلہ چکا رہی تھی۔ دوسری جانب وہ مجھ سے محبت کی دعوے دار بھی تھی۔ میں نے نیلگری کا جو روپ انڈیا' نیپال اور رشی کیش میں دیکھا تھا' اب وہ اس سے قدرے مختلف انداز میں پیش آرہی تھی۔ مجھے اس کے رویّے کی تبدیلی پر اعتراض تھا اور نہ ہی اس کے محبت کے دعوے کو میں شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ میرے اندر سے ایک آواز اٹھتی تھی کہ مجھے نیلگری کی مدد کے بغیر اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنا چاہیے۔ میں اس کی محبت کی ناقدری نہیں کررہا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کی محبت کے تصور ہی سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اس حوالے سے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے پراسرار شکتیوں کی مالک ایک مہان ہستی ہی سمجھا تھا۔

میں اپنی کیفیات کو کوئی نام نہ دے سکا۔ نیلگری سے گریز کی لاشعوری ترغیب کو میں کوئی معنی پہنانے سے قاصر

تھا۔ بعض نازک معاملات میں ہر شخص کے ساتھ ایسا ہوتا ہوگا۔ اگر میرے ساتھ ایسا پیش آرہا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی!

○✲○

ہم دس بجے کے قریب کراچی پہنچ گئے۔

منگل سنگھ نے لینڈ کروزر کو ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر روکتے ہوئے مجھ سے پوچھا "سائیں! اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "تم وہی کرو جس کی تمہیں ہدایت دی گئی ہے۔"

پھر میں نے عقبی حصے میں موجود ساحل اور میر بخش کو گاڑی سے نیچے اترنے کا اشارہ کردیا۔ نیلگری کے کہنے کے مطابق کراچی کی حدود میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں یکے بعد دیگرے بیدار ہوگئے تھے۔ لینڈ کروزر، جگہ کی تبدیلی اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود منگل سنگھ کو دیکھ کر ان کے چہرے حیرت اور استعجاب کا مرقع بن گئے تھے لیکن میری مخصوص سنجیدگی نے انہیں باور کرا دیا کہ انہیں تازہ ترین صورتِ حالات کے بارے میں فی الفور کوئی سوال نہیں کرنا۔ میں بیک ویو مرر میں گاہے بہ گاہے ان کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے ان کی آنکھوں میں لاتعداد سوالات کروٹیں لیتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک آدھ مرتبہ ساحل نے زبان کھولنے کی کوشش کی تو میں نے اسے اشارے سے منع کردیا۔ اس کے بعد وہ چپ سادھ کر بیٹھ گئی تھی۔

ساحل اور میر بخش لینڈ کروزر سے نیچے اتر چکے تو میں نے بھی اپنی سائیڈ کے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آتا، منگل سنگھ کی آواز نے مجھے روک لیا۔

"سائیں! یہ تو لیتے جائیں۔" وہ نہایت ہی مؤدب لہجے میں بولا۔

میں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ میں نے اس کے، آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ نوٹ کیسے ہیں منگل سنگھ؟"

"یہ وہ رقم ہے جو میرے حصے میں آئی تھی۔" اس نے بتایا "آدھی رقم میں نے گنڈا سنگھ کو دے دی ہے۔"

میں نے کہا "مگر تم یہ رقم مجھے کیوں دے رہے ہو؟"

"اس پراسرار ہستی کا حکم ہے۔" وہ دھیرے سے بولا "اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ واپسی پر یہ رقم وہ مجھے دے دے گی۔"

ساحل کی تجویز سے میر بخش نے بھی اتفاق کیا "ساحل ٹھیک کہہ رہی ہے سائیں۔ یہ ہوٹل بڑا معیاری ہے۔ ناشتا بھی کریں گے اور بات چیت بھی ہوگی۔ آپ کی ذات کے حوالے سے میرے ذہن میں بہت سے سوال شور مچا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہے گا۔ اس سے پہلے ایک ضروری کام کرنا ہے۔"

"کون سا کام وجدان؟" ساحل نے پوچھا۔

وہ دونوں ابھی تک اس راز سے واقف نہیں تھے کہ ہم ریلوے اسٹیشن کس مقصد کے تحت آئے ہیں۔ انہیں بوٹا سنگھ، ڈائری اور چوہدری نوازش کے بندوں کی کہانی کے بارے میں فی الفور کوئی سوال نہیں کرنا۔ میں بیک ویو مرر میں گاہے بہ گاہے ان کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے ان کی آنکھوں میں لاتعداد سوالات کروٹیں لیتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک آدھ مرتبہ ساحل نے زبان کھولنے کی کوشش کی تو میں نے اسے اشارے سے منع کردیا۔ اس کے بعد وہ چپ سادھ کر بیٹھ گئی تھی۔

ساحل اور میر بخش لینڈ کروزر سے نیچے اتر چکے تو میں نے بھی اپنی سائیڈ کے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آتا، منگل سنگھ کی آواز نے مجھے روک لیا۔

"سائیں! یہ تو لیتے جائیں۔" وہ نہایت ہی مؤدب لہجے میں بولا۔

میں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ میں نے اس کے، آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ نوٹ کیسے ہیں منگل سنگھ؟"

"یہ وہ رقم ہے جو میرے حصے میں آئی تھی۔" اس نے بتایا "آدھی رقم میں نے گنڈا سنگھ کو دے دی ہے۔"

میں نے کہا "مگر تم یہ رقم مجھے کیوں دے رہے ہو؟"

"اس پراسرار ہستی کا حکم ہے۔" وہ دھیرے سے بولا "اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ واپسی پر یہ رقم وہ مجھے دے دے گی۔"

منگل سنگھ کا اشارہ نیلگری کی طرف تھا۔ ہمیں دوڑا رہی ہے سائیں۔ یہ ہوٹل بڑا معیاری ہے۔ ناشتا اکبر سومرو کی پجارو سے جو پچاس ہزار روپے ملے تھے، قاضی سلطان کے پاس رہ گئے تھے۔ اس وقت ہم بالکل خالی ہاتھ تھے۔ نیلگری نے ہمارے لیے ایک معقول رقم کا بندوبست بھی کردیا۔ منگل سنگھ نے ریلوے کراسنگ پر اپنی نجات کے بدلے مجھے ایک لاکھ روپے کی آفر کی تھی تاہم پوری رقم میں نے اسے واپس لوٹا دی تھی۔ یہ اس کا آدھا تھا یعنی پورے پچاس ہزار روپے۔ نیلگری نے ہماری رقم کا حساب برابر کردیا۔ مجھے امید تھی کہ واپسی پر وہ منگل سنگھ کا نقصان بھی پورا کردے گی بلکہ اسے کچھ زیادہ ہی دے گی۔

میں نے منگل سنگھ کے ہاتھ سے پچاس ہزار کے استعمال بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ تو اپنی بے خبری میں قاضی شدہ نوٹ لے کر اپنی ہپ پاکٹ میں رکھ لیے اور اس سے سلطان کی حویلی سے لینڈ کروزر میں لائے گئے تھے اور نیند کی مخاطب ہوتے ہوئے کہا "منگل سنگھ! وہ پراسرار ہستی بہت حالت میں کراچی تک پہنچے تھے۔

طاقت ور اور بااختیار ہے۔ اس سے راہنمائی ضرور لینا۔ اگر میں نے ساحل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "ہم وہ تمہیں کچھ عطا کرنے پر آجائے تو شرم اور جھجک میں اپنا اس وقت ریلوے اسٹیشن کے قریب کھڑے ہیں اور یہاں نقصان نہ کر بیٹھنا۔ تمہیں اس کی سخاوتیوں کا اندازہ نہیں!" اس لیے آئے ہیں کہ گیارہ بجے والی ٹرین سے میرا ایک ویرینہ

"آپ کو تو اندازہ ہے نا سائیں؟" وہ معنی خیز انداز میں خیر خواہ یہاں پہنچنے والا ہے۔ ہمیں اس کا استقبال کرنا ہے۔"

بولا۔

میر بخش نے کہا "گیارہ بجنے میں تو ابھی ایک گھنٹا باقی ہے

میں نے بھی جواباً وہی انداز اختیار کرتے ہوئے اثبات سائیں!"

میں سر ہلا دیا۔

ہم میں سے کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ تاہم یہاں منگل سنگھ لینڈ کروزر کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا پہنچتے ہی میں نے منگل سنگھ سے وقت کے بارے میں استفسار ان دونوں نے مجھے گھیر لیا۔ میر بخش نے تو قدرے تحمل کا کیا تو اس نے ایک راہ گیر سے معلوم کرکے مجھے وقت بتا دیا مظاہرہ کیا مگر ساحل کی زبان کسی تیز رفتار ٹرین کے مانند چلے تھا۔ اس راہ گیر نے حیرت سے منگل سنگھ کو دیکھا بھی تھا، شاید لگی۔ اس نے یکے بعد دیگرے میرے سامنے سوالات کا انبار اس کی حیرت کی وجہ یہ ہو کہ قیمتی لینڈ کروزر میں بیٹھے ہوئے لگا دیا۔ یہی سوالات میر بخش کی آنکھوں میں بھی مچل رہے شخص کے پاس گھڑی بھی نہیں ہے۔

تھے مگر اس نے بے صبری نہیں دکھائی۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے ساحل کی زبان کو بریک میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہمیں پہلے لگائے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "بتاتا ہوں، سب کچھ اسٹیشن کے اندر جاکر ٹرین کی آمد کے بارے میں تازہ ترین بتاتا ہوں۔ چلو کہیں آرام دہ جگہ پر جاکر بیٹھتے ہیں۔" معلومات حاصل کرلینا چاہیے پھر کہیں بیٹھ کر ناشتا اور گپ شپ کرتے ہیں۔"

ساحل اردگرد نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی "اس مقصد کے "یہ کون سا مشکل کام ہے۔" میر بخش نے کہا "میں دو لیے وہ ہوٹل مناسب رہے گا۔" منٹ میں معلوم کرکے آجاتا ہوں۔ آپ مجھے ٹرین کا نام

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بلند و بالا براؤن کلر بتائیں!"

ہوٹل کی جانب اشارہ کیا۔ وہ ایک معقول صورت اور "ٹرین کا نام مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا "بس اتنا معیاری دکھائی دینے والا ہوٹل تھا۔ اندر کا حال اندر پہنچ جانتا ہوں کہ وہ گیارہ بجے اس اسٹیشن پر پہنچے گی اور میں جس کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ بہرحال وہ قرب و جوار میں مسافر کو لینے آیا ہوں وہ لاہور سے آرہا ہے۔"

موجود ہوٹلوں میں سب سے زیادہ صاف ستھرا اور پرکشش "بس اتنا ہی کافی ہے۔" میر بخش نے کہا "اس سے پتا ہوٹل تھا۔ چل جائے گا۔ ویسے سائیں! ہمارے ملک میں کبھی اتفاق ہی سے ٹرین وقت پر پہنچ پاتی ہے۔ ورنہ گھنٹا، دو گھنٹا تاخیر تو عام سی بات ہے۔"

میں نے کہا "تم معلوم کرکے تو آؤ۔"

جانے سے پہلے وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا "سائیں! آپ کو جس ٹرین کا انتظار ہے وہ اسی اسٹیشن پر آئے گی نا؟"

"کیوں، کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اسٹیشن ہے؟"

"یہ کینٹ اسٹیشن ہے سائیں۔" اس نے جواب دیا "کراچی میں اس کے علاوہ ایک اور اسٹیشن بھی ہے جو سٹی اسٹیشن کہلاتا ہے لیکن۔"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا "لیکن کیا؟"

"میرا بھی دماغ خراب ہوگیا ہے۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "کسی بھی ٹرین کا آخری اسٹیشن کینٹ ہوا سٹی، وہ پہلے کینٹ اسٹیشن پر ہی رکے گی۔ یہاں سے گزرنے کے بعد ہی وہ سٹی اسٹیشن پہنچے گی۔" بات ختم کرتے ہی وہ سڑک عبور کرکے اسٹیشن کی جانب بڑھ گیا۔

منگل سنگھ نے ہمیں اگر کینٹ اسٹیشن پہنچایا تھا تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ بوٹا سنگھ اسی اسٹیشن پر ٹرین سے اترنے والا تھا۔ وہ سب کچھ نیلگری کی ہدایت پر کررہا تھا اور نیلگری بخوبی جانتی تھی، ہمیں کہاں پہنچایا جائے۔

پانچ منٹ بعد میر بخش واپس آگیا اور اس نے بتایا "سائیں! گیارہ بجے یہاں پہنچنے والی ٹرین کا نام تیز گام ایکسپریس ہے۔ وہ دراصل پاکستان کے ایک شمالی ضلع راولپنڈی سے چلتی ہے اور لاہور سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچتی ہے۔ یعنی ہمیں، کینٹ اسٹیشن پر۔"

میں نے پوچھا "اس کی آمد کی کیا صورتِ حال ہے؟"

"وہ ایک گھنٹا لیٹ ہے سائیں۔"

"یعنی یہاں وہ بارہ بجے پہنچے گی؟"

"اگر مزید لیٹ نہ ہوئی تو۔" میر بخش نے کہا "مجھے بتایا گیا ہے کہ اس وقت وہ حیدر آباد کے اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ حیدر آباد سے کراچی تک دو گھنٹے کا رن ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے پاس کم از کم دو گھنٹے ہیں۔" ساحل نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا "اس دوران میں ہم خوب ٹکڑا ناشتا اور ڈھیر ساری باتیں کرسکتے ہیں۔"

ہم تینوں اس ہوٹل کی جانب بڑھ گئے جس کا انتخاب ہم تھوڑی دیر پہلے کرچکے تھے۔ ہم سیدھے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جا پہنچے۔ ہال میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ بس اِکا دُکا میزوں پر ہی لوگ نظر آرہے تھے۔ ہم نے ہال کے

کونے میں بچھی ایک میز کا انتخاب کیا۔ ڈائننگ ہال صاف ستھرا اور جاذب نظر تھا۔ جب تک ہمارے لیے ناشتا سرو کیا جاتا' ہم باری باری واش روم سے ہو آئے تھے۔ ناشتا شروع کرنے سے پہلے ہم پوری طرح فریش ہوگئے۔

میں کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ساحل اور میر بخش کو حقیقتِ حال سے آگاہ کردوں۔ وہ دونوں میرے قریبی اور جاں نثار ساتھی تھے۔ انہیں بہانوں سے بہلانا مناسب نہیں تھا اور گزشتہ رات حالتِ بے خبری میں ان کے ساتھ جو کچھ ہوچکا تھا' اس کے بعد تو وہ بہانوں سے بہلنے والے تھے بھی نہیں۔

ساحل میرے اعتماد پر پوری اتری تھی اور میں اس پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کرتا تھا۔ میر بخش بھی گزشتہ روز سے کئی بار آزمائشی مرحلوں سے گزر چکا تھا لہٰذا اسے بھی اپنے بارے میں کھل کر بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ساحل نیلکری کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ تاہم وہ میرے اور نیلکری کے درمیان تعلق سے واقف نہیں تھی اور نہ ہی اسے فی الحال اس تعلق سے واقف ہونا چاہیے تھا۔ البتہ وہ سونے کے راز کے بارے میں بھی جانتی تھی۔

میں نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ان دونوں کو تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ ساحل خاموشی اور سنجیدگی سے سنتی رہی لیکن میر بخش کے چہرے پر حیرتوں کا میلا لگ گیا تھا۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"سائیں! آپ آخر چیز کیا ہو؟"

"میں جو کچھ بھی ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا "نہیں سائیں' نہیں۔ اللہ سائیں کی قسم! آپ جو سامنے ہو اس سے ہزار گنا چھپے ہوئے ہو۔ پہلے آپ کا مارشل آرٹس اور "چی" کی قوت ہی کم حیران کرنے والی نہیں تھی۔ اب نیلکری جیسی پراسرار شکتی سے آپ کا رابطہ تو پاگل کردینے والا ہے۔"

"مگر تم پاگل نہ ہوجانا میر بخش۔" ساحل نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "یہ ایک معیاری ہوٹل ہے۔ اگر یہاں تمہارا دماغی توازن بگڑ گیا تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔ مجبوراً تمہیں کسی دماغی اسپتال میں داخل کروانا پڑے گا۔ کیا تم وجدان کو چھوڑ کر کسی اسپتال میں رہنا پسند کرو گے؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی "میں اتنے عظیم انسان کا ساتھ چھوڑنے کے بارے میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میں اپنی آخری سانس تک وجدان سائیں کے قدموں میں۔" وہ ذرا سا اٹکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب ہے' اب ہمارا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔"

اسے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ ساحل نے کہا "آئندہ کا لائحہ عمل وہاں کی صورتِ حالات کو دیکھتے ہوئے ہنگامی طور پر طے کرلیں گے۔ سب سے بڑی کامیابی یہ ہوگی کہ بوٹا سنگھ کو ٹریپ کرنے کے لیے وہاں آنے والے افراد کو ہم ٹریس کرلیں۔ اس کے بعد تمام مرحلے آسان ہوجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے' ژن۔" ساحل نے کہا "یہی فائنل ہے۔"

ہم تینوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اس سے قبل میں نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا تھا۔ ہوٹل سے باہر آنے کے بعد میر بخش نے کہا "سائیں! اس وقت ہم تینوں نہتے ہیں۔ ہمارے پاس کم از کم ایک آدھ ریوالور تو ضرور ہونا چاہیے۔"

"مگر فوری طور پر گن کہاں سے آئے گی!" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

اگرچہ میں اپنے پاس کسی قسم کا اسلحہ رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ تاہم میر بخش کا کہنا بھی درست تھا۔ اس کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ہونا چاہیے تھا۔

میر بخش نے میرے استفسار کے جواب میں کہا "سائیں! ہمارے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو پندرہ بیس منٹ میں کسی ہتھیار کا بندوبست کرسکتا ہوں۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "کیا واقعی؟"

"جی سائیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا "یہاں تو پیسہ پھینک' تماشا دیکھ کا قانون چلتا ہے۔"

میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور پوچھا "فوری طور پر ایک ریوالور کتنے میں مل جائے گا؟"

مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ پوری دنیا میں اسلحہ اور غیر ملکی کرنسی کا خفیہ لین دین ہوتا ہے اور اگر آپ کی جیب میں رقم ہو تو آپ ہر شے حاصل کرسکتے ہیں۔ میری بے یقینی کا سبب شاید یہ تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا ہوگا! بہرحال' پاکستان بھی اسی دنیا میں تھا اور دنیا کے ہر ملک میں غیر قانونی کاموں کا قاعدہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

میر بخش نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "سائیں! میرا خیال ہے' دو ہزار کے اندر اندر ایک اچھا سا ریوالور مل جانا چاہیے۔"

میں نے تین ہزار کے نوٹ گن کر اس کے حوالے کیے اور ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہم اس درخت کے نیچے کھڑے ہیں۔ تم یوں جاؤ اور یوں آؤ۔" پھر میں نے بائیں ہاتھ سے چٹکی بجائی۔

میر بخش کے جانے کے بعد میں ساحل کے ساتھ ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس طرف میں ایک خاص مقصد سے جارہا تھا۔ میں حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک ٹیکسی کو ایجنج کرنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں' کس وقت کیسے حالات پیش آجاتے۔ اگر ہمیں ان لوگوں کے تعاقب کی ضرورت پیش آتی تو پہلے سے ہمارے پاس سواری کا بندوبست ہونا چاہیے تھا۔

میں ایک یلوکیب کے پاس پہنچا' ٹیکسی کا ڈرائیور اندر موجود تھا۔ وہ ایک نئی اور بڑے سائز کی ٹیکسی تھی۔ تعاقب کے نقطۂ نظر سے یہ نہایت ہی موزوں سواری ثابت ہوسکتی تھی۔ ڈرائیور بھی جوان اور صحت مند تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تمہاری ٹیکسی خالی ہے؟"

"میں تیز گام کے لیے یہاں آیا تھا مگر وہ تو ایک گھنٹا لیٹ ہے۔" اس نے بتایا "آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"فی الحال تو ہمیں کہیں نہیں جانا۔" میں نے کہا "ہم کسی کا انتظار کررہے ہیں۔ ہمارا ایک مہمان تیز گام سے آنے والا ہے۔"

"مگر میں تو ایک گھنٹا یہاں ضائع نہیں کرسکتا۔ اس وقت میں سو روپے کا دھندا تو ہو ہی جائے گا۔" ڈرائیور نے کہا "میں تو اسٹینڈ سے ٹیکسی نکال رہا ہوں۔"

اس کی ٹیکسی' اسٹینڈ میں ایسی جگہ لگی ہوئی تھی جہاں سے اسٹیشن کی عمارت کا "خروج" بہت نزدیک تھا۔ ہمارے لیے وہ ٹیکسی آئیڈیل کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"اگر میں شام تک کے لیے تمہاری ٹیکسی حاصل کرنا چاہوں تو تم کتنا کرایہ لو گے؟"

اس نے آٹھ سو روپے بتائے۔ تھوڑی بارگیننگ کے بعد وہ پانچ سو میں راضی ہوگیا تاہم ہمارے درمیان گیارہ سے پانچ بجے تک کا وقت طے ہوا۔ میں نے دو سو روپے اسے ایڈوانس دیے اور کہا "تم اسی جگہ ہمارا انتظار کرو' ہم کسی وقت بھی تمہاری ٹیکسی میں آبیٹھیں گے۔ باقی کے تین سو روپے تمہیں شام پانچ بجے ملیں گے۔ ٹھیک ہے؟"

اس کے لیے اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ میں ساحل کے ساتھ واپس درخت کے نیچے آن کھڑا ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں میر بخش بھی آگیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے مقصد میں

کامیاب لوٹا تھا۔ میں نے پوچھا "کتنے میں بات بنی ہے؟"

اس نے دھیمے لہجے میں بتایا "سائیں' دو ہزار میں کام ہوگیا۔ بیس بور کا دیسی ساخت ریوالور ملا ہے۔ میں نے اسے اپنے سینے میں لگا رکھا ہے۔ ہتھیار پوری طرح لوڈ ہے۔"

ہم مطمئن انداز میں ٹیکسی اسٹینڈ سے باہر نکل آئے۔ میر بخش نے کہا "آپ دونوں سامنے سے اندر داخل ہوں۔ میں گھوم کر پیچھے سے آؤں گا۔"

"وہ کیوں میر بخش؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "ٹرین کی آمد سے قبل اور رخصت ہونے سے پہلے جو افراد پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہیں گیٹ پر ان کی چیکنگ کی جاتی ہے۔ مخصوص سائنسی آلے کی مدد سے معلوم کیا جاتا ہے کہ آیا ان کے پاس کوئی آتشیں اسلحہ تو نہیں البتہ واپسی پر اتنی افراتفری ہوتی ہے کہ چیکنگ ناممکن ہو کر رہ جاتی ہے۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اسٹیشن کی عمارت کے نزدیک ہی ایک ریلوے پھاٹک ہے۔ میں وہاں سے پٹری پٹری چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچ جاؤں گا۔ آپ لوگ تین پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر سامنے سے اندر جائیں۔"

میں اور ساحل اسٹیشن کی عمارت کے اندر داخل ہوگئے۔ ایک ونڈو سے میں نے تین پلیٹ فارم ٹکٹ خریدے اور ساحل کے ساتھ پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ میرا ٹکٹ میں نے احتیاطاً میر بخش کے لیے خریدا تھا۔ اس وقت ٹھیک گیارہ بجے تھے۔ پلیٹ فارم پر اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ پاکستان کا کوئی بھی پلیٹ فارم دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میر بخش بھی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اسے ٹیکسی کے انتظام کے بارے میں بتایا تو وہ تشویش ناک لہجے میں بولا "سائیں! کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹیکسی والا دو سو روپے لے کر ہی فرار ہوجائے۔"

اس کی تشویش بجا تھی لیکن پتا نہیں کیوں' مجھے وہ ٹیکسی ڈرائیور بھروسے کا بندہ لگا تھا۔ میں نے کہا "میرا خیال ہے' وہ پوری دیانت داری سے ہمارا انتظار کرے گا۔"

"سائیں! اگر آپ کہہ رہے ہیں تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں۔" وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا "میں تو آپ کو پیر سائیں مان گیا ہوں۔ آج سے آپ میرے مرشد سائیں ہیں۔"

وہ پٹری سے اترنے والا تھا' میں نے جلدی سے کہا "میر بخش! اب ہمیں اپنے کام میں مصروف ہوجانا چاہیے۔"

وہ خاموش ہو کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

ہم نے ساحل کو پلیٹ فارم کے وسط میں کھڑا کرو[illegible] تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ بھی آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے مقام گیٹ کے نزدیک تھا۔ جس سمت سے ٹرین [illegible] ہمارے پاس آتی۔ جب ہم نے اسے اپنی کامیابی کے بارے میں بتایا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

میں داخل ہونا تھا اس طرف کی نگرانی میں [illegible]

لے لی جبکہ دوسری جانب میں نے میر بخش کی ڈیوٹی لگادی۔ میں نے میر بخش سے پوچھا "کیا تیز گام ایکسپریس اسی ایک ایک فرد کو تنقیدی نظر سے دیکھتے۔ اگر ہمیں کسی پر ذرا بھی شبہ ہوتا یا دو افراد کو سرگوشی کی صورت بات کرتے دیکھتے تو ہم غیر محسوس طور پر ان کے قریب پہنچ کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتے۔ وقفے وقفے سے ہم ساحل سے بھی آرہے تھے۔

میر بخش نے بتایا "سائیں! قبل از وقت اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو ٹرین کی "صورت اور چال" دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔"

ساڑھے گیارہ بجے ہمیں پہلی کامیابی حاصل ہوئی۔ میر بخش نے میرے پاس آکر بتایا "وجدان سائیں! میں نے [illegible]

"اس کا مطلب ہے' وہ کسی دوسرے پلیٹ فارم پر بھی چوہدری نوازش کے بندوں کا کھوج لگالیا ہے۔"

یہ ایسی اطلاع تھی کہ میں چونک اٹھا۔ وہ چائے کے [illegible] لگ سکتی ہے؟"

"اس بات کا قوی امکان ہے۔"

ایک اسٹال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہاں جو دو افراد [illegible] میں سوچ میں پڑگیا۔ ہم اس دوران میں ان دو افراد کو کھڑے ہیں' میں نے چھپ کر ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہ نہایت مسلسل اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے لیے ایک ہی دھیمی آواز اور محتاط انداز میں بوٹا سنگھ کے بارے میں [illegible] گائیڈ کی حیثیت اختیار کرچکے تھے۔ کچھ دیر غور و فکر کرنے کہہ رہے تھے۔ تصدیق کے لیے آپ بھی ایک ٹرائی کے بعد میں نے کہا۔

مار لیں۔"

"اگر تو ٹرین اسی پلیٹ فارم پر لگتی ہے تو ٹھیک ہے اور میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے چائے [illegible] وہ کسی دوسرے پلیٹ فارم پر رکتی ہے تو اس صورت میں والے اس اسٹال کی جانب بڑھ گیا جس کا ذکر میر بخش نے کیا [illegible] ساحل یہیں گیٹ کے پاس موجود رہے گی۔ ہم دونوں ان تھا۔ میں نے اسٹال سے ایک کپ چائے کا حاصل کیا اور ان [illegible] دونوں کے تعاقب میں بوٹا سنگھ کے پاس پہنچیں گے پھر واپسی دو افراد کے نزدیک کھڑے ہو کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ [illegible] ساحل کو ساتھ لے کر نکل جائیں گے۔ تم دونوں کا کیا دونوں بھی چائے پی رہے تھے۔ میں بظاہر ان کی طرف سے بے نیاز کھڑا تھا مگر میری تمام تر توجہ ان پر لگی تھی۔

میر بخش کی اطلاع سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ انہوں نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔

میں نے میر بخش سے کہا "اب ہم دونوں باری باری دونوں چوہدری ہی کے آدمی تھے اور اس وقت ان کے تھوڑے تھوڑے وقفے سے چوہدری نوازش کے آدمیوں کی درمیان بوٹا سنگھ زیر بحث تھا۔ وہ ٹرین کے لیٹ ہونے پر برہمی کا اظہار بھی کررہے تھے۔ میں تصدیق کرچکا تو ان سے جائیں گے۔" پھر میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم تھوڑے فاصلے پر چلا گیا پھر بغور ان کا جائزہ لینے لگا۔ وہیں گیٹ کے نزدیک چلی جاؤ' اور ہر ممکن حد تک ہمیں اپنی

ان میں سے ایک کی عمر چالیس کے قریب ہوگی۔ [illegible] نگاہ میں رکھنے کی کوشش کرو تاکہ اگر ہم کسی موقع پر کہیں میانے قد کا ایک فربہ شخص تھا۔ اس نے کلف دار شلوار مس کردیں تو تم ہم تک پہنچ سکو۔"

سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ساتھی کی عمر لگ بھگ تیس طے شدہ پروگرام کے تحت ہم نے اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھالی سال رہی ہوگی۔ وہ دراز قامت اور متناسب جسم کا مالک تھا اور تیز گام ایکسپریس کا انتظار کرنے لگے۔ وہ تیز گام جو اپنے اس نے بلیک پینٹ پر بلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ اگر ہم [illegible] مقررہ وقت سے ایک گھنٹا لیٹ تھی۔ پتا نہیں' اس کے گام دونوں کو نظر میں رکھتے تو بوٹا سنگھ تک رسائی ممکن تھی۔ میں کون سا کانٹا چبھ گیا تھا!

میر بخش میرے نزدیک آگیا۔ ساحل ہماری کارکردگی

○☆○

تھکن زدہ تیز گام نے پلیٹ فارم نمبر چار پر رک کر ایک طویل سانس لی۔

چوہدری کے بندوں نے چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور برج کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ اس برج کے ذریعے پلیٹ فارم نمبر چار تک پہنچا جاسکتا تھا۔ میں نے ساحل کو ہائی الرٹ رہنے کا اشارہ کیا اور میر بخش کے ساتھ ان دونوں کے تعاقب میں قدم اٹھانے لگا۔ ہمارے درمیان صرف دو قدم کا فاصلہ تھا۔ وہاں اس قدر رش ہو رہا تھا کہ انہیں اپنے تعاقب کا احساس نہیں ہوسکتا تھا۔

ہم چاروں آگے پیچھے تیز گام تک پہنچے۔ وہ دونوں شکاری نگاہوں سے بوٹا سنگھ کو ڈھونڈ رہے تھے اور ہم نے ان پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ پانچ منٹ کے اندر اندر ان کی تلاش ختم ہوگئی۔ ٹرین سے باہر آنے والے ایک ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ کر ان دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ گویا وہ بوٹا سنگھ کو پہچان گئے تھے۔ ان کے چہروں کا اطمینان ظاہر کررہا تھا کہ وہ اپنے مطلوبہ بندے کو پانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

میر بخش نے میرے کان کے نزدیک سرگوشی کی "سائیں! یہی شخص بوٹا سنگھ ہوسکتا ہے!"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ادھیڑ عمر بوٹا سنگھ نے کریم کلر پتلون پر چیک دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ نظر آرہا تھا۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی اور سامان نہیں تھا۔ وہ اپنے چہرے سے خاصا ہراساں دکھائی دیتا تھا۔

چوہدری کے بندوں نے بوٹا سنگھ کو اپنے درمیان رکھ لیا۔ پلیٹ فارم پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اس لیے بوٹا سنگھ کو کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہوسکتا تھا۔ ہم ان سے دو قدم پیچھے چل رہے تھے۔

میر بخش نے میرے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا "سائیں! کیا ارادہ ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں بوٹا سنگھ کا بیگ اچک کر دوڑ لگا دیتا ہوں۔ وہ قیمتی ڈائری یقیناً اسی بیگ میں ہوگی۔ میں جیسے پلیٹ فارم پر پہنچا ہوں ایسے ہی کوئی چور راستہ اختیار کرکے باہر بھی نکل جاؤں گا۔ آپ دونوں ٹیکسی میں پہنچ جانا۔ میں بعد میں آپ کے ساتھ آملوں گا۔ یہاں اس قدر رش ہو رہا ہے کہ چوہدری کے بندے مجھے پکڑ نہیں سکیں گے۔"

اس وقت ہم برج کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ میں نے میر بخش کی بات کے جواب میں کہا "میں مانتا ہوں' وہ اس جم

غفیر میں تمہیں چھپانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے مگر اس صورت میں بوٹا سنگھ کی جان خطرے میں آجائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اس محسن کو کوئی جانی نقصان پہنچے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ڈائری اس بیگ ہی میں ہو۔"

"ہاں' یہ ضروری نہیں ہے۔" میر بخش نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "چوہدری کے بندے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بوٹا سنگھ کو "اپنے ساتھ" لے جارہے ہیں اس کا مطلب ہے' وہ یہاں کوئی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتے۔ ہمیں بھی اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلنے کے بعد ہی کوئی ایکشن لینا چاہیے۔"

میر بخش میری دلیل سے قائل ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اس گیٹ کے پاس پہنچ گئے جہاں سے مسافر باہر نکل رہے تھے۔ گیٹ پر دو ٹکٹ چیکر مسافروں کے ٹکٹ چیک کرکے انہیں جانے کی اجازت دے رہے تھے۔ ہجوم اس قدر تھا کہ اکا دکا افراد چیکنگ کے بغیر بھی نکل رہے تھے۔ ہمارے پاس پلیٹ فارم ٹکٹ موجود تھے اس لیے ہمیں اس گیٹ سے گزرنے کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ہم جیسے ہی بوٹا سنگھ اور چوہدری نوازش کے بندوں کے پیچھے پلیٹ فارم سے باہر آئے' میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی۔ کلف دار سوٹ میں ملبوس فربہ اندام شخص نے اپنی قمیص کی سائیڈ پاکٹ میں ہاتھ ڈالا اور ہاتھ کو جیب کے اندر ہی رکھتے ہوئے اس نے بوٹا سنگھ کے پہلو سے لگادیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنا چہرہ بوٹا سنگھ کے کان کے قریب لے گیا۔

میں یک جھپکتے میں سمجھ گیا کہ وہاں کیا کارروائی ہورہی تھی۔ یقینی طور پر اس فربہ شخص نے بوٹا سنگھ کے کان میں سرگوشی کی ہوگی کہ وہ اس وقت ان کے گن پوائنٹ پر ہے لہٰذا شرافت سے ان کے ساتھ چلتا رہے۔ بوٹا سنگھ کے چہرے کے تاثرات میرے اندازے کی گواہی دے رہے تھے۔

میر بخش بھی صورتِ حالات کو بھانپ گیا۔ تشویش ناک لہجے میں بولا "سائیں! بندہ ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔"

"بندہ ہاتھ سے نہیں نکلے گا میر بخش۔" میں نے پُراعتماد انداز میں کہا "میں یہ بندہ تمہارے ہاتھ میں دے رہا ہوں۔"

"کیا مطلب سائیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

ہمارے درمیان بہت دھیمے لہجے میں یہ باتیں ہورہی تھیں۔ میں نے میر بخش کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "تم ساحل اور بوٹا سنگھ کو لے کر فوراً ٹیکسی میں پہنچو۔ میں ان سے نمٹ کر آرہا ہوں۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے فربہ اندام شخص کی چھال دیا۔ وہ اپنے موٹے ساتھی پر گرا۔

تشریف پر ایک زوردار لات رسید کی۔ اس وقت ہم اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلنے والے فرشی زینوں پر قدم رکھ چکے تھے۔ میری دھواں دھار کک نے موٹے شخص کو کسی گوسفند کے مانند لڑھکنے پر مجبور کردیا۔ اس کا ہتھیار بردار ہاتھ سامنے کے سب وہاں رش تو ہو ہی رہا تھا۔ ہمارے اس "اسپیشل پاکٹ سے باہر آگیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا" کی وجہ سے خاصی افراتفری مچ گئی۔ میں اس معاملے کو اس کے ہاتھ میں ایک پسٹل موجود تھا۔ اسی لمحے میر بخش سطول نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ ریلوے پولیس والے اگر ہماری بوٹا سنگھ کا ہاتھ تھاما اور ٹیکسی کی جانب دوڑ لگادی۔ جانب متوجہ ہوجاتے تو ہمارے لیے مشکلات کھڑی ہوسکتی

اس دوران میں موٹے آدمی کے ساتھی دراز قامت تھیں اور میں پولیس سے "دور دور" ہی رہنا چاہتا تھا۔

شخص نے مجھ پر حملہ کردیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا' گویا میرے لیے وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ میرے پہلو میں گرما گرم حلوے کی پلیٹ تیار تھی۔ میں نے اس کے حملے کو بیک کیک اگر رکی پھر میر بخش کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت اپنے بازوؤں پر روکا اور اس کے چہرے پر ایک باقوت گھونسے سے ٹکرائی "سائیں! ٹیکسی میں آجاؤ' جلدی۔" اس کے مارا۔ ساتھ ہی اس نے میری جانب کا دروازہ کھول دیا۔

وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بلبلا اٹھا۔ میر بخش کی عقل مندی پر میں اش اش کر اٹھا۔ اس نے اس کارروائی کے دوران میں' میں موٹے پسٹول بردار سے ٹیکسی کو اسٹینڈ سے نکلوا کر موقع کی مناسبت سے بڑی ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں رہا۔ مردِ مذکورہ زینوں کو شمندی کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے چوہدری نوازش کے اختتام پر پہنچ کر سنبھلا اور اس نے پسٹول والا ہاتھ میری سمت سے بندوں کی طرف دیکھا۔ موٹے آدمی کے ہاتھ میں مجھے پسٹل سیدھا کرنے کی کوشش کی لیکن میں پلک جھپکتے میں اس کے کھائی نہیں دیا۔ میں اچک کر ٹیکسی کے اندر آبیٹھا۔

سر پر پہنچ گیا۔ میر بخش نے تحکمانہ انداز میں ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت

میں نے برق رفتاری سے اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ قریب ہی کھڑے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا "فوراً نکلو یہاں سے۔"

"بھائی' کیا ہوگیا؟" ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ وہ دونوں اس کی زد میں آتے آتے بچے۔ مجھے ٹیکسی کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ

میں نے موٹے شخص کی دھنائی کرتے ہوئے کہا "دونوں میری طرف دوڑے تھے۔ درحقیقت وہ میری نہیں' جیب کترا ہے۔ چور لٹیرا ہے۔ میں اس کی مرمت کررہا تھا۔" ٹیکسی کی سمت لپکے تھے جس کے اندر ان کا شکار بیٹھا تھا۔

ہوں۔" بوٹا سنگھ کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے۔

"شاباش' اور مارو۔" مجھے حوصلہ آمیز انداز میں تلقی میں نے مڑ کر ٹیکسی کے عقب میں دیکھا۔ وہ دونوں رکنگ کے اس حصے کی جانب دوڑتے ہوئے جارہے تھے دی گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا مقابلہ کرنے کے بجائے وہاں پر ایئوٹ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کا ایک ہی مطلب فرار کی فکر میں تھا۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ ڈر کر بھاگ "وہ اپنی گاڑی میں ہمارا تعاقب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تھا۔ دراصل' بوٹا سنگھ ان کے لیے بہت اہم تھا جو اب اس ڈرائیور نے سراسیمہ آواز میں کہا "سر جی! یہ کیا چکر کے گن پوائنٹ پر نہیں رہا تھا بلکہ وہ دونوں میرے لگ ہے؟" پوائنٹ پر آچکے تھے۔

"چکر کچھ نہیں بھئی۔" میں نے جلدی سے کہا "وہ مجھے اپنے عقب میں خطرناک سرگرمی محسوس ہوئی تھی۔ دونوں بدمعاشی کررہے تھے۔ ہمارے مہمان کو لوٹنا چاہتے میں سرعت سے پلٹ گیا۔ چوہدری کا دوسرا نمک خوار میرے ریلوے حکام کو ڈبونے کے لیے اپنے بازوؤں کو میری جانب بڑھا گردن تھا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کو اس کے گریبان پر جمایا۔ ہم اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا "چلنا کہاں ہے تھوڑا جھکتے ہوئے میں نے اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر اور کو جھٹکا دیا۔ وہ فضا میں بلند ہوا تو میں نے اسے دوسری جانب یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے پسٹول کے نشانے پر لاچکا تھا۔ وہ دونوں ایک مجھے کسی گوسفند سے گتھم گتھا دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ ٹرین کی آمد سبب وہاں رش تو ہو ہی رہا تھا۔ ہمارے اس "اسپیشل اس کے ہاتھ میں ایک پسٹل موجود تھا۔ اسی لمحے میر بخش سطول نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ ریلوے پولیس والے اگر ہماری جانب متوجہ ہوجاتے تو ہمارے لیے مشکلات کھڑی ہوسکتی

اس دوران میں موٹے آدمی کے ساتھی دراز قامت تھیں اور میں پولیس سے "دور دور" ہی رہنا چاہتا تھا۔

شخص نے مجھ پر حملہ کردیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا' گویا میرے لیے وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ میرے پہلو میں گرما گرم حلوے کی پلیٹ تیار تھی۔ میں نے اس کے حملے کو بیک کیک اگر رکی پھر میر بخش کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت اپنے بازوؤں پر روکا اور اس کے چہرے پر ایک باقوت گھونسے سے ٹکرائی "سائیں! ٹیکسی میں آجاؤ' جلدی۔" اس کے مارا۔ ساتھ ہی اس نے میری جانب کا دروازہ کھول دیا۔

وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بلبلا اٹھا۔ میر بخش کی عقل مندی پر میں اش اش کر اٹھا۔ اس نے اس کارروائی کے دوران میں' میں موٹے پسٹول بردار سے ٹیکسی کو اسٹینڈ سے نکلوا کر موقع کی مناسبت سے بڑی ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں رہا۔ مردِ مذکورہ زینوں کو شمندی کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے چوہدری نوازش کے اختتام پر پہنچ کر سنبھلا اور اس نے پسٹول والا ہاتھ میری سمت سے بندوں کی طرف دیکھا۔ موٹے آدمی کے ہاتھ میں مجھے پسٹل سیدھا کرنے کی کوشش کی لیکن میں پلک جھپکتے میں اس کے کھائی نہیں دیا۔ میں اچک کر ٹیکسی کے اندر آبیٹھا۔

سر پر پہنچ گیا۔ میر بخش نے تحکمانہ انداز میں ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت

میں نے برق رفتاری سے اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ قریب ہی کھڑے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا "فوراً نکلو یہاں سے۔"

"بھائی' کیا ہوگیا؟" ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ وہ دونوں اس کی زد میں آتے آتے بچے۔ مجھے ٹیکسی کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ

میں نے موٹے شخص کی دھنائی کرتے ہوئے کہا "دونوں میری طرف دوڑے تھے۔ درحقیقت وہ میری نہیں' جیب کترا ہے۔ چور لٹیرا ہے۔ میں اس کی مرمت کررہا تھا۔" ٹیکسی کی سمت لپکے تھے جس کے اندر ان کا شکار بیٹھا تھا۔

ہوں۔" بوٹا سنگھ کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے۔

"شاباش' اور مارو۔" مجھے حوصلہ آمیز انداز میں تلقی میں نے مڑ کر ٹیکسی کے عقب میں دیکھا۔ وہ دونوں رکنگ کے اس حصے کی جانب دوڑتے ہوئے جارہے تھے دی گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا مقابلہ کرنے کے بجائے وہاں پر ایئوٹ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کا ایک ہی مطلب فرار کی فکر میں تھا۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ ڈر کر بھاگ "وہ اپنی گاڑی میں ہمارا تعاقب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تھا۔ دراصل' بوٹا سنگھ ان کے لیے بہت اہم تھا جو اب اس ڈرائیور نے سراسیمہ آواز میں کہا "سر جی! یہ کیا چکر کے گن پوائنٹ پر نہیں رہا تھا بلکہ وہ دونوں میرے لگ ہے؟" پوائنٹ پر آچکے تھے۔

"چکر کچھ نہیں بھئی۔" میں نے جلدی سے کہا "وہ مجھے اپنے عقب میں خطرناک سرگرمی محسوس ہوئی تھی۔ دونوں بدمعاشی کررہے تھے۔ ہمارے مہمان کو لوٹنا چاہتے میں سرعت سے پلٹ گیا۔ چوہدری کا دوسرا نمک خوار میرے ریلوے حکام کو ڈبونے کے لیے اپنے بازوؤں کو میری جانب بڑھا گردن تھا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کو اس کے گریبان پر جمایا۔ ہم اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا "چلنا کہاں ہے تھوڑا جھکتے ہوئے میں نے اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر اور سر جی؟"

"ائرپورٹ!" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"ائرپورٹ؟" بوٹا سنگھ نے حیرت سے دہرایا اور میر بخش کی طرف دیکھنے لگا "ہم تو گارڈن ویسٹ جارہے تھے! ..... آپ لوگ وجدان کا نام استعمال کرکے میرے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں کرنا چاہتے؟"

بوٹا سنگھ کے ان کلمات سے میں سمجھ گیا کہ میر بخش اسے ہمارے بارے میں مختصراً بتاچکا تھا اسی لیے وہ پرسکون اور خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"بوٹا جی! ہم گارڈن ویسٹ ہی جائیں گے۔ پہلے ذرا ائرپورٹ پر ایک ضروری کام ہے۔"

میر بخش نے اسے تسلی دیتے ہوئے بتایا "ہم نے اگر تمہیں دھوکا دینا ہوتا تو چوہدری نوازش کے بندوں سے چھڑاتے ہی نہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ لوگ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ تم اپنے کسی دوست کے پاس گارڈن ویسٹ جارہے ہو اس لیے بھی ہم براہِ راست ادھر کا رخ نہیں کرسکتے۔"

میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے مڑ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا۔ جلد ہی ایک سفید شیرڈ میری نظر میں آگئی۔ وہ بہت تیز رفتاری سے ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کررہی تھی۔ جب وہ ایک محدود فاصلے پر پہنچی تو میں نے پسنجرز سیٹ پر بیٹھے ہوئے موٹے تازے شخص کو پہچان لیا۔ وہ چوہدری نوازش کے انہی دو بندوں میں سے ایک تھا' ریلوے اسٹیشن پر جن سے میری مٹھ بھیڑ ہوئی تھی۔ گویا وہ ہمارے تعاقب میں لگ گئے تھے۔ شیرڈ کی پچھلی نشست پر دراز قامت پتلون قمیص والا شخص بھی موجود تھا۔ ڈرائیونگ ایک دبلا پتلا پستہ قامت آدمی کررہا تھا۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

میر بخش اور ساحل بھی اس تعاقب سے آگاہ ہوگئے۔ ساحل نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "وجدان! وہ ہمارے پیچھے آرہے ہیں!"

"آنے دو' پروا نہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میر بخش بولا "ہم نے ان کا شکار چھیننا ہے' وہ آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں یہ ساری باتیں ہورہی تھیں۔ اس پر آہستہ آہستہ ہمارے جوہر کھل رہے تھے۔ ہماری مجبوری تھی کہ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے' اس میں ہماری حیثیت ٹیکسی ڈرائیور سے پوشیدہ نہیں

آتش فشاں 31 حصہ 8

رہ سکتی تھی۔

اس نے بدستور ڈرائیونگ کرتے ہوئے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "جناب! آپ تو کسی پھڈے کے چکر میں لگتے ہیں۔ وہ لوگ آپ کا تعاقب کررہے ہیں۔ میں نہیں جانتا آپ لوگوں کے درمیان کیا دشمنی ہے۔ اور نہ ہی میں جاننا چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔ میں کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"اتنے بڈھے کھٹے ہو کر بھی بزدلی دکھا رہے ہو!" میر بخش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولا "بات بہادری یا بزدلی دکھانے کی نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے مسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"میں پرائے پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا۔" وہ بے چارگی سے بولا "آپ اپنے دو سو روپے بھی واپس لے لیں۔ مجھے نہیں چاہیے یہ رقم۔ آپ کوئی اور ٹیکسی کرلیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیکسی کی رفتار کم کرنا چاہی، اسی وقت میر بخش نے اسے ریوالور کی جھلک دکھائی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہ سے ریوالور کو دیکھنے لگا۔

پسنجرز سیٹ پر برا جمان میر بخش نے ریوالور پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا "یہ بالکل اصلی ہے اور بھرا ہوا بھی ہے۔ کہو تو چیمبر چیک کراؤں؟"

"نن۔ نہیں۔" ٹیکسی ڈرائیور ہکلایا۔

میر بخش نے پاٹ دار آواز میں کہا "اپنی توجہ کو ڈرائیونگ پر مرکوز رکھو۔ باتیں تم اس طرف دیکھے بغیر بھی کرسکتے ہو۔"

وہ ٹیکسی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ یہاں چون وچرا کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ شرافت اور فرماں برداری کا مظاہرہ ہی اس کے لیے مفید ثابت ہوسکتا تھا۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا "دیکھو مسٹر! ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ اگر تم خاموشی سے ہمارے حکم کی تعمیل کرتے رہے تو ہم بہت جلد تمہیں آزاد چھوڑ دیں گے۔ تمہاری آزادی خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"وہ۔ کس طرح؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

میں نے کہا "تم اپنی ڈرائیونگ کی مہارت کا مظاہرہ کرو۔ جتنی جلدی تم تعاقب کرنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہوجاؤ، ہم اتنی ہی جلدی تمہیں آزاد کردیں گے۔ جب ہمیں یقین ہوجائے گا کہ تعاقب کرنے والی سفید شیرڈ سے ہمارا پیچھا چھوٹ گیا ہے، ہم تمہاری ٹیکسی کو چھوڑ دیں گے۔ اپنے لیے ہم کسی اور سواری کا بندوبست کرلیں گے۔"

وہ مزید اسپیڈ بڑھاتے ہوئے بولا "اس مقصد میں کامیابی سری کے سگنل پر متعاقب گاڑی کو اتنا فائدہ حاصل ہوا کہ کے لیے مجھے بے سمت سفر کرنا ہوگا۔ موقع محل کی مناسبت ہم ایک دوسرے کے برابر آگئے تاہم ہمارے درمیان تین سے راستے بدلنا ہوں گے۔"

"تو بدلو راستے، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میر بخش نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔

"مم۔ مگر آپ لوگ تو ائیرپورٹ جانا چاہتے ہو!"

"اس بات کو بھول جاؤ۔" میں نے سختی سے کہا "گھوڑوں کے مانند آگے بڑھیں۔ سامنے جو سگنل کھلتے ہی دونوں گاڑیاں توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کی طرح ہمیں کہیں نہیں جانا۔"

بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس سمجھ داری میں غالباً میں نے کہا "جہنم کی بلا میں تو اپنے ہاتھ دھونے کے لیے حصہ اس ریوالور کا تھا جو میر بخش نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ ہم بھی آگ ہی استعمال کرتی ہوں گی اس لیے ہمیں زیادہ احتیاط تھا۔ پتا نہیں، یہ ہتھیار کیسی عجیب وغریب شے ہے۔ اس کی ضرورت ہے۔ ان سے پیچھا چھڑانے کا ایک ہی راستہ استعمال تو جو دہشت بٹھاتا ہے وہ بٹھاتا ہی ہے مگر اس کی خاہے۔"

خولی جھلک بھی بہت سے بگڑے کام بنا دیتی ہے۔ انسان بیڈ سے طاقت کی زبان سمجھتا اور اس کے سامنے جھکتا آیا ہے۔

اگر میر بخش ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے ریوالور کی "نمائش" کرتا تو عین ممکن تھا، وہ اپنی ٹیکسی کو سڑک کے ایک جانب روک کر ہمیں نیچے اتار دیتا۔

ائیرپورٹ جانے والی بات میں نے بے ساختہ ہی کہہ دی تھی۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جو ہر انٹرنیشنل سٹی میں ہوتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق کراچی پاکستان کا سب سے بڑا اور جدید شہر تھا۔ میں نے یہاں زندگی میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا۔ یہاں کے علاقے، سڑکیں، مختلف مقامات سے میں ناواقف تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ مجھے یہ ساری معلومات حاصل ہوتی گئیں تاہم واقعات کے تسلسل اور دلچسپی کو قائم رکھنے کے لیے میں ہر شے کا باقاعدہ ذکر کروں گا۔

اس وقت ہم شاہراہِ فیصل سے گزر رہے تھے۔ میٹروپول ہوٹل سے شروع ہونے والی یہ کشادہ سڑک سیدھی ائیرپورٹ کو جاتی ہے۔ بوٹا سنگھ پچھلی نشست پر میرے اور ساحل کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ میں تعاقب میں آنے والی سفید شیرڈ پر بڑی ماہرانہ نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "اسپیڈ بڑھاؤ۔"

"میں ہر ممکن کوشش کررہا ہوں جناب۔" وہ بے چارگی سے بولا "یہ تو شکر کریں، ہمیں سگنل کھلے ہوئے مل رہے! ورنہ اتنی رفتار قائم رکھنا بھی دشوار ہوجاتا۔"

گورا قبرستان کے بعد اس نے رفتار مزید بڑھا دی۔ تیز رفتار ٹیکسی کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے برابر آگئے تاہم ہمارے درمیان تین گاڑیوں کا فرق تھا۔ شیرڈ والوں نے گاڑی کو لیفٹ ہینڈ رکھا تھا۔ میر بخش زیادہ رکھنے کے چکر میں ٹیکسی ڈرائیور نے پہلی لین پکڑی ہوئی تھی۔

سگنل کھلتے ہی دونوں گاڑیاں توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کے مانند آگے بڑھیں۔ ساحل نے کہا "یہ جہنم کی بلائیں تو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے لگ گئی ہیں۔"

میں نے کہا "جہنم کی بلا میں تو اپنے ہاتھ دھونے کے لیے ہمیں زیادہ احتیاط کرتا ہوں گی اس لیے ہی استعمال کرتی ہوں گی اس لیے ہی آگ ہی استعمال کرتی ہوں گی اس لیے ہمیں زیادہ احتیاط

"وہ کون سا راستہ ہے سائیں؟" میر بخش نے پوچھا۔

"ان کو واپس جہنم میں پھینک دیا جائے۔" میں نے کہا "گویا پہنچی وہیں پہ آگ جہاں کا خمیر تھا۔"

سنجیدگی سے ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ اتنے خطرناک لوگ ہیں تو میں کبھی بھی آپ کو اپنی ٹیکسی میں نہیں بٹھاتا۔ آپ تو مرنے مارنے کی باتیں کررہے ہیں۔"

بوٹا سنگھ کا سفری بیگ میر بخش نے اپنی گود میں رکھا ہوا تھا اور اس بیگ کی اوٹ ہی سے وہ ریوالور کے ذریعے ٹیکسی ڈرائیور کو کنٹرول کررہا تھا۔ ڈرائیور کے تبصرے پر اس نے قدم رکھا گمبھیر آواز میں کہا۔

"اب تو تمہیں پتا چل گیا نا، ہم کس قسم کے لوگ ہیں پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"کوئی ارادہ ظاہر کرنا میرے اختیار میں کہاں ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے کہا "جب تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تم بے اختیار ہو چکے ہو تو پھر شرافت سے وہی کرو جو تم سے کہا جا رہا ہے۔ ہم صرف ان لوگوں کے لیے خطرناک ہیں جنہوں نے دوسرے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ ہمارے تعاقب میں آنے والی سفید شیرڈ میں آنے والے سماج دشمن عناصر ہیں۔ ہمارے مہمان کو قتل کرکے اس سے بیگ چھیننا چاہتے ہیں۔ ان سے دو دو ہاتھ کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔" پھر میں نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر ایک آنکھ دبائی اور کہا "کیوں بوٹا جی، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

میں نے بوٹا سنگھ کے بجائے "بوٹا جی" کہہ کر اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ خاصا سمجھ دار آدمی تھا۔ فوراً میرا اشارہ سمجھ گیا کہ اس نے خود کو سنگھ ظاہر نہیں کرنا۔ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"وجدان بھائی! آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔"

ساحل نے کہا "وجدان! اگر اسی طرح کارچیزنگ ہوتی رہی تو نتیجہ برآمد ہونے میں بہت وقت لگ جائے گا اور ہمارے پاس بہت کم وقت ہے۔"

ساحل کی بات ختم ہوئی تو میں نے متعاقب شیرڈ اور ٹیکسی کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگانے کے لیے اپنے پیچھے نگاہ دوڑائی اور اسی وقت میں ایک ہائی روف کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ نیلے رنگ کی وہ ہائی روف بہت تیزی سے سفید شیرڈ کے پیچھے لگی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعی کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ نیلی ہائی روف، سفید شیرڈ کا تعاقب کررہی تھی۔

اس وقت ہم کارساز اور ڈرگ روڈ کے درمیان سفر کر رہے تھے۔ یہ کنٹونمنٹ کا علاقہ ہے اس لیے دائیں بائیں خاصا وسیع علاقہ تعمیرات سے خالی ہے۔ اس ٹکڑے میں بڑی فری ڈرائیونگ کی جاسکتی ہے۔

پتا نہیں، نیلی ہائی روف کب سے سفید شیرڈ کا پیچھا پکڑے ہوئے تھی۔ میری نظر۔ بلکہ ہماری نظر میں تو وہ ابھی ابھی آئی تھی۔ میر بخش سمیت ساحل اور بوٹا سنگھ بھی نیلی ہائی روف کے عزائم کو بھانپ گئے تھے۔

ساحل نے تشویش ناک لہجے میں کہا "یہ شیرڈ والوں کے ساتھی بھی ہوسکتے ہیں!"

"نہیں۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"وجدان! یہ بات تم اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو؟"

"اگر نیلی ہائی روف والے چوہدری نوازش کے بندوں کے ساتھی ہوتے تو انہیں ہماری ٹیکسی کے پیچھے آنا چاہیے تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وجدان سائیں! مجھے تو یہ لوگ چوہدری نوازش کے مخالفین میں سے لگتے ہیں۔" میر بخش نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "تم بالکل ٹھیک نہج پر سوچ رہے ہو۔"

ہمارے درمیان فاصلہ اب اتنا کم ہوگیا تھا کہ نیلی ہائی روف میں موجود لوگوں کو بہ آسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ جس شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ خاصا مشاق اور تجربہ کار نظر آتا تھا۔ دو افراد ہائی روف کے پچھلے حصے میں تھے۔ ان کی نگاہیں بھی سفید شیرڈ پر جمی تھیں۔

نے میرے بہت سے دوستوں کی جانیں لی ہیں۔ لاشوں کے کچھ نذرانے اس کی خدمتِ چوہدریہ میں بھی پہنچنے چاہییں۔"

"آپ نے دل خوش کردیا سائیں!" میر بخش نے مسرور لہجے میں کہا "اب مجھے کوئی پروا نہیں' میں تو آپ کی وجہ سے ہاتھ روکے بیٹھا تھا۔"

پھر میں نے ایک مقام پر ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کو کہا۔ راشد منہاس روڈ پر اب ہم خاصا آگے آگئے تھے۔ ڈرائیور نے اللہ کا نام لے کر ٹیکسی روک دی۔

اس سے پہلے کہ میں اور میر بخش ٹیکسی سے باہر آتے۔ سفید شیرڈ ہمیں اوور ٹیک کر کے پندرہ بیس فٹ آگے آکے رک گئی۔ چوہدری کے گماشتوں نے گاڑی اس زاویے پر روکی تھی کہ اگر ہم چاہتے تو آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ اسی وقت نیلی ہائی روف نے ہم دونوں کو اوور ٹیک کیا اور شیرڈ سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ سفید شیرڈ ٹیکسی اور ہائی روف کے درمیان پھنس کر رہ گئی۔

میں نے ٹیکسی کے دروازے کو کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو ایک منظر نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میر بخش بھی وحشت زدہ انداز میں ہائی روف کی طرف دیکھنے لگا۔ ساحل' بوٹا سنگھ اور ٹیکسی ڈرائیور میری ہدایت پر ٹیکسی رکتے ہی محفوظ پوزیشن میں جا چکے تھے اس لیے وہ اس سنسنی خیز منظر کو نہ دیکھ سکے۔

ہائی روف بریکوں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ رکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کا سائیڈنگ ڈور کھلا اور پچھلے حصے میں سوار دونوں افراد اچھل کر باہر آگئے۔ وہ دونوں مسلح تھے۔

ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی کے۔ کے کا رخ سفید شیرڈ کی جانب تھا۔ وہ چیتے کی مانند چست بھر کر شیرڈ کے قریب آگئے پھر ان کی کے کے (کلاشنکوف) شیرڈ پر گولیوں کی برسات کرنے لگیں۔ شیرڈ میں موجود تینوں افراد سکتے کی سی کیفیت کا شکار تھے۔ گنوں سے نکلنے والے برسٹوں نے شیرڈ کا ستیاناس مار دیا۔ ونڈ اسکرین' سائیڈ اسکرین اور گاڑی کی باڈی "لہولہان" ہوگئی۔ جب گاڑی کا یہ حشر ہوا تھا تو اس کے اندر والوں کا کیا حال ہوگا' اس کا اندازہ یہ خوبی لگایا جا سکتا تھا۔

میں نے چوہدری کے پالتو کتوں کو تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ سب کچھ بہ مشکل پانچ سیکنڈ میں پیش آیا تھا۔ شیرڈ میں موجود تینوں افراد نابود ہوگئے۔ کلاشنکوف بردار افراد نے شیرڈ کے اندر جھانک کر اپنا اطمینان کیا اور ہماری ٹیکسی کی جانب قدم اٹھانے لگے۔

وہ بہت نازک لمحات تھے۔ ہائی روف والوں کی کارروائی نے ہمیں ٹیکسی سے نیچے اترنے کا موقع نہیں تھا۔ خوفناک برسٹ کی آوازوں نے ہمارے ساتھیوں سانس روک کر چھپے رہنے پر مجبور کردیا۔ میں اور میر آنے والوں کی جانب متوجہ ہوگئے۔

وہ دونوں ہماری ٹیکسی کے قریب آگئے۔ کسی لمحے بھی ہو سکتا تھا تاہم کچھ بھی نہ ہوا۔ گن بردار افراد نے ٹیکسی کے نزدیک پہنچ کر کلاشنکوفوں کا رخ زمین کی طرف کردیا۔ چہروں پر بھی مجھے دوستانہ تاثرات نظر آئے۔ میرے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔

ایک گن بردار نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "نے انسانیت کے دشمنوں کو نیست و نابود کردیا۔ ہماری گا میں آجاؤ۔ جہاں جانا ہو' ہم چھوڑ دیں گے۔"

"تم کون ہو؟" میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہو پوچھا۔

اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا "ہم تمہار دشمنوں کے دشمن ہیں اس رشتے سے تم ہمیں اپنا دو سمجھو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پولیس آجائے گی۔ یہ ڈرائیور ریلوے اسٹیشن سے یہاں تک تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکا' پولیس والوں سے کیا بچائے گا۔ اگر بھروسا کرتے ہو تو ہماری گاڑی میں آجاؤ۔ کم آن۔"

میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان کے ساتھ جا کا فیصلہ کرلیا۔ اس دوران میں ہمارے دیگر دونوں ساتھی سیدھے ہو چکے تھے۔ میرے اشارے پر وہ ٹیکسی سے آگئے۔ میں اور میر بخش بھی نیچے اتر آئے۔ ٹیکسی ڈرائیور جان میں جان آئی۔ میں نے اس سے کہا۔

"اب تم جہاں جانا چاہو' جا سکتے ہو۔ ہم نے تمہیں آزا کیا۔"

پھر ہم سب نیلی ہائی روف میں آبیٹھے۔ ہمارے اند پہنچتے ہی ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

کلاشنکوف بردار دونوں افراد ہمارے ساتھ گاڑی پچھلے حصے میں تھے۔ ان پر اعتماد کر کے میں کسی الجھن پریشانی میں نہیں تھا۔ بس میرے دل نے کہا تھا' ان لوگو بھروسا کرنا چاہیے اسی لیے میں نے ان کے ساتھ جانے فیصلہ کیا تھا۔ ساحل اور بوٹا سنگھ سراسیمہ نظروں سے ہمارا اپنے عقب میں دیکھ رہے تھے جب کہ میر بخش خاصا سنجی

صورتِ حال واضح ہوگئی تو بوٹا سنگھ نے کہا "وجدان بھائی! یہ تو کوئی نیا ہی کھیل شروع ہوگیا ہے۔ بیگ میں آپ کی امانت رکھی ہے۔ اسے محفوظ رہنا چاہیے۔"

"بیگ میر بخش کی تحویل میں محفوظ ہے اس لیے اس کے اندر رکھی امانت بھی محفوظ ہی سمجھو۔" میں نے کہا "اب تم اپنی ذمے داری سے آزاد ہو چکے ہو۔ میں نے اپنی ڈائری وصول پائی۔ اس کی حفاظت کرنا اب میری ذمے داری ہے۔"

"شکر ہے' میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔" بوٹا سنگھ نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

میں باریک بینی سے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ آگے ایک سڑک بائیں جانب مڑ رہی تھی۔ اس طرف کا علاقہ خاصا غیر آباد تھا۔ میں اس بلی چوہے کے کھیل کو اب زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ جو بھی ہونا تھا وہ ہو جاتا۔ چوہدری نوازش کے نمک خوار کسی بھی قیمت پر بوٹا سنگھ اور ڈائری والے بیگ کو چھوڑنے والے نہیں تھے اور ہمارا ٹیکسی ڈرائیور ابھی تک اس تعاقب سے جان نہیں چھڑا پایا تھا۔ اتنی مہلت ہمارے پاس نہیں تھی کہ ڈرائیور کو ہٹا کر میں خود ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھتا۔ اس لحاتی وقفے سے وہ لوگ ہمارے سر پر پہنچ جاتے۔ جب ان سے دو دو ہاتھ کرنا ہی تھے تو پھر بھری پُری سڑک کے بجائے بائیں جانب نکلنے والی وہ روڈ زیادہ مناسب تھی۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "وہ آگے بائیں جانب جو سڑک مڑ رہی ہے' تم اپنی ٹیکسی کو اس سڑک پر ڈال دو اور جب میں رکنے کا کہوں تو ٹیکسی روک لینا۔"

"جناب! وہ تو خاصی ویران سڑک ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "اگر کوئی مار ماری شروع ہوگئی تو چھڑانے والا بھی کوئی نہیں ملے گا۔"

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔" میں نے سفاکی سے کہا۔

"جی..... کیا مطلب؟" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"تم مطلب وطلب کو چھوڑو سائیں۔" میر بخش نے کہا "وجدان سائیں تم سے جو کہہ رہے ہیں' آنکھ بند کر کے اس پر عمل کرو۔"

ساحل نے کہا "کہیں واقعی آنکھ بند نہ کرلینا' ہمیں نہ سہی مگر تمہارے گھر والوں کو ابھی تمہاری بہت ضرورت ہو گی۔ آنکھیں بند کر کے ڈرائیونگ کرو گے تو سیدھے ــــ" اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا "پتا نہیں' آج کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

میں نے کہا "اس مصیبت کا نام ہے ــ قسمت کا لکھا اور حالات کی مار۔ اگر تم چاہتے ہو' تمہاری شادی ہو تو پھر تمہیں زندہ رہنا ہوگا ــ اور زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے تم بے چون وچرا ہماری بات مانتے جاؤ۔"

"مانوں گا سر' آپ لوگوں کی میں ہر بات مانوں گا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "مجھے اپنی زندگی پیاری ہے۔ میں آنکھ بند کر کے آپ کے حکم کی تعمیل کا مطلب بھی سمجھتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

آخر کے ایک دو جملے اس نے ساحل کے جواب میں کہے تھے۔

اب تینوں گاڑیاں شاہراہِ فیصل پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ میرے اشارے پر ڈرائیور نے اپنی یلوکیب بائیں جانب موڑی تو اسی وقت میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ سفید شیرڈ تو ریلوے اسٹیشن سے ہمارے تعاقب میں تھی۔ اس نے ہمارے پیچھے ہی مڑنا تھا مگر نیلی ہائی روف نے بھی شیرڈ کے مڑتے ہی شاہراہِ فیصل کو چھوڑ دیا۔

لگ بھگ آدھے کلومیٹر تک یلوکیب' وہائٹ شیرڈ اور بلیو ہائی روف راشد منہاس روڈ پر آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر میں شلوار قمیص والے موٹے کے پاس ایک پسٹل دیکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کیا اور قسم کا اسلحہ تھا' میں نہیں جانتا تھا۔

میں نے میر بخش سے کہا "کوئی مناسب جگہ دیکھ کر ٹیکسی رکواؤں گا۔ تم موٹے سور کو کور کرنا۔ باقیوں کو میں سنبھال لوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے سائیں۔" وہ چوکنا انداز میں بولا پھر پوچھا "کیا ہم ٹیکسی کے اندر ہی رہیں گے؟"

"تم اور میں ٹیکسی سے فوراً باہر آجائیں گے۔" میں نے کہا "ساحل' بوٹا اور ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی رکتے ہی بیک کر سیٹوں کی آڑ میں چھپ جائیں گے تاکہ باہر سے کسی بھی قسم کی ہونے والی فوری فائرنگ سے محفوظ رہ سکیں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا اور کہا "ہم دونوں ٹیکسی سے باہر آتے ہی ٹیکسی کی آڑ لیں گے۔ تم شلوار قمیص والے موٹے شخص کو اپنی نگاہ میں رکھنا۔ ایک آدھ بندہ پھڑکانا بھی پڑ جائے تو پروا نہیں۔ ذرا چوہدری نوازش کو بھی تو پتا چلے کہ اس کے دشمن کا بیٹا کیا چیز ہے۔ اس کے ہرکاروں

نظر آرہا تھا۔

"ہمارے "میزبانوں" نے نہایت ہی مہارت کے ساتھ اپنی کے۔ کے سیٹوں کے نیچے چھپادیں پھر ان میں سے ایک نے پوچھا "تم لوگ کہاں جاؤ گے؟"

سوال کرنے والے کی عمر تیس کے قریب تھی۔ اس نے چلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا دوسرا ساتھی جینز اور ٹی شرٹ میں تھا۔ وہ پچیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ والے شخص کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔

میں نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے سوال کرنے والے سے سوال کر ڈالا "پہلے ہمیں تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ جب ہماری تسلی ہو جائے گی تو پھر ہم سے سوال کرنا۔"

"تم کس قسم کی تسلی چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "پہلے تو یہ بتاؤ' تم کون لوگ ہو اور شیرڈ والوں سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "تم ہمیں خدائی فوج دار کہہ سکتے ہو اور ہم ہر اس شخص کے دشمن ہیں جو اس شہر کے امن و امان کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"گویا تم اس شہر کے ٹھیکے دار ہو!" میں نے کہا۔

"تم ایسا کہہ سکتے ہو۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سا زہریلا پن شامل تھا۔ وہ مجھے بہت گہرا شخص محسوس ہوا۔

میں نے پوچھا "تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ سفید شیرڈ والے ان تینوں افراد کو تم لوگوں نے کیوں قتل کیا؟"

"وہ انسانیت کے دشمن تھے۔" اس نے اپنی کہی ہوئی بات کو دہرایا پھر مزید بتانے لگا۔ "ہم تین چار دن سے انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ دراصل ہمیں اس موٹے شخص کی تلاش تھی۔ اس نے چند روز پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قتل اور ڈکیتی کی ایک واردات کی ہے۔ اس کے وہ ساتھی تو ہمارے ہاتھ نہیں آسکے' چلو یہ دوسرے ساتھی ہی سہی۔ متاثرہ خاندان سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ پولیس والے تو اس موٹے تک کبھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خود ہی انصاف کے تقاضے پورے کر دیے۔ بے کس اور پنچ سے عاری افراد کی کون سنتا ہے بھائی۔"

میں نے کہا "تمہارا نشانہ تو وہ فربہ شخص تھا۔ باقی دو افراد کا کیا قصور؟"

"گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔" وہ سفاکی سے بولا "اس کے یہ دونوں ساتھی بھی شریف شہری نہیں ہو سکتے۔ ہم ریلوے اسٹیشن سے تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے بلکہ شیرڈ کا پیچھا کرتے ہوئے اسٹیشن تک پہنچے تھے۔ ان پر کرنے کا ہمیں موقع نہیں مل رہا تھا۔ ہم نے اسٹیشن عمارت کے باہر تمہارا اور ان کا مقابلہ دیکھا ہے۔ تم بہت بہادری اور جرات مندی سے ان کی پٹائی کی۔ تمہاری کارکردگی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اسی وقت میں نے لیا تھا کہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ ضرور بڑھاؤں گا۔"

بات ختم ہوتے ہی اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے دوستانہ میں کہا "دوستی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تم ہمارے دشمنوں کے دشمن ثابت ہوئے ہو اس لیے ہمارے دوست ہی ہوئے۔"

پھر اس نے باری باری بوٹا سنگھ اور میر بخش سے ہاتھ ملایا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ تک صرف وہی شخص بولتا آیا تھا۔ اس کا نوجوان ساتھی ڈرائیور بالکل خاموش تھے اس سے میں نے یہ اندازہ لگا ہمارے ساتھ بات چیت کرنے والا ان کا کوئی سینئر تھا۔ ہم ایک دوسرے کو اپنے نام بھی بتائے۔

میں نے اس سینئر کو مخاطب ہوتے ہوئے دیکھا "ہم دوست بن ہی گئے ہیں تو پھر یہ بھی بتا دو' تم یہ سڑکوں پر قسم کا انصاف کرتے پھر رہے ہو۔ کوئی بھی معاشرہ اس سماجی ٹھیکے داری کی اجازت نہیں دیتا۔ تم تو لحہ بہ لحہ قانون ہاتھ میں لے رہے ہو۔ یہ کہاں کی دانش مندی ہے؟"

"یہی تو دانش مندی ہے میرے بھائی۔" وہ معنی انداز میں بولا "ہمارے ملک کا مزاج تو جیسا ہے اس سب واقف ہیں لیکن اس شہر کا مزاج کچھ عجیب سا ہو ہے۔ آئے دن وارداتیں اور ہنگامہ آرائی ہوتی رہتی ہے یہاں انصاف حاصل کرنا ناممکنات میں شامل ہوتا جا رہا اسی ناانصافی اور معاشرتی دباؤ کے باعث ہماری تنظیم ہوئی ہے۔ ہمیں اپنا کام کرنے کے لیے کسی سماج یا قانون اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود مختار اور آزاد ہیں۔ جب کوئی معاشرتی ناسور ہماری نظر میں آجاتا ہے ہم اس کے جرم کی تصدیق کر لیتے ہیں تو پھر اس جرائم شخص کو موت کے گھاٹ اتارنا ہمارا اولین فرض بن ہے۔ ہم اس شہر کو ہر قسم کے جرم سے پاک کرنے کا عزم کر میدان میں اترے ہیں۔"

"تمہارے عزائم تو قابل ستائش ہیں۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "لیکن ان کاموں کے لیے

پولیس اور عدالتیں ہر شہر میں موجود ہوتی ہیں۔ یقیناً کراچی میں بھی یہ ادارے ہوں گے!"

"اگر یہ ادارے دیانت داری سے کام کر رہے ہوتے تو پھر "سی ایف کے" کے قیام کی ضرورت پیش نہ آتی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"سی ایف کے!" میں نے حیرت سے دہرایا "یہ کیا چیز ہے بھائی؟"

اس نے بتایا "سی ایف کے ہماری تنظیم کا نام ہے یعنی۔ کراچی فری کراچی۔"

ہمارے درمیان بات چیت کے دوران میں ہائی روف نیلا چور رنگی سے بائیں جانب گھوم گئی۔ اب اس کی رفتار میں قدرے کمی آگئی کیوں کہ یہاں ٹریفک زیادہ اور بے ہنگم تھا۔

"ہم نے سفید شیرڈ والوں سے اپنی دشمنی کے بارے میں تمہیں بتا دیا۔" اسی شخص نے پوچھا۔ "دوست! تم بھی تو کچھ بتاؤ' وہ لوگ ریلوے اسٹیشن سے تمہارے تعاقب میں کیوں لگ گئے تھے اور تمہارے درمیان اسٹیشن کی سیڑھیوں پر فائٹنگ کس ذیل میں ہوئی تھی؟"

میں جس شخص سے باتیں کر رہا تھا' اس نے اپنا نام امتیاز علی بتایا تھا۔ اس کے نوجوان ساتھی کا نام اشتیاق احمد اور ڈرائیور کا نام بابر خان تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ انہوں نے ہمیں اپنے اصلی نام بتائے ہوں گے۔ وہ جس قسم کے کاموں میں ملوث تھے ان میں راز داری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ امتیاز مجھے اپنی تنظیم "سی ایف کے" کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔ اصولی طور پر تو انہیں اپنا کام کر کے جائے واردات سے فوراً فرار ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کے بالعکس وہ نہ صرف ہمیں بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے بلکہ اپنی تنظیم کے عزائم اور مقاصد سے بھی آگاہ کیا جا رہا تھا۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا تھا۔ بہرحال' اب تو ہم ان کی گاڑی میں بیٹھ ہی چکے تھے۔ جائے وقوعہ سے فوری فرار ہماری بھی ضرورت تھی۔ اتنا مجھے احساس تھا کہ وہ لوگ ہمارے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر انہوں نے ہم سے کسی نوعیت کی دشمنی کرنا ہوتی تو وہ موقع عین مناسب تھا جب انہوں نے کے۔ کے کے برسٹ مار کر سفید شیرڈ سمیت تین افراد کو چھلنی کر دیا تھا۔

امتیاز کا سوال ایسا تھا کہ اس کا کوئی تسلی بخش جواب دیا جانا ضروری تھا ورنہ وہ لوگ ہمارے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو سکتے تھے۔ اتنی دیر میں' میں ایک موثر بیان تیار کر چکا تھا جس میں سچ زیادہ اور جھوٹ کم تھا۔

میں نے کہا "امتیاز بھائی! ہم تو بالکل سیدھے سادے لوگ ہیں۔ لاہور سے آئے ہیں۔ ٹرین سے اترتے ہی وہ منحوس ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ پتا نہیں' انہوں نے ہمارے پاس ایسا کیا دیکھ لیا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ان کی نظر ہمارے بیگ پر تھی۔ انہوں نے بیگ چھیننا چاہا تو ہمارے درمیان تھوڑی سی مار ماری ہو گئی۔ اس کے بعد کے حالات آپ لوگوں کی نظر میں ہیں۔" ایک لمحے کو میں سانس لینے کی خاطر رکا پھر کہا۔ "بہرحال ہم ان تینوں کو نہیں جانتے۔ ہم نے انہیں زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تم انہیں نہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں۔" امتیاز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہم نے اس دوران میں ان کے بارے میں تھوڑی چھان بین کی ہے۔ ان تینوں کا تعلق ایک جرائم پیشہ گروہ سے ہے جس کا سرغنہ میاں زاہد حسین نامی ایک شخص ہے۔ ان کا ٹھکانا پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کے علاقے گرین بیلٹ کے ایک بنگلے میں ہے۔ ہم براہِ راست ان کے ٹھکانے پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ اس میں ہماری چند تنظیمی مجبوریاں ہیں۔ تم اسے ہماری مصلحت کہہ لو۔ بہرحال' ہم کھلم کھلا ایکشن میں آکر دوسروں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ چن چن کر جرائم پیشہ افراد کا خاتمہ کرنا ہماری پالیسی ہے۔ تم یقین کرو جدان! چار روز قبل اس موٹے نے جس گھر میں ڈکیتی کی ہے وہاں ایک ماہ بعد لڑکی کی شادی ہونے والی تھی۔ لڑکی کے والد نے مزاحمت کی تو انہوں نے بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ بہت برے لوگ ہیں۔"

میں نے امتیاز سے یہ نہیں کہا' وہ اگر برے لوگ ہیں تو تم بھی کوئی اچھے کام نہیں کر رہے ہو۔ کیوں کہ "سی ایف کے" جو کچھ کر رہی تھی اس پر بحث کا دروازہ کھل جاتا تو بات بہت دور تک جا سکتی تھی اور میں ابھی اس موڈ میں نہیں تھا۔

مجھے سوچ میں مبتلا دیکھ کر امتیاز نے پوچھا "وجدان! تم کراچی میں کس کے پاس آئے ہو؟"

"یہاں کلفٹن کے علاقے میں میرے ایک عزیز رہتے ہیں۔" میں نے سوچے سمجھے پروگرام کے تحت جواب دیا "ہم ان سے ملنے آئے ہیں۔"

جس طرح نیلی ہائی روف والوں میں سے صرف امتیاز علی بات کر رہا تھا ویسے ہی ہماری جانب سے بھی صرف میں ہی بول رہا تھا اور یہ دونوں کے لیے اچھا تھا۔

امتیاز نے کہا "کلفٹن تو کراچی کا سب سے زیادہ پوش

علاقہ ہے۔ تم نے اپنے جس عزیز کا ذکر کیا ہے' وہ کیا کرتا ہے اور اس کا نام کیا ہے؟"

"میرے عزیز کا نام منہاس باقر ہے۔" میں نے بتایا "وہ پبلشنگ کے شعبے سے منسلک ہے۔"

میں نے دانستہ گول مول جواب دیا تھا۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ منہاس باقر ایک اخبار کا مالک ہے تو وہ ہماری طرف سے چوکنا ہو جاتا۔ پبلشنگ کا شعبہ بہت وسیع ہے لہٰذا امتیاز علی میرے جواب سے کسی تشویش میں مبتلا نہیں ہوا۔

اس نے بونا سنگھ والے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "وہ لوگ اسی بیگ کو تم سے چھیننا چاہتے تھے نا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولا "لگتا ہے' اس بیگ میں تم لوگوں نے کلو کے حساب سے سونا بھر رکھا ہے جو وہ لوگ اس کے حصول کے لیے ریلوے اسٹیشن سے تمہارا تعاقب کرتے ہوئے اتنی دور نکل آئے تھے!"

امتیاز نے یہ بات مذاق کے انداز میں کہی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ اس بیگ کے اندر واقعی کلو کے حساب سے سونے کا راز پنہاں تھا۔ میں نے اسی کے رنگ میں کہا۔

"امتیاز! وہ لوگ جتنی دور آئے تھے' آئے ہی تھے لیکن تم نے انہیں جتنی دور پہنچا دیا ہے اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ان کی واپسی کے امکانات اب صفر کے برابر ہیں۔"

"انہیں ایک نہ ایک دن حرام موت مرنا ہی تھا۔" وہ سفاکی سے بولا "اور وہ دن آج کا نکل آیا۔ اس میں نہ تو ہمارا کوئی کمال ہے اور نہ ہی ان کی کوئی بے وقوفی۔"

میں نے اس کے بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

وہ دوبارہ بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "کیا تم یہ بیگ کھول کر مجھے دکھا سکتے ہو۔"

اس کے سوال سے واضح تھا کہ دوست کہنے کے باوجود وہ ہم پر شک کر رہا تھا۔ میں نے کہا "اس میں صرف نجی استعمال کی چیزیں ہیں۔ ان لوگوں کو پتا نہیں کیا غلط فہمی ہو گئی تھی جو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے تھے۔"

"معاف کرنا دوست!" امتیاز ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "میری دوستی کو شک کی نظر سے نہ دیکھنا لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے تجسس سے مجبور ہوں۔ اس بیگ کو کھول کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا "اگر تمہیں واقعی دوست کی زبان پر اعتبار نہیں تو لو' خود ہی اس کا معائنہ کر لو۔" اس کے ساتھ ہی میں نے بیگ امتیاز کی جانب بڑھا دیا۔

مجھے یقین تھا کہ اسے بیگ میں سے کوئی بھی اعتراض" شے نہیں ملے گی۔ ڈائری کے مندرجات غور سے نہ پڑھا جاتا تو کچھ پلے نہیں پڑ سکتا تھا۔

میرے تیور سے وہ خجل سا ہو گیا اور اسی خجالت تھا کہ اس نے بیگ کی سرسری تلاشی لے کر اسے حوالے کر دیا اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا "پاگل لوگ احمق کہیں کے۔ گدھے کے بچے!"

میں نے طنزیہ انداز میں کہا "دوست! میری با تصدیق ہو گئی یا کوئی اور ثبوت بھی فراہم کرنا ہو گا؟"

"میں نے کہا تھا نا' میری بات کا برا نہ منانا۔" اس کہا "لیکن لگتا ہے' تم میری اس حرکت پر ناراض ہو۔"

"خیر' چھوڑو اس بات کو۔" میں نے مسکراتے ہو "جب تمہیں دوست کہہ دیا ہے تو پھر برا کیا منانا۔" ایک کو رک کر میں نے استفسار کیا "ہمیں کہاں ڈراپ کر امتیاز؟"

"تم کہو تو کلفٹن ہی چھوڑ آئیں!" وہ فراخ دلی سے "نہیں' اتنی زحمت کی ضرورت نہیں۔" میں نے سے کہا "تم ہمیں جائے وقوعہ سے بہ حفاظت نکال لا یہی تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ اپنے ٹھکانے پر ہم خود جائیں گے۔ تم ہمیں کسی ایسی جگہ اتار دو جہاں سے ٹیکسی مل جائے۔"

وہ گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا "ہم اس وقت منڈی سے گزر رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں' ہم آپ لوگو بہادر آباد کے چوراہے پر ڈراپ کر دیتے ہیں۔ اس کے آپ جہاں جانا چاہیں' چلے جائیں۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

دراصل میں جلد از جلد ان سے جان چھڑانا چاہتا وہ اگرچہ بالکل دوستانہ ماحول میں گفتگو کر رہا تھا تاہم میں اس کی کسی ہوئی باتوں پر زیادہ اعتبار نہیں کیا۔ موقع دار سے فوری روپوشی ناگزیر نہ ہوتی تو میں ان کے ساتھ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر واقعی ان کا تعلق کسی تنظیم سے تھا تو اب تک امتیاز نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا' وہ اسے ہرگز ہرگز نہیں بتانا چاہیے تھا۔ بھی کھیل' کھیل رہے تھے فی الحال میں اس کی نہ میں نہیں پایا تھا۔

نیلی ہائی روف ایک بار دفق چوراہے کے قریب گئی۔ امتیاز نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "وجدان! اگر

سے دوستی کی ہے تو اس کی لاج بھی رکھنا۔"

"تم مجھ سے ایسا اسپیشل کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"راز کی حفاظت۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں نے کہا "مجھے نہیں لگتا کہ دوبارہ ہماری ملاقات ہو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں تمہاری تنظیم کے بارے میں لوگوں کو بتا دوں۔ کون ہے جو میری بات کا یقین کرے گا؟ "سی ایف کے" کے بارے میں کہی ہوئی میری باتوں کو سپر فکشن سمجھا جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان! کسی کو تمہاری بات کا یقین نہیں آئے گا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "مگر ہماری دوستی میں فرق ضرور آجائے گا۔ میں تم پر بھروسا کر کے تمہیں جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ تم مجھے ایک شریف انسان لگے ہو۔ مجھے امید ہے' تم بھی شرافت کا مظاہرہ کرو گے۔ میں تمہاری دوستی کو کھونا نہیں چاہتا۔ خدا حافظ!"

آخری الفاظ اس نے جذباتی انداز میں ادا کیے اور ہائی روف کا سلائیڈنگ ڈور کھول دیا۔ ہم تینوں نے اس سے مصافحہ کیا اور گاڑی سے باہر آگئے۔

میں نے امتیاز کی جانب دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور مسکراتے ہوئے کہا "وش یو گڈ لک!"

سلائیڈنگ ڈور اپنی مخصوص آواز کے ساتھ بند ہوا اور نیلی ہائی روف ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

"یہ کس قسم کے مجرم ہیں سائیں؟" میر بخش نے جاتی ہوئی ہائی روف کی جانب دیکھتے ہوئے تعجب خیز انداز میں کہا۔

میں نے کہا "مجرموں کی ہزاروں اقسام ہیں مگر اتنے شریف النفس مجرم میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ وہ تو انصاف اور امن و امان قائم کرنے کے بھی دعوے دار ہیں۔"

"ان پر ریسرچ بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔" ساحل نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "فی الحال تو پیٹ پوجا کا کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ مجھے تو بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔"

اس وقت لگ بھگ دوپہر کے دو بجے ہوں گے۔ یہ لنچ کا وقت تھا اور ساحل تو ویسے بھی بھوک کی کچی تھی۔ میں نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی تو تھوڑے فاصلے پر مجھے ایک باربی کیو ریسٹورنٹ نظر آگیا۔ میں نے اس سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو' وہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ کھانا بھی کھائیں گے اور گپ شپ بھی ہوتی رہے گی۔"

ہم چاروں چلتے ہوئے مذکورہ ریسٹورنٹ میں آگئے۔ وہ خاصا صاف ستھرا اور معیاری ریسٹورنٹ تھا۔ ایک جانب ڈائننگ ہال بنا ہوا تھا' اس کے علاوہ فیملی کیبن کا انتظام بھی تھا۔ ہم ایک کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ ایک مناسب سی میز کی دونوں جانب صوفہ نما بڑے سائز کی سیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک سیٹ پر دو افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ میں اور ساحل ایک سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ دوسری سیٹ پر میر بخش اور بوٹا سنگھ نے سنبھال لی۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد ہم باتوں میں لگ گئے۔ موضوعِ گفتگو "سی ایف کے" ہی تھی۔

ساحل نے کہا "مجھے تو ایک فی صد یقین نہیں کہ ان کا تعلق ایسی ویسی تنظیم سے ہے۔"

"ہاں سائیں!" میر بخش تائیدی انداز میں بولا "اس قسم کے خطرناک لوگ تو نہ کسی کو لفٹ دیتے ہیں اور نہ ہی اپنے جرم کے عینی شاہدوں کو یوں آسانی سے جانے دیتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا۔"

بوٹا سنگھ بولا "ان کے رویے پر مجھے خود حیرت ہے۔ انہوں نے چوہدری نوازش علی کے تینوں بندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ وہ ان کے دشمن ہیں مگر ہم سے دوستی کرنے کے لیے انہوں نے جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔"

میں نے اس الجھن کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیا اور بوٹا سنگھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "بوٹا سنگھ! تم نے میرے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ میں تمہارے اس ایثار کا کوئی بدلہ بھی چاہوں تو نہیں دے سکتا۔ البتہ جو کچھ میں تمہارے لیے کر سکتا ہوں مجھے بتاؤ' میں ضرور کروں گا۔"

"وجدان! سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔" وہ معتدل انداز میں بولا "میرے آنجہانی دوست خشونت سنگھ نے یہ ڈائری مجھے بھجوائی اور اس کی حفاظت کی ذمے داری سونپی۔ میں نے تو اپنا فرض نبھایا ہے۔"

"اس فرض کی ادائی میں تمہیں اپنا گھر چھوڑ کر لاہور سے کراچی آنا پڑا۔" میں نے کہا "اور اس طرح آنا پڑا کہ تمہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔"

"پروا نہیں ہے وجدان!" وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "لاہور میں کرایے کا گھر تھا۔ چھوٹ گیا تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ ہے کہ میری جی جائی لائف ختم ہو گئی۔ اب میں کبھی اس طرف کا رخ نہیں کر سکوں گا۔ چوہدری نوازش کے بندے میرے بارے میں سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

ساحل نے کہا "اور تمہاری بو کا کچھ حصہ چوہدری نے یہاں کراچی بھی بھیج دیا۔ تین سونگھنے والے ریلوے اسٹیشن پر تمہارے استقبال کے لیے موجود تھے۔"

"خدا کا شکر ہے' وہ تینوں شیطان جہنم واصل ہوئے۔" میر بخش نے کہا "مجھے ان کے انجام سے خاصا اطمینان ہوا میرے ہمارے دشمنوں کی تعداد کچھ تو کم ہوئی۔"

میں نے کہا "ہاں' کچھ کم تو ہوئی مگر ختم نہیں ہوئی۔ بیلگری کی اطلاع کے مطابق چوہدری کا ایک نیٹ ورک کراچی میں سرگرم ہے پھر امتیاز علی نے بھی بتایا ہے کہ وہ تینوں مجرم جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں' اس کا سرغنہ میاں زاہد حسین نامی ایک شخص ہے۔ جس کا ٹھکانا گرین بیلٹ کے علاقے میں ہے۔ شاید اسی نیٹ ورک کا ذکر نیلگری نے کیا تھا۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! ہم چوہدری کے خاص بندے میاں زاہد حسین کی سرکوبی کے لیے پی ای سی ایچ ایس میں اس کے ٹھکانے کا سراغ لگا سکتے ہیں۔"

"بہ وقتِ ضرورت یہ کام ضرور کریں گے۔" میں نے کہا۔

اسی وقت ہمارا آرڈر پلیس کر دیا گیا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بیگ میں سے وہ ڈائری نکال لی جس کی خاطر یہ سارا کھٹ راگ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ڈائری کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بہ غور دیکھا پھر چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ میں اس وقت خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس ڈائری میں کثیر المالیت سونے کا راز رقم تھا بلکہ میرے جوش اور جذبات کا تعلق ماضی کی یادوں سے تھا۔ وہ ڈائری میرے والد عابد علی سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے باپ نے مجھے کتنی محبت سے پالا تھا' کتنی توجہ دی تھی انہوں نے مجھے۔ اس عرصے کا ایک ایک لمحہ میری نگاہ میں گھوم رہا تھا۔ میں ایک سفید نیپکن میں لپٹا ہوا تھا جب وہ مجھے پاکستان سے لے کر سنگاپور پہنچے تھے۔ دو ماہ کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ چوہدری نوازش علی کے جبر نے میرے والدین کو پاکستان چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ ان لمحات میں میری ماں پر کیا گزری ہو گی' انہوں نے کیسے کیسے صدمے اٹھائے ہوں گے' ان کے تصور ہی سے میری روح کانپ اٹھتی تھی۔ چوہدری ہی کے بھیجے ہوئے انٹرنیشنل غنڈے دارا نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میرے والدین کو ہولناک موت سے دوچار کیا تھا۔ میں اس خوں چکاں واقعے کا عینی شاہد تھا۔ وہ میری باشعور زندگی کا پہلا اپ سیٹ تھا اور ابھی تک میں اس سانحے سے نکل نہیں سکا تھا۔ مجھے سیٹ اپ ہونے میں نہ جانے اور کتنا وقت لگنا تھا!

یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اگر میں ماضی کے اس ریلے میں بہہ جاتا تو پتا نہیں' کہاں سے کہاں پہنچ جاتا لہٰذا میں نے سرخ جلد والی اس ڈائری کو اپنی گود میں رکھا اور بوٹا سنگھ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"بوٹا سنگھ!" میں نے گمبھیر آواز میں اسے مخاطب کیا "آج تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ڈائری والی امانت میرے پاس پہنچ گئی ہے۔ اب تمہارا آئندہ کیا پروگرام ہے؟"

"میں اپنے دوست کے پاس جاؤں گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"وہی دوست جو گارڈن ویسٹ کے علاقے میں رہتا ہے؟"

"جی ہاں' میں اس کے پاس آنے کے لیے ہی لاہور سے نکلا تھا۔" اس نے بتایا "میں جب بھی کراچی آتا ہوں تو اسی کے پاس ٹھہرتا ہوں۔ وہ بہت قابلِ بھروسا آدمی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا تم نے اپنے دوست کو اپنے کراچی آنے کی اطلاع دی تھی؟"

"میں نے جس افراتفری میں لاہور چھوڑا اس میں اطلاع دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔" وہ بولا "میں کئی مرتبہ یہاں آچکا ہوں۔ شمشاد علی کے گھر کا راستہ مجھے معلوم ہے۔ میں بہ آسانی اس کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔"

میں نے پوچھا "تمہارا یہ دوست شمشاد کرتا کیا ہے؟"

"ایک پرائیویٹ ادارے میں اکاؤنٹنٹ ہے۔"

"اس کے بیوی بچے بھی ہوں گے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "جی' شمشاد کے دو بچے ہیں۔ وہ گارڈن ویسٹ کے علاقے "البیلا" کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتا ہے۔ اس کی رہائش تین کمرے والے ایک فلیٹ میں ہے۔"

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "پھر میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اپنے دوست شمشاد کے بیوی بچوں پر رحم کھاؤ اور فی الحال ادھر کا رخ نہ کرو۔ چوہدری نوازش کے بندوں کو یہ بات بتائی گئی تھی کہ تم اپنے کسی دوست کے پاس گارڈن ویسٹ جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ جب وہ یہاں تک معلومات رکھ سکتے ہیں تو پھر ان کے لیے یہ جاننا ہرگز مشکل نہیں ہو گا کہ تمہارا دوست گارڈن ویسٹ میں کہاں اور کس فلیٹ میں رہتا ہے۔ اگر تم وہاں گئے تو شمشاد کسی بہت بڑی مصیبت میں

آتش فشاں 41 حصہ 8

مبتلا ہو جائے گا۔"

یہ بات مجھے نیلگری نے بتائی تھی کہ چوہدری نوازش نے اپنے بندوں کو احکام صادر کر رکھے ہیں کہ بوٹا سنگھ اسٹیشن سے نکل کر گارڈن ویسٹ نہ پہنچنے پائے۔ فوری طور پر اس سے وہ قیمتی ڈائری چھین لی جائے چاہے اس ڈائری کے حصول کے لیے بوٹا سنگھ کی جان ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ نیلگری کی معلومات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چوہدری کے بندے بوٹا سنگھ سے ڈائری حاصل کر سکے تھے اور نہ ہی اس کی جان لینے میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ایک ناگہانی نے ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ اب یہ معاملہ اور بھی زیادہ حساس اور اہم ہو گیا تھا۔ چوہدری نوازش کا جونیٹ ورک کراچی میں کام کر رہا تھا۔ وہ صرف انہی تینوں افراد پر مشتمل نہیں تھا جو یہ سمجھا جاتا کہ کہانی ختم' پیسا ہضم۔ "سی ایف کے" کے اہل کار امتیاز علی نے مجھے بتایا تھا کہ شیرڈ والوں کا سرغنہ میاں زاہد حسین تھا۔ گویا وہ چوہدری کے نیٹ ورک کا بندۂ خاص تھا۔ میاں زاہد ہی ڈائری کے معاملے کو آپریٹ کر رہا ہو گا۔ وہ اپنے بندوں کی ہلاکت پر خاموش نہیں بیٹھ جاتا بلکہ ہمیں گھیرنے' ہم سے ڈائری چھیننے اور اپنے بندوں کا انتقام کی خاطر وہ ہماری تلاش میں کراچی کا چپا چپا چھان سکتا تھا۔ گویا ہمارے لیے بہت ساری ہنگامہ خیزیاں تیار تھیں۔

مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر بوٹا سنگھ نے سوال کیا "آپ نے یہاں کے جو حالات بتائے ہیں' وہ بہت تشویش ناک اور گمبھیر ہیں۔ مجھے واقعی شمشاد کے پاس نہیں جانا چاہیے۔" پھر وہ پریشان نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے پوچھا "تمہارے پاس شمشاد کا کوئی کانٹیکٹ نمبر تو ہو گا؟"

"ہاں میرے پاس اس کے گھر اور دفتر کے فون نمبرز ہیں۔"

"فی الحال تم شمشاد کے پاس نہیں جاؤ۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "وہاں جانا تمہارے لیے اور شمشاد کی فیملی کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے البتہ تم فون پر اسے اپنی آمد کی اطلاع ضرور دے دو اور اسے واضح الفاظ میں یہ بھی بتا دو کہ تم کسی ناگزیر وجہ کی بنا پر اس سے نہیں مل سکتے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے پوچھا "کیا تمہارا دوست شمشاد ڈائری کے راز میں تمہارا شریک ہے؟"

"نہیں' قطعی نہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا "یہ راز پاکستان میں میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ خشونت سنگھ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میں اس کے راز کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے وہ میرا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "ٹھیک ہے' پھر تم شمشاد کو اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤ۔ تمہاری کسی بپتا کے بارے میں سن کر وہ بے چارہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائے گا بلکہ تم اسے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع بھی نہ دو۔ جب تک حالات سازگار نہیں ہو جاتے' تمہیں کوئی سرگرمی دکھانے کی ضرورت نہیں۔"

"اور حالات کے سازگار ہونے تک میں کہاں جاؤں؟" بوٹا سنگھ نے پوچھا "واپس لاہور تو جا نہیں سکتا اور کراچی میں شمشاد کے سوا میرا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔"

میں نے کہا "فی الحال تم کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں ٹھہر جاؤ۔ ہم آپس میں رابطہ رکھیں گے۔ جیسے ہی کوئی مناسب اور موزوں صورتِ حال سامنے آئی' ہم کوئی اہم فیصلہ کر لیں گے۔" پھر میں نے دوستانہ انداز میں اس سے پوچھا "اس وقت تمہاری مالی پوزیشن کیا ہے؟"

"میرے پاس کچھ رقم ہے۔" وہ میرے سوال کا مقصد سمجھتے ہوئے بولا "پانچ ہزار روپے میں کافی دن تک میں بہت اچھا گزارہ کر سکتا ہوں۔ ادھر صدر میں درمیانے درجے کا ایک ہوٹل ہے جہاں میں پہلے بھی دو مرتبہ ٹھہر چکا ہوں۔ آپ کے مشورے کے مطابق فی الحال وہیں قیام کر لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا "اس عارضی قیام کے دوران میں تم اپنے اور اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کر لو۔ آئندہ زندگی کی پلاننگ کے سلسلے میں تمہیں جہاں بھی میری مدد کی ضرورت پیش آئی' میں تمہارے کام آ کر بہت خوشی محسوس کروں گا۔"

پھر میں نے اس سے اس ہوٹل کا نام و پتا پوچھا جہاں وہ قیام کا ارادہ رکھتا تھا۔ مذکورہ ہوٹل صدر کے قلب میں واقع تھا۔ میر بخش اپنے سابق آقا وڈیرا اکبر سومرو کے ساتھ کئی مرتبہ صدر آ چکا تھا اور اس ہوٹل سے واقف بھی تھا۔

کھانا ختم ہو چکا تو بوٹا سنگھ ہم سے رخصت کی اجازت مانگنے لگا۔ میں نے اپنی جیب میں سے پانچ ہزار کے نوٹ نکال کر بوٹا سنگھ کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ رقم بھی اپنے پاس رکھ لو۔ پیسا خرچ ہوتے ہوئے کچھ پتا نہیں چلتا۔ یہ روپے تمہارے کام آئیں گے۔ میں بہت جلد تم سے رابطہ کروں گا۔ تم کوئی فکر نہ کرنا۔"

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے رقم رکھ لی۔ میں نے کہا "احتیاطاً تم مجھے شمشاد کے فون نمبرز اور گھر کا ایڈریس نوٹ کرا دو۔ کسی انتہائی ضرورت کے وقت کام آئے گا۔"

اس نے اپنے سفری بیگ میں سے کاغذ قلم نکال کر میری مطلوبہ معلومات تحریری شکل میں مجھے فراہم کر دیں۔ شمشاد علی جس پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھا' اس کا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر واقع تھا۔ تھوڑی دیر بعد بوٹا سنگھ ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد ساحل نے کہا "وجدان! اپنے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے اپنے بارے میں تو کبھی بھی نہیں سوچا۔" میں نے روا روی میں جواب دیا۔

"میں قیام کے حوالے سے پوچھ رہی ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "ابھی سہ پہر ہے' یہ سہ پہر ہمیشہ نہیں رہے گی۔ شام آئے گی اور پھر رات ہو جائے گی۔ ہم یونہی مارے مارے تو نہیں پھر سکتے ہمیں اپنے لیے کوئی ٹھکانا کرنا ہو گا۔ جس قسم کے حالات سے ہم گزر رہے ہیں' ان کا تقاضا تو یہی ہے کہ ہمارے پاس ایک محفوظ اور مضبوط قیام گاہ ہونا چاہیے۔"

"محفوظ اور مضبوط قیام گاہ!" میں نے ساحل کے کہے ہوئے الفاظ زیرِ لب دہرائے۔

میر بخش چونک اٹھا' اس نے کہا "سائیں! سب سے زیادہ مضبوط اور محفوظ ٹھکانا تو ہمیں قاضی سلطان کا دوست ہی فراہم کر سکتا ہے۔ ہمیں پہلی فرصت میں منہاس باقر سے رابطہ کرنا چاہیے۔ وہ کراچی کی ایک معروف اور طاقت ور شخصیت ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو میر بخش۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"وجدان! تم کہاں جا رہے ہو؟" ساحل نے پوچھا۔

"منہاس باقر سے رابطہ کرنے۔" میں نے جواب دیا پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا "اس ریسٹورنٹ کے برابر میں' میں نے ایک "پی سی او" دیکھا تھا۔ تم لوگ یہیں بیٹھو۔ میں قاضی سلطان کے دوست کو فون کر کے آتا ہوں۔"

پھر میں فیملی کیبن سے نکل کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ اپنی جیب میں سے میں نے وہ پرچہ نکالا جس پر منہاس باقر کے بنگلے کا ایڈریس' اس کے گھر اور دفتر کے فون نمبرز قاضی نے مجھے لکھ کر دیے تھے۔ اسی کاغذ کے ایک کونے میں قاضی سلطان کا فون نمبر بھی درج تھا۔ اس نمبر پر نگاہ پڑتے ہی میرا دھیان "نبی سر" کی طرف چلا گیا۔

ہم رات کے آخری پہر قاضی کی حویلی سے بڑے پراسرار انداز میں روانہ ہوئے تھے۔ نیلگری کی زبانی وہاں پیش آنے والے حالات کے بارے میں مجھے پیشگی جو معلومات حاصل ہوئی تھیں' وہ بہت سنسنی خیز تھیں۔ موٹی توند والا مرتشی ڈی ایس پی قاضی کی حویلی پر ریڈ کر کے مجھے "رنگے ہاتھوں" پکڑنے والا تھا۔ ہوس پرست بدنیت ڈی ایس پی کا منصوبہ کس طرح خاک میں مل گیا ہو گا' یہ جاننے کے لیے میں بے چین ہو گیا۔ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا' ڈی ایس پی مجھے حویلی میں نہ پا کر اپنے بال نوچ رہا ہو گا۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے چوٹ دے آیا تھا۔ وہ اپنے زخم چاٹنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

نیلگری اگر بروقت مجھے حالات کی سنگینی کے بارے میں آگاہ نہ کرتی تو میں بیٹھے بٹھائے ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ نیلگری کے تعاون اور راہنمائی سے میں نے ڈائری بھی حاصل کر لی تھی اور خود سمیت اپنے ساتھیوں کی جان بچانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

نیلگری نے ہمیشہ مجھے فائدہ پہنچایا تھا لیکن اس کی مدد حاصل کرتے ہوئے میں ایک بے نام سے اضطراب میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا' میں کوئی ننھا بچہ ہوں اور نیلگری کسی تجربہ کار جہاں دیدہ عورت کی طرح مجھے گائیڈ کر رہی ہے۔ زمانے کی اونچ نیچ سمجھا رہی ہے اور قدم قدم پر میری مدد کر رہی ہے۔ مجھے لگتا جیسے میں اس کی انگلی پکڑ کر چل رہا ہوں۔

یہی احساس مجھے بے چین اور مضطرب رکھتا تھا۔ میں ابتدائی عمر ہی سے اپنی مرضی کا مالک تھا۔ من مانیاں کرتا آیا تھا۔ لڑکپن ہی میں دارا جیسے منجھے ہوئے شخص سے میرا پالا پڑا تھا اور میں اس سے نمٹتا رہا تھا۔ میں نے اکثر دوسروں کی مدد کی تھی' ان کے کام آیا تھا۔ شاید خود مختار اور آزاد زندگی گزارنے کے سبب میرا مزاج ایسا بن گیا تھا کہ نیلگری کی مدد اور گائیڈنس سے میں الجھ جاتا تھا اور مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا تھا' نیلگری سے مدد نہیں لوں گا لیکن پھر وہ پھر سے میرے حالات میں اس طرح کود تی تھی کہ میں اس کی بات ماننے کے لیے مجبور ہو جاتا۔ پتا نہیں' وہ مجھ سے کیا کیا منوانا چاہتی تھی۔ آثار تو بہت سنسنی خیز اور تشویش ناک تھے۔ بعض اوقات میں اس کے عزائم کے بارے میں سوچ کر ایک الجھن میں پڑ جاتا۔ گزشتہ رات والی ملاقات میں تو وہ کھل گئی تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا اور مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ اس کے سوا اور کوئی عورت میری خلوت کی ساتھی نہیں بن سکتی۔ میرے زہریلے پن کے بارے میں اس نے جو

انکشاف کیا تھا اسے رد کرنا حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف تھا۔

میں نیلگری کے سنگین خیالات کو ذہن میں بسائے "پی سی او" میں داخل ہوگیا۔ ساحل اور میر بخش سے میں یہ کہہ کر آیا تھا کہ منہاس باقر کو فون کروں گا لیکن یہاں پہنچ کر میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے آپریٹر سے قاضی سلطان کی حویلی کا نمبر ملانے کو کہا۔ لاشعوری تجسس نے مجھے وہاں کے حالات جاننے کے لیے مجبور کردیا تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد آپریٹر نے چھوٹے سے بوتھ میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "آپ کا نمبر مل گیا ہے' بات کرلیں۔"

میں نے بوتھ کا دروازہ بند کرکے ریسیور اٹھالیا۔ "ہیلو" کے جواب میں قاضی سلطان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ فوراً مجھے پہچان گیا اور ہیجان خیز لہجے میں بولا۔

"سائیں! تم کہاں ہو؟"

"میں کراچی میں ہوں۔" میں نے بتایا "اور بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ اپنی سنائیں؟"

وہ پرجوش انداز میں بولا "سائیں! یہاں تو خوب ہنگامہ خیزی رہی۔ شادی پلی والے ڈی ایس پی نے نئی سرکے تھانا اِن چارج کی مدد سے میری حویلی پر دھاوا بول دیا تھا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا "مگر تم راتوں رات اپنے ساتھیوں کو لے کر کہاں غائب ہوگئے تھے؟"

"قاضی صاحب! آپ کو بتائے بغیر میرے اچانک چلے آنے سے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

وہ جلدی سے بولا "نن..... نہیں بلکہ تم لوگوں کی غیر موجودگی میں حالات کو نکل کرنا میرے لیے آسان ہوگیا تھا۔"

"اسی لیے تو میں وہاں سے نکل آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اوخدا کے بندے۔ اگر تمہیں جانا ہی تھا تو مجھے بتا کر بھی جاسکتے تھے' وہ میٹھی ناراضی سے بولا "میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوتا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "قاضی صاحب! آپ کو بتانے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ مجھے ایک بے چینی سی لگی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار وارن کررہی تھی کہ مجھے صبح ہونے سے پہلے وہاں سے نکل آنا چاہیے ورنہ کینہ پرور ڈی ایس پی کوئی بھی مصیبت کھڑی کرسکتا ہے۔ میں نے اپنے خدشات کے بارے میں آپ کو بھی بتایا تھا۔"

"ہاں' مجھے یاد ہے۔ تم نے اس سلسلے میں بات تھی۔" وہ تائید کرتے ہوئے بولا "مگر میں سمجھ رہا تھا' میرا ایس پی اس معاملے کو سنبھال لے گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بدذات ڈی ایس پی اپنے خیرخواہ ڈی آئی جی پہنچ جائے گا۔ ڈی ایس پی کے کینے پن نے حالات کو دیا۔ میرا سالا بھی اسی وجہ سے رات کے کھانے پر نہیں سکا۔ وہاں عمرکوٹ میں اونچے پیمانے پر میٹنگز چل تھیں۔"

"بہرحال' یہ بتائیں قاضی صاحب! ڈی ایس پی کے کیا نتائج رہے۔" اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا

وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا "چھ خیریت سے نمٹ گیا۔ تم لوگوں کی غیر موجودگی سے بالکل صاف اور سیدھا کردیا تھا۔ پولیس کے سامنے وہی کہانی پیش کی جو ہمارے درمیان طے ہوئی تھی۔ تم تمہارے ساتھی "کٹ" ہوگئے۔ میں نے سارا ملبا وڈیرا سومرو پر ڈال دیا۔ اسی کے ایما پر منگل سنگھ نامی ایک ڈاکو میری بیٹی ممتاز کو اغوا کیا تھا۔ مقامی تھانے دار میرے اور سومرو کے درمیان سال ہا سال سے چلنے والی دشمنی واقف ہے پھر اس کے تھانے میں ممتاز کے اغوا کی رپور بھی درج تھی۔ میں نے یہی موقف اختیار کیا کہ میر آدمیوں نے وڈیرا اکبر اور اس کے ساتھی تارا پر قابو پا ممتاز کو ان کے قبضے سے نکالا ہے۔ منگل سنگھ ڈاکو اور کے ساتھی گنڈا سنگھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ "وہ لمحے سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے "اگر تم لوگ حویلی میں موجود ہوتے تو میرے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ اس صورت میں ڈی ایس پی مراد بر آتی اور وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوجاتا' گویا اس کہانی ہٹ اور میری کہانی فلاپ ہوجاتی۔"

میں نے پوچھا "وڈیرا اکبر سومرو اور تارا کا کیا بنا؟"

"بننا کیا تھا' میں نے انہیں پولیس کے حوالے کردیا۔ قاضی سلطان نے بتایا "اس موقع پر ممتاز کی گواہی بہت آئی۔ اس نے تمہاری حمایت میں' میری بیان کردہ کہانی تصدیق کردی۔ مغوی نے جب وڈیرا اکبر کو اس اغوا کا اصل ذمے دار ٹھہرادیا تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ واقعات اور شواہد بھی وڈیرے کے خلاف جارہے ہیں پھر ایس پی کی دیرینہ حمایت بھی مجھے حاصل ہے۔ جو بھی ہوگا' میرے حق میں ہی ہوگا۔ وڈیرے کا جو کچھ بھی ہونا ہے وہ پولیس ہی کرے گی۔"

"چوہا آپ نے ان دونوں کو آزاد کردیا۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

وہ چونک کر بولا "تم کیا کہنا چاہتے ہو جدان!"

میں نے کہا "اکبر سومرو جیسے بھوتار و وڈیرے پولیس کی تحویل میں آزاد ہی تصور کیے جاتے ہیں۔ اس وقت تو حالات پوری طرح اس کی مخالفت پر کمربستہ تھے اس لیے وہ قابو آگیا لیکن مجھے امید ہے' وہ کوئی نہ کوئی ذریعہ استعمال کرکے خود کو اور اپنے مہمان دوست تارا کو بچالے گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ اسے ڈی ایس پی کی حمایت بھی حاصل ہے۔"

قاضی سلطان نے کہا "عام حالات میں' کسی عام آدمی کے ساتھ ایسا ہوسکتا ہے' لیکن میں نہ تو عام آدمی ہوں اور نہ ہی موجودہ حالات کو عام کہا جاسکتا ہے۔ میں آسانی سے وڈیرے کو چھوٹنے نہیں دوں گا۔"

"اللہ کرے' ایسا ہی ہو۔" میں نے قاضی سلطان سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

وہ پورے وثوق سے بولا "وجدان! تم دیکھ لینا۔ انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔"

میں ٹیلی فون پر بات تو قاضی سلطان سے کررہا تھا لیکن میری چشم تصور میں مدھوری ڈکشٹ کے سراپا والی وہ دلکش و دلنشین لڑکی گھوم رہی تھی جس کا نام ممتاز تھا۔ وہ قدم قدم پر میری حمایت پر کمربستہ تھی۔ اس کی صورت تو متاثر کن تھی ہی' اس کا عمل بھی مجھے بہت متاثر کررہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ سامنے آنے کے بعد حویلی کے کسی نہایت خفیہ حصے میں جا چھپی تھی اور وہیں بیٹھ کر میرا کیس لڑرہی تھی۔ عجیب احسان شناس لڑکی تھی وہ!

ریسیور میں ابھرنے والی قاضی سلطان کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکادیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "وجدان! ایک بات سچ بتاؤ۔"

"ہاں پوچھیں' آپ سے دوستی کی ہے تو بات بھی بتانا پڑے گی۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔

اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا "کیا تم کوئی جادو وادو بھی جانتے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں' آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں!"

وہ بولا "چلو' یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ تمہیں ڈی ایس پی سے کسی انتقامی کارروائی کی توقع تھی۔ حالات و واقعات سے تم اس قسم کا اندازہ قائم کرسکتے ہو مگر یہ کیسے ممکن ہوا کہ تم میری حویلی سے چپ چپاتے نکل گئے اور میرے ملازمین کو خبر تک نہ ہوئی۔ پہرے دار میرے برسوں کے آزمائے ہوئے ہیں۔ میں ان کی فرض شناسی اور جسور مستعدی کا بھی قائل ہوں۔ اگر تم لوگ ان کی لاعلمی میں حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ ایک چیلنج ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ تم کوئی ایسا علم یا عمل جانتے ہو' جس کی مدد سے ناممکن کام ممکن ہوجاتا ہے۔"

میں نیلگری کی ذات کو قاضی سلطان کے سامنے اوپن نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہ جہاں دیدہ سرد و گرم چشیدہ شخص کسی بہلاوے میں نہیں آسکتا تھا لہٰذا میں نے اپنا بھرم رکھنے کی خاطر کہا۔

"قاضی صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں چند ایسے شعبدے جانتا ہوں جن کی مدد سے بعض کام بہ آسانی ہوجاتے ہیں۔ آپ اسے ہاتھ کی صفائی یا نظربندی کی تکنیک سمجھ لیں مگر میں نہ تو کسی قسم کا جادو جانتا ہوں اور نہ ہی کوئی عامل کامل ناگی باوا ہوں۔"

دوسری جانب لمحاتی خاموشی دہی پھر قاضی سلطان نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "چلو' میں تمہاری بات کا یقین کرلیتا ہوں لیکن اس واقعے کو کس خانے میں فٹ کروگے؟" پھر خود ہی اس نے اپنے سوال کی وضاحت کردی۔ "میرا اشارہ اس رقم کی جانب ہے جو کل ہمیں اکبر سومرو کی پجارو سے ملی تھی۔ یہ حفاظت رکھنے کے باوجود بھی وہ پچاس ہزار روپے غائب ہوگئے۔"

میں اس کے سوال سے گڑبڑا گیا۔ یہ سب نیلگری کا چلایا ہوا چکر تھا۔ اس نے منگل سنگھ والی رقم مجھ تک پہنچادی اور قاضی سلطان کے پاس موجود رقم کو حاصل کرکے منگل سنگھ کو دے دیا ہوگا۔ اس نے بہ قول منگل سنگھ' وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر اسے اس کی رقم مل جائے گی۔ یقیناً نیلگری ہی نے اپنی قوت سے قاضی سلطان کے پاس محفوظ رقم کو غائب کیا تھا۔ میری یہ مجبوری تھی کہ میں قاضی سلطان کو نیلگری کے راز میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ پھر بحث کے کئی دروازے کھل جاتے اور میری ذات اہم سے اہم تر ہوتی چلی جاتی۔ میں فی الحال کسی نئی مہم جوئی کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے قاضی سلطان کو گول مول جواب دیا۔

"قاضی صاحب! آپ بھی عجیب باتیں کررہے ہیں۔ اگر آپ کے پاس سے پچاس ہزار روپے کی رقم غائب ہوگئی ہے تو اس میں میرا کوئی کمال کس طرح ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے' آپ اور کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں۔ انسان سے بھول چوک تو ہو ہی جاتی ہے۔"

وہ میری وضاحت سے مطمئن تو نہ ہوا مگر بندہ وہ خاصا

سمجھ دار تھا۔ اس نے میرے اسٹائل سے بھانپ لیا کہ میں اس سلسلے میں کھلنا نہیں چاہتا اس لیے وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

"خیر چھوڑو۔ میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گیا۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ فی الحال اپنے بارے میں بتاؤ!"

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔" میں نے کہا "کچھ عرصہ میں کراچی میں قیام کا ارادہ رکھتا ہوں جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا۔ آپ سے بات کرنے کے بعد میں آپ کے دوست منہاس باقر سے رابطہ کروں گا تاکہ اپنی رہائش کا کوئی معقول بندوبست کر سکوں۔"

قاضی سلطان نے کہا "منہاس باقر سے تو آج تمہارا رابطہ نہیں ہو سکے گا۔"

"کیوں' کوئی خاص وجہ؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "تمہارے اچانک غائب ہونے کے بعد میں نے کراچی فون کیا تھا' منہاس باقر کو تمہارے بارے میں آگاہ کرنا تھا۔ میں اگرچہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم کراچی ہی جاؤ گے تاہم میں اپنی نئی نویلی دوستی کے تقاضے نبھانا چاہتا تھا مگر منہاس سے میری بات نہیں ہو سکی۔ اس کے گھر سے پتا چلا کہ وہ ایک دن کے لیے اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ آل پاکستان پیپرز پبلشرز کی کوئی ضروری میٹنگ ہو رہی ہے وہاں۔ وہ کل دوپہر کے بعد واپس کراچی آئے گا۔"

"اوہ!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

وہ جلدی سے بولا "وجدان! تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے بارے میں کنفرم نہیں تھا ورنہ منہاس کے گھر والوں کو تمہارے بارے میں ہدایات دے دیتا۔ تم اگر کہو تو میں ابھی فون پر ان سے بات کر لیتا ہوں۔ ہمارے درمیان فیملی ٹرمز ہیں۔ تمہیں منہاس کی غیر موجودی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ میں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہوں۔ کل منہاس باقر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے آپ اس کے گھر والوں کو ہماری آمد کی اطلاع دینا چاہیں تو کوئی حرج نہیں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" وہ متحمل انداز میں بولا "میں انہیں فون کر دیتا ہوں۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بے تکلفی سے کہا "وجدان! تم جتنے نظر آتے ہو اس سے کہیں زیادہ چھپے ہوئے ہو۔ انشاءاللہ بہت جلد ہماری ملاقات ہو گی۔"

میں نے مذاق کے انداز میں کہا "گویا آپ مجھے چھپا رستم کہہ رہے ہیں!"

"بالکل! میں یہی کہہ رہا ہوں۔" وہ قطعیت سے بولا "اور سنو' جب تک ہمارے درمیان تکلفات کی دیوار رہے گی' تم میرے سامنے کھل نہیں سکو گے لہٰذا اس دیوار کو ابھی اور اسی وقت گرا دو۔ جب میں تمہیں "تم" سے مخاطب کرتا ہوں تو تم مجھے "آپ" کہہ کر کیوں بات کرتے ہو؟"

"میں تو عمر کے تفاوت کی وجہ سے آپ کو احتراماً..." میں کسی پرسکون اور صاف ستھری جگہ پر قیام کرنا چاہتا کہتا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت دی۔

"ورنہ اس میں تکلف والی تو کوئی بات نہیں۔" "پھر تو بوٹا سنگھ والا ہوٹل مناسب نہیں۔" میر بخش نے میں بولا۔

"بس' میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔" وہ دو ٹوک تاسفانہ انداز میں کہا "وہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل ہے۔ میں آپ کو ایک انتہائی معیاری اور صاف ستھرے

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اوکے..... میں ہوٹل میں لے چلوں گا۔" میں نے کہا "ہوٹل جانے سے پہلے میں ایک ضروری گیا۔"

"صرف سمجھ ہی نہیں گئے' آئندہ اس کا خیال بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔" دونوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میں اس وقت گے!"

"اوکے..... اوکے۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا بین الاقوامی معیار کے ڈپارٹمنٹل اسٹور کو دیکھ رہا تھا۔ بعض مزید دو چار باتوں کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔ کے تو نام بھی انٹرنیشنل تھے۔ ساحل نے پوچھا "وجدان! کیا تم یہ ڈپارٹمنٹل اسٹور خریدنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" وہ باقاعدہ میری نگاہ کا تعاقب کر رہی تھی۔

ہم اس وقت بہادر آباد کے سب سے زیادہ ہارڈ علاقے میں تھے۔ ریسٹورنٹ سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے کہا "اسٹور نہ سہی مگر اسٹور کے اندر رکھی ساحل اور میر بخش کو قاضی سلطان سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو کے بارے میں بتا دیا تھا۔ چیزیں تو خریدی جا سکتی ہیں۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! اگر اس بات کا پہلے پتا چلتا تو تو تمہارا شاپنگ کا ارادہ ہے؟" وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں' بالکل یہی ارادہ ہے۔" میں نے کہا "ہم تینوں جاتا تو ہم بوٹا سنگھ کے ساتھ صدر چلے جاتے۔ اگر ہوٹل اس وقت خالی ہیں۔ سامان کے نام پر ہمارے پاس کوئی چیز رات گزارنا ہے تو ہم بھی اپنا انتظام وہیں کر لیتے۔" نہیں۔ یہ شاپنگ ناگزیر ہے۔"

"اگر پہلے سے انسان کو ہر بات کا پتا چل جائے تو پھر ہم تینوں ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں گھس گئے۔ میں مسئلہ ہی کیا ہے؟" میں نے سڑک کے کنارے ایک جانے اپنے' ساحل اور میر بخش کے لیے دو دو جوڑے کپڑے چلتے ہوئے کہا "کیا ہم یہ بات جانتے تھے کہ سفید شیراز خریدے۔ چند آرام دہ جوتے بھی لیے۔ دو سفری بیگ بھی پیچھا چھڑانے کے دوران میں ہم "سی ایف کے" والوں۔ لیے۔ روزمرہ استعمال کی چند اشیا بھی لی گئیں۔ ہم نے اپنے ملاقات کریں گے!"

وہ بولا "سائیں! یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اور ساحل کا سامان ایک بیگ میں بھر لیا جب کہ دوسرے میر بخش اپنے سابق آقا اکبر سومرو کے ساتھ کراچی بیگ میں میر بخش کا سامان رکھ کر وہ بیگ اس کے حوالے کر رہتا تھا۔ وہ اس بارے میں مجھے تفصیلاً بتا چکا تھا۔ میں نے دیا۔

اس سے پوچھا "صدر کے علاقے میں بوٹا سنگھ جس ہوٹل میں ٹھہرے گا' کیا اس کے علاوہ بھی وہاں اور ہوٹل ہیں؟" جب ہم ڈپارٹمنٹل اسٹور سے باہر آئے تو میں نے میر بخش کو الجھن کا شکار پایا "کیا بات ہے میر بخش! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"بہت سے ہیں۔" اس نے بتایا "صدر میں ہر معیار کے ہوٹل ہیں۔"

ساحل نے پوچھا "کیا اب ہم صدر جائیں گے؟" وہ تامل کرتے ہوئے بولا "آپ نے اس بیگ میں جو کپڑے ڈالے ہیں' وہ میرے لیے خریدے ہیں نا!" ساتھ ہی "ظاہر ہے' ہمیں پہلے رات گزارنے کا بندوبست کرنا ہے۔" میں نے کہا "اس کے بعد باقی باتیں سوچیں گے۔"

اس نے اپنے ہاتھ میں موجود بیگ کو تھپتھپایا۔

"یہ ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "اب تو آپ تمہاری لی گئی ہے تو یہ دونوں جوڑے تمہارے لیے ہی ہوں گے نا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا "سائیں! میں نے زندگی میں کبھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی۔ یہ تو....."

وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی الجھن بے جا تھی۔ میں نے اس کے استعمال کے لیے دو پتلونیں اور شرٹس خریدی تھیں۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "میر بخش! تم نے اگر زندگی میں کبھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی تو کیا ہوا' اب پہن لو۔ کوئی بھی نیا کام انسان پہلی مرتبہ کرتا ہے' پھر کرتا چلا جاتا ہے۔"

"مم..... مگر میں اس لباس کا عادی نہیں ہوں!"

"کبھی تم اس لباس کے بھی عادی نہیں تھے۔" میں نے اس کے بدن پر موجود گہرے نیلے شلوار قمیص کی جانب اشارہ کیا۔ پیدائش کے وقت انسان بے لباس ہوتا ہے۔ پیدائش کے فوراً بعد اسے نیپکن جیسا لباس میسر آتا ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لباس کے رنگ ڈھنگ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ایک اختیاری عمل ہے اور اس میں تبدیلی ناممکن نہیں ہے۔" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میر بخش! تم نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ہے اس لیے تمہیں اپنے اسٹائل میں تبدیلی لانا چاہیے اور اس کے لیے گیٹ اپ کی تبدیلی سرفہرست ہے۔ یہ ٹھیک ہے' تم پینٹ شرٹ جیسے لباس کے عادی نہیں ہو لیکن جب پہننے لگو گے تو رفتہ رفتہ یہی تمہارا پسندیدہ بن جائے گا۔ دراصل' پتلون قمیص میں بندہ زیادہ اسمارٹ اور چست دکھائی دیتا ہے۔"

وہ میری باتوں سے قائل ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی اور سیدھے صدر پہنچ گئے۔

میر بخش کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا' صدر کراچی کا بڑا گنجان آباد اور مصروف کاروباری علاقہ تھا تاہم اس کی راہ نمائی میں ڈرائیور نے جس ہوٹل کے سامنے ٹیکسی روکی' وہاں رش بہت زیادہ نہیں تھا۔ وہ علاقہ بھی صاف ستھرا اور معیاری تھا۔ ہوٹل کی عمارت متاثر کن اور مناسب تھی۔

ہمارے پاس شناختی کارڈ یا اور کوئی ایسی دستاویز نہیں تھی جس سے ہماری شناخت ہو سکتی لہٰذا ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے چند دوسرے ہنر اور کچھ اضافی رقم خرچ کرنا پڑی۔ میں نے اپنے اور ساحل کے لیے ڈبل بیڈ روم اور میر

بخش کے لیے سنگل بیڈ حاصل کرلیا' تاہم ہمارے کمرے دو مختلف فلورز پر تھے۔ میر بخش تیسرے فلور کے کمرا نمبر دو میں تھا اور ہم دونوں دوسرے فلور کے کمرا نمبر ایک میں۔ ہوٹل کے رجسٹر میں' میں نے اپنا نام جاوید' ساحل کا نام بیلا اور میر بخش کا نام فرید درج کروایا تھا۔

جب ہوٹل پہنچے تو سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد شام ہونے والی تھی۔ ہم نے اپنے کمروں میں پہنچ کر لباس تبدیل کیے اور فریش اپ ہو کر ایک ہی کمرے میں بیٹھ گئے۔ میر بخش نے زندگی میں پہلی مرتبہ پتلون شرٹ پہنی تھی اس لیے عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا اور پندرہ بیس منٹ اسے نشست و برخاست کے ادب و آداب سکھاتا رہا۔ شام کی چائے بھی ہم نے روم سروس کے ذریعے کمرے ہی میں منگوا کر پی' پھر ہمارے درمیان تازہ ترین حالات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ اس وقت ہمارے درمیان صرف دو ہی موضوع زیر بحث تھے۔ نمبر ایک چوہدری نوازش علی اور اس کے گرگے۔ نمبر دو خدائی فوج داری کی دعوے دار تنظیم "سی ایف کے"

میرے ذہن میں بار بار نیلگری کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے مجھے اطلاع دی تھی' چوہدری نوازش علی نے اپنے کراچی کے نیٹ ورک کو سخت ہدایات دی ہیں کہ بوٹا سنگھ سے ہر صورت وہ ڈائری حاصل کی جائے چاہے ڈائری کے حصول کے لیے اس کی جان بھی لینا پڑے۔ وہ کسی بھی طور اسٹیشن سے نکل کر گارڈن ویسٹ تک نہیں پہنچ پائے۔ علاوہ ازیں وجدان کو یعنی مجھے کسی بھی قیمت پر لاہور نہ پہنچنے دیا جائے۔ نیلگری نے آخر الذکر چوہدری کی ہدایت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا' وجدان! اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے' چوہدری تم سے بے حد خوف زدہ ہے۔ میں نیلگری کی فراہم کردہ اطلاعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مجھے خاموش پا کر ساحل نے پوچھا "وجدان! تم کن خیالوں میں گم ہو؟"

میں نے اپنے ذہن میں موجودہ خیالات سے انہیں آگاہ کیا اور کہا "چوہدری نوازش علی تو واقعی بہت پہنچ والا ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی جاری کردہ ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے' وہ جانتا ہے' بوٹا سنگھ کراچی میں گارڈن ویسٹ کے علاقے میں قیام کرنے والا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میں انٹرپیئر سے سیدھا کراچی پہنچوں گا اس لیے مجھے کراچی سے لاہور نہ پہنچنے دیا جائے۔"

"ہاں سائیں! چوہدری بڑا باخبر بندہ لگتا ہے۔" میر بخش نے کہا "کیوں کہ کل رات تک تو ہم نبی سر میں قاضی سلطان کی حویلی میں تھے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے' چوہدری نواز کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہے جس سے وہ تازہ ترین معلومات حاصل کرلیتا ہے۔"

میں نے کہا "چوہدری تو کوئی جادو جانتا ہے یا نہیں لیکن نیلگری بہت بڑی ساحرہ ہے۔ وہ مستقبل کے بارے میں بہت دور تک جان سکتی ہے۔ وہ بے پناہ شکتیوں کی مالک ہے۔ میں اس کے لاتعداد کمالات کا عینی شاہد ہوں۔ چوہدری اور اس کے بندوں کے بارے میں فراہم کردہ اطلاعات نیلگری کی شکتیاں بھی یقیناً کام کر رہی ہوں گی۔ وہ الٹی کرنی والی ہستی ہے۔"

"ویسے بھی جب تمہارا دشمن نوازش علی اتنا سنڈیکیٹ چلا رہا ہے جس کی پہنچ لاہور سے کراچی اور پھر سنگاپور' بنکاک اور انڈیا و نیپال تک ہے تو پھر اسے انتہائی پہنچ والا ہونا ہی چاہیے۔" ساحل نے سنجیدہ لہجے میں کہا "اسے معلوم ہو گیا تھا کہ تم غیر قانونی طور پر میرے ساتھ انڈیا سے پاکستان میں داخل ہونے والے ہو۔ تارا ہمارے "استقبال" کے لیے ہی لاہور سے عمر کوٹ پہنچا تھا اور ہمارے ہاتھ پاؤں توڑ کر ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔"

"شاید اسے وجدان سائیں کی طاقت کا پورا طور اندازہ نہیں تھا۔" میر بخش نے کہا "ورنہ وہ اپنے احکام میں تبدیلی نہ لاتا۔ تارا کو اس نے اس لیے عمر کوٹ بھیجا تھا کہ آپ لوگوں کو بے بس کر کے اپنے ساتھ "رکھاں والی" لے جائے۔ اب وہ کراچی میں موجود اپنے نیٹ ورک کو ہدایات دے رہا ہے کہ وجدان سائیں کو لاہور آنے سے روکا جائے۔"

میں نے کہا "چوہدری دراصل یہ چاہتا ہے کہ جب تک وہ گمشدہ سونے تک نہ پہنچ جائے' مجھے اس وقت تک لاہور نہ آنے دیا جائے۔ سونے کا حصول اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آج سے لگ بھگ بیس سال پہلے اس سونے کی مالیت کم و بیش پانچ کروڑ روپے تھی۔ آج کے نرخ کے مطابق تو یہ قیمت پچیس کروڑ روپے تک پہنچ جائے گی۔ یعنی پانچ گنا زیادہ۔"

"چوتھائی ارب روپے بہت بڑی رقم ہوتی ہے سائیں!" میر بخش دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "اور اس بھاری مالیت کے سونے کا راز جس ڈائری میں رقم ہے وہ میرے قبضے میں ہے اسی لیے تو ڈائری کے حصول کی خاطر چوہدری کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام اس سے روٹھ گیا ہے۔"

"میں تو بوٹا سنگھ کے ضبط اور حوصلے کی داد دیتی ہوں۔" ساحل نے کہا "وہ اتنے عرصے سے اس قیمتی راز کی حفاظت کرتا رہا اور اس دوران میں اس کے ذہن میں خیانت کا خیال نہیں آیا وہ چاہتا تو خود بھی اس سونے کے حصول کی کوشش کر سکتا تھا۔"

"اس میں بوٹا سنگھ کے صبر' ضبط یا ایمان داری کا کوئی دخل نہیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "پہلی بات تو یہ کہ مذکورہ ڈائری کچھ عرصہ پہلے ہی اس کے پاس پہنچی تھی۔ اپنی موت سے چند روز قبل خشونت سنگھ نے ڈائری بوٹا سنگھ کو لاہور بھجوا دی تھی۔ اس ریفرنس کے ساتھ کہ میں کبھی لاہور آ کر اس سے یہ ڈائری حاصل کرلوں گا۔ گولڈن ٹرائی اینگل سے واپسی پر سنگاپور میں میری ملاقات خشونت سنگھ آں جہانی کی بیٹی ارملا سے ہوئی۔ اسی کی زبانی مجھے ڈائری کے بارے میں پتا چلا تھا۔ ورنہ میری یادداشت کے مطابق تو وہ ڈائری چاچا پرتاب سنگھ نے سنگاپور چھوڑنے سے پہلے اپنے دوست خشونت سنگھ کو دی تھی اور اسی کے پاس ہونا بھی چاہیے تھی۔"

پرتاب سنگھ کے ذکر پر میری آواز بوجھل ہو گئی۔ میں نے اپنے دل میں چاچا پرتاب کے لیے درد کی ایک لہر سی اٹھتی محسوس کی۔ پرتاب سنگھ میرے باپ عابد علی کا سچا دوست تھا۔ والدین کے بہیمانہ قتل کے بعد اسی شخص نے مجھے سنبھالا دیا تھا۔ اس وقت میں بارہ سال کا تھا اور نا پختہ کار بھی۔ دارا اینڈ کمپنی وحشی درندوں کے مانند میرے تعاقب میں تھے۔ وہ سنگاپور کے چپے چپے پر میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ چاچا پرتاب سنگھ نے مجھے سنگاپور سے ملائیشیا اور پھر ملائیشیا سے بنکاک (تھائی لینڈ) پہنچایا تھا۔ وہ مجھے مارشل آرٹس کی دنیا میں ایک دیو مہاراج وانگ ونگ یائے کے جمنازیم تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی بلیک بیلٹ تھا اور چاہتا تھا کہ میں بھی اپنے دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ان فنون میں مہارت حاصل کروں۔ میرے تعاقب میں آنے والے دشمنوں نے چاچا پرتاب سنگھ کو مہاراج کے جمنازیم "وائٹ ٹریمٹ" کے احاطے میں بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا تاہم چاچا کی خواہش کے مطابق میں نے مارشل آرٹس میں نہ صرف مہارت حاصل کی بلکہ ان فنون کی دنیا کی سب سے بڑی تربیت گاہ "شاؤلن ٹیمپل" میں یادگار ریکارڈ بھی قائم کیے۔ اب نہ چاچا پرتاب سنگھ زندہ تھا اور نہ مہاراج وانگ ونگ یائے اور نہ ہی میرا استاد ماسٹر ہنگ پائی۔ صرف ان لوگوں کی یادیں باقی ہیں۔ یادیں بہت تڑپاتی ہیں' میں بھی اپنے ان محسنوں کے خیال سے خاصا رنجیدہ اور ملول ہو گیا۔

ساحل نے پوچھا "وجدان! تم نے اپنی بات مکمل نہیں کی؟"

میں نے افسردگی کی کیفیت سے باہر آتے ہوئے کہا "میں آپ لوگوں کو بتا رہا تھا' سنگاپور میں' آخری ملاقات کے دوران میں ارملا کور نے بوٹا سنگھ کا لاہور کا ایڈریس مجھے دیتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ خشونت سنگھ نے بوٹا سنگھ کو سونے والے راز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اس لیے بوٹا اس ڈائری کی اصل اہمیت سے آگاہ نہیں۔ وہ اسے میری خاندانی یادداشتوں کا ایک مجموعہ سمجھتا ہے۔ یہ ممکن ہے' بوٹا نے ڈائری کو کھول کر کبھی پڑھا بھی ہو مگر راز کی باتیں رازدارانہ انداز ہی میں رقم کی گئی ہیں۔ کوئی بھی غیر متعلق شخص اس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی مدد سے اس متروک کنوئیں تک پہنچ سکتا ہے جس کے اندر میرے والد صاحب نے سونے کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے کینوس کے دو بڑے تھیلے پھینکے تھے البتہ....." میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "چوہدری نوازش علی ایسا آدمی ہے' جو مذکورہ متروک کنوئیں کا کھوج لگا سکتا ہے بہ شرط یہ کہ ڈائری اس کے ہتھے چڑھ جائے۔"

"اور یہ ڈائری اس وقت تمہارے ہتھے چڑھی ہوئی ہے۔" ساحل نے کہا "تم کسی بھی حال میں ڈائری کو چوہدری تک نہیں پہنچنے دو گے۔"

"یقیناً ایسی ہی بات ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

میر بخش بولا "سائیں! سی ایف کے آدمی امتیاز نے بتایا تھا کہ سفید شیرڈ والے موٹے کا سرغنہ کوئی میاں زاہد نامی شخص ہے۔ اگر وہی شخص چوہدری نوازش علی کے نیٹ ورک کو آپریٹ کر رہا ہے تو پھر وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ چوہدری کے احکام بہت سخت ہیں۔ ان لوگوں نے ہر قیمت پر یہ ڈائری حاصل کرنا ہے اور آپ کو لاہور جانے سے روکنا ہے۔ ممکن ہے' میاں زاہد حسین ہمیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔"

"اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ وہ ہمیں ٹریس کر چکا ہو۔" ساحل نے گمبھیر آواز میں کہا "اور اس وقت وہ ہماری کڑی نگرانی کر رہا ہو۔"

میں نے کہا "یہ سب کچھ ممکنات میں سے ہیں۔ ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"ہم سے زیادہ بوٹا سنگھ کو احتیاط کی ضرورت ہے۔" میر بخش نے کہا "چوہدری کے بندوں کا اصل ٹارگٹ تو وہی تھا۔"

میں نے میر بخش کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جرائم پیشہ افراد سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ اگر وہ لوگ ہمیں ٹریس کرنے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں تو پھر بوٹا سنگھ جیسے ہی ان کی نظر میں آئے گا' وہ اس کے ساتھ خاصا "یادگار" سلوک کریں گے۔"

"وجدان! کیا ہم چوہدری کے بندوں کے خوف سے ہوٹل کے اس کمرے ہی میں دبکے بیٹھے رہیں گے؟" ساحل نے اکتاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"یہ بات کس نے کہہ دی؟" الٹا میں نے اس سے سوال کردیا۔

"ہم اس وقت جس نوعیت کی گفتگو کر رہے ہیں اس سے تو ایسا ہی تاثر ملتا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔

میں نے کہا "ہرگز میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ ہم کان لپیٹ کر ہوٹل کے اس کمرے تک محدود ہو جائیں۔ میری ساری زندگی خطرناک مجرموں سے پنجہ آزمائی میں گزری ہے۔ میں نے کبھی پس پائی اختیار کی ہے اور نہ ہی ڈیفنسیو کھیلا ہے۔ میں نے ہمیشہ آگے بڑھ کر دشمن پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہاں زاہد حسین جیسے دو ٹکے کے مجرم میرے سامنے کیا بیچتے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "ہم ابھی ہوٹل سے نکلیں گے۔ رات کا کھانا ہم باہر کسی ریسٹورنٹ میں کھائیں گے اور تھوڑی سیر و تفریح کے بعد واپس آجائیں گے۔"

ساحل نے کہا "اور واپسی میں پکچر بھی دیکھتے ہوئے آئیں گے' ٹھیک ہے؟"

ساحل کی زندگی کا زیادہ حصہ کھٹمنڈو کے ایک دور دراز علاقے میں گزرا تھا اور وہ بھی ایک عبادت گاہ میں۔ اس نے بہت محدود زندگی گزاری تھی۔ میں نے بھی اس بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں چند روز قیام کیا تھا۔ اس علاقے میں دریا پر جانے کے سوا کوئی تفریح نہیں تھی۔ ساحل جب ہمارے ساتھ نیپال سے انڈیا پہنچی تو ایک جہانِ حیرت اس کے سامنے تھا۔ اسی دوران میں چار مرتبہ اسے سنیما جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ ہال میں بیٹھ کر پکچر دیکھنے کا تجربہ اسے بھایا اور جب بھی ہم کسی تفریح کا ذکر کرتے تو وہ مچل کر یہی کہتی "پکچر بھی دیکھیں گے۔"

اور ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر بچپنا جھلکتا تھا۔ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا۔ ہمیں فلم کو بیچ میں چھوڑ کر جیسا کہ اس وقت نظر آرہا تھا۔ وہ بولتی ہوئی آنکھیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک معصوم صورت لڑکی تھی۔ شرارت اور چنچلتا ہوا کچھ یوں کہ فلم شروع ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ساحل نے اچانک پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ میں نے کوٹ کر اس کے انگ انگ میں بھری تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور کہا "ٹھیک ہے۔ اس سے پوچھا "کیا ہوا ساحل؟"

"میرے سر پر اس کا پاؤں لگا ہے۔" وہ پچھلی رو میں پکچر بھی دیکھیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم تیار ہو کر ہوٹل سے باہر نکل بیٹھے ہوئے شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

ہوٹل کے زینے اترنے کے دوران میں میر بخش نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ "سائیں! اگر آپ اجازت دیں تو ذرا بوٹا سنگھ کو بھی دیکھ آئے اپنے دونوں پاؤں کو ساحل والی سیٹ کی پشت گاہ پر ہیں۔"

لگائے فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس بے ہودہ انداز نے مجھے "ضرور' ضرور۔" میں نے کہا اور اس کی معینہ کھولا کر رکھ دیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

ایک جانب قدم بڑھا دیے۔ "مسٹر! یہاں سے اپنے پاؤں ہٹالو۔"

جس ہوٹل میں بوٹا سنگھ کو قیام کرنا تھا۔ وہ ہمارے وہ مجھے گھور کر رہ گیا تاہم اس نے پاؤں ہٹا لیے۔ معاملہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ دو تین گلیاں گھومنے کے بعد رفع دفع ہو گیا۔ ہم دوبارہ فلم دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس ہوٹل تک پہنچ گئے۔ استقبالیہ سے بوٹا کے بارے تھوڑی ہی دیر بعد عقبی جانب سے عامیانہ قسم کے جملوں کی استفسار کیا تو پتا چلا' محمد بوٹا نامی ایک مہمان آج ہوٹل آوازیں میری سماعت تک پہنچنے لگیں۔ ہم (ROW_B) کی کر ٹھہرا تو ہے مگر وہ اس وقت کمرے میں موجود نہیں سیٹ نمبر ایک' دو اور تین پر بیٹھے تھے۔ ساحل کی سیٹ کا نمبر کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ بوٹا ہوٹل کے کرایک تھا اور وہ قطار کے کنارے پر تھی۔ میں دو نمبر سیٹ پر تھا ایک سوو میں ٹھہرا ہے۔ فی الحال بوٹا سنگھ سے ملاقات اور میر بخش میرے برابر سیٹ نمبر تین پر بیٹھا تھا۔ میں نے ہو سکتی تھی تاہم یہ اہم بات معلوم ہو گئی کہ وہ یہاں بالکل جس شخص کو تنبیہہ کی تھی وہ (ROW-A) کی سیٹ نمبر تھا' نہ کہ بوٹا سنگھ! ایک پر تھا۔ اب وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے افراد سے بڑے

میں نے ایک بک اسٹال سے کراچی کا میپ اور گھٹیا انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ نشانہ ساحل کی ذات تھی۔ گائیڈ بک خریدی۔ یہ دونوں چیزیں انگریزی میں تھیں اور اس قسم کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ایسے میں کراچی کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا تھا۔ بد اخلاق تماش بین میری نظر سے کبھی گزرے تھے۔

سنگاپور میں اپنی تعلیم کے دوران میں انگلش اور مینڈ بات اگر ان کی جملہ بازی تک محدود رہتی تو ممکن ہے' میں برداشت کر جاتا لیکن اس وقت تو میں صبر کا دامن اپنے (MANDARIN) زبان سیکھی تھی۔ "مینڈرن" لکھنے ہاتھ سے چھوٹنے پر مجبور ہو گیا جب ساحل اچانک اپنی سیٹ حضرات و خواتین کی زبان ہے۔ آپ اسے تعلیم یافتہ سے اٹھی اور پیچھے مڑتے ہوئے نہایت ہی سخت الفاظ میں افراد کی زبان سمجھ لیں۔ گھر میں والد اور والدہ اردو اور اس نے عقب میں بیٹھے شخص سے کہا "اسٹوپڈ۔" بھی سکھاتے رہتے کہ یہ ہماری روایت اور کلچر کا حصہ میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس بد تمیز ہندوستان میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے دوران میں شخص کی جانب قہر آلود نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا "لگتا ہے' تم بھاشا (ہندی زبان) بھی لکھنا' پڑھنا اور بولنا آگئی تھی۔ شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔ تمہیں کوئی اور ہی سبق پڑھانا اور ہندی بول چال میں زیادہ فرق نہیں۔ تاہم میں کسی معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ انگلش زبان پڑے گا۔"

کتابوں کو زیادہ معتبر اور مستند سمجھتا تھا۔ ساحل نے کہا "وجدان! اس کمینے نے میری گردن پر ہاتھ لگایا ہے۔"

ہم صدر کے علاقے میں کافی دیر تک گھومتے رہے ہماری باتیں سن کر دوسرے تماش بین بھی ہماری جانب ہم نے ایک چینی ریسٹورنٹ میں کیا اور فلم دیکھنے کے متوجہ ہو گئے اور مڑ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ بندر روڈ کے ایک سنیما میں گھس گئے۔ مذکورہ سنیما میں

میں نے اس شخص سے استفسار کیا "تمہیں کون سی چیز کھٹکنے نہیں دے رہی ہے؟"

"زیادہ بکواس نہیں کرو۔" وہ الٹا مجھے آنکھیں دکھانے لگا "خاموشی سے بیٹھ کر فلم دیکھو اور ہمیں بھی دیکھنے دو۔"

اس کے رویے نے مجھے سلگا کر رکھ دیا۔ میں نے کہا "میں انتظامیہ سے تمہاری شکایت کرتا ہوں۔ پتا نہیں' کیسے کیسے جانوروں کو یہ سنیما والے اندر گھسنے دیتے ہیں۔"

"جانور کس کو بولا؟" بد تمیز شخص کے ساتھی نے مجھ پر مُکا تانتے ہوئے کہا۔ وہ بالکل میرے عقب میں تھا۔

میں نے کہا "تم لوگوں کو۔۔۔ اور کس کو؟"

"اس کا مطلب ہے' تمہیں مزہ چکھانا ہی پڑے گا۔" ان کے تیسرے ساتھی نے کہا اور بات ختم کرتے ہی میرے چہرے پر گھونسا مارنے کی کوشش کی۔

کوشش ان معنوں میں کہ جب اس کا گھونسا میرے چہرے کے مقام پر پہنچا تو چہرہ وہاں سے ہٹ چکا تھا ورنہ اس نے نشانہ تو باندھ کر وار کیا تھا۔ میں نے شولڈر ٹرن کا استعمال کرتے ہوئے اپنا چہرہ ایک جانب جھٹک دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی جوابی حملہ ضروری ہو گیا۔

میں نے حملہ آور کے شانے کو گرفت میں لیا اور دوسرا ہاتھ اس کے گریبان میں ڈال کر' بیک تھرو (THROW BACK) کے انداز میں دور پھینک دیا۔ وہ گیلری کی بالکل اختتامی ROW میں جا کر گرا۔ اس کے بعد تو وہاں ایک مل چل مچ گئی۔ باقی دو افراد ہم پر پل پڑے۔

میرے حصے میں وہ آیا جس نے دو مرتبہ ساحل سے بد تمیزی کی تھی۔ وہ بالکل دیسی انداز میں مجھ پر حملے کر رہا تھا۔ دوسرے حملہ آور کو میر بخش نے سنبھال لیا اور اس کی ٹھیک ٹھاک درگت بنانے لگا۔

میں اپنے مدِمقابل کے حملوں کے جواب میں اسٹریٹ فائٹ کے گر آزما رہا تھا۔ بہت ہی محدود جگہ پر اگر بالکل رف فائٹ کرنا ہو تو یہ گر بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں' میں نے اپنے مقابل شخص کے منہ ناک سے خون چھڑا دیا۔ اس کا چہرہ بڑا وحشت ناک منظر پیش کرنے لگا۔ میر بخش نے اپنے حصے میں آئے ہوئے شکار کو کھینچ کر اپنے قدموں میں چت گرڈالا تھا اور اس کے چہرے و سینے پر گھونسے برسا رہا تھا۔

یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ سنیما کی انتظامیہ کو اس کی خبر نہ ہوتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنیما کی لائٹس آن کر دی گئیں۔ فلم کو روک دیا گیا۔ پوری گیلری کے تماش بین ہمیں اپنا مرکزِ نگاہ

بنائے ہوئے تھے۔ انتظامیہ کے چار بٹے کٹے گراں ڈیل افراد ہمارے پاس آئے اور اس بدامنی کا سبب دریافت کرنے لگے۔

میں نے اور ساحل نے انتظامیہ کو ان لوگوں کی "حرکتوں" کے بارے میں بتایا۔ دو افراد نے ہم سے مار کھانے والوں کو اپنے قابو میں کرلیا۔ ان کا تیسرا ساتھی کہیں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کے بعد لگتا تھا وہ خاموشی سے کہیں دبک کر بیٹھ گیا تھا یا پھر وہاں سے کھسک لیا تھا۔

ہم تینوں بھی انتظامیہ کے افراد کے ساتھ سنیما منیجر کے کمرے میں پہنچے۔ منیجر کو جب صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا تو وہ ہم سے معذرت کرنے لگا۔

"سر! میں بہت شرمندہ ہوں۔" اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "لیکن یقین جانیں' اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ اندر جاکر شرافت کا مظاہرہ کرے گا یا بدتمیزی پر اتر آئے گا۔ میں ایک مرتبہ پھر اس واقعے پر آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ آپ کو بہت کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔"

میں نے برہمی سے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ کسی کی پیشانی پر اس کے شریف یا بدمعاش ہونے کا ٹھپا نہیں لگا ہوتا مگر آپ یہ تو کرسکتے ہیں کہ ہال میں موجود لوگوں کو لچر قسم کے فقرے بازی اور ہلے گلے کی حرکتوں سے باز رکھ سکیں۔ یقین کریں' فلم کی آواز کم اور تماشائیوں کے تبصرے زیادہ سننے کو ملتے ہیں۔"

"آپ کا اعتراض اور شکایت جائز ہے سر!" سنیما منیجر نے کہا "مگر کیا کریں' اس قسم کے رویے اور سرگرمیاں یہاں کے لوگوں کا مزاج بن چکا ہے۔ شاید آپ پہلی مرتبہ سنیما میں پکچر دیکھنے آئے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں نے دنیا کے بہترین پکچر ہاؤس میں فلمیں دیکھی ہیں البتہ پاکستان میں یہ میرا پہلا تجربہ تھا جو بڑا تلخ ثابت ہوا۔"

منیجر نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ میں ان بدمعاشوں کو پولیس کے حوالے کردوں گا۔ آپ اپنی سیٹوں پر جاکر بیٹھیں تاکہ فلم چلائی جاسکے۔ دوسرے تماشائی بھی خاصا شور مچا رہے ہیں اور میں ایک مرتبہ پھر آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔"

اس واقعے نے طبیعت کو مکدر کردیا تھا۔ میں نے بیزاری سے کہا "آپ فلم شروع کردیں تاکہ دوسرے تماشائیوں کا حرج نہ ہو۔ وہ یہاں تفریح کے لیے آئے ہیں ان کا مزہ کنکریلا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم تو اب واپس جائیں گے۔"

سنیما منیجر کوئی بہت ہی شریف النفس انسان تھا۔ ہمارے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی اس نے ہمارے ٹکٹ کی ادا شدہ رقم واپس کردی۔ ہم تینوں سنیما ہاؤس کی عمارت سے نکل کر باہر آئے اور پیدل ہی ایک جانب چلنے لگے۔

میر بخش نے کہا "سائیں! لگتا ہے' آج کا دن ایسے واقعات کے لیے ہے۔"

"لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔" ساحل نے اس کی تائید کی۔

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی' رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اگر ہم سنیما کے اندر بیٹھے ہوتے اور یہ ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آتا تو اب تک ہم آدھی سے زیادہ فلم دیکھ چکے ہوتے۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا۔

"اور گھومنا پھرنا ہے یا واپس چلیں؟"

ان دونوں نے واپس ہوٹل جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہاں سے ہمارا ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ میر بخش نے کہا "سائیں! کسی ٹیکسی کو روکا جائے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے حتمی لہجے میں "ہم ٹہلتے ہوئے چلیں گے البتہ۔" میں نے ساحل کی جانب دیکھا اور پوچھا "تمہیں پیدل چلنے میں کوئی دشواری تو نہیں پیش آرہی ہے؟"

"بالکل نہیں' میں اپنے پاؤں کو بالکل ٹھیک محسوس کررہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے میر بخش کی طرف دیکھا۔ میری نظر کا مطلب سمجھ گیا' جلدی سے بولا "اللہ سائیں! مجھے لاکھ لاکھ شکر ہے سائیں! میرا بازو بھی بھلا چنگا ہے۔ میں نے کوئی تکلیف محسوس نہیں کررہا۔"

"ڈاکٹر نے دو دن بعد پٹی بدلنے کو کہا تھا۔" میں نے اس کے بازو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "کل صبح میں تمہاری ڈریسنگ چینج کروں گا۔"

"آپ سائیں؟" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا "کیا آپ ڈاکٹری بھی جانتے ہو؟"

میرے بجائے ساحل نے جواب دیا "میر بخش! مرہم پٹی کے لیے باقاعدہ ڈاکٹری جاننا ضروری نہیں' بلکہ انسان کمپاؤنڈر ہونا بھی شرط نہیں' بس میڈیکل اور فرسٹ ایڈ کی آگاہی کافی ہے۔ ویسے اپنے وجدان صاحب تو جانے کیا آخری جملہ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ادا کیا تھا۔ اس کی نظر میں معنی خیزی اور انداز میں شرارت کی جھلک تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔۔۔ جانتے ہیں!"

نہیں جانتے تو صرف یہ نہیں جانتے کہ میرے دل کا کیا حال ہے؟ اور اگر جانتے ہیں تو اپنے رویے سے ظاہر نہیں ہونے دیتے یا تو انہیں جذبات کا اظہار نہیں آتا یا پھر جذبات سے خالی ہیں۔ سپاٹ' بے نیاز۔۔۔ پتھر کے صنم۔۔۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا! پتا نہیں' یہ شخص کیا چیز ہے؟

میں نے ساحل کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور ایک میڈیکل اسٹور میں داخل ہوگیا۔ اب ہم صدر کے اندرونی حصے میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے اسٹور والے سے ہائیڈروجن پر آکسائیڈ' کاٹن رول' بینڈیج کا چھوٹا پیکٹ اور ایک اینٹی سیپٹک آئنٹ منٹ خرید لیا۔ ازیں علاوہ پین کلر ٹیبلٹس کا ایک اسٹرپ بھی لے لیا تاکہ کسی بھی ہنگامی ضرورت کے وقت یہ اشیا کام آسکیں۔

میں نے میڈیکل اسٹور سے باہر آنے کے بعد کہا "میر بخش! اپنے ہوٹل میں جانے سے پہلے ہم ایک مرتبہ بوٹا سنگھ کو چیک کرلیں تو اچھا ہے۔"

اس نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور ہم تینوں بوٹا سنگھ والے ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں کے استقبالیہ سے معلوم ہوا کہ محمد بوٹا اپنے کمرے میں موجود ہے۔ میں نے اس کے کمرے میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو استقبالیہ کلرک نے کہا۔

"میں پہلے ان سے پوچھ لوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

اصلی نام بتانا ضروری تھا ورنہ بوٹا سنگھ الجھن میں پڑ جاتا۔ میں نے اپنا نام وجدان بتایا تو کلرک نے انٹر کام پر بوٹا سنگھ کے کمرے سے رابطہ کیا۔ ایک منٹ تک وہ ریسیور کان سے لگائے رہا پھر قدرے مایوسی سے بولا۔

"جناب! دوسری جانب کوئی اٹینڈ نہیں کررہا۔ لگتا ہے' مہمان سو چکا ہے۔"

اس بات کا امکان تو تھا کیوں کہ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے اور بوٹا سنگھ آج جن اعصاب شکن حالات سے گزرا تھا اس نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہوگا' اس پر ٹرین کے طویل سفر کی تھکن! میر بخش کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ لاہور سے کراچی تک پہنچنے کے لیے لگ بھگ بیس گھنٹے سفر کرنا پڑتا ہے۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' اسے آرام کرنے دیں۔ صبح ملاقات کرلیں گے۔"

ساحل اور میر بخش نے اثبات میں گردن ہلائی۔

استقبالیہ کلرک بولا "آپ لوگ ایک منٹ سامنے صوفے پر بیٹھیں۔ میں اوپر جاکر دیکھ لیتا ہوں۔"

ہم نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور انتظار گاہ نما کارنر میں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ایک منٹ بعد کلرک نے آکر بتایا۔

"میرا خیال ہے' مہمان واقعی سو چکا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اسے آرام سے سونے دیا جائے۔"

"تمہیں مہمان کی اس خواہش کا علم کیسے ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

وہ بولا "کمرا نمبر ایک سو دو کے دروازے کے ہینڈل میں "ٹو ڈسٹربنس پلیز" کا مخصوص ٹیگ لٹک رہا ہے۔"

استقبالیہ کلرک کی وضاحت پر ہم بوٹا سنگھ والے ہوٹل سے نکل کر اپنے ہوٹل میں آگئے۔

ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں اس وقت خاصی گہما گہمی تھی۔ پتا چلا کہ وہ رونق کسی شادی کی تقریب کے سلسلے میں تھی۔ ہم اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میر بخش کو ایک فلور مزید اوپر جانا تھا۔ وہ تیسرے فلور کے کمرا نمبر دو میں تھا اور ہم دوسرے فلور کے کمرا نمبر ایک میں تھے۔ ہم نے اپنے فلور پر میر بخش کو شب بہ خیر کہا اور اپنے کمرے میں داخل ہوگئے۔

اندر آتے ہی مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا؟ اس کا میں فوری طور پر فیصلہ نہ کرسکا۔ میری چھٹی حس بار بار خبردار کررہی تھی کہ کمرے میں کوئی گڑبڑ ہے۔ ساحل کمرے میں داخل ہوتے ہی چینج کے لیے واش روم میں گھس گئی تھی۔ میں نے کمرے کے دروازے کو اندر سے ڈبل لاک لگایا اور اس گڑبڑ کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا جس کا احساس میری چھٹی حس دلا رہی تھی۔

جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہماری موجودگی میں اس کمرے کی تلاشی لی گئی تھی۔ ہمارا بیگ' بیڈ' الماری اور ٹیبل کو باریک بینی سے دیکھنے کے بعد اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کسی خاص چیز کو وہاں ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمارے کمرے میں سب سے زیادہ خاص چیز وہ ڈائری تھی جس کے حصول کے لیے خونیں واقعات پیش آرہے تھے۔

مجھے اپنے پورے بدن میں چونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ میں نے سب سے پہلے اس مقام کا جائزہ لیا جہاں میں نے ڈائری کو چھپایا تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے اس ڈائری کو بیگ سے نکال کر ایک پردے کے پیچھے کھڑکی کے فریم میں پھنسا دیا تھا۔ وہ سلائیڈنگ ونڈو تھی اور جب تک

اسے کھولا نہ جاتا' ڈائری وہاں محفوظ رہتی۔ میں نے اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ سلائیڈنگ ونڈو کھلنے پر ڈائری کمرے کے اندر ہی گرے۔ یہ ایک ایسی عام سی جگہ تھی جس طرف کسی کا خیال نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے مصلحتاً اس راز میں ساحل اور میر بخش کو شامل نہیں کیا تھا۔

میری احتیاط پسندی کام آگئی۔ ڈائری اپنی جگہ پر محفوظ تھی۔ میں نے ڈائری کو فریم سے نکالا' اسے چوما اور سلائیڈنگ ونڈو والا پردہ برابر کرکے کرسی پر آبیٹھا۔

ساحل نے واش روم سے باہر آکر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "کیا اس ڈائری کو ہر وقت سینے سے لگائے رہو گے؟"

اس وقت وہ ڈائری میری گود میں رکھی تھی اور میں کرسی میں نیم دراز سا ہو کر بیٹھا تھا۔ میں نے ساحل کے سوال کے جواب میں ڈائری کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"یہ چیز ہی ایسی ہے ساحل!"

"یہ ایسی چیز ہے یا ویسی چیز' یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" وہ معنی خیز نظر سے دیکھتے ہوئے بولی "مگر یہ جیسی تیسی اور کیسی بھی ہے۔ ہے بہت لکی!"

"یہ ڈائری کی لک (LUCK) کہاں سے نکل آئی؟" میں نے شوخی سے پوچھا۔

وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی "میں نے پارس پتھر کے بارے میں سن رکھا ہے۔ معلوم نہیں' ایسا کوئی پتھر حقیقت میں وجود رکھتا بھی ہے یا نہیں لیکن اس پتھر کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ جس چیز سے چھو جائے' اسے سونا بنا دیتا ہے۔"

"میں نے بھی سنا تو ہے۔" میں نے کہا "اس کی چھونے کی خاصیت کی بنا پر ہی اسے ٹچ اسٹون (STONE TOUCH) کہا جاتا ہے مگر میں نے خالی سنا ہی سنا ہے۔ اس پتھر کو کبھی دیکھا نہیں۔ اگر یہ واقعی وجود رکھتا ہے تو اس کا شمار طلسماتی اور نایاب اشیا میں ہونا چاہیے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان!" وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں بولی۔

میں نے پوچھا "ساحل! یہ تو بتاؤ' ڈائری کے لکی ہونے کا تذکرہ کرتے کرتے تم پارس پتھر تک پہنچ گئیں۔ ان دونوں میں کیا تعلق ہے؟ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

اس نے کہا "میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ تم اچھی طرح سمجھتے ہو!"

"میں نہیں سمجھتا' اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔"

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے تکتی رہی اس کی نگاہ میں کھوجی پن پایا جاتا تھا۔ پتا نہیں' وہ میرے اندر کیا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی ایک ٹک گھورتی غزالی آنکھوں نے مجھے مضطرب کر دیا تو وہ بولی۔

"وجدان! معلوم نہیں' تم واقعی بے خبر ہو یا جانتے ہوئے بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "تم کھل کر کہو' کیا کہنا چاہتی ہو۔ جب تک بتاؤ گی نہیں' مجھے کیسے معلوم ہو گا!"

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی "وجدان! پارس جس چیز کو چھو جائے وہ سونا بن جاتی ہے' اسی طرح تم جس شے کو چھو لو وہ لکی (LUCKY) ہو جاتی ہے۔ تمہارے پاس سوا یہ ڈائری مجھے بہت خوش قسمت نظر آرہی ہے اور میں اس کی خوش بختی پر رشک کر رہی ہوں۔"

میرے سینے سے ایک طویل بوجھل سانس خارج ہوئی اس خوبصورت لڑکی نے بڑی خوبصورتی سے اظہارِ محبت تھا۔ میں پچھلے کچھ عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ ساحل میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔ اس دلچسپی کو پسندیدگی عقیدت تک محدود نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ دلچسپی اس سے آگے کی چیز تھی۔ اسے محبت کے مقام پر فائز کیا جا سکتا تھا اور آج اس نے بڑے موثر الفاظ میں اپنے دلی جذبات اظہار بھی کر دیا۔ اس سے زیادہ کھل کر اور وہ کیا کہہ سکتی تھی!

ساحل کسی تیز رفتار میزائل کی مانند میری جانب بڑھتی چلی آرہی تھی۔ اس کا ٹارگٹ میرا دل تھا اور اس کوشش سے لگتا تھا' وہ خود کو سچی نشانے باز ثابت کرنے پر ہوئی ہے۔ ساحل میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ جوان حسین تھی' معاملہ فہم تھی' ذہین تھی۔ وہ قدم قدم پر ساتھ دیتی آئی تھی اور میری خاطر یارہا اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیا تھا۔ میں اس کے ایثار اور جذبہ قربانی کو مانتا اور بعض معاملات میں اس کا احسان مند بھی تھا لیکن میں کبھی اس کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچا تھا' جو انداز کے سوچنے کا انداز تھا۔

شاید میرے دل کا وہ خانہ ابھی وا نہیں ہوا تھا جس میں محبت کا پودا جڑ پکڑتا ہے اور عشقیہ جذبات نمو پاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے' وہ خانہ تو وا ہو' اس میں محبت کا پودا پروان چڑھ رہا ہو' جذبات بھی موجود ہوں مگر اظہار کی زبان سے عاری ہوں۔ گونگا جذبہ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ خود گونگا بھی اسے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ انتہائی طاقت ور جسم اور بیدار ذہن رکھنے والا کوئی مخلص دلی معاملات میں اس قدر کمزور ہو سکتا ہے' اتنا بزدل ہو سکتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی اور نہ ہی سمجھائی جانے کے قابل!

میں لباس تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ ساحل میرے خیال پر سوار ہو کر اندر آگئی۔ وہ میرے دماغ میں تھی اور میں دماغ کو کمرے میں رکھ کر واش روم میں نہیں آسکتا تھا۔ کپڑے بدلنے کے دوران میں مجھ سے کئی غلطیاں ہوئیں۔ میں بار بار خود سے الجھتا رہا۔ پندرہ منٹ بعد جب میں واش روم سے نکلا تو خود کو سنبھال چکا تھا۔

☆☆

اس ڈائری کا سائز پانچ بائی نو انچ تھا۔ اس پر پیور لیدر کور چڑھا تھا جس کا رنگ سرخ تھا۔ ڈائری کے صفحات لگ بھگ دو سو ہوں گے۔ جب سے یہ ڈائری میرے ہاتھ چڑھی تھی' میں وقتاً فوقتاً اس میں جھانک رہا تھا تاہم تفصیل سے پڑھنے کا اب موقع ملا تھا۔

اس وقت رات کا ایک بجا تھا یعنی کہ نئی تاریخ شروع ہو گئی تھی۔ ساحل ڈبل بیڈ پر پھیل کر سو رہی تھی۔ اس کی آنکھ تھوڑی دیر پہلے ہی لگی تھی اور پتا نہیں' لگی بھی تھی یا نہیں۔ ممکن ہے' وہ سونے کی اداکاری کر رہی ہو۔ وہ بارہا ایسا کر چکی تھی۔

میں ایزی چیئر پر نیم دراز سرخ جلد والی ڈائری کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ اپنی دونوں ٹانگوں کو کراس کر کے میں نے پاؤں بیڈ کے ایک کنارے پر ٹکا رکھے تھے۔ وہاں سے ساحل کا بدن صرف دو انچ کی دوری پر تھا۔ مجھے وہ رات کرسی پر نیم دراز ہو کر گزارنی تھی یا پھر فرش کے قالین پر بستر لگانا تھا۔ بیڈ پر سونے کا رسک میں کسی قیمت پر نہیں لے سکتا تھا۔

نیلگری نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اصلی صورت میں میرے سامنے نہ آنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور خلوت میں میرے ساتھ کسی عورت کو برداشت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میری یہ مجبوری تھی کہ جن حالات سے اس وقت ہم گزر رہے تھے ان میں ساحل کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا' ورنہ اسے دوسرے کمرے میں رکھ کر میں نیلگری کے سحر سے مکمل آزادی حاصل کر سکتا تھا۔ وہ جلوت میں میرے پاس نہیں آسکتی تھی اور خلوت میں آنے کے لیے وہ کسی دوسری عورت کی محتاج تھی۔ اس سے بچنا اگر میرے لیے دشواری لا رہا تھا تو نیلگری بھی مجھے حاصل کرنے کے لیے بڑی مشکلات کا شکار تھی۔ گویا دونوں جانب رسا کشی کی سی کیفیت تھی۔

نیلگری نے قاضی سلطان کی حویلی میں ہونے والی گزشتہ ملاقات میں کھل کر اظہارِ محبت کر دیا تھا۔ وہ مجھے اپنا محبوب مانتی تھی اور میرا قرب حاصل کرنے کے لیے جتن میں لگی ہوئی تھی۔ آج ساحل نے بھی بڑے واضح الفاظ میں اپنے دلی جذبات مجھ تک پہنچا دیے تھے۔ میں عجیب و غریب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ دونوں میری طلب گار تھیں لیکن دونوں کی طلب کا انداز مختلف تھا۔ ایک پراسرار شکتیوں کی مالک بڑی بااختیار تھی مگر میرے معاملے میں وہ بے اختیار ہو جاتی تھی' مجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ دوسری کی محتاج تھی۔ دوسری ایک معصوم صورت اور چنچل مزاج تھی۔ اس کے پاس کوئی اختیار تھا اور نہ ہی کوئی پراسرار طاقت' وہ سادہ اور پُرکار تھی۔ مجھ تک رسائی کے لیے وہ اپنے جذبے کو کام میں لا رہی تھی' گویا وہ اس معاملے میں کسی دوسری کی محتاج نہیں تھی۔ اس حوالے سے ساحل کو نیلگری پر سبقت حاصل تھی۔

میں نے بیڈ پر دراز ساحل کو بھرپور نظر سے دیکھا۔ سوتے میں اس کے چہرے کی معصومیت اور حسن کی سادگی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ تصنع اور بناؤ سنگھار میں وہ کشش نہیں ہوتی جو جاذبیت سادگی میں پائی جاتی ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ خالص ہوتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ سہل اور سادہ نظر آتی ہے۔ اس کی اثر پذیری کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ساحل کے سراپا سے نگاہ ہٹائی اور ڈائری کو پڑھنے لگا۔

رات دبے قدموں گزر رہی تھی اور میں مطالعے میں مگن تھا۔ اس ڈائری کے غالب حصے میں وہ واقعات درج تھے جو آپ میری اس داستان کی ابتدا میں پڑھ چکے ہیں۔ وہ میرے پیدا ہونے سے لے کر بارہ سال کی عمر تک پہنچنے کی تفصیلی کہانی تھی۔ سب سے آخر میں سونے کا ذکر تھا اور وہ بھی اشاروں کنایوں میں تھا۔ میرے والد صاحب کو ان کے مزارع اکبر نے اطلاع دی تھی کہ چوہدری نوازش علی اپنے چچیرے خاص دارا کی مدد سے بھاری مالیت کا سونا سرحد پار اسمگل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ والد صاحب نے اسمگلنگ کی اس کوشش کو ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

وہ سونا بسکٹ کی صورت میں کینوس کے چھے بڑے سائز کے تھیلوں میں بھرا ہوا تھا۔ چار تھیلے اسمگلروں نے کار کی ڈکی میں چھپا رکھے تھے جب کہ باقی دو تھیلے کار کی پچھلی سیٹ پر رکھے تھے۔ والد صاحب کی فائرنگ سے وہ لوگ اپنی گاڑی کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ والد صاحب کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ کار کی ڈکی میں بھی چار تھیلے چھپائے گئے تھے۔ وہ دارا اینڈ کمپنی کے فرار پر کار کی پچھلی سیٹ پر موجود تھیلے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی وقت دارا واپس آگیا

لہٰذا والد صاحب کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ انہوں نے سونے کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے وہ دونوں تھیلے ایک قریبی متروک کنوئیں میں پھینک دیے تھے۔ اس وقت ان دو تھیلوں میں بھرے ہوئے سونے کی قیمت کم و بیش پانچ کروڑ تھی جو بیس برس گزر جانے کے بعد اب پچیس کروڑ تک جا پہنچی تھی۔

بالکل آخری صفحات میں والد صاحب نے رہٹ والے اس متروک کنوئیں کی نشاندہی کی تھی۔ سرحد سے ملی ہوئی زمین میں' ایک مقام پر سرخ قلم سے دائرہ بنایا گیا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں پر بیس سال قبل وہ متروک کنواں پایا جاتا تھا۔ آج کل وہاں کی کیا صورتِ حال تھی' یہ وہاں پہنچ کر ہی معلوم کیا جا سکتا تھا۔ سمجھنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں تھیں۔

میں اس ڈائری کے مندرجات کا اچھی طرح مطالعہ کر چکا تھا۔ میں نے ڈائری بند کر دی۔ پھر دیوار گیر کلاک کی جانب میری نگاہ اٹھ گئی۔ کلاک تین بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ میں نے ایک جماہی لی اور سونے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ساحل ابھی تک اسی پوزیشن میں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سو چکی تھی۔ اب مجھے بھی اس سے محدود فاصلے پر سو جانا چاہیے تھا۔

میں نے کمرے میں کوئی "محفوظ" مقام تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اسی وقت ٹیبل پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ رات کے سناٹے میں گھنٹی کی آواز ایک عجیب قسم کا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس آواز سے ساحل کی نیند غارت ہو اس لیے دوسری گھنٹی بجنے سے پہلے ہی میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری جانب ہوٹل کا آپریٹر تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کے "ہیلو" کے جواب میں کہا۔

وہ منت آمیز لہجے میں بولا "سوری سر! آئی ایم ویری سوری۔ میں آپ کو اتنی رات گئے ڈسٹرب کر رہا ہوں۔"

"آگے بھی کچھ کہو گے یا۔۔۔" میں نے سخت الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ ایک مرتبہ پھر "سوری" کی گردان کرنے لگا اور اس کے بعد بولا "سر! آپ کے لیے ایک ایمرجنسی کال ہے۔ آپ کے والد صاحب بات کریں گے!"

"واٹ نان سینس؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا "سر! آپ گھر سے ناراض ہو کر آئے ہیں نا' اسی سلسلے میں وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

آپریٹر کی بے سروپا باتیں سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اس وقت وہ مجھے کوئی فاترالعقل شخص لگا۔ والد صاحب کا انتقال کو کم و بیش آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ آپریٹر سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا "ٹھیک ہے بات کراؤ۔"

اگلے ہی لمحے اس نے مجھے لائن دے دی۔

"ہیلو!" میں نے گہری سنجیدگی سے ماؤتھ پیس میں کہا۔

دوسری جانب سے ایک اجنبی آواز نے میری سماعت میں دستک دی "جاگ رہے ہو برخوردار!"

اس کی آواز میں بھاری پن اور ایک مخصوص گونج تھی۔

میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا "کون ہو تم؟"

"کیا آپریٹر نے تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" اس نے تعجب سے استفسار کیا۔

"کیا تم بھی وہی بکواس کرنا چاہتے ہو جو آپریٹر کر رہا ہے؟"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "برخوردار! میں تمہارے والد میاں زاہد حسین بول رہا ہوں۔"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس لیے نہیں کہ وہ چونکا دینے والی طاقت ور اور تجربہ کار مہرہ تھا بلکہ اس لیے کہ اس نے مجھے ٹریس کر لیا تھا۔ نہایت ہی تشویش ناک صورت حال ہو گئی۔ میرا ذہن بہ یک وقت کئی محاذوں میں مصروف ہو گیا۔

"کیا میرا نام سنتے ہی تمہاری جان نکل گئی۔" میرا نام سنتے ہی تمہاری جان نکل گئی۔" سنسناتے لہجے میں پوچھا "خاموش کیوں ہو؟"

میں نے اپنے پاؤں کے پنجے سے ساحل کی پنڈلی کو کرتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا "تم بھونکتے جاؤ' میں سنتا ہوں۔"

"کیا اپنے باپ سے بھی تم اس لہجے میں بات کرتے تھے۔" وہ دہاڑ سے مشابہ آواز میں مستفسر ہوا۔

میں نے جواباً ٹھوس لہجے میں کہا "میں منہ دیکھے کی مارنے کا عادی ہوں۔ جو مجھ سے جس لہجے میں بات کرتا ہے میں اسی لہجے میں جواب دیتا ہوں۔ تم ایک ایسے ہی جانور ہو جس پر بھونکنے کے الفاظ پھینکتے ہیں۔"

ساحل نے میری "کونشش" کے جواب میں آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے مکمل خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور میاں زاہد کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ نہایت ہی زہریلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا' تم ویسے ہی

ہو رہے ہو۔"

"مطلب کی بات کرو!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس دوران میں ساحل اشاروں میں مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ فون پر کس سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے ماؤتھ پیس پر اپنی ہتھیلی جما کر اسے دھیمی آواز میں بتایا کہ دوسری جانب میاں زاہد حسین ہے۔ وہ ہراساں دکھائی دینے لگی۔ میں نے اسے تسلی آمیز اشارہ کیا اور اپنی توجہ ائرپیس پر مرکوز کر دی۔

وہ کہہ رہا تھا "میرا مقصد اور مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو برخوردار۔ مجھے وہ ڈائری چاہیے جو بوٹا سنگھ نے تمہارے حوالے کی ہے۔"

"تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو؟"

وہ گمبھیر آواز میں بولا "میں بات کو گھما پھرا کر کرنے کا عادی نہیں ہوں اس لیے تم بھی سیدھی اور سچی بات کرو۔"

میں نے کہا "مجھے بھی پہیلیاں بجھوانے کا کوئی شوق نہیں۔ تم جس ڈائری کا ذکر کر رہے ہو' وہ میرے پاس نہیں۔"

"پھر وہ ڈائری کہاں ہے؟"

"بوٹا سنگھ ہی کے پاس ہو گی۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ کاٹ دار لہجے میں بولا "وہ ڈائری بوٹا سنگھ کے پاس تو نہیں ہے۔"

"کیا مطلب' کیا تم بوٹا سنگھ سے مل چکے ہو؟" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

وہ سفاکی سے بولا "ایک گھنٹا پہلے بوٹا سنگھ میرے پاس تھا۔ اس کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ بہادر آباد کے ریسٹورنٹ میں اس نے وہ ڈائری تمہارے حوالے کر دی تھی۔"

ایک گھنٹا پہلے بوٹا سنگھ کے' میاں زاہد حسین کے پاس ہونے کا مطلب تو یہی تھا کہ اسے اس کے ہوٹل سے کہیں لے جایا گیا تھا۔ اسی وقت میری نگاہوں کے سامنے وہ ٹیگ گھوم گیا جس پر "تو ڈسٹرب پلیز" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ بوٹا سنگھ والے ہوٹل کے استقبالیہ کلرک نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ اس کے کمرے کے ہینڈل میں یہ مخصوص ٹیگ لٹک رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ میاں زاہد حسین کی کارستانی تھی۔ انہوں نے بوٹا سنگھ کو ٹریس کرنے کے بعد اغوا کر لیا تھا۔ اس خیال سے میرے پورے وجود میں سنسنی سی پھیل گئی۔ ہم یہی سمجھے تھے کہ بوٹا سنگھ تھکن کے باعث گہری نیند سو رہا ہو گا۔

میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں میاں زاہد سے پوچھا "اس وقت بوٹا سنگھ کہاں ہے؟"

"اس وقت وہ بہت اچھی جگہ پر ہے۔ وہ گمبھیر میں بولا "ہر غم و فکر سے آزاد۔"

میں سمجھ گیا کہ انہوں نے بوٹا سنگھ کو قتل کر دیا تھا۔ کی شدت سے میری آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا "تم درندے ہو!" میں نے خاصی اونچی آواز میں کہا۔

"اور تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔" میاں زاہد چہکا نے آج دوپہر کو راشد منہاس روڈ پر میرے تین آدمی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ابھی تو ایک ہوا ہے' باقی دو کا باقی ہے۔ وہ دو تم تینوں میں سے کوئی ہو ہیں!"

وہ انتہائی بے تکی بات کر رہا تھا۔ شیرڈ نشینوں کی میں "سی ایف کے" والوں کا ہاتھ تھا۔ میں نے بپھرے لہجے میں کہا "تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ تمہا آدمیوں کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ انہیں ان دشمنوں نے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا جو ایک نیلی ہائی روف ان کا تعاقب کر رہے تھے۔"

"یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا تو یہ سمجھتے ہیں' تم ہی ان کے قاتل ہو۔ کل صبح کے اخبارات بھی ہماری بات کی تصدیق کریں گے۔"

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ میں سراسیمہ ہوئی آواز میں پوچھا۔ "اخبارات والوں کو یہ خبر کس نے پہنچائی ہے؟"

وہ بولا "میرے آدمیوں میں سے جو ڈرائیونگ کر اس نے اسپتال میں' مرنے سے پہلے پولیس کو ایک مختصر بیان بھی دیا ہے اور اس بیان کے مطابق وجدان نامی خطرناک انڈین ایجنٹ نے ان کی شیرڈ پر فائرنگ کی وجدان نامی یہ شخص "را" کا تربیت یافتہ ایجنٹ ہے اور روز قبل وہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے انڈیا سے پاکستان میں داخل ہوا ہے اور اب کراچی میں دہشت گردی وارداتیں کر رہا ہے۔ اس کا مشن امن و امان کی صورتحال کو ختم کر کے خوف و ہراس کی فضا کو قائم کرنا ہے۔ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "باقی کی تفصیل تم صبح کے اخبارات میں پڑھ لینا۔"

میاں زاہد حسین پاؤں تلے سے زمین کھینچ لینے باتیں کر رہا تھا۔ جواباً میں جو کچھ کہہ رہا تھا' اس نے سا گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ صرف ایک طرف کی سن رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی فکرمندی اور بر محل بھی تھی۔

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ایک ہاتھ سے

ناک کے زیریں حصے پر فرضی مونچھوں کو مروڑا دیا' پھر اسی ہاتھ کے اشارے سے نچلی منزل کی جانب اس کی توجہ دلائی اور آخر میں بلانے والے انداز میں ہاتھ کی انگلیوں کو حرکت دی۔ میں نے اشاروں میں اسے میر بخش کو اپنے کمرے میں بلانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

اس دوران میں' میاں زاہد سے فون پر بات بھی کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "ہم تو یہی سمجھ رہے تھے' تم سندھ کے صحرا میں رت پھاندتے پھر رہے ہو گے۔ میں نے صرف بوٹا سنگھ کے استقبال کے لیے آدمی بھیجے تھے مگر تمہیں یہاں پا کر مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی' تم نے تارا کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ تم سے دو دو ہاتھ کرتے ہوئے بہت مزہ آئے گا۔"

میں نے پوچھا "تم نے یہ نہیں بتایا کہ میری یہاں آمد کے بارے میں تمہیں کیسے معلوم ہوا کیوں کہ تمہارے تینوں سا اٹھی تو جنہم واصل ہو گئے؟"

"شاید میری دہشت نے تمہارے حواس گم کر دیے ہیں۔" وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں بتا چکا ہوں کہ شیرڈ کے ڈرائیور نے مرنے سے قبل پولیس کو بیان دیا ہے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اس کے علاوہ میرا ایک آدمی بائیک پر شیرڈ والوں کی نگرانی کر رہا تھا اور اس بات سے شیرڈ والے وہ تینوں افراد بھی آگاہ نہیں تھے۔ میرے اسی آدمی نے خفیہ طور پر بوٹا سنگھ کی قیام گاہ اور تمہارے بارے میں مجھے اطلاعات فراہم کی ہیں۔"

"تم خود ہی اپنی باتوں میں پھنس رہے ہو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "اگر تمہارا کوئی بندہ بائیک پر شیرڈ والوں کی نگرانی کر رہا تھا تو پھر اس شخص نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ تمہارے تین آدمیوں کو میں نے نہیں بلکہ نیلی ہائی روف والوں نے قتل کیا ہے۔"

دوسری جانب سے قہقہہ لگانے کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میاں زاہد نے کہا "میں نہیں بلکہ تم پھنس رہے ہو اور پھنسے ہوئے انسان کا سچ بھی جھوٹ سمجھا جاتا ہے اور پھانسنے والے کا جھوٹ بھی سچ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پولیس اسی بات کا یقین کرے گی جو میں کہوں گا کیوں کہ تم کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم تو "را" کے ایجنٹ ہو۔ پڑوسی ملک سے دہشت گردی کی خطرناک تربیت لے کر یہاں پہنچے ہو۔ کیا تم میرے دعوؤں کو جھٹلا سکو گے؟ تمہارے پاس اپنی کوئی شناخت نہیں ہے نا؟"

"تم ایک نمبر کے شیطان ہو۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"چلو' تم نے مجھے ایک طاقت تو مانا' شیطان ہی سہی۔"

میں نے پوچھا "ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس وقت مجھے فون کس مقصد سے کیا ہے؟ اگر تمہاری "بک بک" ختم ہو گئی ہو تو یہ بھی بتا دو۔"

اس نے بڑے مکروہ انداز میں قہقہہ لگایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "پہلے مجھے شک تھا' اب یقین ہو گیا ہے۔ میری دہشت نے تمہارے اعصاب کو شل اور تمہاری یادداشت کو بالکل ہی بے کار کر دیا ہے۔ میں تھوڑی دیر پہلے تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے وہ ڈائری چاہیے جو بہادر آباد کے ریسٹورنٹ میں بوٹا سنگھ نے تمہیں دی تھی۔"

میں دانستہ زاہد حسین کو باتوں میں لگا کر کچھ وقت حاصل کر رہا تھا۔ مجھے میر بخش کا انتظار تھا۔ میں نے کہا "تم اس ڈائری کی فرمائش کر رہے ہو نا جس کی خاطر تم نے ہمارے کمرے کی تلاشی بھی کرائی ہے؟"

اس کے ساتھ ہی میں نے فون کے ریسیور کو کندھے اور کان کے بیچ دبا کر نہایت ہی مہارت کے ساتھ بہ آہستگی ڈائری کا وہ ورق پھاڑ لیا جس کے دونوں صفحات پر آگے پیچھے سونے والے متروک کنوئیں کی تفصیلات اور مقام کی نشان دہی کی گئی تھی۔ یہ ورق پھٹنے سے ڈائری کے ابتدائی صفحات میں سے بھی ایک ورق آزاد ہو کر باہر نکل آیا۔ جو لوگ ڈائری یا نوٹ بک سے ورق پھاڑنے کا تجربہ رکھتے ہیں' وہ میری بات کو آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ میں نے مذکورہ دونوں اوراق کو تہ کر کے اپنی محفوظ جیب میں رکھ لیا۔ گویا میں نے پچیس کروڑ کے سونے کو اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا!

میاں زاہد حسین نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "تم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو' اس کے اسٹاف میں میرا ایک آدمی بھی کام کرتا ہے۔ اپنے کمرے کی تلاشی سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کتنی پہنچ والا ہوں!" اس کے لہجے میں غرور شامل تھا۔

"تم نے بھی میرے کمرے کی تلاشی سے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ تمہاری مطلوبہ ڈائری میرے پاس نہیں۔" میں نے جواباً چوٹ کی "ورنہ وہ ڈائری ضرور تمہارے ہتھے چڑھ گئی ہوتی اور میں رات کے آخری پہر تمہاری منحوس آواز سننے سے محفوظ رہتا۔"

وہ زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا "تم نے یقیناً وہ ڈائری کہیں چھپا دی تھی یا پھر ہوٹل سے نکلتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے ہو گے۔"

میں نے کہا "جب تم اتنی پہنچ رکھتے ہو کہ میری غیر موجودگی میں میرے کمرے کی تلاشی کروا سکتے ہو تو پھر کسی پردہ دار بی بی کی طرح فون کی اوٹ سے کیوں "ٹیں ٹیں" کر رہے ہو بڈھے طوطے۔ یہاں چلے آؤ' آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

وہ بولا "میں اتنا بھی سنگ دل نہیں ہوں۔"

"اس میں سنگ دلی والی کون سی بات ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے بتایا "آج رات اس ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ایک شادی خانہ آبادی کی تقریب ہوئی ہے۔ دلہا اور دلہن اسی ہوٹل میں سہاگ رات منائیں گے۔۔۔ اور وہ بھی بالکل تمہارے سامنے والے کمرے میں۔ ہوٹل میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی سے ان کی زندگی کی اس منتوں اور مرادوں بھری رات کا سوا ستیاناس ہو جائے گا۔ ویسے تو اس بدبخت دلہا میاں نے شادی جیسا احمقانہ کام کر کے ساری زندگی رونا ہی ہے۔ کم از کم یہ رات تو اسے سکون سے گزار لینے دو۔ شادی کے بعد مرد کے حصے میں صرف ایک رات کی خوشی ہی تو آتی ہے۔ اس بے چارے کو اپنی مختصر سی خوشی کا ایک ایک لمحہ کشید کرنے دو۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ سنجیدہ لہجے میں بولا "مجھے تمہارے ساتھیوں سے کوئی غرض نہیں۔ صرف تم سے اور ڈائری سے مطلب ہے۔ اگر تم میری بات مانتے ہو تو وہ ڈائری میرے حوالے کر دو تو میں تم سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ ڈائری حاصل کرنے کے بعد میں تمہیں آزاد چھوڑ دوں گا۔ تم اگر چاہو تو تمہیں "انڈین ایجنٹ" کے چکر سے بھی نکال دوں گا۔" وہ تمام تر مکاری سے جھوٹ بول رہا تھا۔ میں اس وقت چوہدری نوازش علی کے لیے حلق کی ہڈی بنا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ڈائری حاصل کرنے کے بعد مجھے آزاد چھوڑنے کی بات اس طرح کر رہا تھا جس طرح ریپر میں سے چاکلیٹ نکالنے کے بعد ریپر کو پھینک دیا جاتا ہے۔ میں اس کی چال میں آنے کی بے وقوفی نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال اس کی مکاری کی آخری حد تک پہنچنے کے لیے میں نے کہا "ٹھیک ہے' اگر تم مجھ سے لاتعلق ہونے کا وعدہ کرتے ہو تو میں یہ ڈائری تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ بولو' میں یہ ڈائری تم تک کیسے پہنچاؤں؟"

دوسری جانب ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی پھر میاں زاہد حسین کی مسرور آواز ریسیور میں ابھری۔ وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"تم وہ ڈائری لے کر اپنے ہوٹل سے باہر آ جاؤ۔ مین روڈ پر پہنچ کر تم ہائی کورٹ کی جانب مڑ جاؤ۔ الیکشن ہاؤس سے گزرنے کے بعد "ایف آئی اے" کا پولیس اسٹیشن آئے گا۔ تم تھوڑا اور آگے بڑھو گے تو اس روڈ کے اختتام پر ایک لیٹر بکس کے ساتھ تمہیں گرے کلر کی سوزوکی ایف ایکس کھڑی دکھائی دے گی۔ گاڑی کے اندر تمہیں دو پولیس والے بیٹھے نظر آئیں گے۔ دراصل وہ دونوں میرے آدمی ہیں جنہوں نے پولیس والوں کا بھیس بھر رکھا ہے۔ تم ڈائری میرے آدمیوں کے حوالے کر دو اور جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔ ہمارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

میں اس کی پلاننگ اور "انتظامات" سے آگاہ ہو گیا۔ اسے مزید چکر دینے کے لیے میں نے کہا "تم مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت نہیں دو گے؟"

میں نے ڈائری کی حوالگی کے لیے نیم رضامندی اس لیے ظاہر کی تھی کہ وہ میری بات سے یہ تاثر لے کہ میں اس کے دام میں آ گیا ہوں۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا "میں تمہیں صرف دس منٹ دے سکتا ہوں۔ پانچ منٹ سوچ بچار کے لیے اور پانچ منٹ ہوٹل سے نکل کر سوزوکی ایف ایکس تک پہنچنے کے لیے اور میرا فون بند کرتے ہی تم ان دس منٹ کے لیے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دینا۔ یاد رکھو' کسی بھی چالاکی کی صورت میں شاہراہِ عراق تمہارے لہو سے بھیگ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے' میں آ رہا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

فون بے جان ہو گیا۔ میں نے بے ساختہ نظر اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ کلاک میں ساڑھے تین بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا' پورے آدھے گھنٹے تک ہمارے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے ریسیور کو کریڈل کر دیا۔

اسی وقت کمرے سے باہر راہ داری میں دوڑتے قدموں کی آواز ابھری' پھر کسی نے کمرے کے دروازے کو پیٹ ڈالا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازے کی جانب قدم اٹھاتا' کمرے کے باہر ایک بلند آہنگ نسوانی چیخ ابھری۔

میں اس چیخنے والی کی آواز کو ہزاروں آوازوں میں بھی شناخت کر سکتا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں۔۔۔ میری ساحل تھی!

میں نے کسی زخمی چیتے کے مانند غراتے ہوئے ایک طویل جست بھری اور طوفانی انداز میں دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

ایک وحشت ناک منظر نے میرا استقبال کیا!

دو وردی پوش افراد نے ساحل کو دبوچ رکھا تھا اور اسے کھینچ کر ایک طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے دروازے کے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی تھی پھر دروازے پر دھواں دھار انداز میں دستک ہوئی تھی' اس کے ساتھ ہی ساحل کی بلند آہنگ چیخ میری سماعت تک پہنچی تھی۔ اب سب کچھ میرے سامنے تھا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں' میں صورتِ حال کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ دونوں وردی پوش افراد ساحل کے تعاقب میں میرے کمرے کے دروازے تک دوڑتے چلے آئے تھے۔ ساحل نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے دروازے پر دستک دی تو اسی دوران میں انہوں نے ساحل کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اب وہ اس سے کھینچا تانی میں مصروف تھے۔

ساحل کو جب میں نے میر بخش کو بلانے کے لیے ہوٹل کی اوپری منزل کی جانب بھیجا تھا تو دروازے کو اندر سے مقفل نہیں کیا تھا۔ ان نازک ترین لمحات میں اسے دستک دیے بغیر اندر گھس آنا چاہیے تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا' یہ سوچنے کا نہ وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ وہ فوری ردِعمل ظاہر کرنے کے لمحات تھے اور میں نے ایسا ہی کیا بھی۔

وردی پوش افراد کا تعلق ہوٹل اسٹاف سے تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ روم سروس سے متعلق تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بجلی کے کوندے کے مانند لپک کر ان کے راستے کی دیوار بن گیا۔ وہ دونوں ٹھٹک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

انہیں شاید اُمید نہیں تھی کہ اتنی جلدی کوئی مداخلت کار ان کے سر پر پہنچ جائے گا۔ انہوں نے ایک ساعت کے لیے معنی خیز نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ ساحل کو چھوڑ کر مجھ پر پل پڑے۔ میرے لیے تو یہ "اللہ دے اور بندہ لے" والا معاملہ ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی خوش دلی سے انہیں ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ بری طرح پٹنے لگے۔

ان میں سے ایک لڑائی بھڑائی کا ماہر نظر آتا تھا جب کہ دوسرے کے حملوں میں اناڑی پن کی جھلک تھی۔ وہ شاید مورل سپورٹ کے لیے اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ میں نے دو چار گھونسوں میں اس اناڑی کا اناڑی پن ناک کے راستے باہر نکال دیا۔ وہ راہ داری کے فرش پر لمبا لیٹ چکا تو میں نے چیخ کر ساحل سے کہا "کمرے سے بیگ اٹھا لاؤ۔"

وہ لپک کر کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ اس دوران میں دوسرا حملہ آور کام دکھا گیا۔ اس کا ایک زوردار پنچ میرے کاندھے پر لگا۔ اس نے نشانہ تو میرے منہ کو بنایا تھا مگر میں نے جھکائی دے کر اس کا نشانہ خطا کر دیا۔ اس کے پنچ میں خاصی طاقت تھی۔ مجھے اپنے شانے میں درد کی ایک ہلکی سی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ ایسی دردناک لہروں کو میں کبھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے بیک اسٹیپ لیا اور بجلی کی سی سرعت سے ایک فرنٹ کِک اس کے سینے پر رسید کر دی۔

میرا مدِمقابل دیسی انداز کا فائٹر تھا لہٰذا اس نے اپنا دفاع بھی اسی انداز میں کرنے کی کوشش کی جو صد فی صد ناکام ثابت رہی۔ وہ میری زبردست کِک کھا کر ہوا میں اچھلا اور پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا۔

میرا خیال تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہو گا اور وہ راہ داری کے فرش سے اٹھ نہیں سکے گا لیکن اس کی سخت جانی نے میرا اندازہ غلط ثابت کر دیا۔ وہ فرش پر گرتے ہی کسی اسپرنگ کے مانند ہوا میں بلند ہوا پھر زیادہ طراری سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں ان سنگین لمحات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ مار پیٹ اور اٹھا پٹخ چھپی رہنے والی نہیں تھی۔ یہ بات میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس ہوٹل میں ہمارا مزید قیام انتہائی مہلک اور خطرناک ثابت ہوتا۔ ہمیں جلد از جلد وہاں سے نکلنا تھا اسی لیے میں نے ساحل کو کمرے سے اپنا بیگ لانے کو کہا تھا۔

مدِمقابل کے جسم میں کسی گینڈے ایسی طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں کے حصار میں مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ٹائمنگ اور ٹیکنیک میں کوئی خامی نہیں تھی لیکن میں اس کے عمل سے قبل ہی اس کے عزائم کو بھانپ گیا۔ اس کی کمر کی حرکت نے مجھے بتا دیا کہ وہ کون سا قدم اٹھانے جا رہا تھا چنانچہ اسے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس نے جیسے ہی اپنے بازوؤں کا حلقہ میری کمر کے گرد کسنا چاہا' میں بیٹھک لگانے والے انداز میں تیزی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں بازو میرے سر کے اوپر سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کو کراس کر گئے۔ میں نے اس کی پشت پر اس کے دونوں ہاتھوں کی چیت کی "چٹاخ" بڑے واضح انداز میں سنی۔ یہی لمحہ تھا کہ میں اسی رفتار سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جس تیزی سے میں بیٹھا تھا پھر اس سے قبل کہ حملہ آور کی سمجھ میں کچھ آتا' میرا فولادی پنچ اس کی ناک کا "مزاج"

دریافت کرچکا تھا۔

اس نے ایک دردناک آواز خارج کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی ناک کو تھام لیا۔ اس عمل کے ساتھ ہی میرے لیے اس کی ناپاک زبان سے چند ناقابلِ اشاعت گالیاں بھی برآمد ہوئیں۔ میں گالی کا جواب بھی ہاتھ پاؤں سے دینے کا عادی ہوں۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر سائیڈ بش کک اس کے پیٹ کے بالائی حصے پر رسید کردی۔

میری اس کک میں غصے کی اچھی خاصی مقدار شامل تھی پھر پاؤں بھی عین اس کے "ڈایا فرام" پر پڑا تھا۔ وہ توپ سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند پچھلی جانب اچھلا اور پشت کے بل سامنے والے کمرے کے دروازے سے ٹکرایا۔

یہ ہوٹل کا وہی کمرا تھا جس میں ایک نوبیاہتا جوڑا شبِ زفاف منا رہا تھا۔ معلوم نہیں' دروازے کے قبضے کم زور تھے یا میں نے ہی طیش میں کچھ زیادہ زور دار کک لگادی تھی۔ ٹکراؤ کے نتیجے میں ایک خوف ناک دھماکا ہوا اور وہ شخص سنگل پیس فلش ڈور کے ساتھ کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ دروازے کے پٹ نے فریم سے جدا ہونے میں کسی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

وہ رات کا آخری حصہ تھا۔ دلہا دلہن کو شبِ مراد کے آخری پہر جس حالت میں ہونا چاہیے تھا اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ ان کی بوکھلائی ہوئی تیز چیخیں میری سماعت سے ٹکرائیں۔ کمرے کے اندر زیرو پاور بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نوبیاہتا جوڑے نے چیختے چلاتے ہوئے خود کو سمیٹا پھر ان کی نظریں اس افتاد کی جانب اٹھ گئیں جس کے سبب وہ دھماکا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ وہ خوف زدہ انداز میں' ٹوٹے ہوئے دروازے کے پٹ کے اوپر ایک شخص کو بے حس و حرکت پڑا دیکھنے لگے۔

"ڈایا فرام" انسانی جسم کا نہایت نازک حصہ ہوتا ہے۔ اس پر لگنے والی ضرب سے موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ فرنٹل باڈی پر پائے جانے والے پریشر پوائنٹس میں سے ایک ڈایا فرام بھی ہے۔ پریشر پوائنٹس مارشل آرٹس میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان پر ائیک کو جان لیوا تصور کیا جاتا ہے۔

میں اس ساکت شخص کے زندہ یا مردہ ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ساحل بیگ اٹھائے کمرے سے باہر نکل آئی۔ میں نے اس کا بازو تھاما اور راہ داری میں دوڑ لگادی۔ میں جلد از جلد ہوٹل کی عمارت سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہاں جس قسم کے حالات پیش آچکے تھے اس کے بعد مزید قیام بڑی موت نما مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

زینے کے نزدیک پہنچ کر میں نے بالائی منزل کا رخ چاہا تو ساحل کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "وہ اوپر نہیں ہے۔"

وہ سمجھ گئی کہ میں میر بخش کی طرف جارہا ہوں۔ میرے کا کمرا ہوٹل کے تیسرے فلور پر تھا جب کہ ہم دونوں دوسرے فلور پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے الجھن زدہ نظر سے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اوپر نہیں تو پھر کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم' وہ کہاں ہے۔" وہ جلدی سے بولی "اس کا کمرا تو بالکل خالی پڑا ہے۔ میں نے خود کمرے کے اندر جا کر دیکھا ہے۔ میں میر بخش کے کمرے سے نکل کر تمہیں بتانے آرہی تھی کہ وہ دونوں مصیبتیں گلے پڑ گئیں۔" پھر اس نے راہ داری میں اس سمت اشارہ کیا جدھر سے ہم آئے تھے۔ ہمارے کمرے کے دروازے کے سامنے ایک باوردی ملازم بے ہوش پڑا تھا۔

میر بخش کا اچانک غائب ہوجانا تشویش میں مبتلا کردینے والی بات تھی مگر یہ ایسے لمحات نہیں تھے کہ میں اس کی تلاش میں اوپر نیچے بھاگتا پھرتا۔ ہم دونوں اگر بہ خیریت ہوٹل سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے تو میر بخش کے لیے بھی کچھ کرسکتے تھے۔ اسی خیال کے تحت میں نے ساحل کی کلائی کو ہوا سے جھٹکا دیا اور تیزی سے نیچے جانے والے زینے پر قدم رکھتے ہوئے کہا "ہری اپ' جلدی۔ ہمیں پہلی فرصت میں ہوٹل کی عمارت سے نکلنا ہے۔"

بیگ ابھی تک ساحل کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس سے وہ بیگ لے لیا۔ اس طرح اسے میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے میں آسانی ہوگئی۔ ہم تقریباً دوڑنے والے انداز میں زینے اتر رہے تھے۔ ساحل نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔

"وجدان! میر بخش کہاں جاسکتا ہے؟"

"ابھی یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بولی "میں ڈر رہی ہوں کہیں اسے کوئی حادثہ پیش نہ آگیا ہو!"

"اور یہ بھی ممکن ہے' وہ کوئی گڑبڑ محسوس کرتے ہی کہیں از خود ادھر ادھر ہوگیا ہو۔" میں نے کہا "میر بخش ایک سمجھ دار اور معاملہ فہم شخص ہے۔ پھر اس کے پاس ایک بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔ وہ آسانی سے کسی کے قابو میں آنے والا بندہ نہیں۔"

مطمئن ہوتے ہوئے بولی "ہاں' یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

ہم فرسٹ فلور سے نکل کر ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں پہنچے ہی تھے کہ نیچے دو تین افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ استقبالیہ کاؤنٹر سے ڈائننگ ہال کی جانب آرہے تھے۔ دوسرے فلور پر میں نے چند لمحے قبل جو مارا ماری کی تھی وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی۔ یقیناً ہوٹل کے عملے کے کچھ لوگ صورتِ حال جاننے کے لیے اوپر کا رخ کررہے تھے۔

میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس وقت تین کیا' تیس افراد بھی میرے سامنے آجاتے تو میں انہیں پھاڑ کر رکھ دیتا لیکن میں اس ہوٹل میں خواہ مخواہ کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے مڈبھیڑ سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی اور اچک کر ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کی اوٹ میں ہوگیا۔ ساحل بھی میرے ساتھ ہی کھنچی چلی آئی۔ اس کی کلائی میرے ہاتھ میں تھی' نہ بھی ہوتی تو وہ ایسا ہی کرتی۔

اس وقت ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال کی بتیاں گل تھیں۔ بس ایک آدھ بلب ہی روشن تھا۔ ہم دونوں ایک نیم تاریک گوشے میں خود کو چھپانے میں کامیاب رہے' پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ افراد ہال میں داخل ہوئے' میں نے جن کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ میں نے سانس روک کر ہال کے زینے پر نگاہ جمادی۔

وہ تعداد میں تین تھے اور ان کا تعلق ہوٹل کی سیکیورٹی فورس سے تھا۔ میں نے ان کی مخصوص یونی فارم سے انہیں پہچان لیا۔ وہ تینوں پوری طرح مسلح تھے۔ انہوں نے وہاں رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور تیزی سے اوپر جانے والے زینے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ یقینی طور پر اوپر کے حالات کا جائزہ لینے گئے تھے۔ میں نے زینے سے نظر ہٹا کر ساحل کو دیکھا۔

"تھینکس لارڈ بدھا!" ساحل کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی "شکر ہے' یہ مصیبت تو ٹلی۔"

میں نے اس کی کلائی پر اپنی گرفت قدرے سخت کرتے ہوئے کہا "یہ مصیبت عارضی طور پر ٹلی ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ یہ اس مصیبت کا پہلا حصہ تھا۔ جب تک ہم اس ہوٹل سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر نہیں پہنچ جاتے' یہ مصیبت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی' ہمارے ساتھ ساتھ چلے گی۔"

"جس طرح ہم ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی اور میرے ہاتھ کی گرفت میں جکڑی اپنی کلائی کی طرف دیکھا پھر بولی "وجدان! کہیں تم مجھے بھی کوئی مصیبت تو نہیں سمجھتے؟"

"کیا کسی مصیبت کو اتنے اہتمام سے پکڑ کر رکھتے ہیں؟" میں نے اس کی کلائی پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ جھینپ گئی۔ میں اس وقت براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ نظر چراتے ہوئے سرسراتی آواز میں بولی۔

"وجدان! میں زبردستی اور اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ انڈیا سے پاکستان چلی آئی ہوں۔ رانی روپ متی اور دیگر افراد نے مجھے ہندوستان میں قیام کا مشورہ دیا تھا۔ تم نے بھی مجھے اپنے ساتھ پاکستان لانے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ صرف اور صرف میری ضد تھی کہ میں تمہارے ساتھ ساتھ چلوں گی' چاہے تم کہیں بھی جاؤ۔ اس حوالے سے میں کبھی کبھی سوچتی ہوں' کہیں تم مجھے کوئی مصیبت نہ سمجھتے ہو!"

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بھرپور اور حسین مصیبت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو میں نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "اچھا موقع ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں ہوٹل سے باہر نکل جانا چاہیے۔ اوپر جانے والے سیکیورٹی گارڈز کو جب ہمارے "کارنامے" کا علم ہوگا تو وہ شکاری کتوں کی طرح ہماری بُو سونگھتے ہوئے لپکیں گے۔"

ہم دبے قدموں ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال سے نیچے اتر آئے۔ میں نے زینے کے اختتام پر پہنچ کر استقبالیہ کی جانب محتاط نظر دوڑائی۔ وہاں استقبالیہ کلرک کے سوا اور کوئی مجھے نظر نہ آیا۔ جب ہم ہوٹل میں آئے تھے تو میں نے ہوٹل کی انٹرنس پر بھی ایک مسلح سیکیورٹی گارڈ کو دیکھا تھا جو اس وقت نظر نہیں آرہا تھا۔ ممکن ہے' وہ بالائی منزل کی طرف جانے والے گارڈز میں شامل ہو۔ بہرحال' اس گارڈ کی عدم موجودگی ہمارے حق میں مفید ثابت ہونے والی تھی۔

میں نے ساحل کو اشارہ کیا اور ہوٹل کی لابی میں قدم رکھ دیا۔ استقبالیہ کلرک نے چونک کر ہمیں دیکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر اس سے پہلے کہ وہ استقبالیہ چھوڑ کر ہماری طرف بڑھتا' ہم تقریباً دوڑتے ہوئے لابی کا

ایریا عبور کر چکے تھے۔ میں نے عقب میں ریسپشنسٹ کی للکارتی ہوئی آواز سنی لیکن ہم نے اپنے قدم نہیں روکے اور ہوٹل کی عمارت سے باہر آگئے۔

سامنے ہی مجھے ایک ٹویوٹا ہائی ایس کھڑی نظر آئی۔ وہ کریم کلر گاڑی اسٹارٹ تھی اور ایک باوردی شخص اس کی چھت پر سے سفری بیگ اتار رہا تھا۔ قریب ہی ہوٹل کے دو مہمان بھی کھڑے نظر آرہے تھے۔ ان میں ایک عورت اور دوسرا مرد تھا۔ ان کی شکل وشباہت نے مجھے پلک جھپکتے میں بتادیا کہ ان کا تعلق فار ایسٹ کے کسی ملک سے تھا۔ ٹویوٹا ہائی ایس پر اس ہوٹل کا نام اور مخصوص مونوگرام بھی بنا ہوا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ گاڑی مہمانوں کو ائرپورٹ سے ہوٹل لانے اور ہوٹل سے ائرپورٹ تک چھوڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ان دو مہمانوں کا ہوٹل کی گاڑی میں یہاں پہنچنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے پہلے سے بکنگ لے رکھی تھی' ہوٹل کا ملازم (HIACE) میں انہیں ائرپورٹ سے یہاں لایا تھا۔

میں گاڑی پر نظر پڑتے ہی یہ فیصلہ کرچکا تھا کہ ان ہنگامی حالات میں' میں اسے استعمال کروں گا۔ اس سے پہلے کہ وہ باوردی شخص استقبالیہ کلرک کی چیخ پکار کا مطلب سمجھ پاتا اسے ہم پر توجہ دینے کا موقع ملتا' میں نے اچانک اس پر حملہ کرکے اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کردیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ساحل کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کردیا۔

"ہائی ایس" میں سے اترنے والے مہمانوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو دوڑ کر ہوٹل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھے۔ عورت کے حلق سے تو باقاعدہ ایک ڈری سہمی اور طویل چیخ بھی برآمد ہوئی تھی۔ میں نے وردی پوش شخص پر صرف تین سیکنڈ ضائع کیے اور اس کی گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص نس کی "مزاج پرسی" کرتے ہوئے اسے اثنا غٹیل کردیا۔ وہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔

اس کارروائی کے بعد میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ استقبالیہ کلرک نے خاصی عقل مندی کا ثبوت دیا اور دور کھڑا چلاتا رہا۔ اس نے میرے انتہائی نزدیک آنے کی چنداں کوشش نہیں کی۔ شاید اس نے میرے تیور دیکھ کر اندازہ لگالیا تھا کہ میں اس وقت مرنے مارنے کے فل موڈ میں ہوں۔ اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے اور کلرک..... چاہے وہ کسی بھی شعبے کا ہو' اسے اپنی زندگی کچھ زیادہ ہی عزیز ہوتی ہے کیوں کہ اس کی ایک مفلس زندگی پر دسیوں دوسری زندگیوں کا بوجھ بھی لدا ہوتا ہے!

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بیدار انجن والی ٹویوٹا ایس کو اس کے موجودہ رخ پر ڈال دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ میں شاہراہ عراق پر نکل آیا ہوں۔ یہ سڑک تھی جس کو میرے لہو سے سرخ کرنے کی دھمکیاں حسین نے مجھے دی تھیں۔ اس نے مجھے صرف دس منٹ وقت دیا تھا۔ پانچ منٹ سوچ بچار کے لیے اور پانچ ہوٹل سے نکل کر اس کے بندوں تک پہنچنے کے لیے وقت..... میں سے ایک سیکنڈ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ساڑھے تین بجے فون کو بند کردیا تھا اور اب تین بج کر منٹ ہو رہے تھے۔ گزشتہ دس منٹ بہت ہنگامہ خیز اور آمیز گزرے تھے۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا جب میاں زاہد نے مجھے دس منٹ کی مہلت دے دی مدت گزرنے سے پہلے ہی اس کے آدمیوں نے گھیرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ یہ ممکن نہیں تھا کہ زاہد اس معاملے سے لاتعلق ہو۔

میں ذہن میں ایسے ہی سیکڑوں سوال لیے ڈرائیو کر کہ ایک عمارت پر مجھے پاکستان کا جھنڈا لہراتا نظر آیا عمارت کے پیشانی پر مجھے "ایکشن ہاؤس" کے الفاظ لکھے دکھائی دیے تو میرے رگ وپے میں ایک سنسنی سی دوڑ میں غیر ارادی طور پر اسی جانب بڑھ رہا تھا جہاں میاں کے آدمی میرے انتظار میں' سوزو کی ایف ایکس میں کی وردیاں پہنے بیٹھے تھے۔ مجھے پیدل چل کر ان تک تھا۔ میں نے میاں زاہد کو یہی راگ سنایا تھا۔

میں نے ہر نوعیت کی صورتِ حال سے دو دو ہاتھ کا فیصلہ کرلیا۔ ٹویوٹا ہائی ایس ایکشن ہاؤس کے بعد "آئی اے" کے تھانے کے پاس سے گزری۔ سامنے کورٹ کی عمارت تھی۔ میں نے شاہراہ عراق کے انتظ لیڑبکس کے ساتھ ایک گرے کلر سوزوکی ایف ایکس کھڑے دیکھا۔ گاڑی کے اندر مجھے دو پولیس والے بھی آئے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر تھا جب کہ دوسرا پسنجر سیٹ سنبھال رکھی تھی۔

سوزوکی ایف ایکس کچھ اس انداز میں کھڑی تھی گاڑی کا عقبی حصہ شاہراہ عراق پر تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں چوہدری نوازش علی اور اس کے کارندوں کے غم وغصے اور نفرت کی شدید ترین لہریں اٹھ رہی تھیں نے ٹویوٹا ہائی ایس سے ایک نپی تلی اچھوتی سی کراس ایف ایکس کی "دُم" پر رسید کی۔ اس کارروائی میں "

اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ دونوں گاڑیوں کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ میں اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب رہا۔

گاڑیوں کے معمولی ٹکراؤ نے ساحل کو چیخنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی "کیا کر رہے ہو وجدان؟"

"ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"آنکھیں تو کھلی رکھو۔" اس کے لہجے میں برہمی نہیں بلکہ سرزنش تھی "تم نے پولیس کی گاڑی کو ہٹ کیا ہے۔ ہم پہلے ہی کم مصیبت میں مبتلا نہیں۔ اب یہ لوگ ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔"

میں نے اپنی گاڑی کو بائیں جانب موڑ لیا۔ وہ سوزوکی ایف ایکس بھی ٹکر کھانے سے پہلے اسی رخ پر کھڑی تھی۔ ہائی ایس کی "پھکی" نے اسے لولا لنگڑا یوٹرن لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ گویا اب وہ ہماری مخالف سمت میں رخ کیے کھڑی تھی۔

میں نے ساحل کی بات کے جواب میں کہا "میں نے آنکھیں کھول کر ہی پولیس والوں کو "سیلوٹ" مارا ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے تعاقب میں لگ جائیں۔"

میری بات ختم ہونے تک ایف ایکس نے باقاعدہ یوٹرن لے لیا تھا۔ اب اس کا رخ ہماری جانب تھا۔ ان کے عزائم سے لگتا تھا کہ وہ میری خواہش ضرور پوری کریں گے۔ اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لوگ مجھے وجدان کی حیثیت سے پہچان گئے تھے ورنہ وہ کبھی بھی اپنی جگہ چھوڑ کر ہمارے تعاقب میں نہ آتے۔ میاں زاہد نے انہیں ایک خاص مقصد کے لیے وہاں متعین کیا تھا۔

ساحل میری باتوں سے خاصی الجھ گئی تھی۔ اس نے کہا "وجدان! تم بھی عجیب بات کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ مصیبت کی ان گھڑیوں میں تم پولیس کو اپنے پیچھے کیوں لگانا چاہتے ہو؟"

"وہ پولیس والے نہیں ہیں۔" میں نے ساحل کی پریشانی دور کرنے کے لیے انکشاف انگیز لہجے میں کہا "پولیس کی وردیاں انہوں نے بہروپ بازی کے لیے پہن رکھی ہیں۔"

وہ حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" پھر اس نے تعاقب میں آنے والی ایف ایکس کی طرف نگاہ دوڑائی اور کہا "وجدان! وہ باقاعدہ پولیس یونی فارم میں ہیں۔ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو' وہ پولیس والے نہیں؟"

میں نے کہا "پولیس کی وردی پہننے سے کوئی پولیس والا نہیں ہوجاتا۔ میں نے بتایا ہے نا' یہ بھرم بازی ہے۔"

"پھر وہ کون لوگ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

میرے پُراعتماد انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر میں ان لوگوں کو پولیس والا نہیں سمجھ رہا تو اس کی کوئی ٹھوس وجہ ہوگی۔ میں کوئی بھی بات خواہ مخواہ اور بے مقصد نہیں کہتا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بتایا "وہ دونوں افراد میاں زاہد حسین کے آلۂ کار ہیں جنہوں نے پولیس اہل کاروں کا بھیس بھر رکھا ہے۔"

"تم نے انہیں کیسے شناخت کیا؟" ساحل کے سوالوں میں شک نہیں بلکہ تجسس تھا۔

میں نے ہوٹل کے کمرے میں جب ساحل کو میر بخش کی جانب روانہ کیا تھا تو اس کے بعد ہی میاں زاہد حسین سے سوزوکی ایف ایکس اور پولیس والوں کے بہروپ میں اس کے بندوں کے حوالے سے بات ہوئی تھی۔ ساحل اس گفتگو سے آگاہ نہیں تھی اور یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اسے تفصیل سنانے بیٹھ جاتا اس لیے میں نے مختصر الفاظ میں کہا۔

"تمہارے سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا' پہلے ذرا ان حرام زادوں سے نمٹ لوں۔"

ساحل نے خاموشی اختیار کرلی اور گردن موڑ کر عقبی جانب دیکھنے لگی۔ ایف ایکس والے اب باقاعدہ ہمارے تعاقب میں لگ گئے تھے اور دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا پھر یہ فاصلہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

میں نے سڑک کے اختتام پر پہنچ کر ہائی ایس کو دائیں جانب موڑ لیا۔ ایف ایکس نے ہائی ایس کی تقلید کی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا نقلی پولیس والا کانسٹیبل کے بہروپ میں تھا جب کہ پسنجر سیٹ پر براجمان میاں زاہد کے آدمی نے اے ایس آئی کا سوانگ بھر رکھا تھا۔ میں کسی ویران مقام کی تلاش میں تھا جہاں سوزوکی ایف ایکس والوں سے شاندار "ملاقات" کی جاسکتی۔ میاں زاہد حسین کو یہ بتانا بہت ضروری تھا کہ اس کا پالا کس شخص سے پڑا تھا۔ محبت' جنگ اور دشمنی میں سب جائز سمجھا جاتا ہے۔ میرے اور چوہدری نوازش علی کے درمیان دشمنی خاصی "میچور" ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے شکار کرنے کے لیے اپنے ایک سے ایک مہرے آگے بڑھائے تھے جنہیں میں پیٹتا آیا تھا۔ زندگی اور موت کی اس شطرنج میں دونوں جانب اب بہت کم مُہرے بچے تھے' گویا کھیل فائنل راؤنڈ میں چل رہا تھا۔

ایف ایکس والوں نے میری مشکل آسان کردی یا یوں کہہ لیں کہ انہوں نے میری خواہش پوری کردی۔ سرور شہید روڈ جیسے ہی آرٹس کونسل والے چوراہے پر ختم ہوا' ایف ایکس نے ہائی ایس کو اوور ٹیک کرلیا۔ اب دونوں گاڑیاں ایم۔ آر کیانی روڈ پر آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ یگوڈا طرزِ تعمیر کی عکاس عمارت "شاہین کمپلیکس" سے تھوڑا پہلے ایف ایکس والوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں' میں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا کیوں کہ میرے مطلب کا مقام تھا۔ رات کے لگ بھگ چار بجے اس مقام پر گہرے سناٹے کا راج تھا۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی بھی ناکافی تھی لہٰذا میرے کام کے لیے راہ ہموار تھی۔

بریکس کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک ساتھ رکیں۔ ایف ایکس کی پسنجرز سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک پستول واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ والے نے بھی نقلی اے ایس آئی کی تقلید کی پھر وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے ہماری گاڑی کے نزدیک آگئے۔ میں اور ساحل ابھی تک ہائی ایس کے اندر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سرگوشیانہ انداز میں ساحل کو سمجھا دیا تھا کہ اسے عملی طور پر کچھ نہیں کرنا' صرف میرے اشاروں پر ناچنا ہے اور پہلا اشارہ یہ ہے کہ جب تک میں اس سے نہ کہوں' وہ ہائی ایس کی پسنجرز سیٹ کو نہیں چھوڑے گی۔

ساحل نے سمجھ داری سے اثبات میں سرہلا دیا۔

پستول بردار نقلی اے ایس آئی میری سائیڈ میں آگیا جب کہ کانٹیمبل کے بہروپ والا ساحل کی طرف چلا گیا۔ میں نے گاڑی رکتے ہی ساحل کی جانب والا دروازہ اندر سے لاک کردیا تھا۔ دروازے کا شیشہ پہلے ہی چڑھا ہوا تھا۔

البتہ میری سائیڈ والے دروازے کا شیشہ گرا ہوا تھا۔ اے ایس آئی نظر آنے والا پستہ قامت موٹا شخص مجھ پر پستول تانے ہوئے غرایا "ڈائری کہاں ہے؟"

"کون سی ڈائری؟" میں نے جواباً سوال کردیا۔

وہ خونخوار لہجے میں بولا "ہمارے پاس فضول بحث کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو' میں کس ڈائری کی بات کررہا ہوں۔ وہ ڈائری میرے حوالے کردو ورنہ....."

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ میاں زاہد کی جانب سے اسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ ہماری جان لے لے ورنہ وہ اس موقع پر ڈائیلاگ میں وقت ضائع نہ کرتا اور پہلی فرصت میں ہمیں شوٹ کردیتا۔

میں نے اس سے پوچھا "اگر میں تمہیں وہ ڈائری دے دوں تو تم کیا کرلو گے؟"

"میں تمہاری ماں....."

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا۔ اس نے میرے سوال کا جواب میں میری ماں کو کوئی غلیظ گالی دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اپنی ماں کے خلاف اس کی ناپاک زبان سے کوئی ایسی بات کیسے سن سکتا تھا۔ وہ ماں جس کا دودھ لہو بن کر رگوں میں دوڑ رہا تھا..... اور جس کو میں نے اپنی بصارت کے ذرّے ذرّے خاک و خون میں لوٹتے دیکھا تھا۔

میں پہلے ہی کسی ہنگامی کارروائی کے لیے تیار تھا۔ ایک جھٹکے سے میں نے ہائی ایس کا دروازہ کھولا اور اچھل کر گاڑی سے باہر آگیا۔ نقلی اے ایس آئی کے لیے یہ ایک غیر متوقع حرکت تھی۔ ہائی ایس کا وزنی دروازہ ایک دھماکے سے اس کے منہ پر پڑا۔ وہ ایک دردناک چیخ مارتے ہوئے نیچے گرا۔ ہائی ایس کا دروازہ اس کے منہ پر ایسے پڑا تھا جیسے کسی بدنصیب پر کوئی آفت ٹوٹ پڑتی ہے۔ الفاظ اس کے منہ میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے اور وہ زمین پر ایک جانب پڑا کراہنے لگا۔

اس دوران میں اس کا ساتھی مدد کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ موٹے نقلی اے ایس آئی کو زمین سے اٹھانے کے بجائے آس پاس کچھ تلاش کررہا تھا۔ ایک لمحے میں میرا ذہن اس کی تلاش کی تہ میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھی کے پستول کو ڈھونڈ رہا تھا جو دروازے کے تصادم کے باعث موٹے کے ہاتھ سے نکل کر کہیں ادھر اُدھر گر گیا تھا۔

میاں زاہد حسین کے ان دو گرگوں سے "نمٹنے" کا وقت تھا اور نہ ہی موقع اس لیے میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس دوران میں فربہ شخص کمر پر ہاتھ رکھ کر زمین سے اٹھ چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنے انتہائی قریب پایا تو تانتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

وہ اگرچہ اچھا خاصا موٹا تازہ تھا تاہم پھرتیلا بھی کم نہ تھا۔ اس کا گھونسا میرے سینے پر لگا۔ میں اس سے پہلے سانس روک چکا تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی نے یوگا کی ٹریننگ کے دوران مجھے بتایا تھا کہ انسان اگر بروقت سانس روک لے تو اس کے جسم پر لگنے والی ضرب کم سے کم تکلیف دہ ہوتی ہے۔

جیسے ہی موٹے کے گھونسے نے میرے سینے کو چھوا' میں نے دائیں ہاتھ کی گرفت میں اس کی گھونسے والی کلائی کو لیا پھر اسے کلاک وائز مروڑا دے کر اپنی بائیں کہنی اس کی کہنی پر رسید کردی۔ میری ایلبو کا یہ وار خاصا کاری ثابت ہوا کیوں کہ اس کا بازو مڑنے کے باعث خاصا تن چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی موٹے نقلی اے ایس آئی کے حلق سے بلبلاہٹ خارج ہوئی۔ اس کا دایاں بازو کہنی کے مقام سے بے کار ہوچکا تھا۔

میں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ موٹے کے جھکے ہوئے چہرے پر ایک زوردار ٹھڈا بھی رسید کردیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی کلائی اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کردی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم دور جا گرا۔

اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ موٹے کا ساتھی تھا جس نے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کسنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی اس کوشش میں خاصی حد تک کامیاب رہا۔ اس کی گرفت میں مجھے ایک نیا تجربہ ہوا۔ وہ جتنا دھان پان اور کمزور دکھائی دیتا تھا' ایسا تھا نہیں۔ اس کے سوکھے سڑے بازوؤں میں بجلی بھری تھی اور وہ دائیں بائیں جھٹکے دیتے ہوئے مجھے زمین پر گرانے کی کوشش کررہا تھا۔

جب طاقت اور تکنیک آمنے سامنے ہوں تو جیت ہمیشہ تکنیک ہی کی ہوتی ہے۔ طاقت کی اہمیت سے انکار نہیں مگر جسمانی طاقت ہمیشہ دماغی طاقت (تکنیک + ذہانت) کی غلام رہی ہے۔ اگر طاقت ہی سب کچھ ہوتی تو دنیا کے ہر ملک پر پہلوانوں کی حکومت نظر آتی۔

مدِمقابل نے دائیں بائیں جھٹکے کے بعد مجھے اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ شاید وہ مجھے دھڑام سے زمین پر پٹخنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے ہوا میں بلند کرنے کے لیے اسے تھوڑا نیچے جھکنا پڑا۔ اسی وقت میرا داؤ چل گیا۔ میرے دونوں بازو کہنیوں کے اوپر سے اس کی بانہوں میں قید تھے تاہم میرے ہاتھ آزاد تھے۔ وہ جیسے ہی نیچے جھکا' میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر بجلی کی سی سرعت سے فرنٹ رول کیا۔

میری رولنگ اسے بہت مہنگی پڑی۔ وہ میرے اوپر سے لڑھکتے ہوئے دور جا گرا پھر میں نے اسے اٹھنے کی مہلت نہ دی۔ وہ جیسے ہی سنبھلا' میں نے اس کے تھوبڑے پر فرنٹ جرک کک رسید کردی۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا تاہم دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھامتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے اس کی ہمت کا اندازہ بھی ہوا۔ وہ دونوں مارشل آرٹس سے نابلد تھے اس لیے مجھے اسٹریٹ فائٹر کے اصولوں پر کاربند رہ کر ان سے نمٹنا پڑ رہا تھا۔

وہ جیسے ہی سیدھا ہوا' میں نے اس کے پیٹ میں گھونسا دے مارا۔ وہ ردِعمل کے طور پر جھکا تو میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک دھواں دھار ہک پنچ رسید کردیا۔ وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کے مانند ڈکرانے لگا پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ مغلظات پر اُتر آیا۔

میں اسے نظرانداز کرتے ہوئے موٹے نقلی اے ایس آئی کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میرا یہ عمل بروقت تھا۔ وہ خبیث اپنے مجروح بازو کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے لمبی جست بھر کر اسے سوزوکی ایف ایکس کے قریب جا لیا پھر اس کے منہ پر ایک چانٹا رسید کرتے ہوئے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا تمہارے میاں زاہد نے تم جیسے زنخے ہی جمع کر رکھے ہیں؟"

وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا "تم ٹھیک نہیں کررہے ہو وجدان!"

"اور وہ تمہارا والد ثانی میاں زاہد سب ٹھیک کررہا ہے؟" میں نے غراتے ہوئے دریافت کیا۔

وہ نحیف سی آواز میں بولا "تم سخت نقصان اٹھاؤ گے۔"

"اچھا۔" میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا "اگر میں نقصان اٹھاؤں گا تو پھر تم یہاں سے بہ خیریت کیوں جاؤ۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے اس موٹے سؤر کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی تیز رفتار مشین کے مانند مصروفِ کار ہوگئے۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بری طرح پٹ رہا تھا۔ میرے طوفانی مکوں نے اس کی ناک اور منہ سے خون چھڑا دیا۔ اس کا چہرہ بھیانک منظر پیش کرنے لگا۔

میں پیٹتے اور وہ پٹتے ہوئے اس شخص کے قریب پہنچ گئے' تھوڑی دیر پہلے میں نے جس کی اچھی خاصی درگت بنائی تھی پھر یہ دیکھ کر میں چونک اٹھا کہ اس دبلے پتلے شخص کے ہاتھ میں ایک پستول موجود تھا۔

یہ وہی پستول تھا جو نقلی اے ایس آئی کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا تھا۔ موٹے کے ساتھی نے اسے پہلے بھی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک مرتبہ ناکامیاب رہنے کے بعد اس نے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا۔

وہ پستول کا رخ میری جانب کرتے ہوئے شکستہ لہجے میں بولا "اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں تمہیں شوٹ

کردوں گا۔"

اس کی دھمکی میں دم تھا اور نہ ہی آواز میں کوئی خم تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی آواز میں بول رہا تھا۔ پستول والے ہاتھ میں' میں لرزش دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے اس ہتھیار کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

"تم مجھے شوٹ کرو گے۔۔۔ اس کپکپاتے ہاتھ کے ساتھ؟"

اس نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی تو لرزے میں اضافہ ہو گیا۔ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا "تم میاں جی کو نہیں جانتے۔ وہ تمہاری کھال نچوالیں گے۔"

میں نے کہا "تمہارے میاں جی نے اپنے تعارف کے لیے دو زنخوں کو پولیس والوں کے بھیس میں میرے پاس بھیجا ہے۔ اس سے میں چوہدری نوازش علی کے تلوے چاٹنے والے میاں زاہد حسین کو بہت دور تک جان گیا ہوں۔ وہ میری کھال کیا نچوائے گا۔ تم دونوں کسی نائی کے پاس جا کر اپنی مونچھیں نچوا ڈالو۔ راستے میں کوئی بنجارن مل جائے تو درجن' دو درجن چوڑیاں بھی چڑھوالو۔۔۔ تاکہ میرے دیے ہوئے "ٹائٹل" پر پورے اتر سکو۔"

وہ میری باتیں سن کر تلملا اٹھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پستول کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس وقت موٹا نقلی اے ایس آئی ہم دونوں کے درمیان تھا۔ پستول بردار کے عزائم بھانپتے ہوئے میں نے موٹے کی چربیلی توند پر ایک میکانکی جرک کے ساتھ فرنٹ کک جڑ دی۔ یہ ٹھوکر کسی ڈائی مشین کے وزنی ہتھوڑے سے کم نہیں تھی' میری اس غیر متوقع حرکت سے پستول والے نے بے اختیار گولی چلا دی۔

فضا میں فائر کی آواز بلند ہوئی اور موٹا نقلی اے ایس آئی مردہ چھپکلی کے مانند پیٹ سے زمین پر گرا۔ گولی اس کی کھوپڑی کے آر پار ہو گئی تھی۔

میں نے پستول بردار کو دوسرا فائر کرنے کا موقع نہ دیا کیوں کہ اگلی گولی کا نشانہ میں ہی ہوتا۔ میں نے پستول والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی ایک طویل اسٹیپ لے کر سائیڈ کک مدمقابل کے سینے پر رسید کر دی۔ ہمارے درمیان اس وقت لگ بھگ پانچ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگر کسی مارشل آرٹسٹ کو سائیڈ کک پر عبور حاصل ہو تو وہ طویل اسٹیپ لے کر آٹھ سے دس فٹ تک بھرپور کک کا استعمال کر سکتا ہے۔

میری کک کھا کر وہ نقلی کانسٹیبل لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے گیا پھر فٹ پاتھ سے اس کا پاؤں ٹپا اور وہ فٹ پاتھ پر چاروں شانے چت ہو گیا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچا پھر کسی ریسلر کی فضا میں اچھل کر میں پشت کے بل اس کے بیٹ پر گرا کے حلق سے "اوں" کی نحیف سی آواز خارج ہوئی ہاتھ پاؤں پھینکنے لگا۔

یہ غنیمت تھا کہ وہ ابھی زندہ تھا ورنہ اس قسم کی سے اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی ہے زندگی کے حقیقی رنگ کی بات کر رہا ہوں۔ ٹی وی پر جانے والی ریسلنگ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں نمائشی مار پیٹ کی جاتی ہے۔ ریسلنگ کے مقابلے باقاعدہ انڈسٹری کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

میں نے اپنے نیچے دبے ہوئے شخص کا پستول والا اپنے قابو میں کیا اور اس کی کلائی کو زبردست جھٹکا دیا ہاتھ کی گرفت سے نکل کر فٹ پاتھ پر جا گرا۔

میں اس کے سینے سے اتر آیا اور اس کے چہرے کو پاؤں کی ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ میں تھوڑی دیر پہلے اس کا خاصا ٹائٹ کر چکا تھا۔ میرے پاؤں کی حالیہ آتش ضربوں نے اس کا چہرہ مسخ کر دیا۔ جب وہ کسی بھی قسم مزاحمت کے قابل نہ رہا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میاں حسین کے لیے "زندہ بہ دست مردہ" کا یہ پہلا تحفہ جانب سے خاصی ہلچل مچا دیتا۔ میاں زاہد کا دانت کچلی تلملاتا اور ناک سے دھواں خارج کرتا چہرہ میرے تصور گھوم گیا۔ میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج اور میں نے فٹ پاتھ پر پڑے پستول کو اٹھا کر ٹویوٹا ہائی لکس جانب دوڑ لگا دی۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی میں نے گاڑی کو جھٹکے سے آگے بڑھایا "شاہین کمپلکس" سے میں نے گاڑی بائیں جانب ڈاکٹر ضیا الدین روڈ پر موڑ لیا۔ مجھے جلد از جائے وقوعہ سے دور نکل جانا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے فائر کی آواز فضا میں بلند ہوئی تھی' وہ کسی کو بھی اس جانب متوجہ سکتی تھی اور ہم تو پہلے ہی اپنے پیچھے جہنم کی بلاؤں کو لگا ہوئے تھے۔

پولو گراؤنڈ کے نزدیک سے گزرتے ہوئے ساحل پہلی مرتبہ لب کشائی کی۔ اس کی آواز میں گہری تشویش جاتی تھی۔

"وجدان! جس ڈائری کے لیے یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا گیا ہے وہ تو۔۔۔"

"ہوٹل ہی کے کمرے میں رہ گئی۔" میں نے اس

بات کاٹتے ہوئے کہا "یہی کہنا چاہتی ہو نا!"

اس نے حیرت زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی "تم یہ بات اتنے اطمینان سے کہہ رہے ہو؟"

"ہاں' میں واقعی بہت مطمئن ہوں۔" میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا "تم بھی خواہ مخواہ کسی فکر' اندیشے میں نہ پڑو۔ میں نے خود ہی وہ ڈائری ہوٹل میں چھوڑی ہے ورنہ تم جب بیگ لے کر کمرے سے نکلی تھیں تو میں تم سے پہلا سوال ڈائری کے بارے میں کرتا۔"

اس کی حیرت دوچند ہو گئی بلکہ اس حیرت نے الجھن اور تذبذب کی شکل اپنا لی تھی۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مم۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ ڈائری تو بہت اہم ہے وجدان۔ تم نے اسے ہوٹل کے کمرے میں کیوں چھوڑا؟"

"میاں زاہد کو چکر دینے کے لیے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ اچھل پڑی۔

"مطلب یہ کہ۔" میں نے ہائی ایس کو سگنل سے بائیں جانب موڑا اور اسے "شیرٹن" اور "پی سی" کے درمیان سے گزار کر رفتار بڑھاتے ہوئے ساحل سے کہا "میں چاہتا ہوں' میاں زاہد اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ میں افراتفری میں سرخ جلد والی وہ ڈائری ہوٹل ہی میں بھول کر فرار ہوا ہوں۔"

وہ بولی "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی وجدان۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے تائید کی "یہ بات خاصی پیچیدہ ہے۔"

"میاں زاہد حسین کو اس قسم کی خوش فہمی میں ڈالنے کے لیے تم نے وہ قیمتی ڈائری ہوٹل میں چھوڑ دی۔" وہ متذبذب انداز میں بولی "یہ وہی اہم ڈائری ہے جس کے حصول کے لیے خونی کھیل' کھیلا جا رہا ہے۔ تم نے محض میاں زاہد حسین کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے اتنا بڑا رسک لے لیا؟" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا "اور خوش فہمی بھی کیسی! اگر تم ڈائری کی ڈپلی کیٹ یعنی کوئی اور بوگس ڈائری وہاں چھوڑ آتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تم تو اصلی ڈائری۔۔۔"

میں نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "میں نے ہوٹل کے کمرے میں جو ڈائری چھوڑی ہے اسے تم بوگس اور نقلی ہی سمجھو۔ وہ میاں زاہد حسین کے کسی کام نہیں آئے گی مگر وہ اس کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرے گا۔۔۔ اور اس کا پرائیویٹ باپ ملک نوازش علی تو اس ڈائری کو دیکھ کر ایسا گھومے گا کہ زندگی بھر گھومتا ہی رہے گا۔"

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی "تمہارا اطمینان بتا رہا ہے کہ تم کوئی گہری چال چل چکے ہو!"

"اب تم بالکل صحیح جگہ پر پہنچ گئی ہو۔" میں نے ہوٹل میٹروپول کو پیچھے چھوڑتے ہوئے کہا "میری چال اتنی گہری ہے کہ اس کی تہ میں نہ تو میاں زاہد حسین پہنچ سکے گا اور نہ ہی ملک نوازش علی۔ بڈھا چوہدری زندگی بھر سر پٹختا رہ جائے گا مگر وہ اس سونے تک نہیں پہنچ سکے گا جس کی چکا چوند دیکھنے کے لیے برسوں سے اس کی آنکھیں ترسی ہوئی ہیں۔"

وہ سنجیدگی سے بولی "اپنی اس چال کے بارے میں مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

اس کے سوال کے جواب میں' میں نے مختصر الفاظ میں اسے سرخ جلد والی ڈائری کے اس ورق کے بارے میں بتایا جو میں نے نہایت صفائی سے پار کر کے اپنی جیب میں منتقل کر لیا تھا۔ اس ورق کے آگے پیچھے دونوں صفحات پر سونے والے متروک کنوئیں کی نشان دہی کی گئی تھی اور بالکل درست مقام پر پہنچنے کے لیے خطوط کی مدد سے ایک نقشہ سا کھینچ دیا گیا تھا۔ وہ دو صفحات اس ڈائری کی روح تھے۔ روح کے بغیر جسم بے معنی ہو جاتا ہے۔ وہ ڈائری بھی اب کسی کام کی رہی تھی اور نہ کاج کی۔ کسی لاش کی طرح وہ بھی ایک بوجھ تھی۔ چوہدری نوازش علی اس ڈائری کو چاہے ایک صدی تک اپنے سر پر اٹھائے پھرتا' وہ مردہ کبھی بولنے والا نہیں تھا۔

پوری بات سننے کے بعد ساحل نے کہا "وجدان! تم نے تو بہت کامیاب چال چلی ہے۔ ایسی ذہانت میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔"

آخری جملہ اس نے بڑی لگاوٹ سے ادا کیا تھا۔ میں نے کہا "انسان اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو ایک سے ایک منظر اسے دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ قدرت نے سارے خوب صورت اور حسین مناظر انسان کی آنکھ ہی کے لیے تخلیق کیے ہیں۔ تمہارا مشاہدہ بہت قوی ہے یعنی تم طاقت ور نظر کی مالک ہو۔"

وہ اپنی تعریف سن کر چمکی پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "قدرت نے تو ہر طرف حسن اور دل کشی ہی تخلیق کی ہے لیکن ہماری آنکھوں کو اکثر و بیش تر رنجیدہ اور غم زدہ کرنے والے مناظر ہی دیکھنا پڑتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا

ہے؟"

"یہ حضرت انسان کی کارفرمائی ہے۔ میں نے جواب دیا "وہ اپنے اعمال سے ایسے دل دوز اور جگرپاش مناظر تخلیق کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔"

وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی "اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خود ہی اپنا سب سے بڑا دشمن ہے!"

"اس میں کیا شک ہے؟" میں نے جلدی سے کہا۔

ساحل گاڑی سے باہر سڑک کو دیکھتے ہوئے چونک کر بولی "وجدان! یہ راستہ تو دیکھا ہوا سا لگ رہا ہے!"

میں نے غور کیا تو ساحل کی بات واضح ہو گئی۔ ٹویوٹا ہائی ایس اس وقت شاہراہ فیصل سے گزر رہی تھی۔ ہم نے گزشتہ روز ریلوے اسٹیشن سے نکلنے کے بعد زیادہ تر سفر اسی سڑک پر کیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ شاہراہ فیصل سیدھی ایئرپورٹ کو جاتی ہے۔ اس وقت ہم عائشہ باوانی اسکول کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

ساحل نے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے وجدان؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے ذومعنی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس وقت ہمارے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ ہوٹل کو ہم نے نہایت ہی ہنگامی صورتِ حال میں چھوڑا تھا۔ اس شہر ناشناس میں سر چھپانے کا اور کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ قاضی سلطان کا صحافی دوست منہاس باقر دوپہر تک اسلام آباد سے آنے والا تھا۔ اس سے پہلے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟" مجھے خاموش دیکھ کر ساحل نے استفسار کیا۔

میں نے جواب دیا "ساحل! اس اجنبی شہر میں میرا ایسا کوئی جانکار نہیں ہے کہ میں رات کے آخری پہر اس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں اور نہ ہی ہم کسی دوسرے ہوٹل میں قیام کا سوچ سکتے ہیں۔"

"پھر کیا ساری رات اسی گاڑی میں سفر کرتے رہیں گے؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ بھاری رات گزارنے کا ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اسی گاڑی کو مختلف سڑکوں پر دوڑاتے رہیں..... اس وقت تک، جب تک گاڑی کا ایندھن ساتھ دے یا پھر جب صبح کا اجالا پھیل جائے۔"

وہ معتدل لہجے میں بولی "چلو، ایک طریقہ تو یہ اس کے علاوہ اور کون سا طریقہ ہے تمہارے ذہن رات بتانے کا؟"

"دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم شاہراہ فیصل مائیں۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں!"

میں نے سمجھایا "یہ سڑک ایئرپورٹ کی طرف ہے۔ ہمیں اس کی پیروی کتنا چاہیے۔ کراچی ایک الاقوامی شہر ہے۔ اس کا انٹرنیشنل ایئرپورٹ چوبیس مصروف رہتا ہو گا۔ ایئرپورٹ ہی وہ واحد مقام ہے جو زیادہ سے زیادہ وقت سکون کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے ہر رنگ و نسل کے موجود ہوں گے۔ کوئی ہماری جانب توجہ نہیں دے بہ آسانی اس ماحول اور ان لوگوں میں رل مل جائیں گے

"ڈن!" اس نے اسٹیئرنگ پر جمے میرے بائیں اپنا دایاں ہاتھ مارتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا ایئرپورٹ جائیں گے۔"

میں نے تامل کرتے ہوئے کہا "لیکن اس میں قباحت ہے۔"

"کیسی قباحت؟"

"اس قباحت کا نام ہے، لباس۔" میں نے کہا ہمارے لباس۔"

"کیا ہوا ہمارے لباس کو؟" وہ الجھن زدہ لہجے میں

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اور میرے لبا جائزہ لیا۔ اس کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہم دونوں نے سلیپنگ ڈریس پہن رکھے تھے۔

میں نے کہا "ہم اگر اس لباس میں ایئرپورٹ کی میں قدم رکھیں گے تو فوراً سب کی نظریں آجائیں گے خوامخواہ مذاق کا نشانہ بنیں گے ہی، اس کے ساتھ ساتھ والی نظریں ہمیں شک کے انداز میں دیکھیں گی۔ اس ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ دوسروں کو اپنے لیں۔"

"پھر کیا کریں؟ کہاں جائیں؟" اس کی الجھن د گئی۔

"جائیں گے تو ہم ایئرپورٹ ہی۔" میں نے اٹل کہا "لیکن اس سے پہلے ہمیں اپنا لباس تبدیل کرنا ہو گا۔

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "ہم لباس کہاں تبدیل کریں گے؟"

"اسی گاڑی میں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں مجھے تکنے لگی۔

میں نے کہا "ٹویوٹا ہائی ایس خاصی بڑی گاڑی ہے۔ درجن بھر افراد اس میں بہ آسانی سفر کرسکتے ہیں۔ تم گاڑی کے پچھلے حصے میں چلی جاؤ اور اطمینان سے لباس تبدیل کر لو۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے وجدان۔" وہ جلدی سے بولی "میں تم پر اندھا اعتماد کرتی ہوں۔ مجھے یقین ہے، تم میری جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔ تم نے قدم بہ قدم میری عزت کی حفاظت کی ہے۔ میں ایسے محافظ پر بے اعتمادی کس طرح ظاہر کرسکتی ہوں۔"

"پھر تمہاری ہچکچاہٹ کی وجہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں!" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی پھر پوچھا "تم گاڑی کو کسی جگہ روکو گے یا یہ کارروائی چلتی ہوئی گاڑی میں ہی کرنا ہوگی؟"

میں نے کہا "چلتی ہوئی گاڑی میں تو یہ مناسب نہیں ہو گا۔ میں کسی تاریک مقام پر گاڑی روکتا ہوں۔ پہلے تم اپنا لباس تبدیل کرو پھر میں کرلوں گا۔"

میں نے ایک "معقول" سی جگہ دیکھ کر ہائی ایس کو شاہراہِ فیصل سے اتار کر سروس روڈ پر ڈال دیا پھر ایک نیم تاریک مقام پر گاڑی کھڑی کردی۔ ساحل کو بیگ کے ساتھ میں نے گاڑی کے پچھلے حصے میں بھیج دیا اور خود گاڑی سے باہر آکر نیچے بیٹھ گیا اور سامنے والے ٹائر کا معائنہ کرنے کی اداکاری کرنے لگا۔

میرا یہ عمل دہرے مقصد کا حامل تھا۔ ایک تو میں مین روڈ سے گزرنے والوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ گاڑی میں کچھ خرابی ہوگئی ہے اور میں اسے چیک کرنے یا ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دوسرے میں ساحل کی ہچکچاہٹ اور گریز کو رفع کرنے کا خواہش مند تھا۔ گاڑی کی باڈی کے پیچھے میرا جسم چھپ کر رہ گیا۔ مجھے امید تھی کہ اب ساحل کسی فطری دھڑکے کے بغیر لباس تبدیل کرسکے گی۔

پانچ منٹ کے اندر اندر ساحل نے لباس بدل لیا۔ اس نے بلیو جینز پر گرے کلر کی لونڈی شرٹ پہن لی تھی۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ اس کے بعد میں نے بھی سلیپنگ سوٹ سے نجات حاصل کرکے جینز اور دھاری دار ٹی شرٹ زیب تن کر لی۔ پاؤں میں ساحل کی طرح میں نے بھی جوگرز پہن لیے تھے۔ اتارے ہوئے کپڑوں کو ہم نے بیگ میں بھرا اور پھر ہائی ایس ایک مرتبہ پھر ائرپورٹ کی جانب رواں دواں ہوگئی۔ اس دفعہ رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔

میرے پاس جو رقم بچی تھی، اسے میں نے تین حصوں میں تقسیم کرکے اپنی مختلف جیبوں میں محفوظ کرلیا تھا۔ کچھ رقم میں نے ساحل کے پاس رکھوا دی۔ دورانِ سفر رقم کو ہمیشہ بانٹ کر مختلف جگہوں پر محفوظ کرنا چاہیے۔ جیب کٹنے یا کسی اور قسم کے زیاں کے سبب کسی بڑی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ڈائری سے نکالا ہوا وہ پیش قیمت ہیرا میں نے اپنے لباس کے ایک خاص المخاص مقام پر چھپایا تھا۔ تلاشی لینے والا کوئی بھی شخص اسے بہ آسانی برآمد نہیں کرسکتا تھا۔۔۔ اور یہ وقت تلاش کرنے والے کو میں کسی بڑی سے بڑی مشکل میں ڈال دیتا!

✪✲✪

ٹھیک چار بج کر تیس منٹ پر ہم، بالائی منزل پر واقع ائرپورٹ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ ہم تھوڑی دیر قبل اعصاب شکن لمحات سے گزرے تھے ان کے پیش نظر بڑی شدت سے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ ہوٹل کی گاڑی ٹویوٹا ہائی ایس کو میں نے پارکنگ لاٹ میں کھڑا کردیا تھا اور سفری بیگ ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ میاں زاہد حسین کے گماشتے اس نقلی اے ایف آئی کا پسٹل اسی بیگ کے اندر کپڑوں کے درمیان رکھا تھا۔ ہمارے ساتھ بورڈنگ یا امیگریشن والا کوئی معاملہ تو تھا نہیں لہٰذا ہمارے بیگ میں غیر لائسنس یافتہ آتشیں اسلحے کی موجودگی ہمارے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں کرسکتی تھی۔

کافی پینے کے دوران میں ہمارے درمیان موجودہ حالات پر گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ ساحل کی سوئی ایک ہی مقام پر اٹکی گزر رہ گئی تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"وجدان! میری سمجھ میں نہیں آ رہا، میر بخش کہاں غائب ہوگیا!"

اس کی تشویش بے جا تھی۔ میں میر بخش کی طرف سے غافل نہیں تھا تاہم گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے میں، ہم جن حالات سے گزرے تھے، اس میں سب کچھ فراموش کرکے میر بخش کی تلاش کے لیے نکل کھڑے ہونا ممکن تھا اور نہ ہی مناسب۔

میں نے ساحل سے کہا "تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ میں نے تمہیں میر بخش کو بلانے اوپری فلور کی طرف بھیجا تو وہاں کیا حالات پیش آئے تھے؟"

"اور موقع کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے وہ کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا ہے۔"

ساحل سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "میرا دل تو بہت گھبرا رہا ہے۔"

"تم اپنے دل کی گھبراہٹ پر قابو رکھو۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا "اللہ کے فضل سے وہ بہ خیریت ہوگا۔ تم مجھے بتاؤ، جب تمہیں کمرے میں میر بخش نہیں ملا تو پھر تم نے کیا کیا تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "میں تمہیں میر بخش کے غیاب کے بارے میں بتانے آ رہی تھی کہ ان دو مردوں نے مجھے گھیر لیا۔"

"وہ تمہیں کہاں ملے تھے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں نے میر بخش والے کمرے سے نکل کر جیسے ہی دروازہ بند کیا، وہ دونوں مجھے زینے پر نظر آئے تھے۔" ساحل نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "وہ چوتھے فلور سے تیسرے فلور کی طرف آ رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے دوڑ لگا دی۔ میں بھاگتی ہوئی دوسرے فلور پر پہنچی لیکن اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے مجھے دبوچ لیا۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا "ساحل! تمہارے جانے کے بعد میں نے اپنے کمرے کو اندر سے لاک نہیں کیا تھا پھر تم نے واپسی پر بے دھڑک کمرے میں داخل ہونے کے بجائے دروازے کو کیوں پیٹ ڈالا تھا؟"

"وہ سب کچھ بوکھلاہٹ میں ہوا تھا۔" وہ معتدل لہجے میں بولی "اس وقت میں اوپر سے دوڑتی ہوئی آئی تھی اور اس حالت میں کہ دو افراد مجھے قابو کرنے کے لیے میرے پیچھے آندھی اور طوفان کی طرح لپکے چلے آ رہے تھے۔ تم اس دستک کو میرا لاشعوری اور اضطرابی عمل کہہ لو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں، اس قسم کے سنگین حالات میں انسان اسی نوعیت کی غلطیاں کرتا ہے۔ ان افعال کو غلطیاں کہنا بھی جائز نہیں کیوں کہ اس میں انسان کا ارادہ شامل نہیں ہوتا۔ یہ ایک لاشعوری، بے ساختہ اور فوری عمل ہوتا ہے۔"

ساحل نے کہا "وجدان! اس وقت ہم بڑی حد تک ایک محفوظ مقام پر بیٹھے ہیں۔ راستے بھر کسی دشمن نے ہمارا تعاقب نہیں کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے، ہمارے مخالفین ہمارے فرار ہونے کی سمت سے آگاہ نہیں لہٰذا ہمیں سب سے پہلے میر بخش کو تلاش کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

میں نے ساحل کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "اور وہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی "میں تمہاری سنگینی کو دیکھتے ہوئے وہ کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا ہے۔"

ساحل سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "میرا دل تو بہت گھبرا رہا ہے۔"

"تم اپنے دل کی گھبراہٹ پر قابو رکھو۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا "اللہ کے فضل سے وہ بہ خیریت ہوگا۔ تم مجھے بتاؤ، جب تمہیں کمرے میں میر بخش نہیں ملا تو پھر تم نے کیا کیا تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "میں تمہیں میر بخش کے غیاب کے بارے میں بتانے آ رہی تھی کہ ان دو مردوں نے مجھے گھیر لیا۔"

"وہ تمہیں کہاں ملے تھے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں نے میر بخش والے کمرے سے نکل کر جیسے ہی دروازہ بند کیا، وہ دونوں مجھے زینے پر نظر آئے تھے۔" ساحل نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "وہ چوتھے فلور سے تیسرے فلور کی طرف آ رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے دوڑ لگا دی۔ میں بھاگتی ہوئی دوسرے فلور پر پہنچی لیکن اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے مجھے دبوچ لیا۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا "ساحل! تمہارے جانے کے بعد میں نے اپنے کمرے کو اندر سے لاک نہیں کیا تھا پھر تم نے واپسی پر بے دھڑک کمرے میں داخل ہونے کے بجائے دروازے کو کیوں پیٹ ڈالا تھا؟"

"وہ سب کچھ بوکھلاہٹ میں ہوا تھا۔" وہ معتدل لہجے میں بولی "اس وقت میں اوپر سے دوڑتی ہوئی آئی تھی اور اس حالت میں کہ دو افراد مجھے قابو کرنے کے لیے میرے پیچھے آندھی اور طوفان کی طرح لپکے چلے آ رہے تھے۔ تم اس دستک کو میرا لاشعوری اور اضطرابی عمل کہہ لو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں، اس قسم کے سنگین حالات میں انسان اسی نوعیت کی غلطیاں کرتا ہے۔ ان افعال کو غلطیاں کہنا بھی جائز نہیں کیوں کہ اس میں انسان کا ارادہ شامل نہیں ہوتا۔ یہ ایک لاشعوری، بے ساختہ اور فوری عمل ہوتا ہے۔"

ساحل نے کہا "وجدان! اس وقت ہم بڑی حد تک ایک محفوظ مقام پر بیٹھے ہیں۔ راستے بھر کسی دشمن نے ہمارا تعاقب نہیں کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے، ہمارے مخالفین ہمارے فرار ہونے کی سمت سے آگاہ نہیں لہٰذا ہمیں سب سے پہلے میر بخش کو تلاش کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

میں نے ساحل کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "اور

اس تلاش کا آغاز میں اسی ہوٹل سے کروں گا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو وجدان۔" وہ بوکھلا گئی "کیا دوبارہ اس ہوٹل میں جانے کا ارادہ ہے؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میر بخش کو ڈھونڈنے کے لیے اس ہوٹل کا رخ کرنا دانش مندی ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔"

"پھر تم کیا کرنے والے ہو؟"

"میں فی الحال یہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر میں نے ریسٹورنٹ کے شفاف اور چم چماتے فرش پر رکھے سفری بیگ کو اٹھا لیا۔ گود میں رکھ کر میں نے بیگ کی سائیڈ پاکٹ میں ہاتھ گھمایا تو اپنے مطلب کی شے مجھے مل گئی۔ وہ دراصل ہوٹل کا تعارفی بروشر تھا۔ میں نے بیگ کو دوبارہ فرش پر رکھا اور مذکورہ بروشر ساحل کے سامنے ٹیبل پر ڈال دیا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "یہ کیا ہے؟"

"ہوٹل کا تعارف نامہ ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ہے۔" وہ الجھن زدہ انداز میں بولی "لیکن اس بروشر کا میر بخش کی تلاش سے کیا تعلق؟"

میں نے کہا "میں ابھی ایک اجنبی بن کر اس ہوٹل میں فون کروں گا۔ فون نمبرز اس بروشر پر موجود ہیں۔ میں خود کو فرید (میر بخش) کا شناسا ظاہر کر کے اس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کروں گا۔ دیکھتے ہیں' ہوٹل والے اپنے کمرے نمبر تین سو دو میں ٹھہرے ہوئے مہمان فرید کے بارے میں کیا رپورٹ دیتے ہیں!"

"ہاں' یہ ترکیب اچھی ہے۔" ساحل نے سراہنے والے انداز میں کہا "اس طرح ہمیں میر بخش کے غیاب کے سلسلے میں ہوٹل والوں کا نقطۂ نظر معلوم ہو جائے گا۔"

ساحل کی مضبوط تائید کے بعد میں کرسی سے اٹھا اور بروشر کے ساتھ ٹیلی فون تک چلا آیا۔ میں نے مذکورہ ہوٹل کے نمبرز ڈائل کیے اور دوسری جانب سے ریسیور اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

اس وقت تک پاکستان میں "سی ایل آئی" کی سہولت متعارف نہیں ہوئی تھی اس لیے ہوٹل والے مجھے یا اس مقام کو ٹریس نہیں کر سکتے تھے۔ "سی ایل آئی" ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا تحفہ ہے۔ اس ٹیکنالوجی سے پہلے محکمہ ٹیلی فون جرمن ٹیکنالوجی "اینالوگ" سے استفادہ حاصل کر رہا تھا۔ (ANALOGUE) سسٹم کے تحت اوور ریز کنٹیٹیویٹی کے لیے بہت دشواری کا سامنا ہوتا تھا اور بعض اوقات کال کروانے کے بعد گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے مقابلے میں اب وہ سسٹم انتہائی فرسودہ دکھائی دیتا ہے۔

چوتھی بیل پر میری کال ریسیو کر لی گئی۔ میری سماعت سے "ہیلو" کا مخصوص لفظ ٹکرایا پھر آپریٹر نے اس ہوٹل کا نام دہرایا۔

میں نے مطمئن ہونے کے بعد بھاری آواز میں کہا "میں سلیمان شاہ بول رہا ہوں۔ آپ کے ہوٹل میں میرا دوست فرید ٹھہرا ہوا ہے۔ ذرا اس سے بات کروا دیں۔"

"اپنے دوست کا کمرا نمبر بتائیں۔" دوسری جانب سے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔

میں نے کہا "فرید کمرا نمبر تین سو دو میں ٹھہرا ہوا ہے۔"

دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی پھر نہایت ہی رو سے کہا گیا "اس نام کا کوئی آدمی ہمارے ہوٹل میں قیام نہیں اور۔۔۔ کمرا نمبر تین سو دو تو بالکل خالی ہے۔"

مجھے یہ سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ آپریٹر ایک ہی بات کر رہا تھا۔ میں نے ایک ساعت کے لیے گمان کہیں غلط جگہ تو نمبر نہیں لگ گیا۔ اس غلطی کا امکان ہونے کے برابر تھا کیوں کہ مجھے آغاز ہی میں آپریٹر نے ہو کا نام بتا دیا تھا تاہم میں نے پھر بھی اپنی تسلی کی خاطر ہوٹل کا نام واضح الفاظ میں دہرایا اور پوچھا "کیا یہ وہی ہے؟"

"ہوٹل کا نام آپ بالکل صحیح بتا رہے ہیں۔" دو جانب سے تصدیقی انداز میں کہا گیا "لیکن آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ ہمارے ہوٹل میں کمرا نمبر تین سو دو میں کوئی دوست فرید قیام پذیر ہے۔"

میری الجھن بے انتہا بڑھ گئی۔ میں نے اضطراری میں کہا "دیکھیں' میں اپنے دوست سے بہت ضروری بات چاہتا ہوں۔ اس کے دو عزیز آپ کے ہوٹل کے کمرا نمبر ایک میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک مرد اور عورت۔۔۔ میرا مطلب ہے' لڑکی ہے۔ اس لڑکی کا نام مرد کا نام جاوید ہے۔ آپ ان میں سے کسی کو فون دیں۔"

"شاید آپ کوئی پاگل انسان ہیں۔" دوسری جانب کہا گیا "یا پھر آپ کسی شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارے ہوٹل کمرا نمبر دو سو ایک گزشتہ ایک ہفتے سے خالی پڑا ہے نہیں' آپ کس جاوید اور بیلا کی بات کر رہے ہیں!"

میں نے ایک اور پینترا بدلا "سنیں' آج شام کو میرا سے فون پر بات ہوئی ہے۔ آپ ہی کے ہوٹل میں۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ۔۔۔"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس بدتمیز شخص نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"مسٹر! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم کوئی پاگل ہو جو "مسٹر! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم کوئی پاگل ہو جو میرا مغز کھانے آ گئے ہو۔ گیٹ لاسٹ۔"

اس وقت میرا مغز کھانے آ گئے ہو۔ گیٹ لاسٹ۔"

میں غبیث آپریٹر کے رویے پر تلملا کر رہ گیا۔ وہ اس وقت مجھ سے میلوں کے فاصلے پر تھا اس لیے میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں نے تصور میں ریسیور کو اپنا مکا جانا اور اسے آپریٹر کے کریڈل نما منہ پر رخ دیا۔

میں نے واپس آ کر ساحل کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ بھی سنتے ہی الجھن کا شکار ہو گئی۔ اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"وجدان! یہ ہوٹل والے ہم سے چار سو بیسی کیوں کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم سے نہیں' وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ "سلیمان شاہ" سے کر رہے ہیں۔ میں نے فرید (میر بخش) کا دوست بن کر اسی نام سے بات کی تھی۔"

"پھر بھی ان کا رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"میری تو سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا ہے۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"تمہاری سمجھ میں کیا آ رہا ہے وجدان؟"

"میاں زاہد حسین کا اثر رسوخ۔" میں نے معنی خیز انداز میں ساحل کی طرف دیکھا۔

اس سے پہلے میں ساحل کو اپنے کمرے کی تلاشی کے بارے میں بتا چکا تھا۔ جب ہم فلم دیکھنے گئے تھے تو ڈائری کی کھوج میں ہمارے کمرے کی تلاشی لی گئی تھی۔ وہ تو میری بروقت حکمت عملی کام آ گئی اور قیمتی ڈائری میاں زاہد کے ہتھ لگنے سے محفوظ رہی۔ فون پر میاں زاہد نے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا تھا کہ ہوٹل کے اسٹاف میں اس کا ایک بندہ موجود ہے۔ میں نے یہ ساری تفصیل ساحل کو بتا دی تھی۔

وہ بولی "وجدان! اگر یہ سب کچھ میاں زاہد کے اشارے پر کیا جا رہا ہے تو پھر میں یہ ضرور کہوں گی' ہوٹل کے اسٹاف میں اس کا صرف ایک بندہ شامل نہیں بلکہ وہاں کا پورا اسٹاف اور انتظامیہ اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں ورنہ ہوٹل کے آپریٹر سے تم نے ابھی بات کر کے مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ ناقابل یقین حد تک ناممکن ہے۔ اگر ہوٹل والے وہاں ہماری آمد اور قیام سے منکر ہو رہے ہیں تو اس کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ انہیں ایسا کرنے کے لیے اونچی سطح سے احکام موصول ہوئے ہیں۔"

"میں بھی کچھ اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا "میاں زاہد میری توقع سے بڑھ کر بارسوخ ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی خطرناکی سے بچنے کے لیے ہمیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانا ہوگا۔"

ساحل نے کہا "اس خطرناک شخص کے بھیجے ہوئے دو افراد کے ساتھ تم نے جو عالی شان "سلوک" کیا ہے وہ اسے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔"

ساحل کا اشارہ نقلی کانسٹیبل اور بہروپئے اے ایس آئی کی جانب تھا۔ موٹے "اے ایس آئی" کی لاش ایم آر کیانی روڈ پر بے گور و کفن پڑی تھی۔ اس کے ساتھی کی چلائی ہوئی گولی نے موٹے کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا تھا جب کہ ہم کانسٹیبل کی وردی والے دبلے پتلے شخص کو زخمی حالت میں وہاں چھوڑ آئے تھے۔

میں نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا "ساحل! ہم جس شخص کو زندہ چھوڑ آئے ہیں وہ ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔"

"وہ تو زخموں سے چور چور تھا۔" وہ سادہ سے انداز میں بولی "تم نے اس کے چہرے پر اتنے تھڈے برسائے تھے کہ ممکن ہے' آئینہ دیکھ کر وہ خود کو پہچاننے سے انکار کر دے' وہ بے چارہ ہمارے لیے کیا مصیبت کھڑی کرے گا؟ میرا خیال ہے' وہ تو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں۔"

"تمہارا خیال صد فی صد درست ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تائید کی "میں نے اس کے جسم کے جوڑ جوڑ کی ایسی خبر گیری کی ہے کہ اسے "فٹ" ہونے میں ہفتہ دس دن تو ضرور لگیں گے لیکن یاد رکھو' دشمن کو کبھی بھی حقیر اور کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ میں نے اس نقلی کانسٹیبل کے حوالے سے مصیبت کھڑی کرنے کی جو بات کی ہے' اس سے میرا مطلب کچھ اور تھا۔"

"اپنے اس مطلب کی وضاحت بھی کر دو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا "اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ ان دونوں نے ہمیں ٹویوٹا ہائی ایس میں دیکھا تھا اور یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہائی ایس کا تعلق اسی ہوٹل سے ہے جہاں سے ہم فرار ہو کر ائرپورٹ پہنچے ہیں۔ زندہ بچ رہنے والا وہ نقلی کانسٹیبل اپنے لوگوں کو بتا سکتا ہے کہ

ہم کون سی سواری استعمال کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ ہائی ایس کے طفیل ائرپورٹ تک راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔"

ساحل نے کہا "وجدان! تم خواہ مخواہ اندیشوں میں گھر رہے ہو۔ یہ بات تو ہوٹل والے بھی جانتے ہیں کہ ہم نے فرار ہونے کے لیے ان کی مخصوص ہائی ایس استعمال کی ہے۔ وہ لوگ یعنی ہمارے دشمن زیادہ سے زیادہ اس وسیلے سے ائرپورٹ پہنچ جائیں گے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

ساحل نے اپنی بات کا اختتام ایک اچھوتے سوال پر کیا تھا۔ اس کے سوال نے مجھے ایک نئی راہ سجھادی۔ میں نے مسرور لہجے میں کہا "ساحل! تم قدم قدم پر اپنی ذہانت کو ثابت کرتی رہتی ہو۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا' اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہمارے دشمن اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ ہم ائرپورٹ تک آئے ہیں۔"

"میں نے تو ایک سامنے کی اور منطقی بات کی ہے۔" وہ حیرت آمیز لہجے میں بولی "اس میں میری ذہانت کہاں جھلکتی ہے!؟"

میں نے کہا "تمہاری اس سامنے کی اور سادہ بات سے میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا ہے۔ تم اس لیے بھی ذہین ہو کہ اس وقت تمہاری بات نے ایک محرک کا کردار ادا کیا ہے۔"

"میری ذہانت کو ایک طرف رکھو اور مجھے اپنے اچھوتے آئیڈیے کے بارے میں بتاؤ۔" وہ اچانک بے حد سنجیدگی سے بولی۔

میں نے نیچے سروں میں کھنکار کر گلا صاف کیا اور اسے بتانے لگا "جب ائرپورٹ کے پارکنگ لاٹ میں ہوٹل کی ٹویوٹا ہائی ایس کھڑی پائی جائے گی تو ہمارے دشمن یہی سمجھیں گے کہ ہم کراچی سے باہر کسی دوسرے شہر یا پاکستان سے باہر کسی دوسرے ملک کی جانب پرواز کر گئے ہیں۔ میرا آئیڈیا یہ ہے کہ اب ہم خود کو مکمل طور پر روپوش کر لیں اور دور رہ کر اپنے دشمنوں پر کاری ضربیں لگاتے رہیں۔ ان کا دھیان کبھی ہماری طرف نہیں جائے گا۔ وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ ہم کراچی یا پھر پاکستان چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اس طرح ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ ہم بالکل نئی شخصیات کی آڑ میں میاں زاہد حسین کے سینے پر مونگ دلتے رہیں گے۔"

میری بات ختم ہونے پر ساحل نے کہا "وجدان! تمہارا آئیڈیا نہایت ہی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے۔ اس قسم کی مہم جوئی میں بے پناہ مزہ آئے گا لیکن اس بات کو بھی ذہن میں رکھو کہ میاں زاہد ایک کائیاں اور چال باز شخص ہے۔ اس شہر میں اثر و نفوذ تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ وہ آسانی سے یہ بات تسلیم نہیں کرے گا کہ ہم کراچی چھوڑ کر کسی اور نکل گئے ہیں۔"

"اگر وہ آسانی سے تسلیم نہیں کرے گا تو پھر کیا گا؟" میں نے روا روی میں پوچھا۔

وہ بولی "میاں زاہد ہمارے خروج کی تسلی کے لیے سی ایل" ضرور چیک کروائے گا۔ قریبی پروازوں میں وجدان اور ساحل یا پھر جاوید اور بیلا کے نام نہیں ملیں ہماری جانب سے وہ مشکوک ہو جائے گا۔ کراچی سے جانے والی پروازوں کے مسافروں کی ای سی ایل (ایگزٹ کنٹرول لسٹ) ہمارے منصوبے کا راز عیاں کر دیں گی ہماری روپوشی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

"تم ایک اہم نکتے کو فراموش کر رہی ہو۔" میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "میاں زاہد ایک پیشہ شخص ہے' ایک سینڈیکیٹ کا مقامی باس ہے۔ وہ کا ایک مربوط نیٹ ورک آپریٹ کر رہا ہے۔ وہ مجرموں کی ذہنیت سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ چوہدری نواز کی جانب سے اسے اپنے دو دشمنوں (ساحل + وجدان) سرکوبی کے احکام ملے ہیں۔ ہم نے ہوٹل میں اپنی چھپانے کے لیے (بیلا + جاوید) کے نام استعمال کیے پہلو کو نظرانداز نہیں کر سکتا کہ ہم مزید فرضی ناموں لے کر شہر سے نکل سکتے ہیں۔" ایک لمحے کو رک کر ساحل کے چہرے پر پائے جانے والے تاثرات کا اور کہا "سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارے کمر میاں زاہد کے بندوں کو وہ ڈائری مل گئی ہو گی جس کے لیے اس نے ہمارا پیچھا پکڑا ہوا تھا۔ وہ ڈائری پا بعد میاں زاہد کے لیے ہماری اہمیت خود بہ خود کم ہو جا وہ اس وقت ہماری جانب توجہ دینے کے بجائے پہلی میں اس ڈائری کو اپنے ولی نعمت ملک نوازش علی تک کی تگ و دو میں لگا ہو گا۔"

ساحل اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی "تم وضاحت اور منطق سمجھ میں آ رہی ہے لیکن کوئی اٹھانے سے قبل ہمیں ایک نہایت ہی ضروری کام گا۔"

"کون سا کام؟" اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

وہ بولی "ہمیں جلد از جلد اپنے لیے کسی محفو

مضبوط ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہو گا۔ کسی بھی بڑے کام کے لیے ایک فرم فاؤنڈیشن ضروری ہے۔ ہمارے پاس ایک ایسا پلیٹ فارم ہونا چاہیے جہاں کھڑے ہو کر ہم پرفارم کر سکیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا وجدان؟"

"اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا "تم سمجھاتی ہی اس طرح ہو کہ کوئی نہ بھی سمجھنا چاہے تو سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

وہ بے چین ہو کر بولی "اس میں مسکرانے والی کون سی بات ہے۔ میں نے تو ایک انتہائی سنجیدہ معاملے کی طرف تمہاری توجہ دلائی ہے!"

میں نے بہ دستور مسکراتے ہوئے جواب دیا "ساحل! میں تمہاری سنجیدہ بات پر نہیں بلکہ تمہارے اسٹائل پر بے ساختہ مسکرایا ہوں۔"

"کیوں۔ کیا ہوا میرے اسٹائل کو؟" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

"ہر گزرتے دن کے ساتھ تمہارے اسٹائل بدلتے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا "آج کل تم جتنی میچور اور سوجھ بوجھ کی باتیں کر رہی ہو اسے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی دھونس ہو جو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں بچوں کی طرح اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھیں۔ شوخی اور شرارت تمہارے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دنیا کے کسی غم اور فکر سے تمہیں کوئی علاقہ نہیں تھا پھر میں نے تمہارا معصومیت بھرا سوگ وار روپ بھی دیکھا ہے۔ جب تم کھٹمنڈو سے ہندوستان آئیں تو تمہاری سادگی اور بے خبری بھی دیکھنے کی چیز تھی۔ اور اب تم جتنی بڑی بڑی اور بردباری کی باتیں کرنے لگی ہو' تمہارا یہ انداز یا روپ حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

وہ ایک ادا سے بولی "پہلی بات تو یہ کہ میں اب دھنو نہیں رہی لہٰذا دھنو نامی لڑکی سے منسوب ہر اسٹائل ختم ہو گیا۔ تم نے میرا نام ساحل رکھ دیا۔ میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ مجھ میں' تمہیں جو تبدیلی نظر آ رہی ہے وہ اس نام کا اثر ہے۔ مگر میں ایسا نہیں کہوں گی!"

اس نے بات روک کر سنجیدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا "تم ایسا کیوں نہیں کہو گی؟"

"کیوں کہ میں ایسا نہیں سمجھتی۔" اس کی سنجیدگی اور گہری ہو گئی۔

"پھر تم کیا سمجھتی ہو؟" میں نے کریدا۔

"یہ سب تمہاری قربت کا اثر ہے وجدان!" وہ بے باکی سے بولی۔

میں اس سے کسی ایسے ہی تیکھے جواب کی توقع کر رہا تھا لہٰذا مجھے حیرت کا جھٹکا لگا اور نہ ہی میں سناٹے میں رہ گیا۔ میرے اور ساحل کے درمیان پائی جانے والی رفاقت کا عرصہ بہت مختصر تھا تاہم اس قلیل مدت میں' میں اسے اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ بڑی عجیب و غریب لڑکی تھی۔ میری زندگی میں درجنوں لڑکیاں آئی تھیں اور آ کر چلی گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر مجھ سے محبت کرتی تھیں اور بعض تو اپنی محبت میں جان کا نذرانہ دے کر امر ہو گئی تھیں۔ تھائی وانگ' جانکی ویوی اور..... کون کون سے نام گنواؤں!

کہتے ہیں' دنیا میں جتنے انسان ہیں' اتنے ہی محبت کرنے کے انداز بھی ہیں۔ ہر انسان اپنے اسٹائل سے محبت کرتا ہے۔ جن لوگوں کا اسٹائل قدرے پیچیدہ ہوتا ہے ان کی محبت عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسے مشکل پسند محبت کرنے والے اپنے محبوب کو بھی مشکلات میں ڈال دیتے ہیں۔ بہرحال' محبت ہر حال میں محبت ہوتی ہے اور جب یہ ہوتی ہے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ سمجھ کر ذہن سے کیا جانے والا فیصلہ نہیں جس میں کوئی مجرب فارمولا استعمال کر کے ضرب' تقسیم سے اپنے حسب منشا جواب حاصل کیا جا سکے۔ یہ تو دل کی آواز ہے' الوہی جذبہ ہے۔ جس پر کسی کو اختیار نہیں۔ شاید اسی لیے اکثر محبت کرنے والے بے اختیار نظر آتے ہیں!

ساحل اپنے دل میں میرے لیے جو جذبات رکھتی تھی' میں ان سے بہ خوبی آگاہ ہو چکا تھا۔ وہ بڑے ضبط اور ربط والی لڑکی تھی۔ میں نے اسے عجیب و غریب کہا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا۔ وہ عام محبت کرنے والوں سے بہت مختلف تھی۔ اسے اپنے جذبات اور افعال پر کمال کا عبور حاصل تھا۔ اس کے جذبات میں دیوانگی تھی مگر عمل سے فرزانگی جھلکتی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک حیرت انگیز لڑکی تھی!

"کس سوچ میں ڈوب گئے وجدان؟" مجھے خاموش پا کر اس نے پوچھا۔

"اوں۔" میں چونک گیا پھر بات بناتے ہوئے کہا "میں تمہاری تجویز پر غور کر رہا ہوں وہی مستقل ٹھکانے والی تجویز۔"

اس نے کہا "ہم اس مقصد کے لیے قاضی سلطان کے صحافی دوست منہاس باقر سے مدد لے سکتے ہیں۔ وہ ایک

طاقت ور پبلشر ہے۔ یہ کام اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

"پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" میں نے کہا "لیکن اب ارادہ بدل دیا ہے۔"

"ارادہ بدلنے کی وجہ کیا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

میں نے ساحل کو میاں زاہد کی ان باتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو اس نے ہمارے "انڈین ایجنٹ" ہونے کے بارے میں کہی تھیں۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ راشد منہاس روڈ پر ہونے والی قتل و غارت گری کی واردات کو ہمارے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ اخبارات یہی خبریں شائع کریں گے کہ "را" کے تربیت یافتہ ایجنٹوں نے کراچی کا سکون درہم برہم کرنے کے لیے دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا۔ ان ایجنٹوں کے ذکر میں وجدان اور ساحل کا نام بھی آئے گا۔ اس طرح پورا شہران ناموں کی جانب متوجہ ہو جائے گا۔ میاں زاہد نے اپنے جاں بہ لب آدمی سے اپنی مرضی کا بیان دلوا کر بہت گہری چال چلی تھی۔ ہمارے پاس ایسی کوئی شناخت نہیں تھی جس سے خود کو بے گناہ ثابت کر سکتے۔ اہلِ شہر ہمیں انڈین ایجنسی "را" کا ایجنٹ سمجھنے پر مجبور تھے یا یوں کہہ لیں کہ انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میاں زاہد حسین کے جن تین بندوں نے سفید شیر ڈیمیں ہمارا تعاقب کیا تھا ان میں سے دو تو موقع پر ہی "سی ایف کے" والوں کی فائرنگ سے ہلاک ہو گئے تھے جب کہ تیسرا آدمی جو ڈرائیونگ کر رہا تھا اسے شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا اور اس نے اپنے باس کی زبان بولتے ہوئے پولیس کو بیان دیا تھا کہ ان کی گاڑی پر "را" کے تربیت یافتہ ایجنٹ وجدان نے گولیاں برسائی تھیں۔ جھوٹا بیان دینے والا شخص تو جہنم واصل ہوا ہی تھا لیکن جاتے جاتے ہمارے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر گیا تھا۔

راشد منہاس روڈ والا خونیں واقعہ اتنا اہم تھا کہ آج کے تمام اخبارات اس کی خبریں لگاتے۔ ان حالات میں یہ سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ منہاس باقر کا اخبار وہ خبر نہیں چھاپے گا۔ وہ تو ویسے بھی شام کا اخبار تھا۔ ایوننگر' اپنی چٹ پٹی' مسالے دار اور مبالغہ آمیز خبروں کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ہماری خبر کو منہاس باقر کا اخبار پتا نہیں' کس بلندی پر اچھالتا اور ہمیں کس پستی میں گراتا۔ سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ہم سے پہلے ہی ہماری "شہرت" منہاس باقر تک پہنچ جاتی تھی لہٰذا اس طرف رخ پھیرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے ساحل کو میاں زاہد حسین سے ہونے والی فون گفتگو کے پس منظر میں صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلایا تو وہ پریشان ہو گئی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔" وہ سرا سیمہ لہجے میں بولی "اب تو ہمیں کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔ ابھی تک میرے کے بارے میں بھی کوئی....."

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ میں چونکہ اس کی جانب متوجہ تھا اس لیے اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تازہ ترین تاثرات مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ وہ عقب میں دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے سے تذبذب اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے فطری ردِعمل کے طور پر اس کی نگاہ کے تعاقب میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو ساحل کے تذبذب کا سبب میں آگیا۔ آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر موجود شخص کو دیکھ میں چونک اٹھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے پہچاننے میں مجھے دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔

وہ امتیاز تھا..... امتیاز علی۔ "سی ایف اے" نامی تنظیم کا ایک اہم رکن "کرائم فری کراچی" نامی اس ناقابل تنظیم کو ابھی تک میرے ذہن نے قبول نہیں کیا تھا۔ میں اس نوعیت کے کسی ادارے کے بارے میں پہلے کبھی سنا تھا۔

امتیاز کا رخ ہماری میز کی جانب تھا اور اس کے چہرے سے دوستانہ تاثرات کو بڑی وضاحت سے دیکھا جا سکتا تھا قریب آکر اس نے ہمیں سلام کیا اور مسکرا کر بولا۔

"جگر! کہاں کا ٹکٹ کٹوا لیا؟"

آج اس کے طرزِ تخاطب میں کل کی بہ نسبت زیادہ تکلفی پائی جاتی تھی۔ میں نے گول مول جواب دینے پر کیا "ہم کہاں جائیں گے دوست۔ بس ذرا کافی پینے آگئے تھے۔"

"کافی پینے!" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے نیم طنزیہ دوستانہ لہجے میں بولا "وہ بھی کلفٹن سے اتنی دور ایئرپورٹ پر؟" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ "تم تو اپنے کسی رشتے دار سے ملنے لاہور سے کراچی آئے ناجو کلفٹن میں رہتا ہے؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے کہا "یار' کیا کھڑے ہی انٹرویو کرتے رہو گے۔ آرام سے بیٹھ کر کرو۔"

پھر میں نے میز کے گرد پڑی ایک خالی کرسی کی جانب اشارہ کر دیا۔ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

امتیاز پر نظر پڑنے سے قبل میرے اور ساحل کے درمیان اپنے لیے کسی مضبوط اور محفوظ ٹھکانے کے بارے میں تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ امتیاز کی صورت دیکھتے ہی میرے دماغ میں ایک جگنو سا چمک اٹھا۔ بڑی سرعت سے میرے ذہن نے سوچا' میں ذرا سی کوشش کر کے "سی ایف کے" کے درمیان جگہ بنا سکتا ہوں۔ مجھے اس تنظیم کے اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی سروکار۔ میں عارضی طور پر اپنے لیے "سرچھپانے" کا کوئی ٹھکانا کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے "سی ایف کے" میرے لیے بہت ہی مفید اور مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے امتیاز سے ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی۔

"یار! کافی تو ایک بہانہ ہے۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا "دراصل ہمارے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی ہے جو ہم تمہیں یہاں نظر آرہے ہیں۔"

"کیسی ٹریجڈی؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "ہم اپنے جس عزیز سے ملنے آئے تھے۔ وہ اتفاق سے گھر پر نہیں ملا۔ اس لیے ہمیں ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا اور ادھر ہوٹل میں میاں زاہد نے ہمارا جینا حرام کر دیا۔"

وہ تنگ زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ اگر تمہارا وہ عزیز گھر میں نہیں ملا تو ہوٹل میں ٹھہرنے کی نوبت کیوں آئی۔ تم اس کے گھر میں ٹھہر سکتے تھے۔"

"چند ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پر ایسا ممکن نہیں تھا۔" میں نے مبہم سا جواب دیا "فرصت میں تمہیں تفصیلاً بتاؤں گا۔"

وہ کرید سے گریز کرتے ہوئے بولا "یہ میاں زاہد تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گیا ہے؟"

"شاید اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بولا "اس کا دماغ خراب ہوا ہے یا نہیں لیکن تم میرا دماغ ضرور خراب کر دو گے!"

اس کا انداز ذومعنی تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "کیوں' میں نے ایسا کیا کیا ہے؟"

"دیکھو دوست!" وہ یک لخت بے حد سنجیدہ ہو گیا "سچی بات تو یہ ہے کہ میں نہ تو پہلے تمہاری کہانی پر یقین کیا تھا اور نہ ہی اب اعتبار کر رہا ہوں۔ تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو یا جو کچھ اپنے بارے میں بتاتے ہو۔ تم بڑے گہرے آدمی ہو اور میاں زاہد کے لیے تمہاری بہت اہمیت ہے جبھی اس کے بندوں نے ریلوے اسٹیشن سے تمہارا پیچھا کیا اور اب بھی ہوٹل میں وہ تم سے "دل لگی" کر چکا ہے جو تم یہاں بیٹھے کافی پیتے نظر آرہے ہو۔ یقیناً تمہارے درمیان کوئی دیرینہ دشمنی چل پھول رہی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

آخری جملہ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ادا کیا تھا۔ میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا "تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ میری اصل دشمنی لاہور کے ایک نواحی سرحدی گاؤں موضع "رکھاں والی" کے چوہدری ملک نوازش علی سے ہے۔ میاں زاہد حسین' چوہدری نوازش علی کا آلۂ کار ہے اور مجھے لاہور جانے سے روکنے کے لیے اسے سخت ترین احکام موصول ہوئے ہیں۔ وہ اسی سلسلے میں مجھے ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میں نے دانستہ سونے کی رازوالی ڈائری کا ذکر گول کر دیا تھا۔ امتیاز کھوجنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولا "اس کا مطلب ہے' تم لاہور سے نہیں آئے ہو ورنہ تمہیں لاہور جانے سے روکنے کا جواز نہیں بنتا!"

اس نے بڑی جاندار دلیل دی تھی۔ میں نے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں لاہور سے نہیں بلکہ انڈیا سے آیا ہوں..... اور اس سے پہلے سنگاپور سے ہندوستان پہنچا تھا۔"

وہ گمبھیر انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے قدرے وضاحت کرتے ہوئے کہا "چوہدری نوازش علی کی اصل دشمنی میرے والد عابد علی سے تھی۔ میرا باپ مجھے بچپن ہی میں سنگاپور لے گیا تھا۔ چوہدری کے آدمیوں نے میرے والدین کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا اور میں ان قاتلوں کا تعاقب کرتے ہوئے پہلے انڈیا پہنچا اور پھر سراپا انتقام بن کر یہاں آیا ہوں۔ چوہدری نوازش مجھ سے خاصا دہشت زدہ ہے اور مجھے خود تک پہنچنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' تم چوہدری نوازش علی کے لیے کوئی توپ قسم کی چیز ہو!" وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا "میں نے کہا نا' ذرا فرصت مل جائے تو پھر تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا۔"

"میں نے تمہیں دوست کہا ہے اور دوستی نبھانا بھی مجھے آتا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "بتاؤ' میں فوری طور پر تمہارے لیے کیا کروں؟"

اس کی پیش کش میں مجھے خلوص کی جھلک نظر آئی۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا اس کا تقاضا تھا کہ مجھے کسی نہ کسی پر تو اعتماد کرنا ہی ہوگا۔۔۔ اور وہ امتیاز علی سے بہتر فی الحال اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "مجھے اپنے قیام کے لیے کوئی محفوظ جگہ درکار ہے۔ سردست اتنا ہی ہو جائے تو بہت ہوگا۔"

وہ فراخ دلی سے بولا "سمجھو' تمہارے قیام کا مسئلہ حل ہو گیا۔ آج تم میرے ساتھ' میرے فلیٹ پر رہو گے اور کچھ؟"

میں نے تہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا۔ میں نے کہا "دوست! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

"دوست بھی کہتے ہو اور احسان مندی بھی ظاہر کرتے ہو۔" وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "امتیاز ہمیشہ بے لاگ اور بے لوث دوستی کرتا ہے۔"

"تم جس مشکل وقت میں میرے کام آرہے ہو میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔" میں نے اسے زیادہ سے زیادہ اعتماد میں لیتے ہوئے کہا "ورنہ آج کل کون کسی کا ساتھ دیتا ہے اور وہ بھی کسی اجنبی کا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا "تم ایک اچھے انسان ہو اس لیے میرے تعاون کا بوجھ اپنے شانوں پر محسوس کر رہے ہو مگر فکر نہ کرو' میں تمہیں یہ بوجھ اتارنے کا بہت جلد موقع دوں گا۔۔۔ یعنی آج ہی' رات کو!"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" اس کی مبہم بات کے جواب میں' میں نے کہا۔

وہ بات کرنے سے پہلے بڑے دل آویز انداز میں مسکرایا اور بولا "دوست! آج رات تم مجھے اپنی کہانی سناؤ گے۔ بس میں تم سے یہی چاہتا ہوں۔"

"اوہ!" میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔

وہ مذاق کے انداز میں بولا "تم کیا سمجھے تھے کہ میں تم سے کوئی "فائرنگ" وغیرہ کا کام لینا چاہتا ہوں؟"

"نن۔۔۔ نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "ایسا تو میں نے کچھ نہیں سوچا۔"

اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے اچانک اسے کچھ یاد آگیا ہو پھر اس نے پوچھا "دوست' تمہارے دو ساتھی نظر نہیں آرہے۔ وہ کہاں ہیں؟"

میں جانتا تھا' وہ کسی بھی لمحے بوٹا سنگھ اور میر بخش کے بارے میں سوال کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بڑے رسان سے جواب دیا۔

"میر بخش تو ہمارے ہی ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور بوٹا نزدیکی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ میاں زاہد کے آدمیوں نے اغوا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

میں دانستہ بوٹا سنگھ کے بجائے صرف "بوٹا" کا استعمال کر رہا تھا۔ ہم نے آں جہانی کی شناخت کو چھپانے کے لیے یہ راہ نکالی تھی۔

"بہت افسوس ہوا تمہارے ساتھی کی موت کا سن کر۔" امتیاز علی نے رنجیدہ لہجے میں کہا پھر پوچھا "دوسرے ساتھی میر بخش کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے اسے میر بخش کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں مختصراً بتایا۔

وہ میری بات سننے کے بعد اضطرابی لہجے میں مضطر "آپ تینوں کراچی کے کس ہوٹل میں ٹھہرے تھے؟"

میں نے ہوٹل کا نام بتایا اور کہا "یہ ہوٹل صدر علاقے میں واقع ہے۔"

"پھر تو میں یہی کہوں گا کہ تمہارے ساتھی میر بخش زندہ ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔" وہ تشویش ناک انداز میں بولا "اگر وہ اب تک زندہ بھی ہے تو اسے سخت اذیت میں ہوگا۔ تم بتا ہی چکے ہو کہ تمہارے ساتھی کو میاں زاہد کے آدمیوں نے ہلاک کر دیا ہے۔"

میں نے جلدی سے پوچھا "تم میرے ساتھی کی موت و مصیبت کے بارے میں اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہو؟"

ساحل بھی امتیاز کی بات سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ میر بخش کے بارے میں پہلے ہی لاتعداد اندیشوں اور خدشات نے گھیرا ہوا تھا۔

امتیاز نے گمبھیر لہجے میں کہا "وجدان! تم بہ یک وقت خوش قسمت بھی ہو اور بدقسمت بھی مگر تمہاری خوش قسمتی بدقسمتی پر حاوی ہے۔"

"دوست! پہیلیاں نہ بجھواؤ۔" میں نے بے قرار ہو کر میں کہا "جو بھی کہنا چاہتے ہو' کھل کر کہو۔"

اس نے کہا "تم بدقسمت ان معنوں میں ہو کہ تم ہوٹل میں تم نے قیام کیا' میاں زاہد حسین اس کے داروں میں سے ایک ہے۔ تم اسے ہوٹل کا مالک بھی کہہ سکتے ہو۔"

ایک لمحے میں مجھ پر بہت ساری حقیقتیں عیاں ہو

گئیں کہ اس ہوٹل میں میاں زاہد کا اتنا اثر رسوخ کیوں ہے اور ہوٹل کا عملہ اس کے اشاروں پر کیوں ناچ رہا تھا۔

امتیاز علی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "وجدان! خوش قسمت تم اس حوالے سے ہو کہ اس کے چنگل سے زندہ سلامت نکل آئے' گویا تمہاری خوش قسمتی زیادہ طاقت ور نکلی البتہ تمہارا دوست میر بخش۔۔۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ ساحل نے کہا "جلد از جلد! میں تو تمہیں کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں' میر بخش کسی بڑی مشکل میں پھنس چکا ہے۔ لارڈ بدھا اس پر رحم کرے۔"

میر بخش کی سلامتی کے لیے ساحل کی زبان سے بے ساختہ دعائیہ کلمات نکلے تھے۔ امتیاز نے چونک کر ساحل کی جانب دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں مجسم سوال کو فوراً پڑھ لیا اور وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میری ساتھی ساحل کا تعلق "بدھ مت" سے ہے۔"

"ہندوستان میں تم لوگوں کا "ساتھ" ہوا ہوگا!" اس کے لہجے میں پُراسرار سوال تھا۔

میں نے جواب دیا "نہیں' یہ کھٹمنڈو سے میری ساتھی بنی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' تم انڈیا سے پہلے نیپال میں تھے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

اس نے پوچھا "تمہارے وہ دونوں ساتھی بوٹا اور میر بخش بھی وہیں سے آئے تھے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا "بوٹا تو واقعی لاہور سے آیا تھا۔ چوہدری کے بندوں نے اس کی زندگی عذاب کر دی تھی اور وہ اپنی جان بچاتے ہوئے کراچی پہنچا تھا البتہ میر بخش عمر کوٹ سے ہمارے ہمراہ ہے۔"

"عمر کوٹ!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا "یہ تو اندرونِ سندھ کا ایک ضلع ہے۔ تم اس ریگستان میں کیا کرتے پھر رہے تھے؟"

میں نے مختصراً اسے غیر قانونی طور پر اپنے بارڈر پار کرنے کا قصہ سنایا۔

"اوہ!" وہ متاسفانہ انداز میں بولا "پھر تو تم دونوں کے پاس پاسپورٹ اور دیگر شناختی کاغذات بھی نہیں ہوں گے؟"

"ہاں کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔" میں نے بددلی سے کہا پھر اسے میاں زاہد کی چال بازی کے بارے میں بتا دیا کہ وہ کس طرح ہمیں "را" کا ایجنٹ ظاہر کر کے اپنے آدمیوں کی ہلاکت کو ہمارے کھاتے میں ڈالنے کا بندوبست کر چکا ہے۔

"حالانکہ اس کے تینوں بندوں کو ہم نے ختم کیا تھا۔" امتیاز نے کہا۔

میں نے کہا "آج کے اخبارات اس واقعے کی تفصیل شائع کریں گے اور ہمارا باہر نکلنا دشوار ہو جائے گا۔ بیٹھے بٹھائے ہمیں انڈین خفیہ ایجنسی "را" کا ایجنٹ بنا دیا گیا ہے۔"

"حالات سراسر تمہاری مخالفت پر کمربستہ ہیں۔" امتیاز نے پُرتشویش انداز میں کہا "لیکن تم فکر نہ کرو۔ تمہارے پاسپورٹ اور دیگر ضروری شناختی دستاویزات میں تیار کروا دوں گا۔ تم لوگوں کو بس اپنے میک اپ اور گیٹ اپ پر ذرا خصوصی دھیان دینا ہوگا۔ تم بھی یاد کرو گے' کس قسم کے دوست سے واسطہ پڑا تھا!"

"واقعی' تم بہت مختلف قسم کے دوست ہو۔" ساحل نے متشکرانہ انداز میں کہا۔

وہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا "پانچ بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ اب میں دو ڈھائی گھنٹوں کے لیے بہت مصروف ہو جاؤں گا۔ تم لوگ یہیں ریسٹورنٹ میں میرا انتظار کرو گے یا میں تمہیں اپنے فلیٹ کا ایڈریس سمجھا دوں!"

ساحل نے کہا "میرا خیال ہے' ہم ریسٹورنٹ میں ہی تمہارا انتظار کر لیتے ہیں۔"

میں نے امتیاز سے پوچھا "تمہاری مصروفیت کی نوعیت کیا ہے؟"

وہ بولا "دراصل میں اپنے باس کے ایک غیر ملکی دوست کو لینے ائرپورٹ آیا ہوں۔ جہاز کو پونے پانچ بجے یہاں پہنچنا تھا مگر وہ آدھا گھنٹا لیٹ ہے۔ اب سوا پانچ بجے وہ لینڈ کرے گا۔ میں نیچے جاؤں گا کیوں کہ "انٹرنیشنل ارائیول" کے لیے نچلی منزل ہی استعمال ہوتی ہے۔ بالائی منزل "انٹرنیشنل ڈپارچر" کے لیے مخصوص ہے۔ میرے پاس کافی وقت تھا اس لیے ریسٹورنٹ میں آبیٹھا اور یہ ایک اتفاق ہی ہے کہ تم لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔" پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں بھی اس کی تقلید میں کھڑا ہو گیا اور اس سے پوچھا۔ "تمہارے باس کا وہ غیر ملکی دوست کس کنٹری سے آرہا ہے؟"

"انگلینڈ سے۔" اس نے بتایا "میں مہمان کو باس کے بنگلے پر چھوڑ کر تمہیں لینے آجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

وہ جانے سے پہلے کسی الجھن میں نظر آیا پھر کسی فیصلے پر پہنچتے ہی بولا "یار! تم بھی یہاں میرے انتظار میں کیا سوکھتے

پھوٹ گے۔ مجھے زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

اس نے کہا "نیچے پارکنگ میں مہمان کے لیے تو ایک عالی شان گاڑی موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس غیر ملکی مہمان کی حفاظت کی خاطر وہ نیلی ہائی روف بھی آئی ہوئی ہے۔ جس میں ہم نے تمہیں کل راشد منہاس روڈ سے بہادر آباد تک پہنچایا تھا۔ ہائی روف میں اشتیاق اور بابر خان بیٹھے ہیں۔ ہائی روف مہمان والی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلے گی اور مہمان کو بہ حفاظت بنگلے تک پہنچانے میں ایک نگراں محافظ کا رول ادا کرے گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا "مہمان والی گاڑی کو میں ڈرائیو کروں گا۔ تم دونوں ہائی روف کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جانا۔"

ہم دونوں اس کے ساتھ ہولیے۔ بالائی منزل سے زیریں منزل کی جانب آتے ہوئے میں نے امتیاز سے پوچھا "ان حفاظتی انتظامات کو دیکھ کر لگتا ہے، تمہارے باس کا یہ مہمان کوئی نہایت ہی اہم شخصیت ہے؟"

"وہ اصلی انگریز ہے یار۔" امتیاز نے عجیب سے لہجے میں کہا "اور دولت مند بھی اتنا کہ کچھ نہ پوچھو۔ ہم پاکستانی تو کسی غریب سے غریب انگریز کو دیکھ کر بھی مرعوب ہو جاتے ہیں، شاید یہ ہماری غلامانہ ذہنیت کا کمال ہے۔ مسٹر نیل آرمر تو ارب پتی انگریز ہے۔ جو اپنی خوب صورت سیکریٹری کے ساتھ باس سے ملنے آرہا ہے۔"

"اچھا تو تمہارے باس کے مہمان دوست کا نام نیل آرمر ہے!" میں نے دہرانے والے انداز میں کہا "بھئی، اگر وہ انگریز ارب پتی ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا باس بھی کوئی بہت اونچی شے ہے کیوں کہ نیل آرمر کی ارب پتیت بھی اسٹرلنگ میں ہوگی!"

"ہاں، یہ تو ہے۔" وہ فخر سے سینہ تانتے ہوئے بولا "ہمارا باس واقعی بہت زبردست ہے۔"

میں نے کہا "دوست! میرے دل میں تو تمہارے باس سے ملنے کی شدید خواہش اٹھ رہی ہے۔"

"ملوا دوں گا۔ بھئی ملوا دوں گا۔" وہ جلدی جلدی بولا "کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر میں تمہیں باس کے بنگلے پر لے چلوں گا۔"

امتیاز کا رویہ کبھی کبھی مجھے کھٹکنے لگتا تھا۔ وہ خود کو جس قسم کی تنظیم کا رکن بیان کر رہا تھا وہاں تو راز کو انتہائی راز رکھا جاتا ہے اور کسی بھی غیر متعلق شخص کو تنظیم کے معاملے میں ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی کجا یہ کہ اتنا اپنے باس اور اس کے غیر ملکی مہمان دوست کے بارے میں بھی تفصیلاً بتا رہا تھا۔ وہ ہم دونوں کو اپنے فلیٹ پر قیام کش کر رہا تھا اور ہائی روف میں ایک مرتبہ پھر ہمیں موقع فراہم کر رہا تھا۔ میری چھٹی حس چپکے چپکے مجھے رہی تھی کہ کہیں کوئی گڑبڑ موجود ہے۔ کیا گڑبڑ ہے؟ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر میں "بھولا شاہ" بنا رہا تو اس تنظیم کی حقیقت بہت جلد آشکار ہو جائے گی۔

ہم امتیاز کی معیت میں نیلی ہائی روف کے پاس گئے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پینتیس سالہ شخص امتیاز نے بابر خان بتایا تھا۔ کل کی طرح آج بھی اس شلوار قمیض ہی زیب تن کر رکھی تھی۔ امتیاز کا ساتھی اشتیاق جینز اور ٹی شرٹ میں تھا اور وہ نیلی ہائی عقبی حصے میں بیٹھا تھا۔

امتیاز نے اشتیاق سے کچھ کھسر پھسر کی اور اشتیاق ہمارے لیے ہائی روف کا سلائیڈنگ ڈور کھول دیا۔ ساحل کو گاڑی میں سوار کرایا۔ وہ عقبی سیٹ پر براجمان چکی تو میں نے اپنا سفری بیگ اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس بیگ کو دیکھ کر امتیاز چونک اٹھا اور اس نے

"جگر! یہ کل والا بیگ تو نہیں۔ کیا نیا خریدا ہے؟"

میں دل ہی دل میں اس کی قوتِ مشاہدہ کی داد دیے نہ رہ سکا۔ وہ جزئیات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ میں نے بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ بیگ بوٹا کا تھا جو ہوئے ہم نے اس کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ بیگ ہم نے لیے نیا خریدا ہے۔"

"کیا تم گاڑی میں نہیں بیٹھو گے؟" مجھے باہر ہی کر کرا امتیاز نے سوال کیا۔

میں نے کہا "دوست! تمہارے باس کے مہمان فلائٹ نے ابھی لینڈ کیا ہے۔ اسے ائرپورٹ کی عمارت باہر نکلنے میں کم از کم آدھا گھنٹا تو لگے گا۔ اس سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔ اگر تم کوئی حرج نہ محسوس کرو دوران میں، میں تم سے گپ شپ کر لیتا ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں ہے گپ شپ میں۔" وہ عام میں بولا "لیکن میں تمہارے پاس نہیں رک سکتا۔ مجھے ارائیول لاؤنج میں پہنچنا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں تمہیں رکنے کے لیے کب کہہ رہا ہوں۔"

"پھر!" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"میں تمہارے ساتھ ارائیوال لاؤنج تک جاتا ہوں۔"

"میں نے کہا "جب تمہارے باس کا وہ انگریز مہمان اپنی طرح میں سیکریٹری کے ساتھ عمارت کے اندرونی حصے سے نمودار ہو گا تو میں فوراً واپس آکر ہائی روف میں بیٹھ جاؤں گا۔ تم اپنے مہمانوں کے ساتھ ان کے لیے آئی ہوئی عالی شان گاڑی کی جانب بڑھ جانا۔"

وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "تمہاری تجویز معقول اور قابلِ عمل ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں ائرپورٹ کے اس حصے میں کھڑے تھے جو انٹرنیشنل فلائٹس سے آنے والے مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ جگہ جگہ چھت سے لٹکے ہوئے "انٹرنیشنل ارائیول" کے نیون سائن نظر آرہے تھے۔ ایک مقام پر وہ بورڈ آویزاں تھا جس پر لینڈ کرنے والے جہازوں کی تفصیل تھی اور ان فلائٹس کا بھی اندراج تھا جو اب تب میں لینڈ کرنے والی تھیں۔ ارائیوال لاؤنج میں اس وقت استقبال کرنے والوں کا خاصا رش ہو رہا تھا۔

امتیاز نے مذکورہ بورڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایک غیر ملکی ایئرلائن کا نام اور فلائٹ نمبر دہرایا اور مجھ سے کہا "مسٹر نیل آرمر اس فلائٹ سے آئے ہیں۔"

وہ جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ میں نے امتیاز کی بات کے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا "کل تم لوگوں نے جس نیلی ہائی روف میں واردات کی تھی آج اسی گاڑی کو ائرپورٹ لے آئے ہو۔ یہ کوئی دانش مندی تو نہیں۔"

وہ بولا "اس گاڑی جیسی کم از کم تین ہزار نیلی ہائی روف کراچی کی سڑکوں پر دندناتی پھر رہی ہیں۔ ہماری گاڑی کی جانب کون توجہ دے گا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا "پھر یہ بھی ہے کہ راشد منہاس روڈ پر ہمیں کسی نے فائرنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور نہ ہی کسی نے ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس گاڑی کی جانب کسی نے توجہ نہیں دی۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کروں گا دوست۔" میں نے کہا "تم اس بلوکیب والے کو بھول رہے ہو جو ہمیں ریلوے اسٹیشن سے وہاں تک اپنی ٹیکسی میں لایا تھا۔ وہ تم لوگوں کی فائرنگ کا عینی شاہد ہے اور تمہاری نیلی ہائی روف کا نمبر بھی ضرور اس کے ذہن میں کہیں چپک گیا ہوگا۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے کہا "اس کے علاوہ بھی ایک خاص بات ہے۔"

وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا اور بولا۔ "میں تمہاری بات یا دلیل سے اس حد تک اتفاق کرتا ہوں کہ ٹیکسی ڈرائیور اس واردات کا عینی شاہد ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے لیے کسی بھی طور خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ اپنی بچت کی خاطر زبان بند رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔" یہاں تک کہہ کر اس نے طویل سانس خارج کی اور پوچھا "اس کے علاوہ وہ خاص بات کون سی ہے؟"

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں امتیاز کو ابن معلومات سے آگاہ کیا جو میاں زاہد نے ٹیلی فونک رابطے کے دوران میں مجھے بتائی تھیں۔ اس کے بہ قول، اس کا ایک کارندہ موٹر بائیک پر سفید شیرڈ والوں کی نگرانی کر رہا تھا جس سے شیرڈ والے بھی واقف نہیں تھے۔ اسی نگراں جاسوس نے میاں زاہد کو بوٹا سنگھ اور ہمارے قیام کے بارے میں بتایا تھا۔ نیلی ہائی روف اور اس میں موجود افراد کی "کارروائیاں" بائیک والے جاسوس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔

امتیاز نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور تحمل آمیز انداز میں کہا "اول تو مجھے یقین ہے، میاں زاہد نے کسی نگراں جاسوس کے حوالے سے تم سے غلط بیانی کی ہے۔ ہم بڑی باریک بینی سے اپنے گردوپیش پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ایسا کوئی بائیک والا مشکوک بندہ ہماری نظر میں نہیں آیا۔ میاں زاہد نے تم پر رعب گانٹھنے کے لیے تمہیں یہ کہانی سنائی ہوگی۔" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اور فرض کریں، اگر ایسا ہوا بھی ہو تو دوست، کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس بائیک والے کے ڈر سے یا میاں زاہد سے خوف زدہ ہو کر ہم نظر بند تو نہیں ہو سکتے۔ ہم جتنے بڑے مشن پر سرگرم ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ہمہ وقت باگرم بھی رہیں۔ تم ہماری زندگی کو "ایٹ ہائی رسک" کہہ سکتے ہو۔"

میں نے اس موضوع پر امتیاز سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک موبائل نیوز اسٹینڈ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس اسٹینڈ کو آپریٹ کرنے والا ہماری جانب ہی آرہا تھا۔ اسٹینڈ پر مختلف رسائل، میگزینز اور آج کے تازہ اخبارات سجے تھے۔ امتیاز فوراً سے پیش تر میرا مطمحِ نظر بھانپ گیا اور اس نے نیوز اسٹینڈ والے سے ایک، اردو کا معروف اخبار خرید لیا۔ میں نے ایک انگلش نیوز پیپر کو ترجیح دی۔ امتیاز نے اس اخبار کی رقم بھی اپنی جیب سے ادا کر دی۔

اس وقت تک ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا۔ ہم دونوں

اپنے اپنے اخبارات کو دیکھنے لگے۔ میری نظر اخبار میں کل والی واردات کو تلاش کر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں میری کوشش بارآور ہو گئی۔ اس دوران میں امتیاز بھی مذکورہ خبر ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ ہم نے باری باری دونوں اخبارات کی خبروں کا جائزہ لیا۔ کم و بیش ایک جیسی کوریج تھی تاہم زبان اور پیش کش کا انداز مختلف تھا۔ گولیوں سے چھلنی سفید شیڈ کی تصویر دونوں اخبارات میں ایک ہی جیسی تھی۔

میاں زاہد حسین کا کہا اخبارات کی زینت بن گیا تھا۔ اس خبر کا لب لباب یہ تھا۔۔۔ بدنام زمانہ انڈین خفیہ ایجنسی "را" کے دو تربیت یافتہ ایجنٹ کراچی کا امن و امان درہم برہم کرنے غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہو چکے ہیں۔ خفیہ اور باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ ان خطرناک لوگوں میں ایک وجدان نامی مرد ہے اور دوسری اس کی ساتھی ساحل ہے۔ وہ دونوں مارشل آرٹس کے ماہر اور ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرنے پر قدرت رکھتے ہیں' وہ کل صبح اندرون سندھ سے کراچی پہنچے اور پہلی واردات انہوں نے راشد منہاس روڈ پر کی جہاں تین بے گناہ شہریوں کو گولیوں سے چھلنی کر کے وہ فرار ہو گئے۔ پولیس بڑی سرگرمی سے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ آخر میں ہمارے حلیوں کی کچھ تفصیل بیان کی گئی تھی اور شہریوں سے پُرزور اپیل بھی کی گئی تھی کہ وہ اگر اس حلیے کے کسی مرد یا عورت کو کہیں دیکھیں تو فوراً ایمرجنسی نمبر پر پولیس کو اطلاع دیں۔ اہل شہر کا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ تسلی بھی دی گئی تھی کہ وہ "را" کے ایجنٹوں سے ہرگز نہ ڈریں اور انہیں قانون کے حوالے کرنے کے سلسلے میں انتظامیہ اور پولیس سے بھرپور تعاون کریں۔

امتیاز نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "جگر! تم دونوں کے لیے صورت حال خاصی تشویش ناک ہو گئی ہے۔ اب تمہیں یوں کھلم کھلا باہر نہیں پھرنا چاہیے۔ میں آج ہی تمہارے گیٹ اَپ اور میک اَپ کا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ تم دونوں کے حلیوں کی تفصیل چھپنے کے بعد یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور الجھن زدہ لہجے میں کہا "یہ تو ہو جائے گا مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔" ایسا کہتے ہوئے میں اخبار کے اندرونی صفحات میں بھی جھانک رہا تھا۔

"تم کس بات پر الجھ رہے ہو جگر!" امتیاز نے چونک کر پوچھا۔ اس نے مجھے دوست یا یار کے بجائے اب "جگر" کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے اس انداز میں سادگی اور اپنائیت تھی۔

میں نے کہا "پورے اخبار میں کہیں اس ہوٹل کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی وہاں ہونے والی مار دھاڑ کا تذکرہ جہاں ہم ٹھہرے تھے۔"

امتیاز نے کہا "اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے پر اکتفا کیا۔

وہ بولا "پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ میاں زاہد چونکہ اس ہوٹل کا ایک پارٹنر ہے اس لیے ممکن ہے' اس نے اپنے ہوٹل کو اس معاملے میں ملوث کرنے کو مناسب نہ سمجھا ہو۔ وہ یہاں پر تمہارا دشمن اول ہے۔ وہ اپنے اسٹائل سے نمٹنا چاہتا ہو گا۔"

میں نے حیرت سے امتیاز کو دیکھا اور کہا "کیا بات کر رہے ہو دوست! ہوٹل والا واقعہ اور اس کے بعد ایم آر روڈ پر جو کچھ پیش آیا وہ چھپنے یا چھپانے والے معاملات میں ہیں۔ تمہاری وضاحت سے تو لگتا ہے' یہاں کے اخبارات میاں زاہد کے اشاروں پر خبریں شائع کرتے ہیں۔ کیا پاکستان میں پریس آزاد نہیں؟"

وہ زیر لب مسکرایا اور گمبھیر آواز میں بولا "یہاں پریس اور میڈیا کتنا آزاد ہے یہ تو کہیں رفتہ رفتہ خود ہی کھل جائے گا لیکن میں نے اخبارات میں' ہوٹل والے واقعے کی خبر کی غیر موجودگی کے سلسلے میں جو بھی وضاحت کی ہے' اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ واقعی یہ سب کچھ میاں زاہد کے اشارے پر کیا گیا ہو گا۔ میں نے تو ایک امکان کا اظہار کیا ہے۔ بہرحال' یہاں کا میڈیا اور اخبارات مختلف قسم کے دباؤ کا شکار تو رہتے ہیں۔"

اس نے گول مول جواب دے کر بات نبھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ پوچھا "امتیاز! ایک وجہ تو تم نے بتا دی۔ اب دوسری وجہ بیان کرو۔ تم نے کہا تھا' ہوٹل والے واقعے کے غیاب کی وجوہ ہو سکتی ہیں!"

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا "دوسری وجہ میرے خیال میں یہ ہو سکتی ہے کہ وہ واقعہ چونکہ ساڑھے تین' چار بجے پیش آیا ہے پریس تک یہ خبر پہنچتے مزید دیر ہو گئی ہو گی۔ اس لیے صبح کے اخبارات میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو گا۔ ممکن ہے' شام کے اخبارات حوالے سے خبریں لگائیں۔"

یہ وجہ قرین قیاس تھی۔ میں قدرے مطمئن ہو گیا۔

اسی وقت امتیاز نے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہمارے مہمان آ گئے۔"

میں نے اس کے اشارے کی تقلید میں اس مقام کو دیکھا جہاں سے مسافر ایک ایک کر کے باہر آ رہے تھے۔ ہم رینگ کا سارا لے دس بارہ فٹ دور کھڑے تھے۔

انگریز مہمان نیل آرمر کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکا ہوں۔ جلد ہی مجھے یاد آ گیا کہ میں ایسا کیوں محسوس کر رہا ہوں۔ میں نیل آرمر کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور میرے ان محسوسات کا سبب یہ تھا کہ وہ ہالی ووڈ کے فلم اسٹار مائیکل ڈگلس سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ میں نے سنگاپور اور تھائی لینڈ میں مائیکل ڈگلس کی چند فلمیں دیکھی تھیں۔ نیل آرمر کی عمر لگ بھگ پچپن سال رہی ہو گی جب کہ مائیکل ڈگلس اس وقت اس سے خاصا کم عمر تھا۔ بس ان میں عمر ہی کا فرق تھا ورنہ صحت اور شکل و شباہت میں انیس بیس کا ہی تفاوت ہو گا۔

نیل آرمر کے ساتھ اس کی سیکریٹری بھی قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ اس نے فل اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا' کھلے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اس کی ہائیٹ کسی بھی طور پانچ آٹھ سے کم نہیں رہی ہو گی۔ پاؤں میں موجود پینسل ہیل سینڈل "کھٹ کھٹ" کی مخصوص آواز پیدا کر رہی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے اسکن کلر لیگنگ کا استعمال کر رکھا تھا۔ اس کی چال نرالی' ڈھال متوالی اور انداز میں بے پناہ دل کشی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک حسین و جمیل عورت تھی۔

انگریز۔۔۔ خاص طور پر عورتیں عموماً خوبصورت ہی ہوتی ہیں۔ کسی بدصورت یا کم صورت عورت کو ڈھونڈنے کے لیے خاصی محنت کی ضرورت ہوتی ہے تاہم ہمارے پاکستانی بھائی جو یورپ کی فرنگنوں سے شادی کرتے ہیں' وہ اس تلاش اور جستجو میں بڑے ماہر اور کامیاب ثابت ہوئے ہیں!"

امتیاز نے دھیرے سے سرگوشی کی "جگر! تم فوراً ہائی روف میں پہنچو۔ میں مہمانوں کو لے کر آ رہا ہوں۔"

پھر وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے نیل آرمر اور اس کی سیکریٹری کی جانب بڑھ گیا جو اب خاصے قریب آ چکے تھے۔ میں خاموشی سے وہاں سے کھسک لیا۔

✪✲✪

گزشتہ رات ساحل نے تھوڑی بہت نیند لے لی تھی مگر میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ پہلے میں ڈائری کے مطالعے میں غرق رہا۔ ادھر سے فرصت ملی تو میاں زاہد

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات
ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ
وہ فن پارے' جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ
جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت -/100 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ جو بیگانگی کے بہانے میں اپنا منہ چھپا کر بیٹھ گئے ہیں
قیمت -/250 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

کالی کہانیاں
جرائم' جادو' شیطان ازم' ارواح' طلسم و مزاح' ماسرز و خوف' سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت -/30 روپے ڈاک خرچ -/23 روپے

بنک ویلوٹ کی چوریاں
مشہور جرنگ ڈیلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چراتا ہے
دو حصے۔ قیمت فی حصہ -/60 روپے ڈاک خرچ -/23 روپے

-/500 روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف
یہ عنایت پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی حاصل ہو گی

کتابیات پبلی کیشنز
23 اردو بازار کراچی 74200
فون: 2602521 فیکس: 2602562-2633219
Email: kitabist@wasa.net

کے ٹیلی فون نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد پے در پے ایسے واقعات پیش آتے چلے گئے کہ میں سونے یا آرام کرنے کے بارے میں سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا' دشمنوں سے ہلکی پھلکی "اٹکھیلیوں" میں رات کا باقی حصہ بھی بیت گیا۔ ان حالات میں سکون اور آرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ائیرپورٹ سے نکل کر منزل تک پہنچنے کے دوران میں آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت تھی لہٰذا میں نیند سے لڑتا رہا حالانکہ اس وقت دل تو یہی چاہ رہا تھا' پڑ کر لمبا سو جاؤں اور دو چار دن کے بعد ہی اٹھوں مگر یہ ممکن تھا اور نہ ہی مناسب۔ اس لیے میں نے اس خیال کو ذہن سے اور خواہش کو دل سے باہر نکل پھینکا۔

ہائی روف میں موجود اشتیاق احمد خاصا الرٹ بیٹھا تھا' وہ اپنی عقابی نگاہ سے باہر کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ایک "کے۔کے" تیار حالت میں اس کے دائیں ہاتھ پر پڑی تھی جسے وہ آن واحد میں استعمال کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ ڈرائیور بابر خان بڑی مشاقی سے ہائی روف کو ڈرائیو کر رہا تھا۔ غیر ملکی مہمان ہم سے پانچ چھ فٹ آگے ایک چمچماتی نیوی بلیو ہونڈا اکارڈ میں منزل کی جانب رواں دواں تھے۔

سب خیریت گزری اور ہمارا یہ سفر ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے پر ختم ہوا۔ اس عالی شان رہائشی علاقے میں آکر دونوں گاڑیوں میں درمیانی فاصلہ قدرے بڑھ گیا تھا اور جب امتیاز نے ہونڈا اکارڈ کو ایک ذی شان بنگلے کے سامنے روکا تو بابر خان ہائی روف کو اسی اسٹریٹ پر تھوڑا آگے لے گیا اور پھر گاڑی کو ایک جانب روک دیا۔ اس کی محتاط نظر بنگلے کے گیٹ پر ٹکی ہوئی تھی۔

میں نے لب کشائی کی اور اشتیاق سے پوچھا "بھائی! کیا ہم بنگلے کے اندر نہیں جائیں گے؟"

اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے کوئی جواب نہ دینا چاہتا ہو' تاہم اس نے سنجیدگی سے کہا "تمہارے ہر سوال کا جواب امتیاز ہی دے گا۔"

"اتنا تو بتا دو۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا "ہونڈا اکارڈ جس بنگلے میں داخل ہوئی ہے' کیا تم لوگوں کا باس یہیں رہتا ہے؟"

اس وقت تک نیوی بلیو اکارڈ مذکورہ بنگلے کے اندر غائب ہو چکی تھی۔

اشتیاق نے محتاط لہجے میں کہا "یہ بھی تم امتیاز ہی سے پوچھنا۔"

اس کے بعد مزید کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اشتیاق دانستہ ہم سے فری ہونے کی کوشش نہیں کر رہا۔ پانچ منٹ کے بعد اسی بنگلے کے گیٹ سے مجھے امتیاز کی صورت نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک مسلح گارڈ بھی تھا۔ امتیاز نے ہماری جانب دیکھ کر ہاتھ کے اشارہ کیا۔ بابر خان نے بڑی سرعت سے گاڑی کو رواں کیا اور بنگلے کے گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ ہائی روف جتنی دیر سے کچھ فاصلے پر کھڑی رہی' میں نے اشتیاق کو ہائی روف میں مگر اب وہ خاصا پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یہ دیر نہ لگی کہ وہ تحفظ کے خیال سے اور کسی متوقع حملے کا پتا چلانے کے لیے بنگلے سے باہر رکا تھا۔ ہائی روف بند اندر داخل ہو کر رک گئی تو امتیاز نے ہمیں گاڑی سے آنے کا اشارہ کیا۔

سب سے پہلے اشتیاق اور اس کے بعد میں اور ہائی روف سے باہر آگئے۔ مسلح گارڈ امتیاز کی ہدایت پر ایک ایسے کمرے میں لے آیا جسے سروینٹ کوارٹر کہا جاتا ہے۔ ہم وہاں لگ بھگ آدھا گھنٹا رکے۔ دوران میں چائے پانی سے ہماری تواضع کی گئی پھر امتیاز اپنے ساتھ لے کر بنگلے سے روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ ہم کی ڈرائیوری میں سفر کر رہے تھے۔

دو چار اسٹریٹ سے گھومنے کے بعد وہ مین روڈ پر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "جگر! تمہیں انتظار مگر میری بھی مجبوری ہے۔ مہمانوں کے لیے انتظامات کرنا تھے۔ اب میں تم لوگوں کو اپنے فلیٹ پر واپس اسی مصروفیت میں لگ جاؤں گا۔ رات میں نشست کریں گے پھر اطمینان کے ساتھ تم سے بات

میں نے اشتیاق سے پوچھا ہوا سوال امتیاز سے "یار! جس بنگلے میں تم نے غیر ملکی مہمانوں کو پہنچایا تمہارا باس بھی وہیں رہتا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلا دی "وہ بنگلہ مہمانوں کے قیام کے لیے استعمال ہوتا ہے اور وہ بھی پی مہمانوں کے قیام کے لیے۔ خاطر داری' دیکھ بھال حفاظت کے لیے وہاں نصف درجن ملازم ہیں۔ ایک گارڈ کی جھلک تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

منطقی طور پر میرا اگلا سوال یہ بنتا تھا کہ اگر تمہارا اس بنگلے میں نہیں رہتا تو پھر کہاں رہتا ہے؟ مگر میں نے یہ سوال نہیں کیا۔ اب تک اپنے اور اپنی الیف کے" کے بارے میں اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ اس

اختیاری عمل تھا' اس میں میری کسی کوشش کو دخل نہ تھا۔

اس وقت ہم کورنگی روڈ سے گزر رہے تھے اور ہمارا رخ گورا قبرستان کی جانب تھا۔ اس روڈ کو ٹیشنل ہائی وے بھی کہا جاتا ہے۔ امتیاز نے نہایت سنجیدہ اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"جگر! اب میں تمہیں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں اسے دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "میں طارق روڈ کے سنٹرل کمرشل ایریا میں رہتا ہوں۔ میرا فلیٹ ایک عمارت کے سیکنڈ فلور پر ہے تمہیں وہاں قیام کے دوران میں بہت سی باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔"

ایک لمحے کو وہ خاموش ہوا' گاڑی کو گورا قبرستان سے دائیں جانب موڑا اور کہا "بلڈنگ کے لوگ میرے بارے میں یہ جانتے ہیں کہ میں اپنی بیوی اور چھوٹے بھائی کے ساتھ وہاں رہتا ہوں۔ وہ روزانہ ہمیں آتے جاتے بھی دیکھتے ہیں۔ تم دونوں میرے رشتے داروں کی حیثیت سے وہاں قیام کرو گے۔"

"اور تمہاری بیوی اور چھوٹا بھائی؟" ساحل نے پوچھا۔

"وہ بھی وہیں رہیں گے۔" امتیاز نے کہا "دراصل' اس فلیٹ میں ہماری تنظیم ہی کی ایک رکن روبی نامی لڑکی اور اشتیاق احمد میری بیوی اور چھوٹے بھائی کی حیثیت میں رہتے ہیں۔ سب لوگ ہمیں ایک فیملی سمجھتے ہیں۔"

"جب کہ حقیقت اس کے بالعکس ہے!" میں نے کہا۔

وہ بولا "کسی حد تک کہہ سکتے ہو۔ ایک طرح سے' ہم لوگوں کو جو تاثر دے رہے ہیں اس میں کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ ہم تینوں ایک ہی تنظیم سے منسلک ہیں' ہمارے اغراض و مقاصد بھی یکساں ہیں۔ اس ناتے سے ہم تینوں "فیملی ممبرز" ہی تو ہوئے! البتہ" وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "ہم آپس میں جو رشتے داری ظاہر کر رہے ہیں اس میں حقیقت کا کوئی دخل نہیں اور یہ ہماری مجبوری ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو فوراً لوگوں کی نظروں میں کھٹکنے لگیں گے۔ تم خاصے سمجھ دار آدمی ہو' میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے!؟"

"چلو' مان لیا تم جو کہہ رہے ہو وہ ٹھیک ہے اور جو کر رہے ہو وہ تمہارے معاملات کا تقاضا ہے۔" میں نے کہا "لیکن یہ تو بتا دو' ہم سے تمہاری کیا "رشتے داری" ہو گی۔ اس بات کا تعین کرنا بھی بہت ضروری ہے۔"

"میں یہ تعین کر چکا ہوں۔" وہ گاڑی کو بائیں جانب سندھی مسلم سوسائٹی کی طرف موڑتے ہوئے بولا "جگر! تم روبی کے بھائی ہو اور تمہاری ساتھی ساحل روبی کی بھابی ہے۔ تم دونوں لاہور سے کراچی آئے ہو۔ کچھ عرصہ ہمارے پاس ٹھہرو گے' خوب سیر سپاٹے کرو گے اور واپس چلے جاؤ گے۔ تم کراچی دیکھنے ہی آئے ہو۔ میں روبی کو بھی.... تازہ ترین "رشتے داریوں" کے بارے میں سمجھا دوں گا' تم لوگ بھی خیال رکھنا۔ اگر اڑوس پڑوس والے کسی شخص سے تم لوگوں کی براہ راست بات ہو جائے اور وہ تمہارے بارے میں کچھ پوچھ بیٹھے تو تم اسی "سیٹنگ" کی روشنی میں جواب دو گے جو میں نے طے کی ہے۔"

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا "دوست! تم نے ہمارے سارے رشتے روبی ہی سے جوڑ ڈالے ہیں۔ خود کو بڑی صفائی سے بچا لیا ہے۔"

وہ گاڑی کو مین طارق روڈ پر ڈالتے ہوئے بولا "عورت سے جڑے ہوئے رشتے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں۔" پھر اس نے ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

ساحل نے اس کی بات کی تائید کر دی "امتیاز! میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔"

وہ دوبارہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا "جگر! روبی سے تمہاری رشتے داری جوڑنے کی ایک اور بھی خاص الخاص وجہ ہے۔"

"ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے امتیاز؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

وہ سنجیدہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا "دراصل روبی کا تعلق بھی لاہور ہی سے ہے۔ حالات اور گردش وقت اسے لاہور سے کراچی لے آئی پھر ایک اتفاق نے اسے ہماری تنظیم میں شامل کر دیا۔ تم بھی چوں کہ بنیادی طور پر لاہوری سے تعلق رکھتے ہو اس لیے میں نے تمہیں روبی کا بھائی بنا دیا ہے۔ اب ان رشتوں کا رول ادا کرنا تم دونوں کی ذمے داری ہے۔"

ساحل نے کہا "وجدان! تم اس رشتے داری کو دوسرے رخ سے بھی تو دیکھو۔"

"دوسرا رخ تم ہی دکھا دو۔" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ بولی "ہم دونوں بالواسطہ اور بلاواسطہ روبی اور امتیاز کے رشتے دار ہیں۔ بھئی' جب تم روبی کے بھائی ہو تو پھر امتیاز کے سالے ہوئے..... اور سالے کی بیوی یعنی میں امتیاز کی بھی بھابی ہی لگوں گی نا!؟"

اس نے الفاظ "سالے کی بیوی" بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیے تھے۔ میں اس کی شرارت کو سمجھ گیا اور ذو معنی لہجے میں کہا "تمہارے خوب مزے آرہے ہیں ساحل!"

امتیاز نے ایک گلی میں گاڑی روکتے ہوئے کہا "ایک چھوٹا سا کام تم لوگوں کو خود بھی کرنا ہے۔"

ہم دونوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "جس سرگرمی سے تمہیں تلاش کیا جا رہا ہے' اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ تم دونوں فی الفور اپنے حلیے اور شخصیت و حیثیت میں تبدیلی پیدا کرلو..... میں آج رات تک اس کا انتظام کردوں گا۔ بس تم لوگ اپنی نئی شخصیت کے لیے نئے ناموں کا انتخاب کرلو۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' یہ کام شام سے پہلے ہو جائے گا۔"

ہم گاڑی سے باہر آگئے۔ امتیاز نے گاڑی کو لاک کیا اور ہم اس کی تقلید میں ایک چار منزلہ عمارت کے زینے چڑھنے لگے۔ امتیاز یہ تو بتا ہی چکا تھا کہ اس کا فلیٹ اس عمارت کے سیکنڈ فلور پر تھا۔ اس عمارت کے ہر فلور پر صرف دو دو فلیٹ تھے' آمنے سامنے بنے ہوئے۔ امتیاز نے سیکنڈ فلور کے ایک فلیٹ کے سامنے رک کر جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"اس وقت فلیٹ میں کوئی بھی نہیں' روبی دوپہر کے بعد آئے گی۔ لوگوں کی معلومات کے مطابق وہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے یہاں کے لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ تم لوگوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے روبی کو فون کرکے تم دونوں کے بارے میں مختصراً بتا دیا ہے۔ وہ جب دو بجے واپس آئے گی تو تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہونے دے گی۔"

اس کے بعد امتیاز نے جیب سے فلیٹ کی چابی برآمد کی اور اگلے ہی لمحے ہم تینوں اس فلیٹ کے اندر تھے۔ دو بیڈ روم' ایک ڈائننگ روم اور کشادہ لاؤنج پر مشتمل وہ ایک صاف ستھرا اور فرنشڈ فلیٹ تھا۔ وہاں موجود ہر شے معیاری اور سلیقے کی تھی۔

امتیاز نے ایک بیڈ روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم دونوں فی الحال اس کمرے پر قبضہ کرلو' فائنل سیٹنگ رات میں کریں گے۔"

"تم کب تک واپس آؤ گے؟" میں نے امتیاز سے سوال کیا۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جگر!" وہ چھت کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں شام میں بھی آسکتا ہوں' رات میں بھی' رات گئے بھی! اور علی الصباح بھی۔" وہ تھوڑا رک کر کہنے کے بعد بولا "تم لوگ بالکل بے فکری سے یہاں روبی کے آنے سے پہلے اگر کوئی ناک کرے تو تم اس حسب ضرورت نمٹ لینا۔ ساری باتیں تو ہم طے کر چکے ہیں۔ دوپہر کے بعد تو روبی سب سنبھال ہی لے گی۔"

وہ جانے لگا تو میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا "یہاں فون تو ہوگا؟"

"ہاں' ہاں۔ فون موجود ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ادھر دوسرے بیڈ روم میں رکھا ہے۔ کہو تو میں لے آؤں۔" پھر اس نے ذرا توقف کرکے مجھ سے سوال کیا "کیا تم کسی کو فون کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں' چند دوستوں سے رابطہ کروں گا۔" میں نے جواب دیا "کیا تمہارے فون سے سنگاپور کال ہو سکتی ہے؟"

"براہِ راست تو یہ ممکن نہیں۔" اس نے جواب دیا "سنگاپور بات کرنے کے لیے تمہیں کال بک کروانا ہوگی۔ کوئی بات نہیں' تم یہ فون استعمال کرسکتے ہو۔"

پھر اس نے ٹیلی فون سیٹ ہمارے کمرے میں لا کر رکھا اور انٹرنیشنل کال بک کروانے کے لیے ایکسچینج کا کوڈ بتانے کے بعد بولا "اب میں چلوں گا۔ تم لوگ آرام کرو۔ اگر کہو تو دروازے کو باہر سے لاک کر جاؤں۔ روبی کے پاس اپنی چابی موجود ہے۔ وہ جب آئے گی تو لاک کھول لے گی۔"

میں نے کہا "نہیں' تم دروازے کو باہر سے مقفل مت کرو۔ میں اندر سے بولٹ کرلیتا ہوں۔ روبی کے آنے پر دروازہ کھول دوں گا۔ اگر تم باہر لاک لگا گئے تو پھر ہنگامی صورتِ حال میں اندر سے دروازہ نہیں کھول سکیں گے۔ یہ رسک لینا ٹھیک نہیں۔ کسی وقت بھی کوئی حادثہ رونما ہو سکتا ہے' کوئی ٹربل شوٹنگ ہو سکتی ہے۔ گھر کے اندر اچانک آگ بھڑک سکتی ہے۔ اس قسم کے حالات میں ہمارے لیے جائے فرار رہنا چاہیے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان۔" وہ تائیدی انداز میں بولا "احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر وہ جانے کے لیے دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولا تو میں نے کہا "امتیاز! تمہارے ساتھ تفصیلی میٹنگ تو رات ہی ہوگی لیکن ایک سوال نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا رکھا ہے۔ اگر سرِدست اس کا جواب مل جائے تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔"

"کیا سوال کا تعلق مجھ سے ہے؟"

"خالصتاً وہ سوال تم سے ہی متعلق ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولا "پوچھو' کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں نے پوچھا "امتیاز! تمہاری ملاقات کو ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے۔ گزشتہ روز دوپہر کے وقت ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔ اس قلیل مدت میں ایک دوسرے کو جان لینا اور دوسرے پر بلائنڈ فیتھ کرنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا!"

میں نے ذرا توقف کرکے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ بولا "ذرا وضاحت کردو جگر! تم اپنے فیتھ کی بات کر رہے ہو یا میرے فیتھ کی؟"

"خاص طور پر تمہارے فیتھ کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "میرا فیتھ تو تمہارے فیتھ سے مشروط ہے۔"

وہ ایک لمحے کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میرے فیتھ کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟"

میں نے مختصر اور جامع الفاظ میں اسے بتایا "دوست! تم انتقامی مقاصد کی حامل ایک خفیہ تنظیم "سی ایف کے" کے آلۂ کار ہو۔ اس نوعیت کی تنظیمیں اپنے رازوں کی حفاظت کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور ان کا طریقۂ کار نہایت ہی سیکرٹ ہوتا ہے مگر ہمارے ساتھ تمہارے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم انتہائی بے احتیاطی اور غیر ذمے داری کا ثبوت دے رہے ہو۔"

میں ایک لمحے کو سانس لینے کو رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "تم لوگوں نے کل دوپہر راشد منہاس روڈ پر میاں زاہد کے تین بندوں کو گولیوں سے چھلنی کردیا۔ ہم اس واردات کے عینی شاہد تھے۔ تم نے ہمیں ختم کرنے کے بجائے اپنے ساتھ ہائی روف میں بٹھالیا اور نہایت شرافت کے ساتھ بہادر آباد کے چوراہے پر اتار کر آگے بڑھ گئے۔ یہ رویہ ناقابلِ یقین ہے۔ یہی نہیں' بلکہ دورانِ سفر میں تم نے اپنی تنظیم کے حوالے سے ہمیں خاصی معلومات بھی فراہم کیں۔"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنے سر کو ہلکی ہلکی اثباتی جنبش دیتا رہا تاہم اس کے لب خاموش رہے۔ شاید وہ میری بات مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے بات کو آگے بڑھایا "اور آج علی الصباح سے تم ہمارے ساتھ جس طرح پیش آرہے ہو' وہ مزید حیرت میں

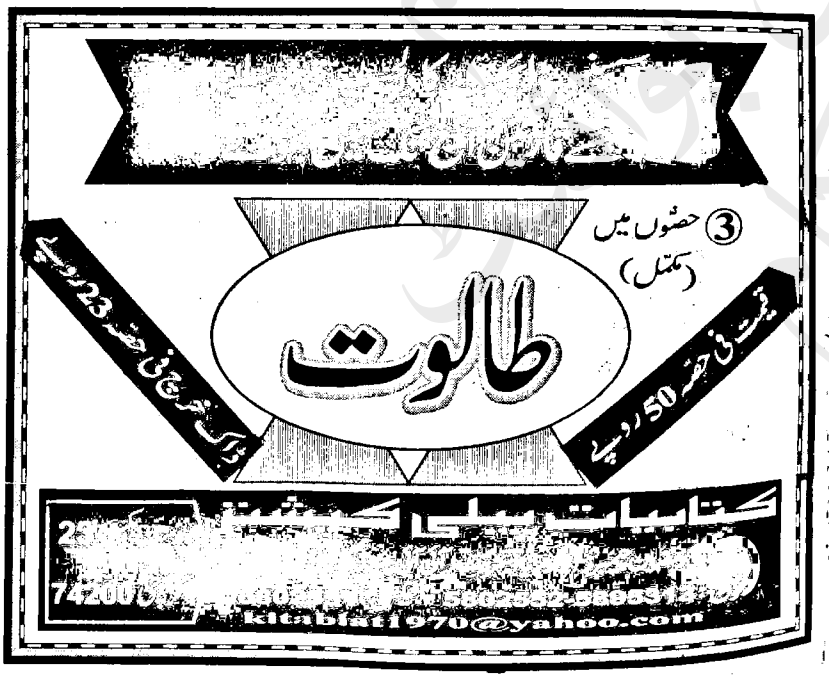

ڈالنے والی بات ہے۔ تم نے ہمیں اپنے باس اور اس کے انگریز مہمانوں کے بارے میں تفصیلاً بتایا پھر وہ بنگلا بھی دکھایا جہاں نیل آرمرا اور اس کی سیکریٹری قیام کریں گے اور اب ہمیں اپنے فلیٹ پر لے آئے ہو۔ کیا کسی اجنبی پر اتنی جلدی اور اس قدر بھروسا کیا جا سکتا ہے..... اور اجنبی بھی ایسے لوگ جن کے پیچھے دشمن لٹھ لے کر دوڑ رہے ہوں اور انہیں خطرناک انڈین ایجنٹ اور دہشت گرد گردانا جا رہا ہو۔ میری اس ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لیے تمہارے پاس کیا جواب ہے امتیاز؟"

وہ چند لمحے مجھے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر گمبھیر آواز میں اس نے استفسار کیا "تم نے کبھی پہلی نظر کی محبت کے بارے میں سنا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "وہی نا..... جس کے بارے میں کچھ اس قسم کے الفاظ ادا کیے جاتے ہیں..... وہ آیا' اس نے دیکھا اور فتح کر لیا!"

"بالکل' بالکل۔" اس نے پُرزور تائید کی پھر بولا "جس طرح پہلی نظر کی محبت ہوتی ہے' اسی طرح پہلی نظر کی دوستی بھی ہوتی ہے جگر!"

میں نے اور ساحل نے حیرت آمیز نظروں سے اسے دیکھا' وہ مجھ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا "وجدان! میں نے کل ریلوے اسٹیشن پر تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا' میرے دل نے تمہیں پسند کیا' اور دماغ نے دوستی کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ سراسر ایک بے اختیاری عمل ہے۔"

"لیکن....."

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بولنے سے منع کر دیا اور کہا "میں جانتا ہوں' اب تم پھر "سی ایف کے" کے حوالے سے کوئی سوال کرنے والے ہو۔ وجدان! میں تمہیں اپنی تنظیم کے مقاصد کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ ہم ظالم کا ہاتھ توڑتے ہیں اور مظلوم کو انصاف مہیا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اگر میں تمہاری مدد کر رہا ہوں تو درحقیقت میں اپنے تنظیمی فرائض نبھا رہا ہوں۔ تم سے میری دوستی ایک الگ چیز ہے اور "سی ایف کے" کے معاملات بالکل الگ ہیں۔ میں "سی ایف کے" کے پلیٹ فارم سے تمہاری مدد تو کرتا رہوں گا مگر کبھی تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ تم ہماری تنظیم کے لیے کام بھی کرو۔ میری دوستی صرف اور صرف تم سے ہے جو ہر قسم کے مفاد سے بالاتر اور جداگانہ ہے' تم یقین کرو یا نہ کرو!"

اس کے لفظوں سے سچائی اور لہجے سے خلوص ٹپکتا تھا۔

میں نے اس وقت امتیاز کی آنکھوں میں بے لوث دوستی کے جذبات امڈتے دیکھے اور بے اختیار آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

چند لمحات تک ہم دونوں بغل گیری کی حالت میں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو بھینچتے رہے پھر امتیاز نے میرے دونوں بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں جکڑتے ہوئے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

"وجدان! میں نے تم سے دوستی کا دعویٰ کیا ہے تو قدم پر اسے نبھانے کی کوشش بھی کروں گا۔ تم دیکھ لینا اپنے قول و فعل میں کتنا راست ہوں۔"

میں نے کہا "میں نے بھی دوست مان کر تمہیں گلے لگایا ہے۔ تم وجدان کی دوستی کو کبھی فراموش نہیں کر سکو گے۔"

وہ پُراعتماد لہجے میں بولا "انشاءاللہ ہماری یہ دوستی ثابت ہو گی۔"

"امتیاز! میری ساری زندگی دشمنوں سے نبرد آزما گزری ہے۔" میں نے کہا "میں نے بھی ہمیشہ کمزور کی مدد کی ہے اور طاقت ور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کیا ہے۔ میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا کہ میرے ریکارڈ پر کتنے بڑے بڑے خونیں معرکے درج ہیں۔ میں نے اپنے روز و شب حق کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی میں کیے ہیں۔ تم اسے "رائٹ اینڈ رانگ" کی جنگ بھی کہہ سکتے ہو۔"

"ہماری تنظیم بھی کچھ اسی قسم کی جنگ لڑ رہی ہے۔" امتیاز نے کہا۔

"ہاں' اب مجھے کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔"

"رفتہ رفتہ تمہارا یہ اندازہ یقین میں بدل جائے گا وجدان!" اس نے کہا۔

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "امتیاز! کل جب تم مجھے اپنی تنظیم سے متعارف کروایا تھا تو مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگا تھا اور میں نے "سی ایف کے" کے حوالے بعض تنقیدی اور طنزیہ جملے بھی کہہ ڈالے تھے۔ دراصل اس قسم کی تنظیم کا تذکرہ میں پہلی مرتبہ سن رہا تھا اس لیے بھی مجھے ہضم نہیں ہو سکا تھا حالانکہ میں بھی گزشتہ کئی سال سے وہی کچھ کرتا آ رہا ہوں جو تمہاری تنظیم کے مقاصد ہیں۔"

"یہ غیر سرکاری انصاف ہے وجدان!" امتیاز نے کہا "ہماری نیت صاف ہے' اور کہتے ہیں' نیت صاف ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ ہم ایک نیک کام کر رہے ہیں اسی

قدرت بھی ہماری مدد کرتی ہے۔"

میں نے کہا "امتیاز! تمہاری "سی ایف کے" کا مشن' میرے عزائم سے لگا کھاتا ہے۔ اگر میں نے تم لوگوں کے طریقہ کار میں دلچسپی محسوس کی اور تمہارے کام نے مجھے متاثر کیا تو میں بھی حتی الامکان تم لوگوں سے تعاون کروں گا۔"

"وہ دن میرے لیے عید کا دن ہو گا وجدان!" امتیاز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ہم کندھے سے کندھا ملا کر ظلم اور ناانصافی کے خلاف سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوں گے لیکن ....."

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے سوال کیا "تم اچانک خاموش کیوں ہو گئے امتیاز؟"

"جگر!" وہ مخصوص انداز میں بولا "مجھے خوشی اس وقت ہو گی جب تم ہمارے کام سے متاثر ہو کر "سی ایف کے" میں شمولیت اختیار کرو گے۔ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اس سلسلے میں' میں تم سے زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔"

میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

تھوڑی دیر بعد امتیاز فلیٹ سے رخصت ہو گیا تو ساحل نے میرے قریب آتے ہوئے کہا "وجدان! کیا تم نے اپنے ساتھ شدید کا چھتا پکا رکھا ہے؟"

اس نے جتنا عجیب سوال کیا تھا' میں نے اتنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"بھئی! میں نے کوئی اتنی پیچیدہ بات تو کی نہیں جو تمہیں سمجھنے میں دشواری محسوس ہو رہی ہو۔" اس کے انداز میں شرارت عود کر آئی "میں نے یہ سنا تھا اور دیکھا بھی ہے کہ صنف مخالف ایک دوسرے پر مرتے ہیں' آپس میں دوستی' محبت اور شادی کرتے ہیں لیکن امتیاز کا تم سے والہانہ لگاؤ دیکھ کر نقل دنگ ہے۔ حضرت کو تم سے پہلی نظر کی دوستی ہو گئی ہے۔"

بات ختم کر کے اس نے معنی خیز انداز میں میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر دل لگی کی مسکان تھی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "ساحل! بہت بری بات ہے۔ کسی کے جذبات کا یوں مذاق نہیں اڑاتے۔ دوستی دراصل محبت ہی کی ایک صورت ہے۔"

"گویا' امتیاز کو تم سے محبت ہو گئی ہے؟"

"یہ تو وقت ثابت کرے گا۔" میں نے کہا "فی الحال نظر تو ایسا ہی آ رہا ہے۔"

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگی جیسے ہم صنف سے محبت پر اسے سخت اعتراض یا حیرت ہو۔ میں نے اس کی نگاہ کا مفہوم جاننے کے بعد ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

"ساحل! سچی اور خالص محبت صنف اور جنس کی محتاج نہیں ہوتی' وہ صرف محبت ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو بکری کے ایک بچے سے بھی محبت کر سکتے ہیں۔"

لاجواب ہو کر اس نے موضوع بدل دیا اور اضطرابی انداز میں بولی "تم سنگاپور میں کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟"

"ہیں میرے چند دوست وہاں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"یعنی ہم صنف دوست یا.....؟"

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں نے کہا "تمہارے سامنے ہی بات کروں گا۔ تم دیکھ لینا' میرے وہ دوست ہم صنف ہیں یا صنف مخالف۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے کہا "فون بعد میں کریں گے' پہلے ذرا فلیٹ کا تنقیدی جائزہ لے لیں۔"

ہم بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔ جاتے ہوئے امتیاز بیڈ روم میں نصب ائرکنڈیشنر کو آن کر گیا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر داخلی دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس کے بعد ہم فلیٹ کے دیگر حصوں کا معائنہ کرنے لگے۔ دوسرا بیڈ روم بھی ائرکنڈیشنر اور اٹیچڈ باتھ روم کی سہولت کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ لاؤنج میں بھی ایک کامن باتھ روم موجود تھا۔ ڈرائنگ روم کی آرائش میں سادگی اور پُرکاری نظر آتی تھی۔ وہاں بہ یک وقت دس بارہ افراد بیٹھ کر باہم کلام ہو سکتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں واپس بیڈ روم میں آ گئے۔

میں نے بیڈ پر بیٹھ کر ٹیلی فون سیٹ کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ ساحل بھی آ کر میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس کے بدن کا گداز میں اپنے جسم پر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ٹیلی فون ایکس چینج میں اوورسیز کال کی بکنگ کے لیے آپریٹر کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر میں نے آپریٹر سے سنگاپور کا ایک نمبر مانگ لیا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور مطلوبہ فون نمبر پر میری بات کروا دی گئی۔

میں نے دراصل سنگاپور کے سینٹرل پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملوایا تھا۔ دوسری جانب سے پوچھا گیا "کس سے بات کرنی ہے؟"

"میں نے کہا "انسپکٹر چیانگ شوے۔"

"آپ کی تعریف؟" نہایت ہی شستہ انگریزی میں سوال کیا گیا۔

"میں انسپکٹر کا ایک دوست بات کر رہا ہوں۔" میں نے شائستہ انداز میں کہا "میرا نام وجدان علی ہے۔"

دوسری جانب سے مجھے انتظار کرنے کو کہا گیا پھر پندرہ سیکنڈ کے بعد وہی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "انسپکٹر چیانگ شو اس وقت ہیڈ کوارٹر میں موجود نہیں۔ کل رات اس کے ایک عزیز کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اسی عزیز کے گھر پر ہو گا۔"

"کیا مجھے وہاں کا فون نمبر مل سکتا ہے؟" میں نے درخواست آمیز لہجے میں کہا "دراصل میں اس سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

فون پر بات کرنے والے نے معذرت کرتے ہوئے کہا "سوری مسٹر! وہاں کا فون نمبر مجھے معلوم نہیں۔ تم اپنا کانٹیکٹ نمبر چھوڑ دو۔ انسپکٹر جب بھی ہیڈ کوارٹر چکر لگائے گا۔ تمہارا پیغام اس تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہ ضروری سمجھے گا تو تم سے رابطہ کر لے گا۔"

میں اپنا نام تو بتا ہی چکا تھا' ٹیلی فون سیٹ کی پیشانی سے پیوست فون نمبر بھی نوٹ کروا دیا پھر وہ ٹیلی فونک رابطہ ختم ہو گیا۔

میں نے ریسیور رکھا تو ساحل نے انسپکٹر چیانگ شو کے حوالے سے متعدد سوال کر ڈالے۔ میں اسے اپنی ابتدائی زندگی سے متعلق جستہ جستہ بتا چکا تھا۔ سنگاپور میں گزارے ہوئے وقت میں چیانگ شو نے میری بہت مدد کی تھی۔ وہ میرے والد صاحب عابد علی کا گہرا دوست تھا۔ والد کے انتقال کے بعد چاچا پرتاب سنگھ اور چیانگ شو نے حقیقی معنوں میں میرے سرپرست کا کردار ادا کیا تھا۔ پرتاب سنگھ اب آں جہانی ہو چکا تھا۔

میں ساحل کو چیانگ شو کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگا تو وہ اور میرے نزدیک آ گئی۔ وہ تو پہلے ہی مجھ سے جڑی بیٹھی تھی' مزید قربت کا مطلب تھا کہ وہ میرے اندر اترنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گئی تھی۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ نیلگری کے کہے ہوئے الفاظ میری سماعت میں گونجنے لگے۔ اس نے بڑے واضح انداز میں مجھے باور کرایا تھا جب بھی کوئی عورت تنہائی میں میرا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرے گی تو اس عورت کے جلو میں نیلگری میری خلوت میں اتر آئے گی۔ اس نے ایسا صرف کہا ہی نہیں تھا بلکہ ایک دو مرتبہ تو ثابت بھی کر دکھایا تھا۔ اس کے بعد میں خاصا محتاط ہو گیا تھا۔

اس وقت جانے کیا ہوا کہ میرے ذہن میں ایک بار پھر خیال بجلی کے کوندے کے مانند چمکا اور میں نے چشم زدن میں فیصلہ کر لیا کہ اس خیال کو عملی جامہ پہناؤں گا۔ اس وقت میری نگاہ ساحل کے چہرے پر جمی تھی۔ میرے ذہن میں ابھرنے والے خیال کو وہ جان نہیں سکتی تھی تاہم میرے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

چہرے کو دل کی کتاب کہا جاتا ہے۔ ساحل میرے ارادے کو بھانپنے کی کوشش کرتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی "وجدان! تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں ایک ٹیسٹ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اس کے لیے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

اس کے بدن میں ایک خفیف سی جھرجھری نمودار ہوئی۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا "یہ اچانک تمہیں کس ٹیسٹ کی سوجھی ہے؟"

"میں ایک تجربہ کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کی حیرت استعجاب میں بدل گئی "کس قسم کا تجربہ؟"

"اس قسم کا تجربہ!"

میں نے یہ جملہ ادا کرتے ہی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی آغوش میں گرا لیا پھر میرا چہرہ اس کے چہرے پر جھک گیا۔

وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے یک ٹک مجھے تکنے لگی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میں اس نوعیت کی حرکت بھی کر سکتا ہوں۔ اس کے جذبات اور احساسات جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔

میں نے اس کی غزالی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ہیلو نیلگری! کیسی ہو!"

"نیل..... گری.....؟" ساحل نے جو حیرت اور بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھی' اچانک سطح آب پر ابھرتے ہوئے سرسراتی آواز میں دہرایا۔

میں نے کہا "ہاں' نیلگری میں تمہی سے مخاطب ہوں۔"

"وجدان! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" ساحل پوری طرح اپنے حواس میں آتے ہوئے بولی "میں ساحل ہوں۔ میرے اندر نیلگری کو کیوں پکار رہے ہو؟"

نیلگری کو وہاں غیر موجود پا کر میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔"

"کیا بس ایسے ہی؟" وہ آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی "تمہیں یہ بیٹھے بٹھائے نیلگری کا خیال کیسے آ گیا؟"

میں نے اس کے سوال کا خاموش جواب دیا۔ اس مرحلے میں الفاظ کو سہارا بنانا حماقت کے مترادف ہوتا۔ اس کے شنگرفی لب کسی انگارے کے مانند دہک رہے تھے۔ میں نے ان گلاب ہونٹوں کی تازگی سے اپنے وجود کو مہکا لیا۔

ساحل نے اس مخملیں گرفت سے آزاد ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے ان قیمتی لمحات کی آتشی ساعتوں میں پہلی مرتبہ رچ کر ساحل کو پیار کیا۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے جدا ہوتے ہوئے بولی "وجدان! تم پچھلی رات کے جاگے ہوئے ہو۔ تھوڑی نیند لے لو۔ نیند کے خمار سے تمہاری آنکھیں سرخ اور پلکیں بوجھل ہو رہی ہیں۔"

میں اس وقت شدت سے نیند کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ کسی فرماں بردار ننھے بچے کی طرح میں نے ساحل کی نصیحت پر عمل کیا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔

ساحل نے ایک ٹانگ کو فولڈ کر کے گھٹنے کے خمیدہ حصے کو میرے لیے تکیہ بنا دیا پھر وہ کسی ایکسپرٹ مساجر کی طرح اپنی مخروطی انگلیوں سے میرے بالوں کو سہلانے لگی' اس کی ریشمی انگلیوں کا گداز سر کے راستے میرے بدن میں اترنے لگا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

نیند کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے میں نیلگری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج کے تجربے نے میرے لیے سوچ کے کئی در کھول دیے تھے۔ نیلگری کا سنسنی خیز دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ ساحل میری تنہائی میں آنے کے باوجود بھی اول تا آخر ساحل ہی رہی تھی جس کے نتیجے میں' میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا نیلگری نے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے وہ طوفان آمیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ اپنے دعوے کی تصدیق کی تھی لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ ہر وقت مجھے اپنی نگاہ میں رکھے اور آج اس خیال کی توثیق بھی ہو گئی۔ میں سمجھ گیا' نیلگری مجھے صرف اپنے لیے مخصوص رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے دوسری عورتوں کو مجھ سے دور رکھنے کے لیے اس نے وہ خطرناک چال چلی تھی اور میں اس پر اعتبار کر کے اس کی چال میں آ گیا تھا۔ وہ پُراسرار ہستی مجھ سے محبت کی دعوے دار تھی اور اس نے مجھے اپنا محبوب تسلیم کر لیا تھا۔ وہ مجھے اپنی جائیداد بنا کر رکھنے کے چکر میں تھی اور مجھے کسی کی ذاتی پراپرٹی بن کر رہنا قطعاً قبول نہیں تھا۔

حالیہ تجربے نے نیلگری کے منصوبے کا راز فاش کر دیا تو مجھے اس کی اس حرکت پر غصہ آنے لگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے بعض نازک مواقع پر میری بھرپور مدد کی تھی لیکن اس کے ہاتھوں بے وقوف بننے سے مجھے شدید ہتک کا احساس ہوا اور نیلگری کا وہ تعاون اور مدد بھی مجھے خود غرضی کی ایک شکل نظر آئی۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ زیر بار کر کے مجھ پر تصرف حاصل کرنے کے لیے اپنی راہ ہموار کر رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں اسی وقت یہ اٹل فیصلہ کر لیا کہ آئندہ میں آنکھیں بند کر کے نیلگری پر بھروسا نہیں کروں گا اور اگر اس نے کسی چالاکی یا چال بازی کا مظاہرہ کرنا چاہا تو میں بھی جواباً اسی لیول کی عیاری اور شاطری دکھاؤں گا۔ وہ اگر نادیدہ اور پُراسرار ہستیوں کی مالک ہے تو میں بھی کوئی ایسا گیا گزرا نہیں تھا کہ اس کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ جاتا۔ میں چند روز تک سنجیدگی سے اگر "جی" کی ایڈوانس مشقیں کر لیتا تو اس باطنی قوت میں بے پناہ استعداد پیدا کر سکتا تھا۔

نیلگری کے خیالوں سے الجھتے ہوئے میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

❂✻❂

جب میری آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ کمرے کے باہر سے مجھے باتوں کی آواز آئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ساحل کسی دوسری عورت سے بات چیت کر رہی تھی۔ اسی وقت میرے ذہن میں روبی کا نام چمکا۔ امتیاز نے بتایا تھا کہ وہ دو بجے تک واپس آئے گی۔ میں گیارہ' ساڑھے گیارہ بجے سونے کے لیے لیٹا تھا۔ اس کا مطلب تھا' میں نے اچھی خاصی نیند لے لی تھی۔ روبی کی واپسی کا مجھے کچھ پتا نہیں چلا تھا۔

میں نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر بستر چھوڑ دیا۔ بنگلے پر مسلح گارڈ نے ہماری جو خاطر تواضع کی تھی اس کے "اثرات" معدوم ہو چکے تھے اور میں ہلکی ہلکی بھوک محسوس کر رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر لاؤنج میں' میں نے ساحل کو ایک نہایت ہی حسین و جمیل عورت کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے پایا۔ میں نے اس عورت کو سلام کیا تو اس نے میرے لیے بھی ایک کرسی سیدھی کر دی اور نہایت ہی مہذب انداز میں مجھے بیٹھنے کو

کہا۔

روبی اسم بامسمّیٰ تھی۔ کبوتر کی آنکھ جیسی سرخی رکھنے والا یا قوت (روبی) اگر اپنی شان ... اور جاہ و جلال میں بے مثال ہے تو گلابی رنگت کے حامل یاقوت کے حسن اور دلکشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں۔ روبی کی جلد شفاف اور رنگت بے داغ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' دست قدرت نے میدے میں گلاب کی پتیوں کو گوندھ کر اسے تخلیق کیا ہو۔ وہ بلاشبہ ایک پُرکشش اور جاذب نظر شخصیت تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ ستائیس سال رہی ہوگی۔

مجھے اپنی جانب دیکھتے پا کر اس نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا "وجدان بھائی! آپ ذرا ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں آپ لوگوں کے لیے ناشتا لگاتی ہوں۔ رات کا کھانا ہم امتیاز کے آنے کے بعد کھائیں گے۔"

اس نے اتنی اپنائیت اور محبت سے مجھے بھائی کہا تھا کہ میرا دل مسرت سے بھر گیا۔ میں حقیقی خوشی کی پھوار میں خود کو سرشار محسوس کرنے لگا۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ یہاں مجھے روبی کے بھائی کی حیثیت سے قیام کرنا ہے۔ امتیاز نے مجھے اپنے لیے نئے نام منتخب کرنے کو بھی کہا تھا اور میں نے یہ کام انجام دے لیا تھا۔

میں نے روبی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "امتیاز نے تمہیں ہمارے بارے میں مختصراً بتا دیا ہوگا' کچھ باتیں ساحل کی زبانی تمہیں پتا چلی ہوں گی۔ ایک اہم بات میں بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ... اب میں وجدان نہیں اور یہ ساحل نہیں۔" آخری الفاظ میں نے ساحل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ادا کیے تھے۔

"اس کا مطلب ہے ہم نے عارضی نام سوچ لیے ہیں؟" ساحل نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "عارضی اور نقلی یہ ہمارے لیے ہوں گے ورنہ دنیا والوں کے لیے تو یہی نام ایک دم اصلی کی حیثیت رکھیں گے۔"

روبی نے پوچھا "وجدان بھائی! آپ نے اپنے لیے کیا نام تجویز کیے ہیں؟"

"میں وجیہ ہوں۔" میں نے جواب دیا "اور ساحل' الماس!"

"ونڈرفل۔" روبی نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "بہت موزوں اور خوبصورت نام ہیں اور تم دونوں پر جچتے بھی ہیں۔"

پھر ہمارے درمیان کافی دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اس دوران میں ہم نے ہلکا پھلکا ناشتا بھی کر لیا۔ آپس میں یوں گھل مل گئے تھے کہ دیکھنے والا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم زندگی میں پہلی مرتبہ ملے ہیں۔ واقعی رشتے داروں کی طرح ہی دکھائی دیتے تھے۔ خوش مزاجی نے بہت جلد تکلفات اور اجنبیت کے پردے اٹھا دیا تھا۔

لگ بھگ سات بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میزبان روبی نے فون اٹینڈ کیا پھر لاؤنج میں آ کر مجھے بتایا "وجدان! تمہارے لیے کال ہے۔"

میں اٹھ کر اس بیڈروم میں آیا جو ہمارے لیے مختص کیا گیا تھا۔ ریسیور کو میں نے کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں کہا "ہیلو۔"

"ہیلو وجدان۔" دوسری طرف سے کہا گیا "میں چیانگ شو بول رہا ہوں۔ تم نے اپنے اس انکل کو پہچانا نہیں؟"

میں چیانگ شو کی آواز کو بہ خوبی شناخت کر چکا تھا۔ ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی پھر اس نے استفسار کیا "مجھے تمہاری کال کے بارے میں پتا چلا تھا۔ کوئی خاص بات تھی؟ یہ تو معلوم ہو گیا کہ تم اپنے آبائی وطن پاکستان کے شہر کراچی میں ہو۔"

میں نے کہا "انکل چیانگ شو! بس آپ سے بات کرنے کو جی بہت چاہ رہا تھا اس لیے فون کر ڈالا۔" پھر کچھ خاص بات یاد آ گئی اور میں نے پوچھا "میرا فون ریسیو کرنے والے نے بتایا تھا کہ کل تمہارے کسی عزیز کی ڈیتھ ہوئی تھی اور تم اسی عزیز کے گھر گئے ہوئے تھے!"

"ہاں' تمہیں بالکل ٹھیک بتایا گیا تھا۔" وہ غم زدہ لہجے میں بولا "وہ میرا عزیز تمہارا بھی بہت کچھ لگتا تھا وجدان۔"

اس کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے پوچھا "انکل! آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"میں بوٹا سنگھ کا تذکرہ کر رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ بوٹا سنگھ کو تو کل زاہد کے آدمیوں نے اغوا کر کے قتل کر ڈالا تھا اور چیانگ شو سنگاپور میں اپنے کسی عزیز کی حیثیت سے انتقال کی بات کر رہا تھا بلکہ وہ تو بوٹا سنگھ کو میرا بھی رشتے دار بتا رہا تھا۔ انکشاف کے انکشاف نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"انکل! میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

"وجدان! کیا تم بوٹا سنگھ کو بھول گئے ہو؟"

"میں بوٹا سنگھ کی قربانی کو بھلا کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا "لیکن اس کا قتل تو کل یہاں کراچی میں ہوا ہے اور آپ وہاں سنگاپور میں اس کے گھر تعزیت کے لیے گئے تھے' یہ بات مجھے الجھا رہی ہے۔ پھر آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بوٹا سنگھ میرا بھی بہت کچھ لگتا تھا۔"

"وجدان! میں نہیں جانتا' تم کس بوٹا سنگھ کے قتل کی بات کر رہے ہو۔"

انسپکٹر چیانگ شو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "البتہ میں جس بوٹا سنگھ کی موت کا ذکر کر رہا ہوں وہ تمہارے کاروبار کا نگران اعلیٰ تھا۔ "عابد علی اینڈ سن" کا منیجر ادھیڑ عمر بوٹا سنگھ جو کل رات ہارٹ اٹیک کے باعث چل بسا۔"

"اوہ!" میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی "تو آپ اس بوٹا سنگھ کی بات کر رہے ہیں۔"

"ہاں' اب آیا تمہاری سمجھ میں؟" چیانگ شو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

اور واقعی سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا؟ بوٹا سنگھ' انسپکٹر چیانگ شو کا ایک دیرینہ جانکار تھا اور جب میں چاچا پرتاب سنگھ کے ساتھ بنکاک چلا گیا اور ازاں بعد' میں... ایک طویل عرصہ گولڈن ٹرائی اینگل اور شاؤلن کمپیل میں گزارنے کے بعد... واپس سنگاپور پہنچا تو چیانگ شو کی زبانی مجھے پتا چلا کہ بوٹا سنگھ نامی اس شخص نے اپنی محنت سے میرے والد صاحب کے کاروبار کو بہت ترقی دی ہے۔ انسپکٹر ہی نے بوٹا سنگھ کو "عابد علی اینڈ سن" کا منیجر مقرر کیا تھا۔ ان دنوں سنگاپور کے علاقے چائنا ٹاؤن کی ساگو اسٹریٹ پر میرے والد صاحب کا ایک جنرل اسٹور ہوا کرتا تھا۔ اب یہ اسٹور "عابد علی اینڈ سن" کے نام سے تین بڑی دکانوں پر پھیل چکا تھا۔ اس شعبہ جاتی اسٹور پر درجنوں ملازم بھرتی تھے جو سب بوٹا سنگھ کی نگرانی میں میرے والد کے لگائے ہوئے پیڑ کی آب یاری میں مصروف تھے۔ انسپکٹر چیانگ شو نے فورٹ کیننگ روڈ والے ہمارے گھر کی دیکھ بھال کا بھی مناسب بندوبست کر دیا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ چاچا خشونت سنگھ نے جس مونے سکھ کو ڈائری کی حفاظت کی ذمے داری سونپی تھی' اس کا نام بھی بوٹا سنگھ ہی تھا "عابد علی اینڈ سن" کا منیجر بوٹا سنگھ اس وقت میرے دماغ سے نکل گیا تھا جب میں نے انسپکٹر چیانگ شو سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

بہرحال' میں نے اپنے منیجر کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ انسپکٹر سے اس سلسلے میں تعزیت اس لیے بھی ضروری تھی کہ بوٹا سنگھ اس کا دوست اور دیرینہ شناسا تھا۔

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولا "وجدان! تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہارے بزنس کی نگرانی کا کوئی معقول انتظام کر دوں گا۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں انکل۔" میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا "میں نے اپنے گھر اور "عابد علی اینڈ سن" کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اسی سلسلے میں' میں نے آپ کو فون کیا تھا۔"

ریسیور میں مجھے انسپکٹر چیانگ شو کی حیرت بھری آواز سنائی دی "وجدان' تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا کاروبار تو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس سنہری موقع پر تم بزنس کو فروخت کرنے کی بات کر رہے ہو۔ یہ تو عقل مندی نہ ہوئی!"

میں نے کہا "انکل! کچھ بھی ہو' میں اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا۔ آپ جلد از جلد میرے گھر اور بزنس کے لیے کسی مناسب خریدار کو تلاش کریں اور اس فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو امریکی ڈالرز میں تبدیل کروا کر مجھے بھجوا دیں۔ میں نے گزشتہ ملاقات پر آپ کو ایک "پاور آف اٹارنی" قسم کی دستاویز بھی تیار کروا کے دی تھی۔ آپ کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

"تم مالک ہو۔ میں تمہاری بات ماننے سے انکار تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا تو بتا دو' مستقبل میں تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" انسپکٹر نے گہری اپنائیت سے پوچھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک میرے ذہن میں اس کثیر رقم کے استعمال کا کوئی باقاعدہ منصوبہ موجود نہیں تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر انسپکٹر کو ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

"انکل! میں نے مستقل طور پر کراچی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب جو بھی کاروبار کروں گا' یہیں پر کروں گا۔"

"ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی۔" چیانگ شو نے دوستانہ انداز میں کہا "لیکن اس موقع پر تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔ اگر تم اس مشورے پر عمل کرو گے تو اس سے بہت سوں کو فائدہ ہوگا اور تم اپنے استادوں کا کچھ احسان بھی کم کر سکو گے۔ علم' فن اور ترقی کا یہ سفر اسی طرح جاری رہنا چاہیے۔"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "انکل! آپ کس قسم کا مشورہ دینا چاہتے ہیں؟"

وہ بولا "تمہارا جو جی چاہے' وہ کاروبار کرنا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی زیر نگرانی "مارشل آرٹس" کا ایک ادارہ

ضرور قائم کرنا تاکہ ان فون کی منتقلی کا کام جاری رہے۔"

"ایسا ایک مستند اور شان دار "کلب" میرے منصوبے میں شامل ہے انکل۔" میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا "انشاءاللہ میں فنونِ حرب و ضرب کو پھیلانے کے لیے مؤثر اقدامات کروں گا۔"

انسپکٹر چیانگ شو نے اختتامی گفتگو کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے وجدان! اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں۔ میں کل ہی "ساگو اسٹریٹ" والے شعبہ جاتی اسٹور اور (FORT KENNING ROAD) پر' پارک کے سامنے واقع تمہارے گھر کو فروخت کرنے کے لیے چارہ جوئی کرتا ہوں۔"

میں نے مناسب اور بھرپور انداز میں انسپکٹر چیانگ شو کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فون بند کردیا۔ پاکستان کا وقت سنگاپور کے وقت سے تین گھنٹے پیچھے ہے۔ میرے بیڈ روم کا دیوار گیر کلاک اس وقت ساڑھے سات کا وقت بتا رہا تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور فلیٹ کے لاؤنج میں بیٹھ کر ساحل اور روبی سے باتیں کرنے لگا۔

❁✲❁

امتیاز رات دس بجے لدا پھندا واپس آیا۔

اس کے ساتھ اشتیاق کو نہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اشتیاق اس کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے وہاں رہتا ہے۔ میں نے امتیاز سے پوچھا۔

"اشتیاق کہاں ہے؟"

"وہ آج دبئی چلا گیا ہے۔"

"دبئی!" میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا "مگر تم نے تو کہا تھا کہ.....!"

وہ میری بات کو قطع کرتے ہوئے بولا "میں نے جو پہلے تم سے کہا تھا اسے بھول جاؤ۔ نئی پالیسی یہ ہے کہ اشتیاق کافی عرصے سے روزگار کے سلسلے میں بیرونِ ملک جانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ یہاں کے اکثر لوگوں کو بھی میں نے اسی قسم کی باتیں بتا رکھی ہیں۔ آج اشتیاق دبئی روانہ ہوگیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔" وہ ایک لمحے کو رک کر میری جانب دیکھنے لگا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "اور کل سے روبی کے اسکول میں بھی "سمر ویکیشن" کا آغاز ہو رہا ہے۔ اب دو ڈھائی ماہ تک یہ اسکول نہیں جائے گی۔ اس فلیٹ میں صرف دو جوڑے رہیں گے۔ ایک میں اور روبی اور دوسرا....."

"وجیہ اور الماس!" ساحل نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"اوہ!" وہ چونک اٹھا پھر زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "آپ دونوں کے نام مجھے پسند آئے۔"

میں نے کہا "جب ایک جوڑے میں روبی موجود ہو تو دوسرے میں کم از کم ڈائمنڈ (الماس) تو ہونا چاہیے نا!"

"ضرور..... ضرور۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اور تمہارے اس ڈائمنڈ کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ مسٹر آرمر اس قیمتی پتھر کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ برطانوی ڈائمنڈ ایکسپورٹ کمپنی کے مالک ہیں جس کی دنیا کے بیش تر ممالک میں موجود ہیں۔"

میں نے کہا "اس بیوپار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے نیل آرمر کی مالی حیثیت کیا ہوگی کیوں کہ ڈائمنڈ کی پتھروں میں اس وقت وہی ویلیو اور مقام ہے جو پھولوں میں گلاب کا' پھلوں میں آم کا اور جنگل میں شیر ببر کا ہوتا ہے۔"

"تم مثالیں اچھی دیتے ہو وجدان!" روبی نے خوش ہو کر سے کہا "تمہارے بیان سے جملے میں جان پڑ جاتی ہے۔"

امتیاز بولا "مسٹر نیل آرمر ڈائمنڈ انڈسٹری تک ہی محدود نہیں ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے بینک کے مالک بھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے سیکڑوں بزنس ہوں گے۔ مجھے ان کے بارے میں زیادہ تفصیل معلوم نہیں۔"

ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ امتیاز باتیں کرتے کرتے اچانک نیل آرمر کا تذکرہ لے بیٹھتا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا جو سبب تھا اس کی تصدیق کے لیے میں نے پوچھا۔

"امتیاز! لگتا ہے' آج نیل آرمر سے تمہاری پہلی ملاقات ہوئی ہے؟"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "پہلے ان کی پاکستان آمد پر بھی کبھی کبھار آدھ بات ہو جاتی تھی مگر آج وہ بہت دوستانہ موڈ میں باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے ایک ایسا انکشاف بھی میں دنگ رہ گیا۔"

"کیسا انکشاف؟" ساحل نے تجسس کے ہاتھوں مجبور کر سوال داغ دیا۔

تجسس تو مجھے بھی تھا تاہم میں نے محض مستفسرانہ ہی میں امتیاز کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔

امتیاز نے بتایا "یہ بات تو مجھے معلوم تھی کہ وہ کسی بینک کے مالک ہیں مگر میں یہ نہیں جانتا تھا' وہ بینک نوعیت کا ہے۔ میرا تو یہی خیال تھا' جس طرح کے دوسرے بینک ہوتے ہیں وہ بھی ویسا ہی ہوگا۔"

"دوست! نیل آرمر کا بینک کس قسم کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "اس بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے رقم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہاں سونے سے اکاؤنٹ کھولا جاتا ہے اور اس نوعیت کے بینک کو گولڈ اکاؤنٹ بینک کہا جاتا ہے۔"

میں نے "گولڈ اکاؤنٹ بینک" کا ذکر سنا تھا اس لیے میرے لیے یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس نوعیت کے بینک میں کم از کم پانچ گرام سونے سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔

ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک مسٹر نیل آرمر اور اس کی خوبصورت سیکریٹری مس شیبا کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر ہم نے ایک ساتھ مل کر ڈنر کیا۔ کھانے پینے کی بیش تر چیزیں امتیاز اپنے ساتھ باہر سے لایا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد روبی اور ساحل تو ایک کمرے میں بیٹھ گئیں۔ میں اور امتیاز دوسرے کمرے میں گپ شپ کرنے لگے۔ وہ اپنے ساتھ جو بڑے بڑے شاپنگ بیگز بھر کر لایا تھا پہلے تو اس کی تفصیل بتانے لگا۔ وہ ہمارے لیے کئی جوڑے کپڑے اور میک اپ کا مکمل سامان اور لوازمات لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔

"وجدان! تمہارا شیو کافی دنوں سے بڑھا ہوا ہے۔ آج تم شیو تو بناؤ گے مگر مونچھیں چھوڑ دو گے۔ تمہارا شیو خاصا گھنا ہے۔ چند روز میں تمہاری عالی شان مونچھیں تیار ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ تم سر کے بال تھوڑے سے بڑھا کر سائیڈ مانگ نکالنا شروع کردو گے۔ لباس کے سلسلے میں تم ہمیشہ یہ خیال رکھو گے کہ تمہیں اپنی شرٹ کو پتلون کے اندر نہیں کرنا' اوپن اینڈ فری چھوڑ دینا ہے۔ اس طرح تمہارے حلیے اور اسٹائل میں نمایاں تبدیلی آجائے گی۔ ساحل بھی بدلی پہناوے کو ترک کرکے شلوار قمیص اور دیگر "ایزی ہینڈل ڈریس" استعمال کرے گی۔ بالوں کو باندھنے کے بجائے کھلا چھوڑا جا سکتا ہے۔ اگر تم لوگ اتنا بھی کرلو تو تمہارے گیٹ اپ میں اتنا فرق آجائے گا کہ دشمنوں سے اپنی شناخت چھپانے کے لیے تم لوگوں کو کسی قسم کے اسپیشل میک اپ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

میں امتیاز کی ذہانت کا قائل ہوگیا۔ وہ بہت مفید اور موقع کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان چند لمحے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ اصل موضوع کی طرف آگیا اور مجھ سے میری کہانی سننے کی فرمائش کرنے لگا۔

میں اپنے ذہن میں ایک مکمل کہانی کا خاکہ تیار کر چکا تھا جس میں مرکزی کردار میں خود تھا۔ ازیں علاوہ میں نے بہت کم کرداروں کو اس کہانی میں شامل کیا تھا یہ کہانی چوہدری نوازش علی اور میرے والد عابد علی کے مابین پیدا ہونے والی دشمنی سے شروع ہوتی تھی۔ میرے والد مجھے اور میری والدہ کو لے کر پاکستان سے سنگاپور جا پہنچے۔ اس کے بعد چوہدری کے بھیجے ہوئے خبیث الاخبیث دارا کا طویل تذکرہ تھا اور ہمارے معرکوں کی تفصیل تھی۔ دوستوں اور دشمنوں کے چھوٹے موٹے کردار بھی آتے جاتے رہے۔ میں دشمنوں کو ختم کرتے ہوئے اپنے والدین کے لہو کا حساب لینے کے لیے پاکستان آیا تھا اور یہاں چوہدری نوازش علی میرا اصل ٹارگٹ تھا۔ میں نے پاکستان میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے سے لے کر اب تک کے حالات واقعات کو من و عن امتیاز کے گوش گزار کر دیا تھا۔ سردست میں نے متروک کنوئیں میں دفن لگ بھگ چوتھائی ارب مالیت کے سونے کا راز امتیاز کو نہیں بتایا تھا۔ یہی وہ واحد چیز تھی جو میں نے اس سے چھپائی تھی۔ میں فی الحال احتیاط کے پیشِ نظر ایسا کر رہا تھا۔ اس میں میری کوئی بدنیتی یا چال شامل نہیں تھی۔ میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر امتیاز کو اس راز میں ضرور شریک کرلیتا۔

نصف شب کے بعد روبی ہمارے کمرے میں چلی آئی۔ ساحل اس کے ساتھ تھی۔ روبی نے ہم دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا "کیا آج سونے کا ارادہ نہیں۔ اس کو تو کافی دیر سے جماہیاں آرہی ہیں۔"

امتیاز اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر ٹیلی فون سیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "اگر تمہیں اس کی ضرورت نہ ہو تو میں اسے اپنے کمرے میں لے جاؤں۔ دراصل مجھے ایک اہم کال کا انتظار ہے جو رات میں کسی وقت بھی آسکتی ہے۔"

"تم فون کو بہ خوشی لے جاؤ۔" میں نے کہا "فی الحال میں اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔"

وہ کمرے سے جانے لگا تو میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "وجدان! ممکن ہے' رات کے کسی پہر میں مجھے تمہارے بیڈ روم کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش آجائے۔ تم ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار رہنا!"

"کیوں بھئی!" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "خیریت تو ہے۔ تمہیں اس قسم کی ضرورت کیوں پیش آنے لگی؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "میں نے ابھی جس اہم فون

کال کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق ایک سرپرائز سے ہے۔ اگر میرے حسبِ منشا مجھے اطلاع دی گئی تو پھر میں تمہیں ضرور ڈسٹرب کروں گا۔"

"اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے' اس سرپرائز کا تعلق وجدان سے ہے!" ساحل نے ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا "کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں نے کہا "ایسا کون سا سرپرائز ہے میرے دوست؟"

"جگر!" وہ مجھے مخصوص انداز میں مخاطب کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "اگر وقت سے پہلے بتا دیا تو پھر وہ "سرپرائز" کیسے رہے گا؟" پھر اس نے روبی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہم دونوں کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے کہا "گڈ نائٹ مائی ڈیئر فرینڈز!"

ہم نے بھی جواباً انہیں "شب بہ خیر" کہا اور بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا' تاہم میں نے دروازے کو بولٹ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری اجازت کے بغیر وہ اس بیڈ روم میں جھانکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

تنہائی میسر آتے ہی ساحل الفاظ کی کاٹ سے حالات کے گڑے مردے اکھاڑنے لگی۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وجدان! تم نے دوپہر میں مجھے نیلگری کیوں کہا تھا؟"

ہماری دوستی اور تعلق جس مرحلے میں داخل ہو چکا تھا وہاں ساحل سے' نیلگری کے حوالے سے کھل کر بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ خاص طور پر جب سے نیلگری کی چال مجھ پر کھلی تھی' میں اپنے دل میں اس کے لیے خفگی کے جذبات رکھتا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں ساحل کو نیلگری کے دعوے اور طریقۂ واردات کے بارے میں بتا دیا۔

وہ پوری توجہ سے میری بات سنتی رہی پھر الجھن زدہ لہجے میں بولی "وجدان' یہ تم کہہ رہے ہو اس لیے میں یقین کر لیتی ہوں ورنہ عقل ان باتوں کو ماننے سے انکاری ہے۔"

میں نے کہا "عقل ایک محدود شے کا نام ہے اور قدرت نے ایسی ایسی قوتیں اور صلاحیتیں پیدا کی ہیں..... اور ان قوتوں کے حامل افراد ایسے عجوبۂ روزگار ہیں کہ عقل ان کے کمالات کا احاطہ نہیں کر سکتی اسی لیے انہیں ماورائے عقل اور "مابعد" وغیرہ کے خانے میں فٹ کر دیا جاتا ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی "کیا یہ سچ ہے کہ نیلگری میرے جسم کے ساتھ تمہاری تنہائی میں آ چکی ہے؟"

"ہاں' یہ صد فی صد سچ ہے۔" میں نے راست مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تمہاری خلوت میں کس حد تک داخل ہوئی؟" اس نے تیکھے اور معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"جس حد تک میں نے اسے اجازت دی۔" میں بھی معنی خیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "وہ کبھی مجھ نہیں ہو سکی۔"

وہ متذبذب نظر آنے لگی۔ اس وقت اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات تھے جیسے کسی عورت کا شوہر دوسری عورتوں سے مراسم قائم کر لے تو اس بیوی کے چہرے پر نمودار ہوتے ہیں۔ ساحل کی یہ کیفیات صرف اس وجہ سے تھیں کہ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی' ظاہر ہے ایسی صورت میں کسی دوسری عورت کا سایہ بھی میرا قرب حاصل کرنا چاہتا تو اسے تکلیف پہنچانا لازمی بات تھی۔

"وجدان!" ساحل میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے "ایک بات پوچھوں' سچ سچ بتاؤ گے؟"

میں نے کہا "ہاں' پوچھو۔ بتانے والی بات ہوئی تو ضرور جواب دوں گا۔"

"گویا تم نے جواب دینے سے پہلے ہی ایک کڑی شرط عائد کر دی!" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"میں نے تو ایک اصولی بات کی ہے ساحل۔" میں نے پہلو تہی کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "اور اپنے خود ساختہ اصول کی روشنی میں فیصلہ بھی تمہی کرو گے کہ آیا میرا سوال جواب کے قابل ہے یا نہیں؟"

"اچھا بابا! پوچھو' کیا پوچھنا چاہتی ہو!" میں نے ہتھیار اختیار کر لیا۔

اس نے چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور مدبرانہ انداز میں بولی "وجدان! اب معلومات اور مشاہدے کے مطابق ہر قسم کے لوگ محبت میں گرفتار ہیں۔ ان میں لڑکیوں اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہے اور اب یہ پُراسرار ہستی نیلگری بھی اسی قطار میں آن کھڑی ہوئی ہے۔ تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ' کیا تم بھی کسی سے محبت ہے؟"

یہ سوال وہ پہلے بھی کئی مرتبہ کر چکی تھی مگر ہر بار انداز مختلف ہوتا تھا۔ میں نے ڈپلومیسی کا سہارا لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ساحل! میں اپنے تمام دوستوں اور ساتھیوں

محبت کرتا ہوں اور ان کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"میں جان دینے اور لینے کی بات کر رہی ہوں اور نہ ہی میں قسم کی محبت میرا موضوع ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی "تم ہر دفعہ بڑی خوبصورتی سے میرے سوال کے حصار سے نکل جاتے ہو مگر آج میں تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی۔ تمہیں بتانا ہو گا کہ تم نے اپنی زندگی میں کس سے محبت کی ہے اور اس محبت سے میری جو مراد ہے وہ تم بہ خوبی سمجھ رہے ہو!"

میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا "میری ایسی قسمت کہاں کہ مجھے کسی سے اس قسم کی محبت ہو جائے جس نوعیت کا تم تذکرہ کر رہی ہو۔ یہ تو نصیب والوں کا حصہ ہے۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اس سے پوچھا "ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنے کسی حصار کا ذکر کیا تھا۔ کیا تم مجھ پر کوئی بندش ڈھیلی کروا رہی ہو؟"

"شروع کر دی تم نے گڑبڑ!" وہ ایک انداز دل ربائی سے مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی "لیکن میں تمہیں چھوڑنے والی نہیں ہوں!"

"میں نے کب چھوڑنے کو کہا ہے!"

"اِدھر اُدھر کی باتوں میں میرا دھیان نہ بٹاؤ وجدان!" میں نے کہا "تمہارا دھیان اگر بٹ سکتا ہے تو بہت پہلے تم اپنے سوال کو بھول چکی ہوتیں۔ تم مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہو ساحل!"

"میں اس وقت اپنی تعریف نہیں بلکہ اپنے سوال کا جواب سننا چاہتی ہوں۔"

"جواب تو میں تمہیں دے چکا۔"

"اس کا مطلب ہے' تم شرافت سے نہیں مانو گے!" وہ اپنے نازک ہاتھوں سے بچوں کی طرح میرا سینہ کوٹتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "اگر میں شرافت سے نہیں مانا تو کیا تم کوئی بدمعاشی وغیرہ بھی دکھا سکتی ہو؟"

"بالکل دکھا سکتی ہوں!"

اتنا کہتے ہی اس نے دھکا دے کر مجھے بستر پر گرا دیا پھر میرے قریب بیٹھتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں بولی "شریف انسان کی بدمعاشی بڑی قیامت خیز ہوتی ہے وجدان! میں وہ پہلے والی چھوئی موئی دھنو نہیں رہی جو ہر وقت بچوں ایسی حرکتوں میں مشغول رہتی تھی۔ تمہارے ساتھ نے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔ تمہیں ابھی میری طاقت کا اندازہ نہیں!"

آخری جملہ اس نے ذو معنی انداز میں ادا کیا تھا۔ ساحل کی بے باکی' بہادری اور جارحیت آمیز انداز کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور اس کی وجہ سے بھی میں بہ خوبی آگاہ تھا۔ آج دوپہر والے واقعے کے بعد سے اس کا حوصلہ کھل گیا تھا۔ اس کے انداز میں بے پناہ اعتماد آ گیا تھا اور اس کے عزائم تشویش ناک دکھائی دیتے تھے۔

ساحل کے اندر جو یہ تبدیلی آئی تھی' اس کے لیے اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ موقع تو اسے میں نے ہی فراہم کیا تھا۔ شاید وہ میرے اشارے کی منتظر تھی اور میں..... فی الحال کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

ساحل خاموش نظر سے مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے خیالات کے بھنور سے باہر نکلتے ہوئے کہا "میں تمہیں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ میں ایک زہریلا انسان ہوں۔ تمہیں اگر اپنی زندگی عزیز ہے تو مجھ سے فاصلے پر رہا کرو۔"

"تمہارا یہ زہریلا پن دوپہر میں کہاں چلا گیا تھا وجدان؟" وہ شرارت آمیز مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی۔

میں بوکھلا گیا اور لاجواب ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی "وجدان! اگر واقعی تمہارے ساتھ کسی قسم کے زہریلے پن کا مسئلہ ہے تو تم بے فکر رہو۔ میں خود تمہارا علاج کرواؤں گی۔"

میں نے شدید حیرت سے اس کی طرف دیکھا "تم میرا علاج کرواؤ گی! مگر کس سے؟"

"ایک لیڈی ڈاکٹر سے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ساحل؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں!" اس نے کہا "میں دن میں اپنے کسی نسوانی مسئلے پر روبی سے بات کر رہی تھی تو اس نے مجھے بتایا کہ ایک نہایت ہی ماہر لیڈی ڈاکٹر اس کی دوست ہے اور وہ خاص طور پر پیچیدہ اور مہلک امراض کا علاج کرنے کے لیے معروف ہے۔ میں کل تمہیں اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گی۔"

ساحل تو بہت تیزی سے پیش قدمی پر آمادہ نظر آتی تھی۔ وہ میرے ایک ایک معاملے کو گہری فکرمندی سے دیکھنے لگی تھی جو میرے لیے شدید فکرمندی کی بات تھی۔ اگر میں اس سیلِ آب کے سامنے کوئی مضبوط بند نہ باندھتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ بہالے جانے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔

میں نے ایک تکیہ اٹھایا اور بستر سے نیچے اُتر آیا۔ وہ

حیرانی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔
"کہاں جارہے ہو وجدان؟"
"مجھے نیند آرہی ہے۔" میں نے ایک مصنوعی جماہی لیتے ہوئے کہا "میں اب سونا چاہتا ہوں۔"
وہ چمک کر بولی "سونے کے لیے تو یہ بیڈ ایجاد کیا گیا ہے اور تم ادھر قالین پر ڈیرا لگانا چاہتے ہو!"
"بیڈ پر تم سو جاؤ۔" میں نے کہا "میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔"
"نیلگری کی دھمکی سے ڈرتے ہو؟" اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔
"میں نیلگری کی دھمکی سے زیادہ تمہاری بے باکی سے ڈرنے لگا ہوں ساحل!"
اس نے کھلکھلا کر ایک قہقہہ لگایا اور چھیڑنے والے انداز میں بولی "مجھے یقین نہیں آرہا' تم وہی وجدان ہو جو دس بارہ افراد کو چٹکیوں میں مسل ڈالتا ہے' جرائم پیشہ افراد اس کا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں اور چوہدری نوازش علی جیسا طاقت ور شخص اسے خود سے دور رکھنے کے لیے اپنے درجنوں گرگوں کو میدانِ عمل میں اتار چکا ہے۔"
ساحل کے اندازِ وضاحت میں طنز نہیں بلکہ شرارت تھی۔ وہ گویا مجھ سے دل لگی کررہی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ "دل لگی" دل کی لگی میں بدل جاتی' میں نے نہایت ہی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے باور کروانا ضروری سمجھا۔
"ساحل!" میں نے اس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے کہا۔ "شیر کے منہ کو ایک مرتبہ خون لگ جائے تو پھر اس کی پیاس پانی سے نہیں بجھتی۔ کیا تم خود کو میرے لیے خون کی ندی میں بدلنا چاہتی ہو؟"
میرے اس سنسنی خیز سوال میں بلا کی طاقت تھی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ بہ یک وقت آکر گزر گئے پھر وہ سلیپنگ ڈریس پہننے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔
میں نے بیڈ روم کے دروازے کے نزدیک قالین پر تکیہ رکھا اور دراز ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے ساحل روشن ہوگئی اور اپنی آتشیں روشنی کی حرارت کو میرے موجود میں اتارنے لگی۔
ساحل کی بے باکی اگر اسی رفتار سے سفر کرتی رہی تو مستقل قریب میں میرے لیے بہت پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔ وہ رنگ سنت کی قیامت سرایا بیٹی سونیا سے دس ہاتھ آگے دوڑنے کے موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔

○✲○

رات کے آخری پہر دروازے پر ہونے والی دستک سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔ اس وقت صبح کے تین بجے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔
سامنے امتیاز کھڑا بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔
"خیریت تو ہے دوست۔" میں نے چونک کر پوچھا "اس صبح صبح.....!"
وہ بڑی سرعت سے قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "میں تمہیں بتایا تھا نا' مجھے ایک اہم کال کا انتظار ہے۔ اگر منٹ پہلے وہ کال مجھے موصول ہوئی ہے۔"
"تم نے تو یہ بھی کہا تھا' مجھے کوئی انوکھا سرپرائز والے ہو؟"
"میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔" وہ ہیجان زدہ میں بولا "یہ کال اسی سلسلے کی کڑی ہے۔"
میں نے پوچھا "اور وہ سرپرائز کہاں ہے؟"
"سرپرائز تک پہنچنے کے لیے ہمیں اس فلیٹ سے کچھ فاصلہ طے کرنا ہوگا۔" وہ دبے دبے جوش کے ساتھ "میں تو بالکل تیار ہوں۔ تم بھی فوراً ریڈی ہو جاؤ۔"
"جانا کہاں ہے؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا "گرین بیلٹ کے ایک بنگلے میں!"
گرین بیلٹ کے نام پر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میں اضطرابی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اس علاقے میاں زاہد حسین کے گروہ کے کچھ افراد بھی ایک بنگلے رہتے ہیں!"
"ایگزیکٹلی!" اس کی آواز خاصی بلند ہوگئی "اسی بنگلے میں داخل ہونا ہے جگر!"
میں نے چوکنا نظر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا "کوئی خاص بات ہے؟"
"تمہارے لیے سرپرائز ہے۔ اس سے زیادہ خاص اور کیا ہوگی!"
"کچھ وضاحت اس سرپرائز کی بھی تو کرو دوست!"
"جگر! میں نے میر بخش کا سراغ لگالیا ہے۔"
میں بے ساختہ اچھل کر رہ گیا!

میں نے حیرت آمیز خوشی سے اس کی طرف دیکھا "کیا واقعی؟"
"یس!" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
میں نے ایک نظر بے خبر سوئی ہوئی ساحل پر ڈالی اور دوبارہ امتیاز کی جانب متوجہ ہوگیا "یار یہ اتنی بڑی خبر ہے کہ تیاری میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ بس میں لباس تبدیل کرلوں۔"
"ٹھیک ہے' میں لاؤنج میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔" امتیاز نے کہا "ساحل کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے روبی کو ہر بات سمجھا دی ہے۔ ہماری واپسی سے پہلے اگر ساحل بیدار ہوگئی تو روبی اسے پریشانی سے بچالے گی۔"
میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور دروازہ بند کردیا۔ دروازے کو کھلا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ کیوں کہ اندر ائرکنڈیشنر چل رہا تھا۔ میں سیدھا واش روم میں گھس گیا۔
میر بخش کو ہم سے جدا ہوئے لگ بھگ چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ میاں زاہد حسین والے ہوٹل میں قیام کے دوران میں وہ گزشتہ رات آخری پہر غائب ہوگیا تھا۔ ساحل کا شک درست ثابت ہوا۔ اسے میاں زاہد کے ایما پر ہی غائب کیا گیا تھا کیوں کہ امتیاز اس کی موجودگی ایک ایسے بنگلے پر بتا رہا تھا جو مبینہ طور پر میاں زاہد حسین کے آدمیوں کے استعمال میں تھا۔
میر بخش کے بارے میں ملنے والی اس اطلاع نے میرے رگ و پے میں مسرت آمیز سنسنی دوڑا دی۔ وہ میرا سچا دوست اور وفادار ثابت ہوا تھا اور اب اسے میری مدد کی اشد ضرورت تھی۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ ہمارے وہاں پہنچنے تک وہ زندہ اور سلامت ہو۔
میر بخش کے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے دو منٹ میں کپڑے بدلے اور تیسرے منٹ پر میں امتیاز کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور پوچھا "کوئی ہتھیار وغیرہ ہے تمہارے پاس؟"
"نہیں!" میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "کہو تو لے آؤں۔ بیگ کے اندر ایک پسٹل رکھا ہے جو میں نے گزشتہ رات "شاہین کمپلکس" کے نزدیک ایک معرکے میں میاں زاہد کے بندوں سے چھینا تھا۔"
امتیاز نے اپنے لباس سے ایک اسٹیل باڈی پسٹل نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا "اسے اپنے پاس رکھ لو۔ پوری طرح لوڈڈ ہے۔ ضرورت پڑنے پر بہت کام آئے گا۔"
میں نے پسٹل کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور کہا "اور..... تم؟"
"میرے پاس ہے اسلحہ۔" وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "چلو آؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"
اگلے ہی لمحے ہم دونوں فلیٹ سے باہر تھے۔ ہم نے نہایت ہی محتاط انداز میں زینے طے کیے اور بلڈنگ کے داخلی گیٹ پر پہنچ گئے۔ اس گیٹ کی ایک ایک چابی بلڈنگ کے تمام مکینوں کے پاس رہتی تھی تاکہ وقت بے وقت اسے اپنی سہولت اور ضرورت کے تحت کھولا جاسکے۔ عموماً رات بارہ بجے یہ گیٹ بند کردیا جاتا تھا۔ امتیاز نے گیٹ کھولا اور باہر آکر دوبارہ لاک کردیا۔
بلڈنگ سے باہر آکر امتیاز پیدل ہی ایک جانب چل پڑا۔ میں نے اس کی تقلید کرتے ہوئے پوچھا "کیا گرین بیلٹ کا علاقہ یہاں سے قریب ہی ہے؟"
اس نے بتایا "طارق روڈ اور گرین بیلٹ ایک ہی علاقے یعنی "ڈی ای سی ایچ ایس" میں واقع ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم وہاں تک پیدل جائیں گے۔ دونوں مقامات کے درمیان پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو ہے۔"
"اور ہم تو....." میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
وہ میرے جملے کی تہ تک پہنچ گیا' جلدی سے بولا "ہم احتیاطاً تھوڑا پیدل چلیں گے وجدان۔ تم فکر نہ کرو' ادھر کیفے ڈی خان کے نزدیک ہمارے لیے ایک گاڑی تیار کھڑی ہے۔"
دو گلیاں گھومنے کے بعد ہم کیفے ڈی خان کے پاس پہنچ گئے۔ امتیاز ایک یلوکیب کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "آؤ وجدان۔ ہم اس گاڑی میں جائیں گے۔"
یلوکیب ہمارے اندر بیٹھتے ہی اسٹارٹ ہوچکی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ڈرائیور صورت شخص موجود تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے یلوکیب آگے بڑھادی۔
میں نے امتیاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا ہم اس ٹیکسی میں گرین بیلٹ تک جائیں گے؟"
"یہ دکھنے میں ایک ٹیکسی ہے۔" امتیاز نے بتایا "مگر ہمیشہ پرائیویٹ استعمال میں رہتی ہے۔ جاوید کو اپنا ہی بندہ سمجھو۔" اس نے ڈرائیور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے ہم جس قسم کے مشن پر جارہے ہیں' اس میں ٹیکسی کا استعمال زیادہ موزوں رہتا ہے۔"
یلوکیب مین طارق روڈ کو چھوڑ کر شاہراہِ قائدین پر

آگئی۔ میں نے امتیاز سے پوچھا "یار! تم نے یہ نہیں بتایا' میر بخش کا سراغ تم نے کیسے لگایا ہے؟"

ڈرائیور جاوید کو امتیاز اپنا ہی بندہ کہہ چکا تھا۔ اس لیے اس کی موجودگی میں میر بخش کا تذکرہ کیا جا سکتا تھا۔ امتیاز نے میرے سوال کے جواب میں بتایا "زیادہ تفصیل سنانے کا تو ابھی وقت نہیں۔ مختصراً اتنا جان لو کہ میں نے آج صبح ہی میر بخش کی تلاش شروع کر دی تھی۔ میاں زاہد حسین اور اس کے گرگے میرا خصوصی ٹارگٹ تھے۔ بالآخر میری یہ تلاش کامیاب رہی۔ میرے ایک ساتھی نے تھوڑی دیر پہلے اطلاع دی ہے کہ میر بخش اس وقت گرین بیلٹ والے بنگلے میں موجود ہے۔" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے میری جانب دیکھا اور پوچھا "کہو وجدان! یہ سرپرائز تمہیں کیسا لگا؟"

"فنٹاسٹک!" میں نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔

یلوکیب نے شاہراہ فیصل کو عبور کرنے کے بعد ایک سروس روڈ پکڑلی پھر چند گلیوں میں سے گزر کر وہ ریلوے لائن کے قریب پہنچ گئی۔ خلافِ معمول ہماری گاڑی نے ریلوے لائن کو اوپر سے کراس کرنے کے بجائے اس کے نیچے' ایک پلیا میں سے راہ لی اور دوسری جانب پہنچ گئی۔ ہم لوگ "ای مارکیٹ" میں سے گزرے پھر چند لمحے ایک نالے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ اب ہم گرین بیلٹ کے علاقے میں تھے۔ امتیاز نے ایک گلی کے کونے پر... یلوکیب رکوائی اور جاوید کو وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

ہم قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔ امتیاز نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "اس بنگلے کا مین گیٹ دوسری گلی میں ہے۔ ہم اس وقت بنگلے کی عقبی گلی میں ہیں۔ تم یہ بات تو سمجھ ہی گئے ہو گے کہ ہمیں بنگلے میں کہاں سے داخل ہونا ہے؟"

"اچھی طرح سمجھ گیا ہوں یار۔"

اس نے کہا "میری آخری اطلاع تک میر بخش زندہ تھا۔ ہمیں اسے یہاں سے زندہ ہی لے کر جانا ہے' وجدان' چاہے اس کے لیے ہمیں میاں زاہد کے آدمیوں کی زندگیوں سے کیوں نہ کھیلنا پڑے۔"

"زندگی اور موت کی بساط میاں زاہد نے بچھائی ہے۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا "اور اس بساط پر مجھے کھیلنے کی کھلی دعوت بھی دی ہے۔ کھیلوں گا تو میں ضرور... اور کھل کر کھیلوں گا۔"

"تمہارے عزائم میں خاصی سنگینی محسوس کر رہا ہوں میں۔" امتیاز نے چونک کر کہا۔

"میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں یار!" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

امتیاز... ایک بنگلے کے پچھواڑے رک گیا اور دائیں جانب دیکھتے ہوئے بولا "ہمیں اس بنگلے کے اندر داخل ہونا ہے۔ میر بخش یہیں پر ہے۔"

میں نے گلی میں دونوں جانب دور تک نگاہ دوڑائی۔ ایک طرف خاموشی کا راج تھا' یہ چوں کہ ایک عقبی گلی تھی' اس لیے اسٹریٹ لائٹس کا دور دور تک نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ یہ ایک طرح سے ہمارے لیے خاصا سود مند تھا۔ رات کی گہری تاریکی میں ہم کسی کی نگاہ میں آئے بغیر اپنا کام خوش اسلوبی سے نمٹا سکتے تھے۔

امتیاز نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ ویسٹ انڈیز کا اندھیرے میں بھی اسے وقت بتا دیا۔ وہ دھیمے لہجے میں "ساڑھے تین بجے ہیں۔ بنگلے کے اندر موجود سناٹے سے ہے' وہ لوگ سو گئے ہیں۔"

"سو گئے ہیں؟" میں نے حیرت سے دہرایا "رات کی آخری پہر تو یقیناً سب سو ہی رہے ہوتے ہیں یار۔"

امتیاز نے کہا "جگر! یہ رات کا آخری پہر شریف کے لیے ہے۔ اس بنگلے کے مکینوں کے لیے تو ابھی سونے کا وقت ہوا ہے۔" پھر اس نے ایک آنکھ دبائی اور بولا "میری اطلاعات کے مطابق آج رات یہاں راگ رنگ کی محفل بھی تھی۔ چند ماہر ناچنے والیاں بلائی گئی تھیں۔ رات تک وہ ناچ ناچ کر خود کو توڑتیں' تھک کر چور ہو جاتیں۔ اپنے تماش بینوں کو تھکانے میں مصروف ہو جاتیں۔ اس وقت تک تمام مہمان اور میزبان ایک دوسرے میں گم ہو گئے ہوں گے' ہر کوئی دوسرے میں خود کو ڈھونڈ رہا ہو گا۔ کارروائی کے لیے یہ بالکل مناسب موقع ہے۔"

"اور ہمیں اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا ہے۔" میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ اس وقت مجھے اپنے بازوؤں میں بجلی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

امتیاز معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بنگلے کی باؤنڈری وال کا جائزہ لینے لگا۔ مذکورہ دیوار بہ مشکل پانچ فٹ اونچی تھی۔ ہم بہ آسانی اچک کر بنگلے کے اندر پہنچ سکتے تھے۔ وہ بنگلا گلی کے آخری سرے پر واقع تھا اور خاصا کشادہ معلوم ہوتا تھا۔ آباد بنگلوں سے وہ کافی ہٹ کر تھا۔ شاید ایڈوانٹیج کی یہ دولت میاں زاہد کے بندوں نے اسے آماج گاہ بنایا ہوا تھا۔ اس گلی کے بیش تر بنگلے خالی تھے۔

چار زیرِ تعمیر بھی نظر آئے۔

"کیا خیال ہے جگر!" امتیاز نے سرگوشیانہ انداز میں دریافت کیا "ادھر سے ادھر ہو جائیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ سے مخصوص اشارہ بھی کیا۔

میں نے کہا "یہ تو کرنا ہی ہو گا یار لیکن ایک بات مجھے الجھا رہی ہے۔"

"ایسی کون سی بات ہے بھئی؟"

"تم نے ٹیکسی کو گلی کے اس سرے پر کھڑا کر دیا ہے۔" میں نے یلوکیب کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا "جب کہ بنگلا گلی کے اس سرے پر واقع ہے۔ اس میں کیا مصلحت ہے بھائی؟"

"مصلحت یہ ہے کہ میں میاں زاہد کے آدمیوں کو کسی قسم کے شک میں مبتلا ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔" امتیاز نے بتایا "اگر گاڑی کو اس طرف کھڑا کر دیا جاتا تو وہ ان لوگوں کی نظر میں آ سکتی تھی وہ فوراً یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ اس ٹیکسی میں کون آیا ہے... اور وہ کس بنگلے میں گیا ہے جب کہ گلی کا وہ سرا روشن اور آباد ہے۔ ادھر ایک دو گاڑیاں بھی کھڑی ہیں لہٰذا پریشانی یا تشویش کی کوئی بات نہیں۔"

"رائٹ یو آر!" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

آئندہ دو منٹ کے اندر ہم بنگلے کے اندر تھے۔ بنگلے کے اس عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا لان بنا ہوا تھا۔ جس کے وسط میں جزوی گھاس دکھائی دے رہی تھی گویا وہاں گھاس اگانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ پھولوں کے چند پودے بھی نظر آ رہے تھے۔ بنگلے کے دونوں پہلوؤں میں' اصل عمارت اور باؤنڈری کے درمیان پانچ فٹ کے راستے چھوڑے گئے تھے۔ یہ اہتمام ہوا کی گزرگاہ کے لیے کیا گیا تھا۔ عقبی لان کوئی دس فٹ چوڑا تھا۔

میں نے کہا "امتیاز! اس خاموشی اور سناٹے سے تو لگتا ہے' یہاں کوئی بھی نہیں۔"

"یہ خاموشی نہیں' مدہوشی ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا "مدھ' ہوش اڑاتی ہے جگر اور یہاں بھی شباب اور مدھ کا عام استعمال ہوا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

بات اتنی واضح تھی کہ نہ سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلانے کے بعد پوچھا "کیا پروگرام ہے یار؟"

"ٹپل پروگرام۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"ٹپل پروگرام' کیا مطلب؟"

"ہم ان دونوں پہلوؤں والے راستوں سے الگ الگ چلتے ہوئے عمارت کے سامنے والے حصے میں پہنچیں گے۔" امتیاز نے پانچ فٹی گزرگاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس دوران میں ہم بنگلے کے اندرونی حصے کی کیفیت جاننے کی کوشش بھی کریں گے۔"

"اچھا آئیڈیا ہے۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "میں اس پہلو کی طرف جا رہا ہوں۔" یہ بنگلے کا دایاں پہلو تھا تاہم عقبی سمت سے بایاں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا "ہم میں سے جو بھی کوئی خاص بات نوٹ کرے' دوسرے کو بتائے گا۔ اس کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔"

"آل رائٹ جگر!" امتیاز نے دو ٹوک لہجے میں کہا اور اپنے لباس میں سے لمبی نال والا ایک ریوالور برآمد کر لیا۔

ایسا خوف ناک ریوالور میں نے شان کو نری المعروف بہ جیمس بانڈ ڈبل او سیون کی فلموں میں ہیرو کے پاس دیکھا تھا۔ این فلیمنگ کا یہ جاسوسی کردار عالم گیر شہرت کا حامل ہے۔ شان کو نری کے بعد اور بھی بہت سے ہیروز اس کردار میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔

امتیاز کو دکھانے کے لیے میں نے بھی جاپانا میڈ اسٹیل باڈی پسٹل ہاتھ میں لے لیا اور اس کی نال کو ایک بوسہ دینے کے بعد میں اپنے منتخب راستے کی جانب دبے قدموں بڑھ گیا۔ امتیاز نے دوسرے پہلو کی جانب قدم اٹھا دیے۔

تاریکی میں چند قدم اٹھانے کے بعد میں نے پسٹل دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا تاہم بہ وقتِ ضرورت میں اسے فوراً استعمال میں لا سکتا تھا۔ میں نے نہایت ہی احتیاط سے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور ایک ایک کھڑکی کا چیک کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں اور اندرونی پردے بھی کھنچے ہوئے تھے۔ ایک کمرے کے اندر لائٹ کے آثار محسوس ہوئے تو میں نے کان لگا کر اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کی۔ دوسری جانب دیکھنا تو ممکن نہیں تھا۔ میری وہ کوشش ناکامیاب رہی۔

کچھ دیر بعد میں بنگلے کے دائیں پہلو کا سفر پورا کر کے سامنے والے حصے میں پہنچ گیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر بائیں جانب دیکھا۔ امتیاز مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔ میری نگاہ کے سامنے بنگلے کا مین گیٹ تھا۔ میں نے دائیں بائیں چوکنا نظر سے دیکھا' وہاں کسی ذی روح کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میں دبے قدموں گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

گیٹ مقفل نہیں تھا' صرف اندر سے کنڈی لگائی گئی تھی۔ میں نے بہ آہستگی گیٹ کی اندرونی کنڈی کھول دی تاکہ بہ وقتِ واپسی ہمیں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں

واپس مڑا اور اس طرف قدم بڑھا دیے جدھر سے امتیاز کو آنا تھا۔ اس کونے میں ایک پورچ بنا ہوا تھا۔ پورچ کے اندر سلیٹی رنگ کی ایک ٹویوٹا کرولا کھڑی تھی۔

میں بنگلے کے بائیں پہلو کی سمت بڑھا تو امتیاز مجھے ایک جگہ کھڑا نظر آگیا۔ وہ ایک کھڑکی پر آنکھ ٹکائے ہوئے تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔ جس کھڑکی پر امتیاز نے دونوں ہاتھ رکھ کر چہرہ جما رکھا تھا اس کے پیچھے مجھے روشنی دکھائی دی۔

میں نے امتیاز کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔

میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا "دوسری طرف تو کچھ نہیں ملا۔ کیا یہاں کچھ ہے؟"

اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور آواز دبا کر بولا "اندر" تھری اِن ون۔" پروگرام چل رہا ہے۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"خود ہی دیکھ لو۔" امتیاز نے مبہم انداز میں کہا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا' کھڑکی کے اس کونے سے اندرونی پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی کے اس حصے پر آنکھ لگائی تو کمرے کے اندر نظر آنے والے منظر نے مجھے ساکت کر دیا۔ میری کنپٹیوں میں سنسناہٹ ہونے لگی اور دل کی دھڑکن یک بارگی بے انتہا بڑھ گئی۔

اندر چار مرد و زن فطری لباس میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ ان میں ایک عورت اور تین مرد تھے۔ عورت خود کو ان کے چنگل سے نکالنے کی جو بھی کوشش کرتی' وہ مل کر اسے ناکامیاب بنا دیتے۔ بالآخر عورت نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم لوگ انسان ہو یا جانور؟"

وہ بے بس عورت یقیناً چلا کر بولی ہوگی تاہم کھڑکی کے بند ہونے کے باعث اس کی مدھم آواز مجھ تک پہنچی تھی پھر اس عورت کے سوال کے جواب میں ایک مرد نے کہا۔

"ہم انسان ہی ہیں لیکن ہماری جبلت نے اس وقت ہمیں حیوان بنا دیا ہے۔"

"میں نے ایسے بھوکے مرد اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھے۔"

"تو اب دیکھ لو۔" ایک مرد بے ہودگی سے بولا۔

میں اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکا' نہ سننا اور نہ ہی دیکھنا۔ اس وقت میرے جسم کا سارا خون دماغ کو پہنچ گیا۔ میں نے نظر ہی نظر میں امتیاز کو اشارہ کیا اور اس کھڑکی کے برابر میں نظر آنے والے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

وہ کمرا عام عمارت سے تھوڑا الگ تھلگ تھا جیسا کہ سرونٹ کوارٹر ہوتے ہیں۔ اس کمرے کے اندر جو کھیل کھیلا جا رہا تھا میں اس کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ عورت یقیناً اپنی مرضی سے وہاں پہنچی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کو مردوں سے واسطہ پڑے گا۔ بہرحال اس وقت وہ مظلوم تھی۔ شاید وہ انہی ناچنے والیوں میں سے کوئی ایک تھی جن کے امتیاز کے مطابق' آج رات اس بنگلے کو رونق بخشنے آئی تھیں۔ اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ بنگلے میں کوئی چوکیدار یا ملازم وغیرہ کیوں دکھائی نہیں دیا تھا!

میری دستک کے جواب میں اندر خاموشی چھا گئی پھر ایک مرد کی آواز ابھری "اس وقت باہر کون ہو سکتا ہے؟"

میں اب دروازے کی چول سے کان لگائے کھڑا تھا۔ دوسرے مرد نے کہا "ابے' ہوگی کوئی بلی وِلی۔"

"بلی دستک نہیں دے سکتی!" پہلے مرد نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں دے سکتی۔" دوسرا بحث پر اُتر آیا "تم کوئی احمق جانور نہ سمجھو۔"

تیسرے نے کہا "تم دونوں بلی کی بحث میں پڑ کر اپنا وقت کھوٹا کر رہے ہو۔ صبح ہونے میں اب زیادہ دیر باقی نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جائے گی اور ابھی تو ہم نے۔"

پہلے نے تیسرے کی بات کاٹی اور بولا "مینا چلی گئی تو دوبارہ بھی آسکتی ہے مگر ہماری جان چلی گئی تو واپس نہیں آئے گی اس دستک کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔"

"ابے بزدل کہیں کے۔" دوسرے نے کہا "مرد ہو کر اتنا ڈرتے ہو۔ پتا نہیں' صاحب نے تمہیں اپنے پاس ملازم کیوں رکھا ہے اور وہ بھی چوکیدار اور گارڈ کی ملازمت پر۔"

"اس وقت تو جبار وردی میں ہوتا ہے نا..... اور اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف بھی ہوتی ہے۔" تیسرے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور اس وقت بے چارہ نہ یونی فارم میں ہے اور نہ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہے۔" مینا نامی اس پیشہ ور عورت نے گہری چوٹ لگائی "اس کنڈیشن میں تو یہ جبلی بہادری کا مظاہرہ کر سکتا ہے!"

"تم لوگوں کو مذاق سوجھ رہا ہے۔" جبار نامی چوکیدار نے سراسیمہ لہجے میں کہا "میں نے واضح طور پر دستک کی آواز سنی ہے۔ ہمیں پہلے باہر جھانک کر دیکھ لینا چاہیے۔ پورے اطمینان کے بعد ہی....."

جبار نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کو بزدلی کا طعنہ دینے والے نے کہا "اس سے پہلے کہ تم ہم میں سے کسی کو دروازہ کھولنے کے لیے کہو' میں تمہاری مشکل آسان کر دیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں' یہ کام تمہارے بس کا تو ہے نہیں!"

اس شخص نے جبار کی مشکل آسان کرنے کی بات کی تھی یعنی وہ خود دروازہ کھول کر باہر جھانکنا چاہتا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر اس نے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ اب مجھے نہ تو دروازہ کھولنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی دروازہ کھلوانے کے لیے مزید دستک کی۔

میں تن کر پوری طرح تیار دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی اندرونی کنڈی گرائی گئی پھر پینڈل گھومنے کی آواز آئی۔ جیسے ہی دروازے کے پٹ نے فریم کو چھوڑا' میں نے ایک ڈبل ہینڈ پُش دروازے پر رسید کر دیا۔

دروازے کا پٹ عقب میں موجود شخص کے منہ پر پڑا۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اسی اثنا میں ہم دونوں بھڑا مار کر کمرے کے اندر داخل ہو چکے تھے امتیاز نے دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔

امتیاز کے ہاتھ میں لمبی نال والا ریوالور دیکھ کر عورت کی چیخ نکل گئی۔ اس نے بڑی سرعت سے بیڈ شیٹ کو کھینچا اور ستر پوشی میں مصروف ہو گئی۔

منہ پر دروازے کا پٹ کھانے والے کے ہونٹوں سے خون جاری ہو گیا۔ دوسرے دونوں افراد ڈرے سہمے ایک جانب کھڑے تھے۔ اس وقت وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ انہیں اپنی برہنگی کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔

زخمی ہونٹوں والے نے سراسیمہ آواز میں پوچھا "کون ہو تم لوگ..... اور بنگلے میں کیسے داخل ہوئے ہو؟"

"اگر یہ تمہارا پہلا اور آخری سوال ہے تو اس کا جواب میں ضرور دوں گا۔" میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے دیکھا "بولو منظور ہے؟"

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ اس سوال کے بعد اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔ امتیاز نے اس کی حیرت آمیز پریشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے میرا مطمحِ نظر اس پر واضح کر دیا "ہم خدائی فوج دار ہیں..... اور ایسے لوگ کہیں بھی' کسی بھی طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ اب تم تینوں اچھے بچوں کی طرح کم از کم ایک ایک چڈی پہن لو تاکہ تمہارا حساب کتاب ہو سکے۔"

"ہم نے ایسا کیا کیا ہے؟" جبار منمنایا۔

امتیاز نے اس کے گال پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا اور خون خوار لہجے میں بولا "تم نے سنا نہیں' باس نے کیا کہا تھا! پہلا اور آخری سوال؟ اور تم نے ایسا ویسا' جیسا تیسا سب کیا ہے۔"

امتیاز نے مجھے باس ظاہر کر دیا تھا۔ وہ تینوں ریوالور کی زد پر اپنے لباسوں کو تلاش کرنے لگے۔ بیڈ شیٹ میں نیم لپٹی ہوئی مینا نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تو سوال کرنے کی اجازت ہے نا؟"

"پوچھو' کیا پوچھنا ہے تمہیں۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

"کہیں تم لوگوں کا تعلق پولیس سے تو نہیں؟"

امتیاز نے اس کی بات کا جواب دیا "تم جیسی عورتوں کا دھندا تو پولیس کے تعاون سے چلتا ہے۔ تمہیں پولیس والوں کی کیوں فکر ہو گئی۔ وہ تو اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ آج کی آمدنی میں سے ان کا حصہ تم نے یہاں آنے سے پہلے پیشگی انہیں پہنچا دیا ہو گا۔"

مینا جز بز ہو کر رہ گئی۔ وہ ڈھلتی ہوئی جوانی کی طوائف تھی۔ عمر لگ بھگ پینتالیس سال رہی ہو گی تاہم اس نے خود کو فٹ رکھنے کے لیے خاصی محنت کی تھی اور پینتیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

اتنی دیر میں امتیاز نے تینوں مردوں کا مختصر انٹرویو لیا۔ ان میں ایک تو وہی بزدل چوکیدار جبار تھا' دوسرا خود کو بہادر ظاہر کرنے والا ڈرائیور تھا۔ اس کا نام حنیف معلوم ہوا۔ تیسرا شخص گھریلو ملازم عثمان تھا۔ بنگلے کے اندر ان چاروں کے علاوہ دو مرد اور دو عورتیں مزید تھیں۔ دونوں عورتیں مینا کے ساتھ آئی تھیں اور بنگلے کے اندر صاحب اور اس کے دوست کی تفریح کا سامان بنی ہوئی تھیں۔ مینا ان کی میڈم تھی جو زیادہ کمانے کے لالچ میں ان تینوں ندیدوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اندر موجود عورتوں کے نام سویٹی اور رخ معلوم ہوئے۔

مینا بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھاگ عورت میرے اندر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی بالآخر اس نے پوچھا۔

"مان لیا' تم خدائی فوج دار ہو لیکن یہ بھی تو پتا چلے کہ یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟"

امتیاز نے اسے ڈانٹ پلائی اور کہا "اگر باس نے تمہیں بولنے کی اجازت دی ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم سوال پر سوال کیے جاؤ۔ اب اپنی چونچ بند رکھنا' ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ ہمت کر کے بولی "ان تینوں کی چاہے تم لوگ کھال نوچ ڈالو۔" اس کا اشارہ حنیف' جبار اور عثمان کی جانب تھا "لیکن مجھے اور میری لڑکیوں کو کچھ نہ کہنا ورنہ میرا دھندا چوپٹ ہو جائے گا۔ کسی کے روزگار پر لات مارنا اچھی بات نہیں۔"

"کیا تمہاری لڑکیاں بھی یہاں موجود ہیں؟" میں نے بھولے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی سے بولی "میں سویٹی اور رخ کی بات کر رہی ہوں۔"

"باس! مینا جیسی عورتیں دنیا کی عجیب مائیں ہیں جو اپنی مرضی اور خوشی سے بیٹیوں کو اس راہ پر چلنا سکھاتی ہیں۔" امتیاز نے خیال افروز انداز میں کہا پھر وہ گن پوائنٹ پر کھڑے ان تین افراد کی جانب متوجہ ہوگیا۔ "تم میں سچ بولنا کس کو آتا ہے۔"

اس نے باری باری تینوں کو گھورا اور اپنی جیب میں سے سانپ نکال کر ریوالور کے منہ پر فٹ کرنے لگا جس سے اس ریوالور کی خوف ناکی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ امتیاز کے استفسار میں ایسی وحشت تھی کہ وہ تینوں بہ یک زبان بول اٹھے۔

"مم..... میں!" اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا ایک ایک ہاتھ بھی اوپر اٹھا دیا۔ یہ الفاظ دیگر وہ تینوں اپنے راست گو ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

امتیاز نے ریوالور کا رخ بزدل چوکیدار جبار کی طرف کیا اور شاکی سے پوچھا "اس بنگلے میں تم چاروں اور" ان لاشوں کے علاوہ بھی ایک شخص موجود ہے۔ اس کا..... اصلی نام میر بخش اور فرضی نام فرید ہے۔ بولو' وہ اس وقت بنگلے کے کس حصے میں ہے؟"

جبار کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کی جانب دیکھتے ہوئے لکنت زدہ انداز میں بولا "مم..... میں..... کسی میر بخش..... کسی فرید کو نہیں جانتا....."

"ٹھک" کی ایک آواز پیدا ہوئی اور جبار اپنا سینہ تھامتے ہوئے پیچھے کی جانب الٹ گیا۔ امتیاز کے سائلنسر لگے ریوالور نے اس کے دل میں چھید ڈال دیا تھا۔

"سچ بولنے کا دعوے دار جب دروغ گوئی کرتا ہے تو اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔" امتیاز نے دہاڑ سے مشابہ لہجے میں کہا اور ریوالور کا رخ گھریلو ملازم عثمان کی طرف موڑتے ہوئے غرایا "میر بخش کو کل رات آخری پہر میاں زاہد کے ساتھ سے اغوا کیا گیا تھا۔ میں اسی میاں زاہد حسین کی بات کر رہا ہوں جو تم لوگوں کا باس ہے۔ کیا مجھے اپنا سوال دہرانے کی ضرورت ہے؟"

عثمان تھر تھر کانپنے لگا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ امتیاز نے اس کے گھٹنے کو نشانہ بنا کر خاموش فائر کر دیا اور دہاڑا "ہاتھ اٹھانے میں تم تو سب سے آگے تھے مردود!"

عثمان تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا اور اپنے مجروح گھٹنے کو تھام کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ مینا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم لوگ خواہ مخواہ ان کے خون میں ہاتھ رنگ رہے ہو۔ میں رات دس بجے سے اس بنگلے پر موجود ہوں۔ میں نے یہاں کسی میر بخش یا فرید کو نہیں دیکھا۔"

"تم نے زندگی میں صرف اپنے گاہکوں کو دیکھا ہے نا بائی۔" امتیاز نے طنزیہ لہجے میں کہا "میر بخش جیسے گرفتار افراد تک تمہاری نگاہ کیسے جا سکتی ہے؟"

وہ بولی "میں مینا بائی نہیں..... میڈم مینا ہوں۔"

اس کے انداز سے خفگی عیاں تھی۔ امتیاز نے بے پروائی سے کہا "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہارا پیشہ اور کردار نام کی تبدیلی سے نوعیت نہیں بدل سکتے۔"

میں نے مینا کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا "تھوڑی دیر پہلے تو تم ان تینوں کی کھال نچوانے کا مشورہ دے رہی تھیں اور اب ان کی حمایت کر رہی ہو۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے اچانک ان کی جان کی اتنی فکر کیوں پڑ گئی ہے؟"

"انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم ایسے لوگوں سے ہمدردی جتا رہی ہو جو تھوڑی دیر پہلے حیوانوں کا کردار ادا کر رہے تھے!"

"میں ان کی سطح پر تو نہیں آ سکتی۔" وہ گمبھیر انداز میں بولی "ہر شخص کا اپنا اپنا کردار ہوتا ہے۔"

مینا نے مجھے لاجواب کر دیا۔ ایک طوائف کے منہ سے ایسا دانش بھرا جواب سن کر میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

ہماری اس گفتگو سے ڈرائیور حنیف نے فائدہ اٹھایا اور اس نے لپک کر امتیاز کے ریوالور والے ہاتھ پر جھپٹا دیا۔ اس اچانک حملے سے ٹریگر پر امتیاز کی انگلی دب گئی۔

"ٹھک" کی آواز سے گولی چل گئی۔

اس کے ساتھ ہی فرش پر پڑے ہوئے عثمان کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔ ریوالور کی ہلاکت خیز گولی اس کی کھوپڑی میں جا گھسی تھی۔ اس کے بدن نے دو جھٹکے کھائے اور ٹھنڈا نہار ہوگیا۔

"تم لوگ ٹھیک نہیں کر رہے ہو!" مینا چیخ سے مشابہ آواز میں بولی۔

میں نے آگے بڑھ کر امتیاز کی خبر لی۔ حنیف نے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا۔ حنیف ڈیل ڈول اور جسم کا خاصا مضبوط تھا۔ میں نے محسوس کیا' امتیاز کو اس وقت میری مدد کی ضرورت تھی۔

میں نے حنیف کی گردن میں ہاتھ ڈال کر نیک لاک لگایا اور ایک جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ اسے کھانسی کا شدید دورہ اٹھا اور امتیاز کا ریوالور بردار ہاتھ اس کی گرفت سے نکل گیا۔ امتیاز نے حنیف کو گولی کا نشانہ بنانا چاہا تو میں نے اسے روک دیا۔

"ایک آدھ میرے لیے بھی رہنے دو یار۔" میں نے حنیف کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ بری طرح پچھتاؤ گے۔" حنیف نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا "تم دو بندوں کو قتل کر چکے ہو۔ یہاں سے نکل کر نہیں جا سکو گے۔"

"جو لوگ دو بندوں کو قتل کر سکتے ہیں وہ دو سو اور دو ہزار کو بھی چاں سے گزار سکتے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تم سیدھی طرح میر بخش کے بارے میں بتاتے ہو یا تمہیں بھی زمین پر لمبا لٹا دیا جائے۔"

وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر خاصی تقویت محسوس کر رہا تھا' دھمکی آمیز لہجے میں بولا "تم دونوں نے میاں جی کے چھپر میں گھس کر اپنی موت کو آواز دی ہے۔ اب بھی وقت ہے' یہ ہتھیار پھینک کر خود کو میرے حوالے کر دو ورنہ تمہارا حشر بڑا عبرت ناک ہوگا۔"

میں نے اس کی دھمکی کا جواب ہاتھ پاؤں سے دیا۔ ایک دو ہاتھ کے بعد وہ بھی اٹنشن بنا کر میرے سامنے جم گیا۔ اس کے جسم پر اس وقت صرف ایک پتلون تھی۔ میں نے اسے گگ مارنے کا جھانسا دیا اور ایک نیچا اسٹیپ لے کر تھوڑا آگے آ گیا۔

وہ بلاک کرنے والے انداز میں تھوڑا پیچھے ہٹا تو میں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک کریسنٹ کک جڑ دی۔ وہ چہرے کو تھام کر دو قدم پیچھے گیا پھر ڈگمگاتے ہوئے انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اب وہ تمام اسٹائل اور پینترے بھول گیا اور بالکل دیسی انداز میں مجھ پر پل پڑا۔ میں نے بھی جوابا اسٹریٹ فائٹ کے اصولوں کے مطابق اس کی دھنائی شروع کر دی جس کے اختتام پر میری ایک سائڈ کک نے اسے دور اچھال دیا۔

وہ سیدھا میڈم مینا کی گود میں جا کر گرا۔ وہ ایک مرتبہ پھر بہ آواز بلند چیخ اٹھی۔ اسی بوکھلاہٹ میں وہ نیم برہنہ بھی ہو گئی۔

اسی وقت باہر سے کسی کی پکار سنائی دی "حنیف..... جبار..... تم کہاں مر گئے ہو حرام زادو..... میں تمہیں پورے بنگلے میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔" اس کی آواز سے خمار جھلکتا تھا۔ وہ اپنی خواہش پر چڑھائے ہوئے تھا۔

مینا سراسیمہ لہجے میں بولی "یہ تو شاکر صاحب کی آواز ہے۔"

"کون شاکر؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"شاکر صاحب یہاں کے کرتا دھرتا ہیں۔" اس نے بتایا "ہم لوگ انہی کے بلانے پر اس بنگلے میں آئے ہیں۔"

اس دوران میں حنیف ڈرائیور نے جست لگا کر بیڈ سے نیچے اترنے کی کوشش کی۔ اس سے قبل کہ میں اس کی مرمت کے لیے ہاتھ پاؤں کو زحمت دیتا' امتیاز کے ریوالور نے ایک اور گولی اگلی اور حنیف نامی وہ گراں ڈیل شخص مردہ چھپکلی مانند دوبارہ بیڈ پر جا گرا۔ اب اس کے اٹھنے کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ کیونکہ خاموش موت کنپٹی کے راستے اس کے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔

"تمہارا کیا ارادہ ہے بائی جی؟" امتیاز نے سفاکی سے مینا کی جانب دیکھا۔

وہ لکنت زدہ لہجے میں بولی "مم..... میں..... نہیں جانتی' تم کون لوگ ہو..... اور ان لوگوں سے تمہاری کیا دشمنی ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ تم لوگ جو کہو گے' میں وہی کروں گی..... خدا کے واسطے مجھے جان سے نہ مارنا..... اور نہ میری لڑکیوں کو کوئی نقصان پہنچانا۔"

وہ باقاعدہ گھگیا رہی تھی۔ امتیاز نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اس کے اشارے کا جواب اشارے میں ہی دیا جس کا مطلب تھا' میڈم مینا کی جان بخش دی جائے۔ امتیاز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شاکر نامی اس شخص کی آواز اب بہت قریب سے آ رہی تھی جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ اس کمرے کے نزدیک پہنچ گیا تھا جہاں اس وقت ہم موجود تھے۔

"عثمان۔۔۔ جبار۔۔۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں اپنے ملازمین کو پکار رہا تھا "وہ بڈھی حرافہ مینا کس کونے میں جا چھپی ہے۔ اس سے کہو' جلدی بنگلے کے اندر پہنچے۔ رخ کو کچھ ہو گیا ہے۔"

"ہائے میں مرگئی۔۔۔ میری بچی؟" مینا بے ساختہ سینہ تھام کر بستر سے نکل آئی۔

اس کے بدن پر لباس نامی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ رخ کے بارے میں سنتے ہی وہ بے اختیار ہو گئی تھی۔

امتیاز نے اس کا لباس اس کی جانب پھینکتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "فوراً اسے پہن لو۔ شاکر کے سامنے' یہاں کی صورتِ حال تمہارے چہرے سے نہیں جھلکنا چاہیے۔ اس کی بات غور سے سنو اور بنگلے کے اندر چلی جاؤ۔ اگر تم نے میری ہدایت کے خلاف ایک سانس بھی لی تو سمجھ لینا' اسی وقت ایک بے آواز گولی تمہارے بدن میں اتر جائے گی۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکی ہو' میں کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کرتا!"

وہ جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگی پھر اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

لباس پہننے کے بعد اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا "شاکر صاحب ان تینوں کے بارے میں کوئی سوال کریں تو کیا جواب دوں؟" اس نے ان تینوں کی لاشوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

"تم کہہ سکتی ہو کہ یہ اپنا کھیل مکمل کرنے کے بعد سکون کی نیند سو رہے ہیں۔" امتیاز نے بے پروائی سے کہا "کمرے کے اندر وہ آئے گا نہیں' تم دروازے پر ہی اس سے بات کر لینا اور اس کے ساتھ چلی جانا۔ ویسے تم شاکر سے کچھ غلط بھی نہیں کہو گی۔ یہ تینوں واقعی سکون کی ابدی نیند سو رہے ہیں۔"

اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی پھر شاکر کی چنگھاڑ سے مشابہ آواز اندر پہنچی "عثمان!۔۔۔ اگر تم لوگ بڑھاپے سے جنگ میں مصروف ہو تو تھوڑی دیر کے لیے سیز فائر کر دو۔ یہ نامراد کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ اس وقت تم سے زیادہ رخ کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ اندر کمرے میں بے ہوش پڑی ہے۔ شاید اسے کوئی دورہ وغیرہ پڑ گیا ہے۔" شاکر کی آواز نشے سے بوجھل تھی۔

میڈم مینا نے یہ سننا تھا کہ لپک کر دروازے پر آئی اور بجلی کی سی سرعت سے بولٹ گرانے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ ہم اچک کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔ باہر کھڑا شاکر نامی وہ شخص کوشش کے باوجود بھی اندر کا منظر ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

اس موقع پر مینا نے واقعی سمجھ داری کا ثبوت دیا۔ جذبات سے لبریز آواز میں بولی "کیا ہوا ہے رخ کو؟"

"خود ہی آ کر دیکھ لو۔" شاکر سٹپٹائے ہوئے لہجے میں پھر کمرے کے اندر نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے عجلت سے سوال کیا "وہ تینوں کہاں ہیں؟"

"تھک کر سو رہے ہیں۔" مینا نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"سالے۔۔۔ گدھے کے بچے۔" شاکر نے زیرِ لب ملازمین کو ایک کلاسیکل ناقابلِ اشاعت گالی دی اور رخ کے لیے مڑ گیا۔

مینا نے پلٹ کر اطمینان بھری نظر سے کمرے کو دیکھا اور شاکر کے پیچھے چل دی۔

میں نے امتیاز سے کہا "یار! ہمیں ان کے پیچھے بنگلے کے اندرونی حصے میں پہنچ جانا چاہیے۔"

"میرا بالکل یہی ارادہ ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "مینا پر ہم زیادہ بھروسا نہیں کر سکتے۔ یہ عورت کسی بھی وقت ہمارا بھانڈا پھوڑ سکتی ہے۔ پہلے میں ہمیں اس کمرے سے نکلنا ہے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے کمرے میں موجود لاشوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور باہر نکل گیا۔ میں اس کی تقلید میں قدم اٹھا دیے۔ شاکر اور مینا تھوڑے فاصلے پر آگے جا رہے تھے۔ امتیاز نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"شاکر اس وقت پوری طرح ہوش و حواس میں نہیں آیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمیں بنگلے کے حصے میں پہنچنے میں کافی آسانی رہے گی۔"

میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا "کیا تمہیں صد فی صد یقین ہے کہ میر بخش اس وقت اندر موجود ہے؟"

"صد فی صد نہیں بلکہ ایک سو ایک فی صد میں ہوں۔" وہ چٹانی لہجے میں بولا "مجھے ملنے والی اطلاعات ہی نہیں سکتیں۔"

ہم ان دونوں کے تعاقب میں انتہائی احتیاط سے بنگلے کی اندرونی عمارت میں پہنچ گئے۔ جب مینا' شاکر ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو گئی تو میں نے کہا۔

"یار امتیاز! مینا نے بتایا تھا کہ شاکر یہاں کا کرتا

ہے۔ اگر ہم اس پر قابو پالیں تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

"جگر! تم نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔" امتیاز خوشی سے کھل اٹھا۔

اس وقت ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اس بنگلے میں بمبینہ طور پر صرف دو افراد ایسے رہ گئے تھے جن سے ہمیں تمنا تھا۔ ایک نیم مدہوش شاکر اور دوسرا اس کا دوست... جو مینا کی لڑکی سویٹی کے ساتھ مصروف تھا۔ ہمارے لیے یہ ایک انتہائی آسان ٹارگٹ تھا لہٰذا ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کیا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

میری نگاہ نے ایک وحشت انگیز منظر دیکھا۔ چاند چہرہ رخ ایک کنگ سائز بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔ سینے تک اس کا جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس چادر کے نیچے وہ یقیناً بے لباس ہو گی۔ مینا بے تابی سے جھنجوڑ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وحشی شاکر نے جانے اس کے ساتھ ایسا کیا کر دیا تھا کہ وہ کومل سی لڑکی ہوش و حواس گنوا بیٹھی تھی۔

بیڈ کے نزدیک ہی ٹرالی پر ایک کلر ٹی وی آن تھا جس پر ایک یورپی چینل چل رہا تھا "وو کس" نامی اس چینل پر غریبوں والی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ وہ کوئی تربیتی فلم تھی جس میں ٹاپ ماڈل کال گرلز کو پیشہ ورانہ تعلیم دی جا رہی تھی۔ یورپ اور امریکا میں ایسی فلم بندی اور فلم بینی عام سی بات ہے!

اگر ہم نے کمرے کے اندر کی صورتِ حال کو اس تفصیل سے جان لیا تھا تو ممکن نہیں تھا کہ اندر والے ہمیں نہ دیکھ پائے ہوں۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی شاکر اور مینا نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا تھا۔ مینا ایک نظر ہم پر ڈالنے کے بعد رخ کی جانب متوجہ ہو گئی تاہم شاکر پھٹی پھٹی سرخ آنکھوں سے ہمیں تکتے ہوئے غصے سے بولا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

"تمہاری ماں کے یار۔" امتیاز نے زہر خند لہجے میں کہا اور ریوالور کا رخ شاکر کی جانب موڑتے ہوئے بولا "میر بخش کہاں ہے؟"

"میر بخش!" شاکر نے زیرِ لب دہرایا اور اسے جیسے ہوش آ گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا زیادہ نشے میں نہیں تھا جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ میں نے شاکر کی آنکھوں میں اپنے لیے شناسائی کی چمک دیکھ کر چونک اٹھا۔

اسی لمحے وہ میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے [illegible] آواز میں بولا "وجدان... اولادِ شیطان... تم یہاں کیسے گئے!"

"میں عن قریب تمہارے پرائیویٹ باپ میاں حسین اور سیمی پرائیویٹ دادا چوہدری نوازش علی کی [illegible] تک بھی پہنچنے والا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے [illegible] "مسٹر شاکر! باقی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ فی الحال صرف اتنا بتاؤ' میرا ساتھی میر بخش کہاں ہے؟"

[illegible] اس کے نام سے مخاطب کیا تو حیرت سے [illegible] آنکھیں کھل گئیں اس کا نشہ تقریباً ہوا ہو چکا تھا۔ وہ [illegible] ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو تمہیں میرا نام بھی معلوم ہو چکا ہے۔"

میرے بجائے امتیاز نے اسے لتاڑا "صرف [illegible] نہیں' ہم تمہارا پورا شجرۂ نسب بھی جانتے ہیں۔ تم [illegible] خبیث بن فلاں مہاخبیث کی اولاد ہو۔"

ہمیں باتوں میں لگا کر شاکر نے ایک چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔ اس کا ہاتھ بڑی سرعت سے تکیے کے نیچے اور ایک پستول لے کر باہر آ گیا۔ اس نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں مجھے نشانہ بنا کر گولی داغ دی۔

فائر کی آواز بند کمرے میں ایک دھماکے کی طرح [illegible] لیکن میں کسی بھی قسم کے ضرر سے محفوظ رہا۔ میں اگر [illegible] کے نشانے پر موجود رہتا تو گولی میرا کچھ بگاڑ سکتی تھی۔ اس کا پستول والا ہاتھ سیدھا ہوتے ہی فضا میں پرواز [illegible] ڈبل فرنٹ سمرسالٹ لگاتے ہوئے عین شاکر کے [illegible] گیا۔ اس نے بوکھلاہٹ میں پستول کا رخ میری جانب [illegible] چاہا لیکن اسی وقت میرے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر [illegible] ٹھوڑی پر لگی۔

وہ بلبلاتے ہوئے پیچھے بستر پر الٹ گیا۔ وہ پشت [illegible] بے ہوش رخ پر گرا تھا۔ مینا کی "لڑکی" نے حیرت انگیز [illegible] آنکھیں کھول دیں۔

میرے حملے نے شاکر کے ہاتھ سے پستول چھڑا [illegible] اتفاق سے وہ پستول سیدھا مینا کے سامنے جا گرا۔ مینا [illegible] پستول پر قبضہ کیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر ہم سب کو [illegible] نشانے پر رکھتے ہوئے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"تم سب جہنم میں جاؤ اور وہیں جا کر اپنی [illegible] نکالتے رہو۔ مجھے اور میری لڑکیوں کو ابھی یہاں سے

[illegible] ہمارے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش نہ [illegible]

[illegible] رخ کو پچکارنے لگی "اٹھو میری بچی۔ ہمت کرو۔ [illegible] کو بھی بلاتی ہوں۔"

میں سویٹی کو بھی بلاتی ہوں۔"

میں نے فیصلہ میرے دل کو لگا' میں نے سرہانے والے مینا کا فیصلہ انداز میں کہا "تمہاری بہتری اور بچت اسی میں ہے کہ فوراً سے پیشتر فوجکر ہو جاؤ۔ اپنی حفاظت کے لیے شاکر کا پستول ساتھ لے جاؤ اور یہ بات تو تمہیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے بارے میں تم نے زبان بند رکھنا ہے۔"

"تم کہیں نہیں جاؤ گی مینا۔" شاکر نے مینا کی جانب دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا "لاؤ' یہ پستول مجھے دے دو۔ یہ دونوں ہمارے دشمن ہیں۔ میں ان پر قابو پالوں گا۔ تم رخ کو سنبھالو۔"

اسی وقت کمرے کے دوسرے دروازے پر تیز دستک ہوئی پھر کسی نے تشویش بھری آواز میں دریافت کیا "شاکر بھائی! تم خیریت سے تو ہو نا۔ میں نے ابھی ابھی فائر کی آواز سنی ہے؟"

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا۔ اس دروازے کی دوسری جانب وہ کمرا تھا جہاں شاکر کا دوست سویٹی کے ساتھ موجود تھا۔ شاکر نے مجھ پر گولی چلائی تھی تو امتیاز انتہائی ماہرانہ سرعت سے فرش پر رول کرتے ہوئے ایک جانب لڑھک گیا تھا۔ وہ اس وقت اسی دروازے کے نزدیک پوزیشن سنبھالے کھڑا تھا۔

شاکر نے بند دروازے کے پیچھے سے بولنے والے سے چلا کر کہا "یار قوبا! ادھر دو بدمعاش گھس آئے ہیں۔ تم اپنی گن لے کر فوراً یہاں پہنچو۔"

میں نے امتیاز کو اشارہ کیا کہ مذکورہ دروازے کی کنڈی گرا دے۔ اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔

شاکر نے چیخ کر اپنے دوست کو مطلع کیا "قوبا! اس دروازے سے نہ آنا۔ دروازے کے پیچھے ایک بدمعاش ریوالور لیے کھڑا..."

اس کی سنسنی خیز اطلاع پوری ہونے سے پہلے ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور کلاشنکوف بردار قوبا نامی وہ شخص کمرے کے اندر آ گیا۔ یا تو اس نے شاکر کی وارننگ سنی ہی نہیں تھی یا پھر اس کی بات کو اہمیت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ صورتِ حال اچانک واہیات رخ اختیار کر گئی۔

قوبا نامی اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی شاکر ایک مرتبہ پھر چلایا "یہ وجدان ہے' تمہارے بھائی اسحاق کا قاتل۔ اسے فوراً شوٹ کر دو۔" وہ انگلی سے میری جانب اشارہ کر رہا تھا۔

قوبا نے نفرت آمیز انداز میں مجھے دیکھا اور کلاشنکوف کا ایک برسٹ فائر کر دیا۔

اس موقع پر امتیاز نے برق رفتاری سے ردِ عمل کا مظاہرہ کیا اور ٹریگر پر قوبا کی انگلی دبنے سے پہلے ہی وہ اس کی کلاشنکوف کو ایک ٹھوکر مار کر چھت کی جانب موڑ چکا تھا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے کمرا گونج اٹھا۔ تمام گولیاں چھت میں لگی تھیں اور وہاں جا بہ جا پلاسٹر ادھڑ کر رہ گیا۔ اس فائرنگ کے ساتھ ہی دوسرے کمرے سے سویٹی کی انتہائی کریہہ چیخ بھی بلند ہوئی۔

امتیاز کلاشنکوف کو ٹھوکر مارنے کے بعد لوٹ لگا کر ایک چوبی الماری کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ قوبا نامی کلاشنکوف بردار دوبارہ میری جانب متوجہ ہوا تو اس کے چہرے میں ایک شناسا جھلک دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہائٹ شیرڈ میں جن تین افراد نے ریلوے اسٹیشن سے ہمارا تعاقب کیا تھا ان میں کلف دار شلوار قمیص والا ایک فربہ شخص بھی تھا۔ قوبا اس موٹے سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شاکر نے قوبا کو مطلع کیا تھا کہ میں اس کے بھائی اسحاق کا قاتل ہوں۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ قوبا اس موٹے کا بھائی تھا۔ سفید شیرڈ والے تینوں افراد "سی ایف کے" والوں کی فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے لیکن یہ ہلاکتیں وقت کی ستم ظریفی نے میرے کھاتے میں ڈال دی تھیں۔

قوبا (بعد میں اس کا نام یعقوب معلوم ہوا) مجھ پر فائرنگ کرتے ہوئے تھوڑا سا ہچکچایا کیوں کہ میرے عقب میں مینا اور رخ موجود تھیں اور پہلو میں شاکر بھی بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اسی لمحے سویٹی بھی خوف زدہ انداز میں بھاگتے ہوئے اپنی "ماں" میڈم مینا کے پاس پہنچ گئی۔

یعقوب کی لمحاتی ہچکچاہٹ سے امتیاز نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے الماری کے عقب سے تاک کر یعقوب کے ہاتھوں کا نشانہ لیا اور یکے بعد دیگرے دو بے آواز فائر کر دیے۔

یعقوب عرف قوبا چیختے ہوئے پیچھے ہٹا اور کلاشنکوف اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گری۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے [illegible] رکاں اور کلاشنکوف پر قبضہ کر لیا۔ قوبا اور شاکر وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

"اب کیا ارادہ ہے شاکر! میر بخش کے بارے میں بتاتے

ہو یا تم دونوں کو گولیوں سے چھلنی کردوں؟"

"میر بخش اس بنگلے میں نہیں۔" شاکر نے کن انکھیوں سے یعقوب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر کہاں ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

امتیاز نے کہا "وجدان! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ فائرنگ کی آواز کسی حد تک باہر بھی گئی ہوگی۔ اگرچہ یہ رات کا آخری پہر ہے۔ لوگ گہری نیند میں ہوں گے لیکن کوئی شب بیدار اس جانب متوجہ ہو سکتا ہے۔ تم ان سب کو کور کرو۔ میں خانہ تلاشی لے کر آتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کلاشنکوف کو ریڈی آن کرتے ہوئے کہا پھر امتیاز سے پوچھا "ان کا کیا کرنا ہے؟" میرا اشارہ میڈم مینا اور اس کی لڑکیوں کی جانب تھا۔

وہ مینا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "تم اپنی لڑکیوں کو لے کر واش روم میں.... جاؤ اور ان کے لباس پر توجہ دو۔ تمہارے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے۔" پھر اس نے میری جانب مڑتے ہوئے کہا "انہیں فی الحال جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔"

بات ختم کرتے ہی وہ مینا کے پاس پہنچا اور اس کے ہاتھ سے شاکر والا پستول جھپٹ لیا۔ امتیاز کے ریوالور کی چھے گولیاں فائر ہو چکی تھیں۔ اب اس کے تمام چیمبرز خالی ہو گئے تھے۔ اسی لیے امتیاز نے وہ پستول اپنے قبضے میں کیا تھا' البتہ میرے پاس فلی لوڈڈ اسٹیل باڈی پسٹل خاموشی سے آرام فرما رہا تھا۔

امتیاز کی ہدایت پر مینا' سوہنی اور رخ کے ساتھ ملحقہ واش روم میں گھس گئی اور میں ان دو سورماؤں کی جانب متوجہ ہو گیا جو اس وقت نہ شور تھے اور نہ ماؤں بلکہ صرف "میاؤں میاؤں" ہو کر رہ گئے تھے۔ کلاشنکوف کے نشانے پر وہ بے دست وپا ہو کر رہ گئے تھے۔

شاکر نے مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وجدان! تم ابھی نئے نئے جرم کی دنیا میں آئے ہو اسی لیے میاں جی کی طاقت کا تمہیں اندازہ نہیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس کارروائی سے باز آجاؤ۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم مجھے یہ مشورہ اس لیے دے رہے ہو کہ شاید تمہارا میاں بھی میرے بارے میں تفصیلاً نہیں جانتا۔ میں تو شیر خواری کی عمر ہی سے تمہاری مخصوص دنیا میں قدم رکھ چکا تھا۔ بارہ سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد تو میں نے دارا جیسے بدنام زمانہ' شیطان ابن شیطان سے پنجہ آزمائی شروع کردی تھی۔"

وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "کیا ہمارے درمیان [illegible] نہیں ہو سکتی؟"

میں بہ خوبی اس کی چال سمجھ رہا تھا۔ اس کی یہ پیش کش بھی اصول پر پوری نہیں اترتی تھی۔ وہ مجھے گم [illegible] موقع حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جواباً' میں نے اسے گھورنے پر اکتفا دیا۔

"کیوں نہیں' ہمارے بیچ یقیناً دوستی ہو سکتی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ قدرے مطمئن نظر آیا اور میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "چلو' پہل میں کرتا ہوں۔ آج سے ہم دوست ہیں۔ کلاشنکوف پھینک کر میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دو۔"

میں نے اس کی مکاری کی تہ میں اترتے ہوئے لفظی جوتا مارا "مسٹر شاکر! تم نے دوستی کے لیے ہاتھ [illegible] دیا ہے لیکن یہ بھول گئے کہ تمہیں میری دوستی کے [illegible] اپنے میاں جی کی دشمنی مول لینا ہوگی۔ کیا تم یہ سودا [illegible] سکتے ہو؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا' وہ [illegible] آمیز لہجے میں بولا "میں میاں جی کو سمجھانے کی کوشش [illegible] گا۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ دراصل اس نے میاں زاہد حسین کو سمجھانے کی بات اس طرح کی تھی جیسے کوئی بیوی اپنے شوہر کو سمجھانے کا ذکر کرتی ہے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "[illegible] یہ بات پوری سنجیدگی سے کر رہے ہو تو پھر میں یہی کہوں گا تم الو کے پٹھے ہو۔ کیوں کہ تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم میاں زاہد کی کٹھ پتلی ہو' وہ تمہارے ہاتھوں کا کھلونا ہے جو تم اسے ڈکٹیشن دو گے!"

اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے آثار نمودار ہوئے جیسے اس نے دل ہی دل میں مجھے کوئی طوفانی گالی دی ہو۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا' صرف دانت کچکچا کر رہ گیا۔

اسی وقت قوبا نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ اپنے کو پکڑ کر دہرا ہوا پھر فرش پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے شدید تاثرات تھے یوں محسوس ہوتا تھا' اچانک اس کے پیٹ میں کوئی خطرناک قسم کا درد اٹھا ہو۔

شاکر جھک کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور تشویش بھرے لہجے میں پوچھنے لگا "کیا ہوا قوبا۔ یہ اچانک تم زمین پر کر

گئے ہو؟"

میں بھی صورت حال جاننے کے لیے دو قدم آگے بڑھ آیا۔ قوبا کی کیفیت نے مجھے بھی الجھا دیا تھا۔ جلد ہی اس کی مکاری کا پول کھل گیا۔

میں قوبا کی جانب متوجہ تھا کہ امتیاز جلدی سے کمرے میں داخل ہوا اور مایوسی بھرے لہجے میں بولا "وجدان! میں نے تمام کمرے اور دوسری جگہوں پر چیک کرلیا ہے' میر بخش کا سراغ نہیں مل رہا۔ کہیں ان کمینوں نے اسے جان سے تو۔۔۔!"

امتیاز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور قہر آلود نظروں سے شاکر کو تکنے لگا۔

شاکر نے کہا "میں تو تم لوگوں کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ تمہارا مطلوبہ بندہ یہاں نہیں ہے۔ اب تم نے خود دیکھ کر تسلی کرلی نا!"

"تیری تسلی کی تو میں ایسی کم تیسی کروں گا۔" امتیاز نے سفاکی سے کہا پھر میرے ہاتھ سے کلاشنکوف لے کر وہ جارحانہ انداز میں شاکر کی طرف بڑھ گیا۔

یہی لمحہ تھا جب قوبا کے "دردِ قولنج" کی قلعی کھل گئی۔ مجھے نہتا ہوتے دیکھ کر وہ کسی اسپرنگ کے مانند فرش پر اچھلا اور بے قابو گاڑی کی طرح سیدھا میری طرف بڑھا۔

اس کی اس برقی حرکت نے ثابت کر دیا کہ وہ شدید تکلیف کا بہانہ بنا کر زمین پر اسی مقصد کے لیے گرا تھا کہ کسی طرح مجھ تک پہنچ سکے۔

قوبا نے کسی سرکاری سانڈ کی طرح میرے پیٹ میں ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ اس کا نشانہ سچا تھا لیکن میں اس وقت فل ایکشن میں تھا۔ قوبا کا سر "ٹارگٹ" تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

میرا یہ عمل میکانکی تھا' قوبا اپنی ہی جھونک میں میرے قریب سے گزرا پھر اس کا سر ٹی وی ٹرالی سے جا ٹکرایا۔ ٹرالی پر رکھا ہوا وہابیات پروگرام دکھانے والا کلر ٹی وی اس ٹکراؤ کے باعث فضا میں اچھلا پھر ایک دو قلابازیاں کھانے کے بعد زمین بوس ہو گیا۔ اس طوفانی بوسے کے نتیجے میں ایک چھناکے سے اس کا اسکرین چکنا چور ہو گیا۔ ٹرالی پر رکھی ہوئی دیگر اشیا بھی اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔

اسی وقت واش روم کا دروازہ کھلا اور "ماں بیٹیاں" چلاتی ہوئی وہاں سے برآمد ہوئیں۔ وہ اس وقت مناسب لباس میں تھیں۔

ہنگامے کے دوران میں پھیلی ہوئی افراتفری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"تمہاری لڑکیوں کی برائیں آئی ہیں۔" میں نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا "اس لیے پٹاخے چھوٹ رہے ہیں۔"

جب ہم اس کمرے میں پہنچے تھے تو ہم پر نظر پڑتے ہی شاکر نے ٹی وی کو ریموٹ کنٹرول سے آف کر دیا تھا مگر اس کی پاور سپلائی جاری تھی۔ قوبا سے ٹکراؤ کے بعد شاید اس کے اندر کوئی شارٹ سرکٹ جیسا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس میں سے ایک دو مرتبہ کچھ آوازیں سی برآمد ہوئی تھیں۔ میرا اشارہ انہی آوازوں کی جانب تھا۔

"ہم تو جا رہے ہیں بھائی۔" مینا دونوں لڑکیوں کو سمیٹتے ہوئے ایک جانب بڑھی۔ اس وقت تک رخ باقاعدہ ہوش میں آچکی تھی۔

میں نے ڈانٹ کر کہا "کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ تم تینوں واپس باتھ روم میں چلو۔"

انہوں نے مایوسی سے میری جانب دیکھا اور میرے حکم کی تعمیل کردی۔ میں نے ان کے' باتھ روم میں داخل ہوتے ہی باہر سے کنڈی لگا دی۔ اب وہ اس وقت تک باہر نہیں آسکتی تھیں جب تک وہ کنڈی کھولی نہ جاتی۔

میں نے پہلے رخ کو چاند چہرہ کہا تھا۔ اس وقت تک میں نے پوری طرح اسے دیکھا نہیں تھا۔ اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس کی ادھوری تعریف کی تھی۔ رخ درحقیقت چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں تھی۔

میں اس سے زیادہ رخ کے بارے میں سوچ نہ سکا کیوں کہ زخمی چہرے والا قوبا میرے سر پر پہنچ گیا تھا۔ ٹی وی ٹرالی سے تصادم نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا' تاہم اس کی دانست میں' میں اس کے بھائی اسحاق کا قاتل تھا۔ اس لیے وہ مرنے مارنے پر تل گیا۔

وہ دونوں ہاتھ آگے نکال کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت میں دبوچنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے بازوؤں کو بڑی مہارت کے ساتھ اپنی بغلوں میں دبوچ لیا پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی کنپٹیوں پر کراس چوپ (CHOP CROSS) رسید کردیے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے ایک دھکا دیتے ہوئے اپنی گرفت سے آزاد کردیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے کی جانب گیا۔ میں نے شارٹ اسٹیپ کے ساتھ ایک سائیڈ فلائنگ کک اس کے سر پر جڑ دی۔ وہ لڑھکتے ہوئے ایک مرتبہ پھر مجروح ٹرالی کے پاس پہنچ گیا۔

امتیاز پے در پے کلاشنکوف کے بٹ شاکر کے منہ سر پر

رسید کر رہا تھا۔ شاکر کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا تاہم امتیاز پر اس وقت ایک جنون سوار تھا۔ شاکر کی اس کے سامنے کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ شاکر کا پورا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا۔

آنے والے پانچ منٹ میں ہم دونوں نے شاکر اور یعقوب کے سارے کس بل نکال دیے۔ وہ ہمارے قدموں میں پڑے زمین چاٹ رہے تھے۔ اب وہ ہم پر ہاتھ اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں رہے تھے کیوں کہ زمین سے اٹھنا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔

امتیاز کی سفاکی اس وقت پورے عروج پر تھی۔ وہ شاکر کے نزدیک ہی ایک کرسی ڈال کر بیٹھ گیا پھر اپنے لباس سے ایک تیز دھار خنجر برآمد کرتے ہوئے غرایا۔

"میر بخش کو تم نے کہاں چھپایا ہے؟"

شاکر جواب دینے سے پہلے تھوڑا ہچکچایا۔

امتیاز نے اس کا ایک پاؤں پکڑ کر اپنے نزدیک کھینچ لیا پھر ٹخنے کے عقبی حصے میں' ایڑی سے تھوڑا اوپر خنجر کی نوک دھنسا کر ایک جھٹکا دیا۔ پاؤں کو حرکت دینے والی ایک مخصوص رگ کٹ گئی۔

اس کے ساتھ ہی شاکر کے حلق سے فلک بوس چیخ برآمد ہوئی اور وہ کسی ذبح کیے ہوئے بکرے کے مانند تڑپنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اب زندگی بھر اس پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا..... امتیاز نے تڑپتے پھڑکتے شاکر کی آنکھوں کے سامنے خنجر لہراتے ہوئے خوں خوار لہجے میں دریافت کیا

"میر بخش چاہیے مجھے' کہاں ہے وہ؟"

تکلیف کی شدت سے شاکر کے منہ سے گالیوں کا گٹر ابل پڑا۔ امتیاز نے بلا تردد اس کے دوسرے پاؤں کے ساتھ بھی وہی عمل دہرایا جو وہ پہلے کے ساتھ کر چکا تھا۔ شاکر کا حشر دیکھ کر قوبا بے ہوش ہو گیا۔

"اب تمہاری پوری زندگی وہیل چیئر پر گزرے گی شاکر!" امتیاز نے خنجر کی دھار اسی کے لباس سے صاف کرتے ہوئے کہا "اس اپاہج زندگی کی ضمانت بھی اسی صورت میں دی جا سکتی ہے کہ تم مجھے میر بخش کے بارے میں بتا دو۔ ورنہ اب میں تمہاری آنکھوں کا رخ کرنے والا ہوں!"

شاکر کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ گھگیاتے ہوئے بولا "خدا کے لیے مجھے جان سے نہ مارنا..... میری آنکھوں کو چھونا بھی نہیں..... میں تمہیں بتاتا ہوں میر بخش کے بارے میں..... بتاتا ہوں....."

"بکو بھی!" امتیاز دہاڑا "ہمارے پاس تمہاری فضول تمہید سننے کا وقت نہیں۔"

"وہ..... وہ تہ خانے میں ہے۔" شاکر کے ہونٹوں سے بالآخر وہ راز پھسل ہی گیا جس کی حفاظت کی خاطر وہ قدموں سے محروم ہو گیا تھا۔

"تہ خانے کا راستہ کس طرف ہے؟" امتیاز نے پوچھا۔

شاکر نے بڑی شرافت سے تہ خانے تک پہنچنے کا راستہ بتا دیا۔

آئندہ پندرہ منٹ کے اندر ہم نے بنگلے کے تہ خانے سے میر بخش کو برآمد کر لیا۔ اس کی حالت خاصی تشویشناک تھی۔ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ زندہ تو تھا مکمل بے ہوش تھا۔ امتیاز علی بلوکیسہ کو بنگلے کے دروازے کے سامنے لے آیا اور کسی بدمزگی سے بچنے کے لیے ہم میر بخش کو گاڑی کی ڈکی میں بھر لیا۔ ایک سائیڈ کی سیٹ اور انڈی کیٹر کو کھول کر ہوا کی آمد و شد کا بندوبست کر گیا۔

روانہ ہونے سے قبل یعقوب عرف قوبا اور شاکر کا مناسب انتظام کرنا بھی ضروری تھا۔ اس کے علاوہ دیگر اور اس کی لڑکیوں کا بھی مسئلہ تھا پھر سرونٹ کوارٹر میں افراد کی لاشیں بھی پڑی تھیں۔

امتیاز کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر میں نے "سب پر لعنت بھیجو یار! بس ان تینوں کو آزاد کر دیتے ہیں جہاں جانا چاہیں' چلی جائیں۔ ان کی طرف سے ہمیں خطرہ نہیں ہو سکتا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو جگر۔" وہ میری تجویز سے متفق ہوتے ہوئے بولا "ویسے ان دو مردودوں کی جانب سے بھی خدشہ والی کوئی بات نہیں۔ شاکر تو اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا' وہ ہمارا تعاقب کیا کرے گا اور قوبا..... وہ تو فرطِ خوف اثنا غفیل ہو چکا ہے۔"

میں نے کہا "ہم احتیاطاً ٹیلی فون کے تار کاٹ دیتے ہیں تاکہ کسی قسم کا اندرونی یا بیرونی رابطہ ممکن نہ رہے۔"

"یہ کام تو نہایت ہی ضروری ہے جگر!" امتیاز نے کہا "ٹھیک پانچ منٹ بعد' ہم ہر قسم کی تسلی کرنے کے بعد بنگلے سے روانہ ہو رہے تھے۔ گلی کے سرے پر پہنچے تو بنگلے کے گیٹ پر میں نے ایک پریشان صورت بوڑھے کو کھڑے دیکھا۔ اس نے ہماری گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں نے ڈرائیور جاوید سے روکنے کو کہا۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔

میں نے کھڑکی سے سر نکال کر اس عمر رسیدہ شخص سے پوچھا "فرمائیے بابا جی' کیا مسئلہ ہے؟"

"جیتے رہو بیٹا۔" اس نے مجھے دعا دی پھر بولا "کچھ دیر پہلے میں نے اس طرف فائرنگ کی آواز سنی تھی جدھر سے تم لوگ آ رہے ہو۔ کیا کوئی سنگین معاملہ ہو گیا ہے؟"

"ادھر کچھ میٹنیں ہو گئی ہیں۔" امتیاز نے اس شخص کے سوال کا جواب دیا۔

"میٹ پر فائرنگ!" اس نے حیرت سے دہرایا۔

امتیاز نے سنجیدگی سے کہا "بس انکل! اس شہر کا مزاج ہی کچھ ایسا بن گیا ہے۔ خوشی اور غم میں تفریق کرنا ممکن نہیں رہا۔ واقعہ چھوٹا ہو یا بڑا' خوشی کا موقع ہو یا غم کے لمحات' ہم فائرنگ ضرور کرتے ہیں۔ فائرنگ دراصل ہمارے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو بیٹا..... تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔" وہ شخص اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

میرے اشارے پر ڈرائیور نے بلوکیب آگے بڑھا دی۔

ہم نے جاوید کی مدد سے میر بخش کو ٹیکسی کی ڈکی میں پہنچایا تھا لہٰذا حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر اس نے امتیاز سے پوچھا "کس طرف چلنا ہے امتیاز صاحب؟"

"میر بخش کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے ہم فلیٹ پر لے چلیں۔" میں نے کہا "اسے کسی اسپتال پہنچانا چاہیے تاکہ فوری طبی امداد دی جا سکے۔ اس کی بے ہوشی کو توڑنا ضروری ہے۔"

امتیاز نے کہا "میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں لیکن اس وقت اور اس کنڈیشن میں ہم اسے جہاں بھی لے جائیں گے' ہم پر سوالات کی بوچھار کر دی جائے گی۔ ہم اس باڑ کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔"

"پھر؟" میں نے تشویش میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔" جاوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میرے ایک ڈاکٹر دوست کا پرائیویٹ اسپتال ہے جہاں ہر قسم کے علاج کی سہولیات میسر ہیں۔ اگر آپ کہو تو میں سیدھا وہاں چلتا ہوں۔"

"کیا تمہارا وہ دوست ہم سے جرح نہیں کرے گا؟" امتیاز نے پوچھا۔

"وہ میرا دوست ہے۔" جاوید نے پُراعتماد لہجے میں کہا "میں سمجھاؤں گا تو وہ سمجھ جائے گا۔ اس کی رہائش بھی اسپتال کی بالائی منزل پر ہے۔ ویسے اس اسپتال میں چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کی سہولت موجود ہے۔"

امتیاز نے پوچھا "تمہارے دوست ڈاکٹر کا اسپتال کہاں ہے؟"

"گلشن میں۔" اس نے بتایا۔

"ڈاکٹر کا نام؟"

"فیروز۔" جاوید نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" امتیاز نے مطمئن انداز میں کہا "ہم ابھی اور اسی وقت گلشن اقبال جائیں گے۔"

جاوید نے یک بارگی بلوکیسہ کی رفتار بڑھا دی۔

✪✶✪

جب ہم فلیٹ پر پہنچے تو اجالا پھیل چکا تھا۔

دروازے پر آویزاں تالے کو دیکھ کر میں نے حیرت بھرے لہجے میں امتیاز سے پوچھا "یہ دونوں کہاں چلی گئیں؟"

"روبی کو مارننگ واک کی بیماری ہے۔" وہ جیب سے تالے کی چابی نکالتے ہوئے بولا "ساحل کو وہ اپنے ساتھ لے گئی ہو گی۔"

"اوہ!" میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ "روبی جتنی حسین ہے' اتنی ہی خوبصورت اس نے بیماری بھی پال رکھی ہے۔ مارننگ واک کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔"

ہم فلیٹ کے اندر آ گئے۔ امتیاز نے معنی خیز انداز میں کہا "ابھی روبی سے تمہاری کھل کر بات نہیں ہوئی ہو گی۔ اس حسین لڑکی نے واقعی بڑی سنگین بیماریاں پال رکھی ہیں۔ اس کے غم کو محسوس کرنے کے لیے غم خوار دل کا ہونا ضروری ہے۔"

میں نے محسوس کیا' روبی کے حسن کے تذکرے نے اسے خاصا سنجیدہ کر دیا تھا۔ اس سنجیدگی میں افسردگی کا عنصر شامل تھا۔ میں نے اس کی کیفیت کو زائل کرنے کی خاطر موضوعِ گفتگو بدل دیا اور پوچھا۔

"کیا یہاں قریب میں کوئی پارک وغیرہ بھی ہے یا وہ مارننگ واک کے نام پر روڈ ناپنے گئی ہیں؟"

امتیاز نے جواب دیا "یہاں کچھ ہی فاصلے پر ایک خوبصورت پارک موجود ہے۔ ایک پہاڑی پر واقع اس صحت افزا مقام کا نام "ہل پارک" ہے۔ یہ کراچی کا سب سے بلند مقام ہے جس سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔"

"واہ!" میں نے پُرمسرت انداز میں کہا "مجھے کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی۔"

"کیا کرنے کا ارادہ ہے جگر!" اس نے ٹٹولنے والے انداز سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "ساحل کو مارشل آرٹس اور یوگا سیکھنے سے

خاصی دلچسپی ہے۔ اس کی تربیت کے لیے ہل پارک بہت مناسب رہے گا۔"

"جگر! آج میں نے تمہارے آرٹ کا عملی مظاہرہ دیکھا ہے۔" امتیاز نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا "تم نے واقعی شاؤلن ٹیمپل سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اگر موقع ملا تو میں بھی تم سے کنگ فو کی چند تیکنیکس ضرور سیکھوں گا۔ پاکستان میں خالص چینی کنگ فو (KUNG-FU) کے ماہرین کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔"

"فکر نہ کرو' اب سمجھو یہ کمی کافی حد تک دور ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنا لگا۔

میں نے بتایا "میں مستقبل قریب میں یہاں کراچی میں مارشل آرٹس کا ایک بہت بڑا کلب کھولنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"ویل ڈن۔" وہ خوشی سے کھل اٹھا "تمہارے عزائم نے مجھے بڑی تقویت دی ہے جگر۔ میں اس سلسلے میں پیش آنے والے فنانشل معاملات کے بارے میں باس سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً اس پروجیکٹ کے لیے ہمیں مالی تعاون دیں گے۔"

"میں نے فنانس کا مسئلہ حل کر لیا ہے۔" میں نے سنگاپور والے معاملات سے اسے آگاہ کرنے کے بعد کہا "مجھے کراچی میں سٹیل ہونے کے سلسلے میں کسی مالی پریشانی سے نہیں گزرنا پڑے گا یار۔"

امتیاز نے کہا "میری دعا ہے' اللہ تمہیں اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔"

میں نے پوچھا "امتیاز! تم نے بتایا تھا کہ تم بھی کافی عرصہ مارشل آرٹس سیکھتے رہے ہو؟"

"ہاں' میں نے بانڈو (BANDO) اسٹائل میں براؤن بیلٹ تک سیکھا ہے۔ اس کے بعد میرا پارٹنر ملک سے باہر چلا گیا اور میں نے بھی ٹریننگ سینٹر جانا چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا "یار! تھوڑی سی محنت اور کر لیتے۔ بانڈو میں براؤن بیلٹ غالباً چھٹا گریڈ ہے۔ اس کے بعد بلیک بیلٹ کا درجہ آتا ہے۔ تم بھی بلیک بیلٹ ہو جاتے۔"

"غالباً نہیں بلکہ یقیناً براؤن بیلٹ کا چھٹا گریڈ ہے۔ وہائٹ' یلو' اورنج' گرین' بلیو اور پھر براؤن..... بس میں بلیک بیلٹ سے ایک درجہ پیچھے رہ گیا۔" ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے بے پروائی سے کہا "خیر جگر! کپڑے کی ان رنگ دار پٹیوں میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز ہے ٹیکنیک میں مہارت حاصل ہونا۔ جو کسر رہ گئی ہے۔ وہ میں تم سے پوری کر لوں گا۔"

"ضرور..... ضرور۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

پھر ہمارے درمیان "مشن لیٹ نائٹ" پر گفتگو ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ساحل اور روبی بھی واپس آ گئے۔ سب نے نہا دھو کر ناشتا کیا۔ ناشتے کے اکثر آئٹم دوبارہ تیار لے آئی تھیں۔

ناشتے کے بعد امتیاز نے کہا "میں اور روبی آج کا باقی مصروف رہیں گے۔ ضروری نوعیت کے چند کام نمٹانے ہیں۔ تم لوگ فلیٹ پر آرام کرو۔ ویسے چاہو تو گھومنے پھرنے کے لیے نزدیکی علاقوں میں جا سکتے ہو۔ فلیٹ کی ایک چابی تمہارے پاس ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

روبی نے خاتونِ خانہ کے فرائض نبھاتے ہوئے کہا "فریج میں کھانے پینے کی ہر چیز موجود ہے۔ تم لوگ لنچ کر سکتے ہو۔ ویسے یہاں آس پاس ہر قسم کے ہوٹل' ریسٹورنٹ دن بھر اور رات گئے تک کھلے رہتے ہیں۔ فاسٹ فوڈ' باربی کیو اور ہر نوع کے لوکل کھانے بہ آسانی دستیاب ہیں۔"

میں نے امتیاز سے پوچھا "ویسے تم لوگ کب تک واپس آ جاؤ گے؟"

"شام تک..... اور رات بھی ہو سکتی ہے۔" اس نے جواب دیا "باس کو اپنی تازہ ترین کارکردگی کی رپورٹ دینی ہے' اور تمہارے بارے میں کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"میں میر بخش کے لیے پریشان رہوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "میر بخش بڑی اطمینان بخش جگہ پہنچ گیا ہے۔ تمہیں اس کے لیے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ویسے میں اس کے بارے میں معلوم کرتا رہوں گا۔ رات کو میرے ساتھ چل کر اسے دیکھ آنا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

لگ بھگ دس بجے وہ دونوں فلیٹ سے رخصت ہو گئے۔ تنہائی میسر آتے ہی ساحل نے مجھے اپنے سوالوں کی باڑ پر لیا۔ میں اسے بتائے بغیر منہ اندھیرے امتیاز کے ساتھ نکل گیا تھا۔ اس کی تشویش بہ جا تھی۔ اگرچہ روبی نے نہایت موزوں الفاظ میں اسے بریف کر دیا تھا تاہم وہ میرے منہ سے سننے کی متمنی تھی۔

میں آدھے گھنٹے تک اس کے مختلف سوالات کے جواب دیتا رہا۔ میں نے شاکر کے بنگلے پر پیش آنے والے حالات کی سنگینی کو ممکنہ حد تک کم کر کے اس کے سامنے

کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے اب اتنی سیانی ہو گئی تھی کہ میرے بیان کی گہرائی تک رسائی حاصل کر سکے۔

اس پوچھ گچھ کے اختتام پر اس نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور کہا "کلارڈ بدھا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میر بخش زندہ سلامت ہم تک پہنچ گیا۔"

اس وقت ہم لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گرمی بڑھنے لگی تو میں نے کہا "چلو ساحل اندر کمرے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔"

وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھنے کے بعد شرارت سے مسکرائی پھر پوچھا "کیا نیلگری کو ٹیسٹ کرنے کا ارادہ ہے؟"

"تم کافی تیز نہیں ہوتی جا رہی ہو؟"

"کس حوالے سے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے کہا "ہر ہر حوالے سے۔"

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے میرا کچھ زیادہ ہی تیز ہونا ظاہر ہو۔" وہ چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولی "تم نے خود ہی تو بتایا ہے نا' نیلگری نے دعویٰ کیا تھا کہ جب بھی کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں جاؤ گے' وہ تمہاری خلوت میں چلی آئے گی۔"

"اس کا دعویٰ کل دوپہر والے واقعے کے بعد غلط ثابت ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے' نیلگری اس وقت کسی ضروری کام میں مصروف ہو اور وہ کام چھوڑ کر یہاں نہ آ سکتی ہو!" ساحل اگرچہ سنجیدہ لہجے میں بات کر رہی تھی تاہم مجھے معلوم تھا' وہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "نیلگری کا دعویٰ کس حد تک غلط ثابت ہوا ہے یہ تو آنے والے دنوں ہی میں پتا چلے گا۔ میں فی الحال آرام کرنے کے لیے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔"

"وجدان اور آرام؟" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کہا "ہاں' میں اپنے سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کر رہا ہوں۔"

"مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔" وہ جلدی سے بولی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی "شاید کافی سے کچھ آرام ملے۔ تم کمرے میں چلو' میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

پھر وہ کچن میں گھس گئی اور میں نے کمرے کا رخ کیا۔

دس منٹ بعد ہم ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ کافی ختم ہوئی تو ساحل نے کہا "آؤ وجدان! میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"درد میں آرام ملے گا۔"

"درد تو تمہارے سر میں بھی ہو رہا ہے!"

"ہاں' ہو تو رہا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "پھر میں تمہارے نازک ہاتھوں کو تکلیف کیوں دوں؟"

"تم ایک دم اتنے بیگانے سے کیوں ہو جاتے ہو وجدان؟"

"کیوں' میں نے ایسا کیا کیا ہے؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی "تمہارا ہی تو قول ہے' فرینڈشپ میں پلیز' سوری' ایکسکیوزمی اور تھینک یو کو جگہ نہیں دینا چاہیے۔ ابھی تم نے میرے نازک ہاتھوں کو تکلیف دینے کی جو بات کی ہے وہ کیا فرینڈشپ کو زیب دیتی ہے۔ اس سے بیگانگی اور تکلف کا اظہار ہوتا ہے۔"

وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہی تھی' میں نے معاملے کو سنبھالتے ہوئے کہا "میں نے تو وہ بات محض اس لیے کی تھی کہ تم خود بھی اپنے سر میں درد محسوس کر رہی ہو۔"

"تو کیا ہوا!" وہ کھلکھلا کر ہنس دی "جواب میں تم میرا سر دبا دینا۔ حساب برابر ہو جائے گا۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلائی۔ اس کی نقرئی ہنسی نے فلیٹ کے در و دیوار میں تازگی بھر دی۔ کمرے کی فضا معطر ہو گئی۔ وہ بولی تو جیسے سریلی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

"وجدان! تم بہت چالاک ہو!"

میں نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کیسے چالاک ہوں' صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا "تم سے زیادہ چالاک نہیں ہوں۔"

"تم جب کسی بحث مباحثے میں نہیں پڑنا چاہتے تو فوراً سامنے والے کی بات مان لیتے ہو۔" وہ لگاوٹ بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "چاہے بعد میں وہ کام کر دیا نہ کرو مگر وقتی طور پر بحث و تکرار کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔"

"اس میں ایسی برائی کی کون سی بات ہے!" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"گویا تم اپنے طریقۂ واردات کو تسلیم کر رہے ہو؟"

"حقیقت کو تسلیم کرنے میں حرج کیا ہے!"

"کوئی حرج نہیں۔" وہ موضوعِ گفتگو تبدیل کرتے ہوئے بولی "فوری حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سر میں درد ہو رہا

ہے۔ پہلے میں تمہارے سر کا درد دور کرتی ہوں پھر تم میرا سر دبا دینا۔"

ہم بیڈ پر آ گئے۔ ساحل نے مجھے دراز ہونے کا مشورہ دیا، پھر میرا سر اپنی گود میں رکھ کر پیشانی کو ہلکے ہلکے دبانے لگی۔

میں نے کہا "اس سے تو اچھا ہے، تم مساج کر دو۔"

اگلے ہی لمحے اس کی مخروطی انگلیاں میرے بالوں میں سرسرانے لگیں۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ساحل کی شہد بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وجدان! آج شام ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔"

"وہ کیوں بھئی، کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا۔" وہ بولی "میں تمہیں دکھانے جا رہی ہوں۔"

"مجھے؟" میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں "میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تمہاری یادداشت خراب ہو گئی ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"ساحل! تم یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہو!"

"بابا! کیا اتنی جلدی بھول گئے۔" اس نے مجھے ننھے بچوں کی طرح پچکارا "میں نے کل تمہیں بتایا تو تھا، تمہارے زہریلے پن کے علاج کے لیے میں نے ایک لیڈی ڈاکٹر دریافت کر لی ہے۔"

"اوہ!" میرے سینے سے اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔

ساحل نے بتایا "وہ ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہے اور شام پانچ سے رات نو بجے تک بیٹھتی ہے۔"

"میں نے ہومیوپیتھک طریقۂ علاج کے بارے میں سن رکھا ہے۔" میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں "لیکن آج تک اس سے واسطہ نہیں پڑا۔"

وہ اپنی انگلیوں کو میرے بالوں کے اندر مصروف رکھتے ہوئے بولی "آج واسطہ بھی پڑ جائے گا۔ روبی نے بتایا تھا کہ وہ ہومیوپیتھ ڈاکٹر صرف پیچیدہ امراض کا ہی علاج کرتی ہے۔"

"لیکن روبی تو پتا نہیں کب آئے۔"

"مجھے یقین ہے، وہ ڈاکٹر کے وقت میں آ جائے گی۔" وہ پُروثوق لہجے میں بولی "بتا رہی تھی، آج دن میں وہ اس کا اپائنٹمنٹ لے لے گی۔"

ہمارے درمیان، میرے زہریلے پن اور ہومیوپیتھک طریقۂ علاج کے بارے میں تھوڑی دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ روبی نے اس سلسلے میں ساحل کو کافی مفید معلومات فراہم کر دی تھیں۔ وہ بالکل اس طرح بات کر رہی تھی جیسے خود ڈاکٹر ہو یا پھر طویل عرصے تک کسی ڈاکٹر سے علاج کراتی رہی ہو۔ وہ اتنی ہی ذہین تھی کہ بہت جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔

بولتے بولتے ساحل اچانک خاموش ہو گئی۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ گمبھیر آواز میں بولی "وجدان! بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں ہم رہتے تھے وہاں سے تھوڑے فاصلے کی دوسری جانب واقع پہاڑوں میں ایک خطرناک دیو کا ہے۔"

"پھر؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"ایک روز میں اپنی ماں بھیرجانی کے ساتھ دریا وہ دیو مجھ پر عاشق ہو گیا۔" ساحل نے بدستور سنجیدہ کہا۔

"اس کے بعد کیا ہوا۔" میں نے بے یقینی سے پوچھا وہ دیو تمہیں اٹھا کر پہاڑوں پر لے گیا تھا؟"

وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی "تھومبانا نے مجھے ایک دھمکی دی تھی۔"

"مثلاً کیسی دھمکی؟" میں نے اب اس کی بات کو میں اڑا دیا۔

وہ بولی "تھومبانے کہا تھا، اگر میں تنہائی میں کسی پاس گئی تو وہ مجھے سخت سزا دے گا۔"

میں دل ہی دل میں اس سادہ سی لڑکی کی مکاری پر کاری پر مسکرا اٹھا۔ میں نے بھی خود پر مصنوعی طاری کرتے ہوئے ساحل سے پوچھا۔

"تو کیا اس دیو نے تمہیں سزا بھی دی۔ تم تو کئی مرتبہ میری تنہائی میں آ چکی ہو؟"

"کل سے پہلے تو نہیں دی تھی۔" وہ بدستور سنجیدگی بولی۔

"اس کا مطلب ہے، کل اس نے تمہیں سزا دی۔"

"ہاں دی ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کل سے اب تک میں بہت بے چین ہوں۔ تھومبا دیو ایک بے نام سی بے کلی میں مبتلا کر دیا ہے۔ سمجھ میں رہا، کیا کروں!"

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے پو

"بہت کچھ۔" اس نے میرے کان کے نزدیک

سرگوشی کی۔

میں نے بھی اس کی تفریح میں شریک ہوتے ہوئے پوچھا "ہاں بولو!"

وہ کچھ نہیں بولی۔ اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دو دہکتے ہوئے انگارے میرے ہونٹوں پر رکھ دیے ہوں۔

میں ایک مسرت آمیز جھرجھری لے کر رہ گیا۔

✪✲✪

"عنبر ہومیو کلینک" شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ اپنی باری پر ہم ڈاکٹر کے مخصوص چیمبر میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر عنبر کو خدا نے حسن اور شائستگی کی دولت سے نواز رکھا تھا۔ ملاقات پر معلوم ہوا کہ وہ خاصی ذہین اور معاملہ فہم بھی ہے۔ ساحل کی بات سننے کے بعد اس نے سوال کیا۔ اس کا مخاطب میں تھا۔ روبی بھی ہمارے ساتھ تھی۔

"آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی کہ آپ زہریلے ہیں؟"

جواب میں، میں نے اسے دو خطرناک سانپوں کی ہلاکت کے واقعات سنا دیے۔ وہ گہری تشویش میں مبتلا ہو گئی پھر اس نے کہا "میں آپ کا علاج شروع کرنے سے قبل دو ٹیسٹ کروانا چاہتی ہوں۔"

"کس قسم کے ٹیسٹ؟" ساحل نے استفسار کیا۔

ڈاکٹر عنبر نے کہا "ایک بلڈ کا ٹیسٹ ہے اور دوسرا اسپیشل کلچر ہے۔ آپ خون اور تھوک کے یہ دونوں ٹیسٹ اس لیبارٹری سے کروائیں گے۔ میں صرف اسی لیب کی رپورٹس پر فیصلہ کرتی ہوں۔"

پھر اس نے اپنے لیٹر ہیڈ پر وہ دونوں ٹیسٹ لکھے اور مذکورہ پرائیویٹ لیبارٹری کا نام بھی بتا دیا۔ وہ خاصی مہنگی اور جدید لیبارٹری تھی۔

ٹیسٹ والا یہ پرچہ میری جانب بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا "ان ٹیسٹ کی رپورٹ کے بعد میں آپ کی ہسٹری لوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی پائزن والا معاملہ ہوا تو اس کا شافی علاج ممکن ہے۔ ہومیوپیتھی بڑا حیرت انگیز طریقۂ علاج ہے۔ آپ اس کی اثر پذیری اور کاملیت کو مان جائیں گے۔"

ہم اٹھ کر آنے لگے تو ڈاکٹر نے کہا "لیبارٹری ٹیسٹ کے ساتھ ساتھ میں آپ کو بھی ایک کام کی ذمے داری دوں گی۔ یہ بھی ایک طرح کا ٹیسٹ ہی ہو گا۔"

ہم تن گوش ہو کر سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر عنبر کو تکنے لگے۔

وہ بولی "آپ اپنے منہ کا چبایا ہوا نوالہ کسی بلی یا کتے کے آگے ڈالیں۔ یہ تجربہ مرغی کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کے لعاب دہن میں زہر کے اثرات موجود ہوئے تو آپ کا جھوٹا کھانے والا فوراً ہلاک ہو جائے گا۔"

ہم ڈاکٹر کے کلینک سے باہر نکل آئے۔ روبی نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "ابھی لیبارٹری کا وقت ختم نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے، یہ ٹیسٹ آج ہی کروا لیتے ہیں۔"

ہم دونوں نے اس کی بات سے اتفاق کیا پھر ہم باجماعت مذکورہ لیبارٹری کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب ہم واپس فلیٹ پر پہنچے تو امتیاز آ چکا تھا۔ روبی شام سے کچھ پہلے اکیلی ہی پہنچی تھی۔ ساحل کا یقین سچا ثابت ہوا کہ روبی ہمارے ساتھ ڈاکٹر کے پاس ضرور جائے گی۔

میں نے امتیاز سے پوچھا "میر بخش کی کیا خیر خبر ہے یار۔ میں تو دن بھر تمہارے فون کا انتظار کرتا رہا۔"

"یہ دن بڑا مصروفیت میں گزرا ہے جگر!" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا "تمہارے لیے ایک بہت بڑی خبر لایا ہوں۔"

"پہلے تو مجھے میر بخش کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"وہ بڑی خبر بعد میں سنا دینا۔"

روبی اور ساحل دوسرے کمرے میں جا چکی تھیں۔ اس لیے ہم آزادانہ گفتگو کر سکتے تھے۔ امتیاز نے کہا "میر بخش کی حالت تسلی بخش ہے۔ میں نے دو تین مرتبہ جاوید کے ذریعے اس کی خیر لی ہے۔ وہ ہوش میں آ گیا ہے۔ ڈاکٹر فیروز تندہی سے اس کا علاج کر رہا ہے۔ امید ہے تین چار روز میں میر بخش چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔"

"پولیس وغیرہ کا کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں ہوا؟"

"نہیں جگر!" امتیاز نے نفی میں گردن ہلائی "ڈاکٹر فیروز، جاوید کا سچا دوست ثابت ہوا ہے۔ اس نے تمام معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ کوئی پریشانی یا دقت پیدا نہیں ہو سکی۔"

میں نے اضطراری انداز میں کہا "میں میر بخش سے ملنے کے لیے بے قرار ہوں۔"

"ہم ڈنر کے بعد اس کی طرف جائیں گے۔" امتیاز نے بتایا "ویسے میں نے احتیاطاً جاوید کے ذریعے میر بخش کو یہ اطلاع پہنچا دی ہے کہ اس کے ساتھی ملاقات کے لیے رات میں آئیں گے۔"

میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا "یہ تم نے بہت اچھا کیا یار! اس سے میر بخش کی ڈھارس بندھے گی۔"

"اب اگر تمہاری اجازت ہو تو میں وہ خبر بھی سنا دوں۔" امتیاز نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں' ضرور سناؤ۔"

"کل تم باس سے ملنے جا رہے ہو۔"

"کیا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ پُرجوش انداز میں بولا "میں نے تمہارے اور تمہارے کارناموں کے بارے میں تفصیلاً باس کو بتا دیا ہے۔ انہوں نے خود تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ جگر! تم بہت لکی ہو ورنہ باس آسانی سے کسی کو لفٹ نہیں کراتے۔ وہ پہلی فرصت میں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یار! ابھی تک تو میں تمہارے باس کے نام سے بھی واقف نہیں ہوا' نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ وہ رہتا کہاں ہے... اور تم نے ملاقات کا بندوبست بھی کر ڈالا!"

آخری جملہ میں نے دانستہ کہا تھا ورنہ مجھے معلوم تھا' اس ملاقات میں امتیاز سے زیادہ اس کے باس کا ہاتھ ہوگا۔ ویسے میں نے کل ائرپورٹ پر امتیاز کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اس کے باس سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب سے "سی ایف کے" کے اغراض و مقاصد کے بارے میں سنا تھا' اس تنظیم کے کرتا دھرتا اور روحِ رواں سے ملنے کا اشتیاق میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ "کرائم فری کراچی" نامی یہ تنظیم میرے مشن کے بہت قریب تھی۔

امتیاز میری بات کے جواب میں بولا "جگر! ہمارے باس کا نام شعیب غوری ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں بھی اس کی اصلی رہائش گاہ سے آگاہ نہیں۔ ویسے کراچی کے پانچوں اضلاع میں اس کے ٹھکانے ہیں۔ وہ انہی ٹھکانوں پر اپنے ملنے والوں سے ملاقات کرتا ہے اور وہ بھی نہایت احتیاط کے ساتھ۔ کوئی نہیں جانتا' وہ کس وقت کہاں ہوگا۔ اگر تنظیم کے افراد اس کی خبر رکھنے لگیں تو پھر وہ "باس" کس چیز کا ہوا۔ جگر! میں نے کہا تھا نا' میرا... باس بہت اونچی شے ہے۔"

"ہاں' مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے پھر پوچھا "کل تم مجھے اپنے باس سے ملوانے کس ٹھکانے پر لے کر جاؤ گے؟"

"باس نے ڈسٹرک ساؤتھ والے بنگلے پر بلایا ہے۔" امتیاز نے بتایا "تم نے وہ بنگلا کل دیکھا تھا۔"

"یعنی وہ بنگلا جہاں تمہارے باس کا انگریز دوست نیل آرمرا اپنی طرح دار سیکریٹری شیبا کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔"

میں نے چونک کر کہا "تم ڈیفنس سوسائٹی والے بنگلے کا ذکر کر رہے ہو نا؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "بالکل وہی بنگلا۔ مسٹر نیل آرمرا اور اس کی سیکریٹری آج سہ پہر یہاں سے روانہ ہو گئے ہیں۔"

"واپس انگلینڈ؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا "ہمیں کل صبح ٹھیک دس بجے ساؤتھ والے بنگلے پر پہنچنا ہے۔ ہم نے... یعنی باس نے کوڈ ورڈز میں ہر ٹھکانے کا ایک نام رکھ دیا ہے جو ڈسٹرکٹ سے منسوب ہے۔ یوں سمجھو کہ کل صبح ہم باس سے ملنے "ساؤتھ" جا رہے ہیں۔"

"اس وقت ہم کس ڈسٹرکٹ میں بیٹھے ہیں؟"

"یہ ڈسٹرکٹ ایسٹ ہے۔" امتیاز نے بتایا۔

میں نے پوچھا "باقی تین ڈسٹرکٹ کون کون سے ہیں؟"

وہ بولا "ڈسٹرکٹ ویسٹ' ڈسٹرکٹ سنٹرل اور ڈسٹرکٹ ملیر۔"

"اس کا مطلب ہے "سی ایف کے" کا نیٹ ورک پورے شہر میں پھیلا ہوا ہے!" میں نے پُرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جگر! اس شہر کو "کرائم فری کراچی" بنانے کے لیے فعال نیٹ ورکنگ تو اشد ضروری ہے۔"

ہم کچھ دیر تک "سی ایف کے" اور اس کے طریقۂ کار کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں کل اس تنظیم کے باس سے ملنے جا رہا تھا اس لیے بھی زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا میرے لیے مفید تھا۔ امتیاز نے اس سلسلے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

اس رات ڈنر ہم نے گھر سے باہر کیا۔ نزدیک ہی ایک صاف ستھرا فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ تھا۔ امتیاز ہمیں وہاں لے گیا۔ آج فلیٹ آتے ہوئے وہ ایک پرانی سی مزدا گاڑی لے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ براؤن کلر کی وہ مزدا کار اس استعمال میں رہتی ہے۔ پرانی نظر آنے والی وہ گاڑی نہایت ہی طاقت ور انجن کی حامل تھی۔ پچھلے دو دن سے وہ گاڑی مکینک کے پاس گئی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی امتیاز اور ربانی نجی استعمال میں رہتی تھی۔ ربانی بھی ڈرائیونگ کرتا تھا۔

کھانے کے بعد ہم نے بہادر آباد کا مشہور آئس فالودہ کھایا پھر میر بخش سے ملنے گلشن اقبال کی جانب روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر فیروز کا وہ پرائیویٹ اسپتال گلشن کے بارونق علاقے میں تھا۔ اس دو منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر ڈاکٹر کی اپنی رہائش تھی۔ ڈاکٹر اس وقت اسپتال میں موجود نہیں تھا تاہم ہمیں مریض تک رسائی کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ امتیاز نے جو ریفرنس استعمال کیا تھا اس کے بعد ہمیں فوراً میر بخش کے پاس' اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر فیروز نے اپنے عملے کو ہماری بابت بتا رکھا تھا۔

وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اس نے بے اختیار بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے اس کوشش سے روکتے ہوئے سنبھالا "نہیں میر بخش۔ ابھی تمہیں بہت زیادہ حرکت نہیں کرنا۔"

فرطِ جذبات سے اس کے آنسو نکل گئے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا "سائیں! انہوں نے میرے ساتھ بہت..." اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے کندھا تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی "میر بخش! حوصلہ رکھو۔ ہم نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔ میاں زاہد حسین اس وقت اپنے بال نوچ رہا ہوگا۔ تمہیں اغوا کرنے والے اور زدوکوب کرنے والے اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ گئے ہیں۔"

اس کے جسم کے بیش تر حصوں پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ ایک بازو میں فریکچر بھی ہو گیا تھا۔ زیادہ تر چوٹیں اندرونی تھیں جو بیرونی چوٹوں سے کہیں زیادہ خطرناک تھیں تاہم یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اور فوراً ہی اسے ٹریٹ منٹ بھی دے دیا گیا ورنہ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میر بخش مجھے اور ساحل کو اپنے پاس دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔ امتیاز کو بھی اس نے پہچان لیا تاہم روبی کی جانب وہ بار بار سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتا۔ میں نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے اسے روبی کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔

ہم نے بہادر آباد سے میر بخش کے لیے تین چار تازہ موسمی پھل خرید لیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پھولوں کا گل دستہ بھی۔ یہ تمام چیزیں اس کے بیڈ کے نزدیک ایک چھوٹی سی میز پر رکھی تھیں۔ ہم میر بخش سے تسلی تشفی کی باتیں کر ہی رہے تھے کہ معلوم ہوا' ڈاکٹر فیروز اسپتال میں آ چکا ہے۔ میں نے امتیاز سے کہا "میں ڈاکٹر فیروز سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں وجدان! ڈاکٹر سے ایک تفصیلی ملاقات بہت ضروری ہے۔" وہ بولا "ہم جاتے ہوئے اس کو بچ کر لیتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ہم میر بخش کے پاس سے اٹھنے لگے تو اسی وقت ڈاکٹر فیروز وہاں پہنچ گیا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ ہم مریض سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی پھر وہ میر بخش کے چیک اپ میں مصروف ہو گیا۔

ڈاکٹر فیروز کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ چہرے پر نظر کا چشمہ اس کی شخصیت پر بہت سوٹ کر رہا تھا۔ وہ بہت تیز تیز بولتا تھا۔ اس کی باتیں سمجھنے کے لیے پوری طرح اٹینٹو رہنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر میر بخش کے معائنے سے فارغ ہوا تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ ہماری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا "مریض کی حالت تسلی بخش ہے۔ ہم مزید دو دن اسے اسپتال میں رکھیں گے۔ تیسرے روز آپ اسے لے جا سکتے ہیں۔"

"ڈاکٹر!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہاتھ کا فریکچر کس پوزیشن میں ہے؟"

"صاحب' فریکچر تو فریکچر ہوتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا "یہ دو چار دن میں ٹھیک ہونے والا معاملہ نہیں۔ میر بخش کا دایاں بازو کہنی کے نزدیک سے ٹوٹا ہے۔ اگرچہ یہ ٹوٹ پھوٹ بہت زیادہ خطرناک نہیں تاہم ایک آدھ مہینا تو یہ اس بازو سے کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ میں نے بہت اطمینان بخش پلاسٹر چڑھا دیا ہے۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دو روز بعد آپ اسے گھر لے جائیں اور مکمل آرام کرائیں۔ ایک ہفتے بعد چیک اپ کے لیے دوبارہ اسپتال لانا ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد ہم چاروں میر بخش سے رخصت ہو کر اسپتال سے نکل آئے۔ آتے ہوئے میں نے میر بخش سے وعدہ کیا تھا کہ گاہے بہ گاہے میں اسے دیکھنے آتا رہوں گا۔

ہم واپس فلیٹ پہنچے تو رات کے کم و بیش بارہ بج رہے تھے۔ امتیاز نے یاددہانی کے طور پر مجھ سے کہا "وجدان' جلدی... سونے کی کوشش کرنا تاکہ صبح جلدی اٹھ سکو۔ کل ہمیں باس سے ملنے بھی جانا ہے۔"

"تم میرے اٹھنے اور سونے کی فکر نہ کرو۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "میں علی الصباح بیدار ہو جاؤں گا۔ ویسے بھی کل سے مجھے باقاعدگی کے ساتھ ہل پارک جانا ہے۔ ساحل کی ٹریننگ شروع ہونے والی ہے۔"

"جگر' تم اس نیک کام میں روبی کو بھی شریک کر لو تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔" وہ قریب ہی کھڑی روبی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "شاید یوگا کی مشقیں ہی اس کی قنوطیت کو

دور کر سکیں۔"

"قنوطیت!" میں نے حیرت سے خوش مزاج روبی کی طرف دیکھا "میں نے تو اسے قنوطیت میں نہیں دیکھا۔ کیا تم کوئی دلچسپ مذاق کر رہے ہو؟"

"جگر! یہ مذاق کا کون سا وقت ہے!" وہ دیوار گیر کلاک کی طرف نگاہ اٹھا کر بولا۔ "روبی کی قنوطیت بہت گہرائی میں چھپی ہوئی ہے' اوپر سے نظر نہیں آتی۔ ابھی تم نے اس کی کہانی سنی ہے اور نہ ہی گھل مل کر گفت و شنید کی ہے۔ آہستہ آہستہ تم پر اس کی نظر نہ آنے والی اداسی کا راز کھلے گا۔"

اس دوران میں روبی بالکل خاموش اور سنجیدہ کھڑی رہی۔ امتیاز کی بات پوری ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا "وجدان بھائی! یہ سچ ہے کہ میں یوگا کی مشقیں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ لوگ مجھے بھی ساتھ لے جایا کریں تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"تمہاری خوشی مجھے عزیز ہے روبی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگرچہ میں تم سے عمر میں پانچ چھے سال چھوٹا ہوں لیکن تمہارے منہ سے اپنے لیے "بھائی" کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے..... شاید اس لیے بھی کہ میری اپنی کوئی بہن نہیں۔"

"بہن بھائی کے رشتے میں عمر کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا وجدان۔" وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی "تمہیں بھائی کہتے ہوئے مجھے بھی ایک انجانی سی مسرت کا احساس ہوتا ہے اور میں بھی یہ ضرور کہوں گی کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا بھی کوئی بھائی نہیں ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔"

"اکلوتی تھی' کیا مطلب؟" ساحل نے چونک کر روبی کی طرف دیکھا۔

وہ ایک دم اداس ہو گئی "بتاؤں گی..... بتا دوں گی۔"

امتیاز نے مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں اشارہ کیا۔ مطلب یہی تھا' اس وقت اس موضوع کو موقوف کر دیا جائے۔ میں نے ایک طویل مصنوعی جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"بھئی' مجھے تو شدید نیند آ رہی ہے۔ باقی باتیں کل کر لیں گے۔"

ساحل میری بات کو فوراً سمجھ گئی۔ روبی سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا "ٹھیک ہے ڈیئر' ہم تمہارے اکلوتے پن پر بعد میں بات کریں گے' فی الحال تم آرام کرو اور ہم بھی۔"

پھر ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

یہ سچ ہے کہ روبی کی زبان سے اپنے لیے "بھائی" سننا مجھے بڑا مسرور کن لگا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے جب میں ہندوستان کے شمالی قصبے "رشی کیش" میں تھا تو سیتا نامی چودہ سالہ لڑکی نے مجھے "بھیا" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کی شیرینی کو بھی میں آج تک نہیں بھول سکا تھا۔ ہردوار کی بیٹی سیتا کو میں نے وحشی پنڈتوں کی بربریت سے بچایا' پتا نہیں' روبی مجھے بھائی بنا کر کون کون سے امتحانات میں ڈالنے والی تھی!

ہم کمرے میں آ کر سونے کے لیے لیٹنے لگے تو ساحل نے کہا "وجدان! تمہیں تو بیٹھے بٹھائے ایک بنی بنائی بہن اور خوبصورت بہن بھی مل گئی۔"

میں نے اس کی بات کے آخری حصے پر توجہ دیتے ہوئے کہا "ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو۔ روبی واقعی ایک خوبصورت لڑکی ہے۔"

"بے چاری بڑی دکھی معلوم ہوتی ہے۔" وہ ہمدردی سے بولی۔

میں نے کہا "تم سے وہ کافی کلوز ہو چکی ہے۔ اس کے دکھ کریدنے کی کوشش کرنا۔"

"ہاں' میں اس کا مسئلہ جاننے کی پوری کوشش کروں گی۔" ساحل نے سنجیدگی سے کہا پھر مجھ سے پوچھا "پارک میں جانے کے لیے کتنے بجے نکلنا ہے؟"

"صبح صادق کا وقت ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا "آج صبح ہل پارک جا چکی ہو۔ یہاں سے کتنے منٹ کی ڈرائیو ہے؟"

"مشکل سے پندرہ منٹ۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے' پھر ہم پیدل ہی جائیں گے۔" میں نے کہا "لیکن وقت کے بارے میں روبی کو بتانا ہو گا۔"

وہ بولی "میں ابھی بتا کر آ جاتی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک تکیہ اٹھایا اور سونے کے لیے کمرے کے ایک کونے میں قالین پر لیٹ گیا۔ ساحل واپس آئی تو مجھ پر نگاہ پڑتے ہی مسکرا اٹھی۔ دروازہ کو اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے شوخی سے کہا۔

"نیل گر' نیل گری سے اس قدر خوف زدہ ہے!"

"یہ نیل گر کیا ہوتا ہے؟" میں نے وہیں لیٹے لیٹے پوچھا۔

اس نے بہ دستور شوخی سے بتایا "نیل گری کا مذکر۔"

"تم بعض اوقات اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگتی ہو۔"

"صرف باتیں..... یا حرکتیں بھی؟"

میں اس وقت آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ساحل کی

مجھے اپنے قریب ہی محسوس ہوئی تو میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا "کیا مطلب؟"

وہ اس وقت مجھ سے صرف دو قدم کی دوری پر تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں بھی ایک تکیہ دبا ہوا دیکھا تو صورتِ حال میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے میرے اندازے کی تصدیق کردی۔

"میں بھی قالین پر ہی سوؤں گی۔"

"یہ کیا حماقت ہے ساحل؟"

"اگر قالین پر سو کر رات گزارنا حماقت ہے تو اس حماقت کا آغاز تمہاری طرف سے ہوا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "میں تو تمہاری پیروی کر رہی ہوں' یہ سوچتے ہوئے کہ جو کام تم کر رہے ہو اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔ یعنی وہ کام اگر تمہارے لیے مفید ہے تو میرے لیے بھی سودمند ہوگا۔"

میں نے اس کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سمجھانے والے انداز میں کہا "ساحل! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ نیچے سونے میں کون سی مصلحت یا مجبوری پوشیدہ ہے۔ تم جا کر وہاں بیڈ پر لیٹو۔ آرام دہ بستر چھوڑ کر یہاں کیوں بے آرام ہونا چاہتی ہو؟"

"مجھے تمہارے قرب میں آرام ملتا ہے۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی "یا تو تم بھی بستر پر لیٹو گے یا پھر میں تمہارے نزدیک قالین پر رات بسر کروں گی۔"

میں نے کہا "تم خواہ مخواہ کی ضد کر رہی ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولی "وجدان! نیلگری کا دعویٰ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود بھی تم بہت محتاط ہو' کیوں؟"

"میری یہ احتیاط نیلگری کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ کی بنا پر ہے۔" میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

وہ بھلا کہاں جان چھوڑنے والی تھی' شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی "تم نیلگری کی پروا نہ کرو۔ اگر اس نے ہماری خلوت میں داخل ہونے کی کوشش کی تو بری طرح پچھتائے گی۔ اس کی اس حرکت کے ساتھ ہی "تھومبا" دیو بھی یہاں پہنچ جائے گا کیوں کہ تھومبا نے بھی نیلگری سے ملتے جلتے دعوے کر رکھے ہیں۔ تھومبا کی موجودگی میں نیلگری کی دال نہیں گلے گی اور اسے مجبوراً یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔"

میں ساحل کی چالاکی کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ مگر قدرے سخت لہجے میں کہا "میں اس وقت نہایت ہی ہوں ساحل! نیلگری ایک حقیقت ہے' تم بھی اس کو دیکھ چکی ہو۔ تھومبا جیسا بچکانا کردار متعارف کروا کر ساحیل کھیلنا چاہتی ہو؟"

وہ ایک لمحہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتی رہی پھر ہی شریر مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے "وجدان! تم مانو یا نہ مانو' نیلگری کی طرح تھومبا بھی ایک حقیقت ہے۔"

میں بے بسی سے نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی پھر بوجھل آواز میں "وجدان! پتا نہیں کیوں' مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے رات ہماری زندگی میں پھر کبھی نہیں آئے گی۔"

میں نے اچنبھک نظر سے اسے دیکھا۔ وہ اس خاصی مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سرسری لہجے میں کہا "تمہیں اگر ایسا محسوس ہو رہا ہے تو اس پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے انسان کی زندگی میں جو دن اور جو رات گزر جاتے ہیں پلٹ کر واپس نہیں آتے۔ ظاہر ہے' یہ رات بھی کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئے گی۔"

"تم شاید میرے محسوسات کو سمجھ نہیں سکے۔" الجھن زدہ انداز میں بولی۔

اس کی الجھن سے میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے "تم کھل کر کہو' کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ چند لمحے متذبذب رہنے کے بعد تامل کرتے ہوئے بولی "مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے' جیسے۔۔۔ جیسے آج رات کے بعد بہت کچھ بدل جائے گا۔"

اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ذہنی دباؤ نے اسے اپنی گرفت میں رکھا ہو۔ میں نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا ساحل' کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ ڈپریس دکھائی دے رہی ہو۔ جا کر آرام سے سو جاؤ۔ نیند کے بعد تم بالکل ہلکی پھلکی ہو جاؤ گی۔"

"ہلکی پھلکی!" وہ گمبھیر آواز میں بولی "جب بہت کچھ جاتا ہے تو انسان خود بہ خود ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔"

اب میں ساحل کے بارے میں تشویش میں مبتلا اس کا رویہ اس کے عمومی مزاج سے لگا نہیں کھا رہا

بدحواسی اور اُداسی سے بھاگنے والی لڑکی تھی مگر اس وقت اچانک اس کی ساری شوخی اور چنچلتا غائب ہو چکی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بستر کی جانب لاتے ہوئے کہا "چلو' میں تمہیں سلا دیتا ہوں۔ تم اس وقت ایک غمگین کیفیت سے گزر رہی ہو۔"

وہ ایک نڈھال سی حالت میں بستر تک پہنچی پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی "تم مجھے سلانے کے بعد دور تو نہیں چلے جاؤ گے نا!"

"میں کہاں جا سکتا ہوں؟ زیادہ سے زیادہ وہاں نیچے قالین پر۔۔۔ بس۔"

"نہیں!" اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور قطعیت سے بولی "تم بھی ادھر بستر پر ہی سو جاؤ نا۔"

"اچھا بابا' تم سونے کی کوشش تو کرو۔" میں نے اسے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے کہا۔ اس وعدے کے بغیر وہ سونے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

وہ میری یقین دہانی سے قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ میں نے سوچا' جب وہ گہری نیند میں پہنچ جائے گی تو میں اٹھ کر نیچے قالین پر چلا جاؤں گا۔

میں اس کے نزدیک ہی بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا اور اس کی گھنیری زلفوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور دھیمے لہجے میں بولی۔

"وجدان! کیا تم مجھے وہ نیند بھی سلا سکتے ہو؟"

"وہ کون سی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

اس نے سادگی سے کہا "ابدی نیند!"

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ساحل۔" میں نے ہلکے سے اسے جھنجوڑ ڈالا "اتنی مایوسی کی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔ آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اس کی کھلی ہوئی غزالی آنکھوں میں کرب کے سائے لہراتے دیکھے۔ وہ مجروح آواز میں بولی "وجدان! تمہاری قسم' میرے پہلو میں بہت شور ہے۔ لو' تم بھی محسوس کر کے دیکھو۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنے دل کے مقام پر رکھ دیا۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے اپنے پورے وجود میں ایک سنسنی سی پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اس کیفیت نے میرا جینا محال کر رکھا ہے۔ تم اس دھڑکن روک کر مجھے اس تکلیف سے نجات دلا دو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "یا پھر اس درد کو کشید کر کے اپنے پہلو میں بسا لو۔ مجھے اس دردناک زندگی کی ضرورت نہیں۔"

"تم اس وقت ذہنی دباؤ اور خیالی انتشار کا شکار ہو۔" میں نے دوبارہ اس کے بالوں میں مساج کرتے ہوئے کہا "ایک بھرپور اور پُرسکون نیند تمہیں شانت کردے گی۔ پلیز' سونے کی کوشش کرو۔"

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "واقعی مجھے سو جانا چاہیے کیوں کہ یہ رات میری زندگی میں دوبارہ پھر کبھی نہیں آئے گی۔۔۔ اور تم نے بھی تو اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ یہ رات کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔"

پھر اس نے زیرِ لب دعائیہ انداز میں کہا "لارڈ بدھا تمہیں بھی اس درد سے آشنا کردے۔" اور وہ ایک گہری سانس لینے کے بعد خاموش ہو گئی۔

پتا نہیں کیوں' اس وقت آپوں آپ میرا دھیان نیلگری کے ایک ادھورے جملے کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی میں پورے وجود سے کانپ کر رہ گیا۔

نیلگری نے نبی سرمیں' قاضی سلطان کی رہائش گاہ پر ایک پُراسرار ملاقات کے دوران میں ساحل کے نام کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا "اس مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساگر اور ساحل کا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن۔۔۔!"

"لیکن" کے بعد نیلگری کی پُراسرار خاموشی کا ایک ہی مطلب تھا کہ میرا اور ساحل کا ساتھ پائیدار نہیں اور عنقریب ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے اور اب ساحل کی باتیں مایوسی کی جس انتہا کو چھو رہی تھیں' نیلگری کے ادھورے جملے کی روشنی میں وہ کچھ اور بھی زیادہ سنگین اور خطرناک محسوس ہو رہی تھیں۔ میں اچانک لاتعداد اندیشوں میں گھر گیا۔ غیر ارادی طور پر میرے ذہن میں اس سوال نے سر اٹھایا۔

"کیا ساحل مجھ سے بچھڑنے والی ہے؟"

"یہ نہیں ہو سکتا!" بے اختیار میرے دل سے نکلا۔

میں نے اضطراری نگاہ سے معصوم صورت ساحل کو دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کی سانسوں سے اندازہ ہوتا تھا' وہ ہر قسم کے ذہنی انتشار سے نجات حاصل کر چکی تھی۔

میں کافی دیر تک بغیر سوچے اور محسوس کیے اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ ان لمحات میں میری سوچ اور محسوسات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ شاید میں محویت کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ میں ساحل کے مشاہدے میں غرق ہو گیا تھا۔

جب میں کمرے کے ماحول میں واپس آیا اور میں نے بیڈ سے نیچے اترنے کی کوشش کی تو پتلا چلا' میری شرٹ کا

ایک کونا ساحل کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنی شرٹ آزاد کروانا چاہی تو پتا چلا' یہ اتنا آسان نہیں۔۔۔ اور میں نے اگر زبردستی سے کام لیا تو وہ جاگ جائے گی۔ اس کی گرفت بڑی مضبوط اور بے یقینی کی عکاس تھی۔

جیسے اگر کسی معصوم بچے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کی ماں کہیں جانے والی ہے تو وہ بڑی مضبوطی سے اس کا دامن اپنے ہاتھ کی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔ ماں لاکھ سمجھانے کی کوشش کرے کہ وہ کہیں نہیں جا رہی مگر بچے کی بے یقینی' اسے بہلنے نہیں دیتی اور وہ ماں کے دامن پر اپنی گرفت کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور وہیں اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ یہ وہ پہلو تھا جس میں بہت شور سنائی دیتا تھا' ایک درد لادوا نے اس مقام کو اپنا آشیانہ بنا لیا تھا۔ ساحل نے مجھ سے التجا کی تھی کہ اس کسک کو کشید کر کے میں اپنے یہاں پناہ دے دوں۔ وہ لاڑد بھا سے دعاگو تھی کہ وہ مجھے بھی اس درد سے آشنا کر دے۔

کچھ ہونے والا تھا مگر یہ معلوم نہیں تھا' کیا ہونے والا ہے۔ جب یہ اندازہ نہ ہو' کیا ہو جائے گا تو پھر انسان الجھ کر رہ جاتا ہے۔ میرے خیالات میں پراگندگی اتر آئی۔ میں نے دزدیدہ نگاہ سے ساحل کی جانب دیکھا۔ وہ آسودگی کی نیند سو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا' وہ اپنا سارا انتشار مجھ میں منتقل کر کے بری الذمہ ہو گئی ہو!

وہ میری زندگی کی پہلی بے کل رات تھی۔ میں نے وہ رات سونے کی کوشش میں جاگتے ہوئے گزار دی۔

❂✲❂

میں اس وقت ہل پارک کے سب سے اونچے مقام پر کھڑا تھا۔ یہاں ایک اچھا خاصا گول چبوترہ بنا تھا جس کے اردگرد مضبوط پائپ کی ریلنگ لگائی گئی تھی تاکہ کسی قسم کے حادثے میں جانی نقصان کا سامنا نہ ہو۔ اس چبوترے سے واقعی پورا کراچی شہر دکھائی دیتا تھا۔ فضا شاندار اور منظر جان دار تھا۔ اس وقت پیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ ہم جب فلیٹ سے روانہ ہوئے تو ہلکا ہلکا اندھیرا موجود تھا۔ خوش گلو پرندوں کے چہچہانے کی آوازوں نے معطر فضا میں نغمگی سی گھول دی تھی۔

صبح خیزی کے شوقین مرد و زن کثیر تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے گھوم پھر کر اس بلند ترین چبوترے کو منتخب کیا تھا مگر اس میں ایک خرابی بہرحال موجود تھی کہ وہاں "چی" کے لیے مخصوص مشق نہیں کی جا سکتی تھی۔ چبوترے کا فرش تھا جب کہ مذکورہ مشق کے لیے فرش کا آرام دہ اور ہموار پاک ہونا ضروری تھا۔

میں نے "چی" کی مشق کے لیے نزدیک ہی واقع کے ایک تختے کو منتخب کر لیا۔ اس طرف مختلف ورزشیں کرنے کے لیے آہنی پائپ کے جھولے لگے ہوئے تھے۔ روبی خاصی پُرجوش دکھائی دیتی تھی جب کہ نے ساحل کو انتہائی سنجیدہ پایا۔

میں نے ساحل سے کہا "پہلے تم صرف پانچ منٹ "چی" کی ورزش کرو گی۔ اس کے بعد مارشل آرٹس ٹریننگ کا آغاز ہو گا۔"

اس کے بعد میں روبی کی جانب متوجہ ہو گیا "ساحل مصروف کرنے کے بعد میں تمہیں یوگا کی مشق کے بارے بتاؤں گا۔"

روبی تھوڑے فاصلے پر ایک جانب خاموش کھڑی ہو گئی۔ ساحل نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا ایک دم سنجیدہ دکھائی دیتی تھی۔

"تم نے پارس پوزیشن میں کھڑے ہونے کی اچھی پریکٹس کر لی تھی۔" میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے "اب تم شمال کی سمت رخ کر کے سیدھی کھڑی ہو جاؤ آنکھیں بند کر کے آٹھ دس گہری گہری اور ہموار سانسیں لو۔"

اس نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ میں نے کہا "اب مشق کے لیے بالکل تیار ہو چکی ہو۔ پارس پوزیشن میں کھڑے ہو کر تم اپنی آنکھیں بند کر لو گی۔ زبان کو تالو کے ساتھ لگانا ہے' میرا مطلب ہے' زبان کی نوک (ٹپ) کو۔ اپنی پوری اور دھیان ناف کے مقام پر مرکوز کرنا ہے۔ اس کے بعد کے راستے ایک جھٹکے سے سانس کو اندر کھینچنا ہے اور فوراً ہی منہ کے راستے جھٹکے سے سانس کو خارج کرنا واضح رہے کہ اس عمل کے دوران میں زبان کی نوک مستقل تالو سے چپکی رہے گی اور ہونٹ نیم وا رہیں سانس کی آمد و شد کے دوران میں پیٹ پھولتا پچکتا یعنی سانس اندر کھینچنے پر پیٹ پھولے گا اور خارج کرنے پچک جائے گا۔ اس عمل میں ذہن صرف ایک کام اور وہ یہ کہ تمہاری توجہ مستقل مقام ناف پر جمی رہے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔" ایک لمحے کا توقف دے استفسار کیا "اگر کوئی اسٹیپ تمہاری سمجھ میں نہ پوچھ سکتی ہو؟"

"میں ہر بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "آر ریڈی؟"

"یس۔" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اسے مشق کرنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی وہ پارس پوزیشن میں کھڑی ہوئی اور اس نے آنکھیں بند کیں' میں نے قدموں اس کے سامنے ایک فٹ کے فاصلے پر' زمین پر بیٹھ گیا۔ اس مشق کے دوران میں بعض اوقات مبتدی منہ کے بل زمین پر آن گرتا ہے۔ "سانس" اور "توجہ" کے درمیان جب تک ایک ردھم یا ربط نہیں بن جاتا' دماغ بغاوت پر کمربستہ رہتا ہے جس کے نتیجے میں ایک چکر سا آتا ہے اور مبتدی دھڑام سے منہ کے بل گرتا ہے۔ میں ساحل کو سنبھالا دینے کے لیے اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ وہ وہاں میری موجودگی سے واقف نہیں تھی۔

پورے پانچ منٹ تک ساحل نے بڑے سکون اور اطمینان سے مشق کی اور اسے ایک مرتبہ بھی چکر نہیں آیا۔ اس کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ میں نے اس کی مشق ختم کروا کر اسے آرام کرنے کو کہا۔

وہ آنکھیں بند کر کے ایک جانب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

میں روبی کی جانب متوجہ ہو گیا "ایک بات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن نشین کر لو روبی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں نے بولنا شروع کیا "یوگا میں توجہ' لگن اور انوالومنٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے ان چیزوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ بنیادی طور پر یوگا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ "ہتھ یوگ" میں کی جانے والی مشقوں کا تعلق انسان کے جسم سے ہوتا ہے۔ اسے باڈی یوگا (BODY YOGA) یا فزیکل یوگا بھی کہتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر "راج یوگ" آتا ہے جس میں ذہنی اور دماغی مشقیں کی جاتی ہیں۔ اسے (YOGA BRAIN) کہا جاتا ہے۔ تیسرے اور آخری نمبر پر "منتر یوگ" ہے۔ یہ خالصتاً روحانی مشقوں اور مختلف جاپ پر مشتمل ہے اور (SPIRITUAL YOGA) کہلاتا ہے۔"

"میں فی الحال جسمانی مشقیں کرنا چاہتی ہوں۔" روبی نے میری بات ختم ہوتے ہی کہا "جیسا کہ ٹی وی وغیرہ پر دکھایا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں ابتدا میں یہی کرنا بھی چاہیے۔ "ہتھ یوگ" کی مشقوں کے اثرات سب سے زیادہ جسم پر ہوتے ہیں اور یہ دوسرے "یوگ" سے نسبتاً آسان بھی ہے۔ ایک بات یاد رکھنا' یوگا میں سانس کا ایک الگ اور اہم سسٹم ہے۔ اس کے بارے میں تمہیں میں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ "یوگ" چاہے کوئی بھی ہو' اس کی مشق سانس کے ساتھ بھی کی جا سکتی ہے اور بغیر سانس کے بھی۔ سانس کے ساتھ مشق خاصی لطیف اور فرحت بخش ہو جاتی ہے' ظاہر ہے' اس عمل میں اس کی افادیت بھی بڑھ جاتی ہے۔"

وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے اسے یوگا کی ابتدائی معلومات سے روشناس کرواتے ہوئے مزید بتایا "ضروری نہیں ہے کہ دنیا کے تمام یوگا ایکسپرٹ مجھ سے متفق ہوں لیکن اب میں تمہیں جو نکتہ بتانے جا رہا ہوں وہ میرے تجربے کا نچوڑ ہے اور میرے اساتذہ کی تعلیم بھی۔ شاؤلن ٹیمپل میں آں جہانی ماسٹر ہنگ پائی اور بنکاک میں آں جہانی ماسٹر وانگ ونگ یائے نے مجھے یہ گر سکھایا تھا۔ یہ نکتہ تم بھی ذہن نشین کر لو۔ یوگا میں چاہے کوئی بھی مشق کی جائے' یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جب جسم کا کوئی حصہ زمین کی مخالف سمت میں حرکت کرے گا تو سانس کو اندر کھینچنا یعنی (INHALE) کرنا ہے۔ جب جسم کا کوئی حصہ زمین کی جانب حرکت کرے گا تو سانس کو باہر خارج کرنا یعنی (EXHALE) کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یوگا میں آسن یعنی پوسچر کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ آسن یا پوسچر جسمانی نشست کو کہتے ہیں۔"

ایک لمحے کو رک کر میں نے ساحل کی طرف اشارہ کیا اور روبی کو بتایا "ساحل کے بیٹھنے کا جو انداز ہے' اسے "پدم آسن" یا کنول آسن یعنی (LOTUS POSTURE) کہا جاتا ہے۔ عام زبان میں اسے "آلتی پالتی مارنا" بھی کہتے ہیں۔"

پھر میں نے روبی کو یوگا کی ایک آسان سی ابتدائی مشق کرنے کا طریقہ بتایا۔ یہ مشق بالکل سیدھے کھڑے ہو کر بہ آسانی کی جا سکتی تھی اور خاصی مفید بھی تھی۔

اس کے بعد میں ساحل کو مارشل آرٹس کی تربیت کے لیے ابتدائی ایکسرسائز سے متعلق بتانے لگا۔ یہ ہلکی پھلکی جسمانی ورزشیں جسم کو گرم کر کے اس میں لچک پیدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد بازوؤں اور ٹانگوں کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت دینا آسان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم واپس فلیٹ پر آ گئے۔ اس دوران میں امتیاز بیدار ہو چکا تھا۔

ناشتے کے دوران میں بھی میں نے ساحل کو گم صم پایا۔

وہ بات تو نارمل انداز میں کررہی تھی مگر کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی تھی۔ روبی اور امتیاز نے تو اس کی اس کیفیت کو پتا نہیں' محسوس کیا تھا یا نہیں' البتہ مجھے یہ تبدیلی بہت محسوس ہورہی تھی۔

ناشتے کے بعد ہم نہادھو کر تیار ہوگئے۔ آج مجھے امتیاز کے ساتھ اس کے باس شعیب غوری سے ملنے جانا تھا۔ یہ ملاقات ڈیفنس سوسائٹی والے بنگلے یعنی ساؤتھ میں ہورہی تھی۔ ہمیں ہر صورت دس بجے وہاں پہنچنا تھا۔

میں نے ساحل سے پوچھا "چل رہی ہو؟"

"کہاں؟" الٹا اس نے مجھ سے سوال کرڈالا۔

"ڈیفنس سوسائٹی!" میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"وہاں کیا ہے؟" اس نے پھر سوال کیا۔

ساحل کے بات کرنے کا انداز نارمل تھا تاہم اس کے لہجے میں اس کی مخصوص شوخی مفقود تھی۔ امتیاز کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے وہ بہ خوبی آگاہ تھی لیکن اس وقت وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ کہاں جانا ہے۔ اس بات نے مجھے اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کردیا۔

میں نے کہا "یوگا اور مارشل آرٹس کی مشقیں تو انسانی قوت اور صلاحیت کو بڑھانے کا کام کرتی ہیں لیکن میں محسوس کررہا ہوں کہ آج کی محنت کا تم پر الٹا اثر ہوا ہے۔"

اب اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور الجھے ہوئے لہجے میں استفسار کیا "مجھ پر ایسا کیا الٹا اثر ہوگیا۔ وجدان!"

میں نے کہا "میں محسوس کررہا ہوں' تمہاری یادداشت خاصی متاثر ہوئی ہے۔"

"میری یادداشت تو بالکل ٹھیک ہے" وہ سادگی سے بولی۔

میں نے کہا "ساحل! تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو' آج میں امتیاز کے باس اور "سی ایف کے" کے کرتا دھرتا شعیب غوری سے ملنے جارہا ہوں اور تم پوچھ رہی ہو' جانا کہاں ہے۔"

"اوہ!" اس نے اپنے چہرے کے عضلات کو اس طرح حرکت دی جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو پھر بولی "سوری وجدان! میں واقعی بھول گئی تھی۔"

"یہ سوری کیا ہوتا ہے؟" میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

"سو۔۔۔" وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔

میں سمجھ گیا' وہ "سوری" کے استعمال پر سوری کہنے جارہی تھی۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ سوری' تھینک یو پلیز اور ایکسکیوزمی' جیسے الفاظ سے حتی الامکان اجتناب برتیں گے۔ اس وقت ہم دونوں اپنے کمرے میں تھے' خواہ مخواہ اسے الجھن ہوتی۔

میں نے کہا "ساحل! میں تمہاری ان حرکتوں سے تشویش میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ تم مجھے کچھ بدلی بدلی لگ رہی ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں وجدان!" وہ جلدی سے بولی "واقعی میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔"

میں نے اسے تولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "تو کیا ارادہ ہے؟"

"تم چلے جاؤ وجدان' میں تھوڑا آرام کرنا چاہتی ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "ویسے بھی یہ تمہاری اور شعیب غوری کی ملاقات ہے۔ میرا وہاں کیا کام؟"

میں نے اس کے بعد ساحل پر زیادہ زور نہیں دیا۔ وہ سمجھ گیا' وہ اس وقت میرے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔ اس رویہ مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہا تھا تاہم میں نے اس فی الوقت چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اس ٹاپک کو آئندہ کے لیے چھوڑ کر صرف اتنا کہا۔

"ساحل! تم نے آرام کرنے کا فیصلہ بالکل درست کیا ہے۔ "چی" کی بیداری کے سلسلے میں تم نے سانس کی جو مشق کی ہے وہ ذہن و جسم کو تھکا دینے کے لیے کافی ہے۔ اب میں اتنی کامیابی ظاہر کررہی ہے کہ تم بہت جلد اپنی قوت کو بیدار کرلوگی ورنہ مخصوص انداز میں وہ سانس لی نئے افراد ایک آدھ منٹ سے زیادہ نہیں کرپاتے۔ تم واقعی کمال کردیا ساحل!"

میری اس تعریف سے وہ خوش تو ہوئی تاہم اس میں وہ شوخی اور جوش شامل نہیں تھا جو اس کی فطرت کا

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہارس پوزیشن میں کھڑے سانس کی وہ مشق لگاتار پانچ منٹ تک کرنا خاصا مشکل ہے۔ اس مشق کے بعد ذہن کا تھک جانا ایک لازمی ہے۔ میں نے سوچا' ساحل نے شوق میں' ہمت کرکے تو ٹھیک ٹھاک کرلی۔ اب واقعی اسے تھکن کا احساس ہوگا۔ کچھ دیر آرام کرلے گی تو اس کی ساری تکان ہوجائے گی۔ میں اسے فلیٹ پر روبی کے پاس چھوڑ کر کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

میری اس سوچ کو دل نے قبول نہیں کیا۔

سے سراغار ہے تھے۔ گزشتہ رات ساحل نے بڑی الجھی ہوئی اور خلاف معمول باتیں کی تھیں۔ اس مبہم اور بولی اور مفتگو کی روشنی میں ساحل کا موجودہ رویہ بہت دور خطرناک تھا۔ کیا ساحل نے جو کچھ کہا تھا' وہ سب سچ ہونے پر مجبور کررہا تھا۔ کیا واقعی بہت کچھ تبدیل ہونے والا تھا؟ کیا ان سوالات کے جوابات "ہاں" میں تھا' تبدیل ہوچکا تھا؟ اگر ان سوالات کے جوابات "ہاں" میں فرض کرلیے جاتے تو پھر نیلگری کا وہ ادھورا جملہ اپنی تمام تر فرض کرلیے جاتے تو پھر نیلگری کا وہ ادھورا جملہ اپنی تمام تر سفاکی کے ساتھ نگاہ کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔

اچانک مجھے اپنے سینے میں چھناکے کی ایک مدھر آواز سنائی دی۔ مجھے محسوس ہوا' دل میں کیف آور درد کی جیسے ایک لہری اٹھی ہو اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ میں نے خود کو ایک نادیدہ حصار میں بند پایا۔ اس وقت میری شدید خواہش تھی کہ نیلگری کا کہا ہوا غلط ثابت ہوجائے۔ میں کسی بھی قیمت پر ساحل کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

انسان صرف اسی چیز کو کھونا نہیں چاہتا جسے وہ پانا چاہتا ہو۔ شاید لارڈ بدھا نے ساحل کی سن لی تھی۔ اس نے میری تمناؤں دھڑکنوں کے جو ہار بُنے تھے ان کے مہکنے کا وقت آگیا تھا!

❁✲❁

"ساؤتھ" میں پہلے بھی آچکا تھا لیکن اس وقت وہ میرے لیے ڈیفنس سوسائٹی کا ایک بنگلا تھا جہاں "سی ایف کے" کے باس کا انگریز دوست نیل آرمر کو ٹھہرایا جارہا تھا۔ آج میں باس شعیب غوری سے ملاقات کے لیے وہاں آیا تھا۔

ٹھیک دس بجے مجھے اس کمرے میں پہنچادیا گیا جہاں "سی ایف کے" کا چیف پہلے سے موجود تھا۔ پتا نہیں' اس کا نام شعیب غوری تھا بھی یا نہیں' مجھے امتیاز نے یہی نام بتایا تھا اور مجھے امتیاز پر پورا بھروسا تھا۔ اگر وہ شعیب غوری نہیں تھا تو پھر یقیناً امتیاز بھی اس کے اصلی نام سے بے خبر ہوگا۔

شعیب غوری کی عمر پچپن چھپن کے قریب تھی۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا' جسم انتہائی متناسب اور سرخ وسفید رنگت۔ وہ سر سے تقریباً گنجا ہی تھا۔ بالوں کی ایک جھالر سی کھوپڑی پر موجود تھی۔ اس نے نفیس اور قیمتی فریم والا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ جسم پر انتہائی عمدہ تراش کا ایک بیش قیمت سوٹ تھا۔ غوری کے بائیں گال پر بھورے رنگ کا ایک مسّا موجود تھا جس کا سائز دو کیرٹ کے کسی نگینے کے برابر تھا۔ وہ بھاری اور گونج دار آواز میں بڑی روانی اور فراوانی سے انگلش بولتا تھا۔ اس کے اردو میں بولے جانے والے جملوں میں بھی انگریزی الفاظ کی بھرمار تھی۔ وہ ایک انتہائی پڑھا لکھا اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس کے چہرے سے بردباری اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ کسی بھی تنظیم کے لیے ایک آئیڈیل باس تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد ہمارے درمیان آدھے گھنٹے تک جو گفتگو ہوتی رہی' اس کا تعلق نہ تو میری ذات سے تھا اور نہ ہی میرے موجودہ حالات سے۔ غوری نے اپنے اور اپنی تنظیم "سی ایف کے" کے بارے میں بھی بات نہیں کی۔ وہ عجیب آدمی تھا' صرف اور صرف سیکس کا موضوع لے کر بیٹھ گیا۔ مجھے وہ بنکاک کی "پیٹ پونگ اسٹریٹس" نیلا کی "مائنی اسٹریٹ" اور دنیا کے دیگر "ریڈ لائٹ ایریاز" کے قصے سنانے لگا۔ حسین ساحلوں پر' اپنے ساتھ پیش آنے والے رنگین واقعات کی سنگین تفصیل وہ بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کررہا تھا۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں ایک بھی چبھتا ہوا سوال نہیں کیا اور ہماری یہ پہلی ملاقات ختم ہوگئی۔

میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو اس نے ایک فوٹوگراف میری جانب بڑھاتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا "مسٹر وجدان! یہ اپنے پاس رکھ لو۔ انسان کو اپنے دشمنوں کا چہرہ شناس ہونا چاہیے۔"

غوری کی یہ آخری بات بڑی قابلِ غور تھی اور گزشتہ تیس منٹ تک ہونے والی گفتگو سے انتہائی مختلف بھی۔ میں نے بہ غور اس فوٹوگراف کو دیکھا۔ وہ ایک گروپ فوٹو تھا جس میں ایک پستہ قامت سیاہ رو شخص کسی عورت کو سلائی مشین کا تحفہ یا عطیہ دے رہا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی اور مکاری سے بھرپور تھیں۔ اس کے قریب ہی دو باوردی پولیس والے بھی کھڑے تھے جن میں ایک آفیسر رینک کا تھا۔

میں نے فوٹوگراف سے نگاہ اٹھا کر شعیب غوری کو سوالیہ نظر سے دیکھا۔ وہ اپنی مخصوص بھاری بھرکم آواز میں بولا "مسٹر وجدان! گہرے سانولے رنگ کا یہ شخص میاں زاہد حسین ہے' جسے عام طور پر "میاں جی" کہا جاتا ہے۔ اس تقریب میں وہ بے کس اور نادار بیوہ عورتوں کو سلائی مشینیں تقسیم کررہا ہے۔ اس قسم کے سوشل ڈرامے وہ اکثر کرتا رہتا ہے اور۔۔۔" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "وہ جو تصویر میں پولیس افسر نظر آرہا ہے نا' یہ میاں کا ایک دوست ایس پی ہے جو اکثر تقریبات میں

باوردی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ میاں زاہد کو تصویریں کھنچوانے اور عوام میں مقبول ہونے کا بہت شوق ہے۔ شاید مستقبل بعید میں وہ خود کو چیف منسٹر یا گورنر کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ سیاست میں بھی بڑی سرگرمی دکھا رہا ہے۔"

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلایا اور وہ فوٹوگراف شعیب غوری کی جانب بڑھادیا۔

"اپنے پاس رکھ لو" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "میں نے میاں جی کو اپنے ذہن میں رکھ لیا ہے۔"

"گڈ ... ویری گڈ۔ تم میرے اندازے کی تصدیق کررہے ہو مسٹروجدان!"

"تمہارا یہ اندازہ میرے بارے میں ہے یا میاں زاہد حسین کے بارے میں؟"

وہ بولا "تمہارے بارے میں مسٹروجدان علی!"

"لیکن تم نے تو میرے بارے میں ایک بات نہیں کی۔"

میں نے کہا "پھر میرے بارے میں لگائے گئے کسی اندازے کی تصدیق یا تردید کیسے ہوسکتی ہے؟"

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے تکتا رہا پھر گمبھیر لہجے میں بولا "جب وقت آئے گا تو تمہارے اور تمہارے معاملات کے بارے میں گفتگو رہے گی جس کے نتیجے میں' مجھے یقین ہے ہم بہت گہرے دوست بن جائیں گے۔"

میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔ شعیب غوری کی بات اس وقت میرے پلے نہیں پڑی تھی تاہم ازاں بعد اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ہمارے درمیان واقعی بہت گہری دوستی قائم ہوگئی تھی۔

میں امتیاز کے پاس شعیب غوری سے ملاقات کے بعد باہر نکلا تو امتیاز نے مجھے گھیرلیا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہورہا تھا کہ ہمارے بیچ کیا باتیں ہوئیں۔ جب میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا "کیا واقعی؟"

"ہاں یار!" میں نے کہا "میں خود بھی حیران ہوں۔"

"بات تو حیرانی ہی کی ہے" وہ کسی گہری سوچ میں نظر آنے لگا "باس تو ٹوٹی پوائنٹ اور نہایت مختصر بات کرنے کا عادی ہے ... پھر وہ ایک انتہائی غیر متعلق موضوع کیوں لے بیٹھا۔"

اس کے انداز سے لگتا تھا' وہ خاصا مایوس ہوا تھا۔ میں نے کہا "یار! تمہارا باس تو مجھے عجیب سا لگا ہے۔ پورے آدھے گھنٹے تک وہ مجھے یہ بتاتا رہا کہ دنیا کے کرنٹ لائٹ ایریا کہاں کہاں واقع ہے اور کس ملک کی فورسز کہاں ہے؟ مجھے تو یوں محسوس ہورہا ہے جیسے تمہارا باس بھرکی کال گرلز پر پی ایچ ڈی کررکھا ہے۔ اس کی فراہم معلومات اور بیان کردہ تجربات حیرت آفرین اور جذبات ہیں۔"

"جگر! تم کوئی گڑبڑ تو نہیں کررہے ہو؟" وہ شک سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "گڑبڑ ... اور وہ بھی تم سے۔ سوال نہیں ہوتا۔"

"لیکن اپنا باس ایسا تو نہیں!" اس کی بے یقینی تھی۔

"تم اس سلسلے میں باس سے استفسار کرسکتے ہو۔"

"یہ ناممکن ہے" وہ جلدی سے بولا۔

"پھر مجھ پر اعتبار کرو۔"

"وہ تو کرتا ہوں۔"

"پھر؟"

"جگر! باس کا تمہارے ساتھ رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "امتیاز! وہ تمہارا باس ہے اور ..."

"آلویز رائٹ!"

"اوکے ... دیٹس اوکے۔ میں سمجھ گیا" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

اس کے اسٹائل پر بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔

پھر ایک مہینا گزر گیا۔ اس عرصے کے دوران میں ساحل کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ بالکل ویسا تھی لیکن پتا نہیں کیوں' مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا اس کے اندر کوئی بہت بڑی تبدیلی آرہی ہو' وہ پہلے جیسی کے باوجود بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اس کا کوئی سسٹم آف ہوگیا تھا۔

میرا یہ احساس تنہائی میں اور زیادہ شدت اختیار کرجاتا۔ خلوت میں پہنچتے ہی مجھے یوں لگتا' ساحل میرے قریب ہوگئی ہے۔ پہلے اس کا انگ انگ میرے قرب کا متمنی تھا' وہ میرے سنگ کے لیے مچلتی تھی اور اس کی والہانہ خودسپردگی کی حدود کو چھونے لگتی تھی۔ اس کی انہی طرازیوں نے میرے اندر حوصلہ جگایا تھا اور میں نے چند عملی مثالیں قائم کرڈالی تھیں مگر اب وہی ساحل میرے ساحل پر پنچ رہی ساگر جا چھپی تھی۔ وہ جتنی نظر آرہی تھی اس سے میری تشفی ممکن نہیں تھی۔ میری ہرپیش قدمی کو وہ خوبصورت گریز کے حوالے کرکے صاف نکل جاتی۔ وہ میری اداؤں میں ٹھکراؤ نہیں بلکہ ایک سلجھاؤ تھا مگر میری بے تابی مجھے الجھاؤ میں ڈال دیتی۔ میں بعض اوقات خوشی کی جھجھک کا شکار ہوجاتا۔ وہ یا قوتی ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ سجائے میری آنکھوں میں بہت دور تک اور بہت دیر تک تکتی رہتی۔ اس وقت میں خود کو ٹرانس کی سی کیفیت میں محسوس کرتا۔ وہ ایک عامل ہوتی اور میں معمول' وہ ایک ساحرہ ہوتی اور میں مسحور!

ساحل میری توقعات سے بڑھ کر ثابت ہورہی تھی۔ وہ میری زندگی میں آنے والی ہر لڑکی سے مختلف تھی۔ اس کے اندر بڑی گہرائی اور گیرائی تھی۔ وہ تو اپنے وجود میں موج زن ایک بحرِبے کراں کا تعارف تھی۔ جس طرح ساحل پر بیٹھ کر ایک تیرنے والے شخص کو سمندر کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا بالکل اسی طرح ساحل سے ملنے والا' اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے والا اس کی اصلیت تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

دیا سلائی الاؤ بھڑکانے کے بعد خاموش ہوجاتی ہے' اسی الاؤ کا حصہ بن جاتی ہے۔ شعلہ دکھا کر شعلوں کی نذر ہوجاتی ہے۔ ساحل میرے من میں ایک تڑپ جگا کر شانت ہوگئی تھی' وہ میرے احساس کا حصہ بن گئی تھی۔ میری سانسوں کی سرسراہٹ میں وہ خوشبو کی طرح بس گئی تھی۔ لمس کی انتہا سے کشید کیا ہوا کیف وہ آسودگی نہیں دے سکتا جو اس اَن چھوئے سرور میں پنہاں تھی۔

ساحل نے اس ایک ماہ کے اندر عملی میدان میں نمایاں کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ "چی" کی مشق کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ وہ لائٹ ویٹ اشیا مثلاً کاغذ' کولڈ ڈرنک کا اسٹرا اور پانی کی سطح کو حرکت دینے میں ماہر ہوگئی۔ اب ارتکازِ توجہ کے ساتھ پریکٹس کی ضرورت تھی۔ اس کی باڈی توانائی میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا' اس کی کارکردگی اور فعالیت بھی بڑھتی چلی جاتی۔

مارشل آرٹس میں ساحل نے اتنی مہارت حاصل کرلی کہ اچھی خاصی فائٹ کرسکتی تھی۔ اس نے یہ فن سیکھنے کے لیے رات دن محنت کی تھی۔ وہ بنیادی تین کلاسز یعنی فرنٹ کک' سائیڈ کک اور بیک کک بالکل صحیح انداز میں استعمال کرنے پر قادر ہوگئی۔ ازیں علاوہ بلاکنگ اور پنچنگ میں بھی پرفیکٹ ہوگئی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ ساحل میں سیکھنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی جس میں اس کی سنجیدگی نے مزید اضافہ کردیا۔ اس کے بالعکس روبی نے مجھے سخت مایوس کیا۔ امتیاز نے ایک روز مجھ سے کہا "کیا بات ہے جگر! تم اپنی اس بہن روبی پر توجہ نہیں دے رہے ہو؟"

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "یار! ناسور کے منہ پر مرہم لگانے سے بات نہیں بنتی۔ مجھے یہ سرجری

مقناطیسیت

اس کتاب کے مطالعے سے اپنی شخصیت کی مقناطیسی قوت کو اجاگر کریں اور کامیاب زندگی گزاریں

قیمت 40 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ

خط کتابت کا پتہ

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

کیس لگتا ہے۔"

وہ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔

میں نے مزید کہا "روبی کے علاج کے لیے مجھے پہلے اس کی کہانی سننا ہوگی۔ وہ کہانی جس کا تم نے ابتدا میں تذکرہ کیا تھا۔ اس کی نفسیات میں کوئی گرہ پڑی ہوئی ہے۔ جب تک وہ گرہ نہیں کھلے گی' کوئی مشق اور ایکسرسائز اسے فائدہ نہیں پہنچائے گی۔"

"تم کس گرہ کی بات کررہے ہو جگر!" وہ پُرسوچ انداز میں بولا "مجھے تو لگتا ہے' اس کی پوری نفسیات ہی گنجلک ہوچکی ہے" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "ویسے تو میں بھی تمہیں اس کی کہانی تفصیلاً سنا سکتا ہوں لیکن اس کی تحلیلِ نفسی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان سے بتائے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر اس کا تفصیلی انٹرویو کروں گا۔ ویسے تم نے کبھی اس سلسلے میں کوشش نہیں کی۔"

"ایک آدھ بار کی تھی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی" امتیاز نے اپنی شکست کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے' اب میں ٹرائی کروں گا۔"

"یہ بہت نیکی کا کام ہوگا جگر!"

"ہاں' یہ تو ہے۔"

میر بخش کی آمد سے ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میر بخش اب پوری طرح فٹ ہوچکا تھا۔ ہم نے اس کا فرضی نام سلیمان شاہ رکھ لیا تھا۔ ہم فلیٹ کے اندر صرف وجدان' ساحل اور میر بخش ہوتے تھے ورنہ باہر ہر جگہ ہم وجیہ' الماس اور سلیمان شاہ بن جاتے تھے۔ میر بخش نے اسی فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں ڈیرا جمار کھا تھا۔

فلیٹ پر قیام کے دوران میں' میں نے اس ایک ماہ میں بہت سے مفید کام بھی کیے۔ مثلاً میں نے پورے کراچی کو کھنگال ڈالا' تمام اہم راستے ذہن نشین کرلیے۔ اب میں کہیں بھی تن تنہا آجاسکتا تھا۔ بیشتر بسوں اور ویگنوں کے روٹ اور نمبر بھی مجھے معلوم ہوگئے جو میں نے اپنی یادداشت میں محفوظ کرلیے۔ جس طرح ہم نے اپنے گیٹ اپ اور حلیوں میں مناسب تبدیلی کرلی تھی بالکل یہ سلوک میر بخش کے ساتھ بھی کیا گیا۔ اس نے باقاعدہ داڑھی چھوڑ دی تھی' پہلے اس کے چہرے پر صرف بھاری بھرکم مونچھیں ہوا کرتی تھیں۔ پوری طرح اس شہر کے رنگ میں رنگ گئے اور [illegible] ڈھل گئے گویا ہم بھی "کراچوی" ہوگئے تھے۔

اس عرصے میں اپنی رضا سے' میں نے امتیاز [illegible] مشن میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ درحقیقت یہ "[illegible] کے" کے پراجیکٹ تھے۔ میری ہمراہی نے امتیاز کو [illegible] خوشی سے سرفراز کیا۔ وہ اب مجھے اپنا دایاں بازو [illegible] تھا کیونکہ میں اس کے شانہ بشانہ لڑا تھا۔

پہلا مشن محکمۂ ٹیلی فون کے ایک افسر کی [illegible] کرکے قتل کرنے والوں کے خلاف تھا۔ ڈی ای [illegible] لاکھوں کی نمائندہ ایک پارٹی کے خلاف قانونی چارہ [illegible] اسے نامعلوم افراد کی طرف سے خطرناک دھمکیاں [illegible] لگیں۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ فریقِ مخالف نے اس [illegible] سالہ بیٹی کو اغوا کرلیا۔ پولیس نہ تو اس معصوم مغوی [illegible] لاسکی اور نہ ہی اغوا کنندگان کا کوئی سراغ ملا۔ [illegible] معاملے سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتی رہی۔ چند روز بعد [illegible] کی کٹی پھٹی لاش ایک گندے نالے سے مل گئی۔ بربریت [illegible] ظلم کے اتنے بڑے واقعے کے بعد بھی پولیس مجرموں [illegible] رسائی حاصل نہ کرسکی اور کیس دفتر داخل ہوگیا۔ "[illegible] کے" نے اپنی کوشش سے مجرموں کا سراغ لگالیا اور [illegible] سرکاری انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے چاروں [illegible] کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

دوسرا واقعہ بہت اندوہناک اور گردنیں جھکا [illegible] تھا۔ یہ ڈکیتی اور آبروریزی کی ایک واردات تھی۔ جس [illegible] ڈاکوؤں نے گھر سے تمام نقدی اور زیورات سمیت [illegible] سامان سمیٹنے کے بعد اس گھر کی تو بیاہتا بہو کے ساتھ [illegible] فعل بھی کیا تھا اور وہ بھی ... اس بدنصیب کے شوہر [illegible] آنکھوں کے سامنے۔ گن پوائنٹ پر پہلے اس شخص کو [illegible] دست وپا کرکے اچھی طرح رسیوں میں جکڑا گیا پھر [illegible] بیوی کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ دوسرے روز وہ [illegible] ایک ٹرین کے نیچے آکر کٹ مرا۔ خودکشی کے سوا [illegible] پاس کوئی راستہ نہیں رہا تھا کیونکہ وہ بدقسمتی سے [illegible] بھی تھا اور انتہائی وجیہ اور جوان بھی۔ بے بسی نے [illegible] سینے میں جتنے خنجر پیوست کیے تھے' اس کے بعد وہ جینے [illegible] بھی نہیں کرسکتا تھا۔ پولیس معمول کے مطابق ڈاکوؤں [illegible] تلاش میں ناکامیاب رہی۔ میں نے "سی ایف کے" [illegible] تلے ان دو مجرموں کو تلاش کرکے عبرتناک [illegible] دینے میں [illegible]

ہمارا تیسرا شکار بڑے گھرانے کا بگڑا ہوا ایک نوجوان تھا۔ وہ اپنی امارت کی جھلک دکھا کر نچلے طبقے کی لڑکیوں کو پھانستا۔ انہیں شادی کے خواب دکھا کر اپنی مرضی کے سفر پر بہت دور تک لے جاتا اور پھر... اسی دوری پر آنسو بہاتا چھوڑ کر کسی اور میدان کی طرف نکل جاتا۔ اس کے کریڈٹ ایسے درجنوں "کارنامے" تھے۔ برباد ہونے والیوں میں سے ایک دو نے پولیس اسٹیشن جاکر فریاد بھی کی تھی مگر پولیس والے اس شیطان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے کیونکہ وہ جن مہاشیطانوں کی اولاد تھا' وہ بڑی پہنچ والے تھے۔ ان کے اشارۂ ابرو پر پولیس افسروں کی تقرریاں اور تبادلے ہوتے تھے۔ "سی ایف کے" نے اس شیطان کو ایک تاریک گوشے میں گھیر کر' ایک صاف ستھری سڑک کو اس کے غلیظ خون سے داغ دار کردیا۔

ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ "سی ایف کے" سے منسلک ہوچکا تھا۔

✪✲✪

میں اس وقت "ایسٹ" میں شعیب غوری کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہمارے سوا اس کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ یہ بنگلا بل پارک کے نزدیک ہی واقع تھا۔ امتیاز کے ذریعے غوری کے پیغام پر میں وہاں پہنچا تھا۔

آج وہ قدرے مختلف موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے گزشتہ ملاقات کی طرح سیکس یا کسی اور غیر متعلقہ بات کو موضوعِ گفتگو نہیں بنایا بلکہ حال چال دریافت کرنے کے بعد اس نے میرے "تعاون" کی تعریف کی اور پھر قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"مسٹر وجدان! پچھلی ملاقات میں' میں نے تم سے ڈھنگ کی کوئی بات نہیں کی تھی جس پر تمہیں حیران ہونا چاہیے تھا مگر تم نے اپنی کسی الجھن یا حیرانی کا مظاہرہ نہیں کیا۔"

وہ یہاں تک پہنچ کر خاموش ہوا اور ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ نظر کے چشمے کے پیچھے اس کی ذہین آنکھیں ساکت تھیں۔ میں خاموش رہا تو اس نے کہا۔

"دراصل اس وقت تک میں تمہارے بارے میں ادھوری معلومات رکھتا تھا لیکن اب یہ نامکمل معلومات تقریباً مکمل ہوچکی ہیں اس لیے بزنس کی بات ہوسکتی ہے۔"

"کیسا بزنس؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا "سی ایف کے کو چلانے کے لیے مجھے مختلف قسم کے بزنس کرنا پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے' کوئی بھی تنظیم سرمائے کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس کو فعال رکھنے کے لیے فنانس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب میں یہ تو کر نہیں سکتا کہ دولت حاصل کرنے کے لیے لوٹ مار شروع کردوں۔ میں نے دولت کمانے کے چند ذرائع وضع کرلیے ہیں اور انہیں میں اپنا بزنس کہتا ہوں۔"

میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا "مجھ سے تم کس قسم کا بزنس کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اسی طرف آرہا ہوں" وہ اپنی مخصوص گونجیلی آواز میں بولا "میں نے ابھی تک یہ فیصلہ تو نہیں کیا کہ تم سے کون سا بزنس کروں گا لیکن میرا خیال ہے' اس ملاقات کے اختتام تک یہ معاملہ طے ہوجائے گا۔"

"تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو' کھل کر اور واضح الفاظ میں کہو" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "تمہارا یہ مبہم انداز مجھے الجھا رہا ہے۔"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا "مسٹر وجدان! مجھے پتا چلا ہے' تمہارے اور چوہدری نوازش علی آف رکھاں والی کے درمیان کوئی دیرینہ دشمنی پھل رہی

مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب
احساس کمتری
اسباب تدارک علاج
اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ
احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔
کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں۔
قیمت 25 روپے ڈاک خرچ 23 روپے
خط و کتابت کا پتہ
Rishtay 1970@yahoo.com

ہے۔ اس نے پاکستان سے باہر تمہارے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا کردیا تھا اور تم نے پاکستان میں داخل ہوتے ہی اس کا خون خشک کردیا ہے۔ وہ مارا ہوا میاں زاہد حسین، تم نے سب کو ناقابل یقین نقصان پہنچایا ہے۔ یہ سب چوہدری کے بندے ہیں اور تم سے اس قسم کی جرأت کی توقع نہیں کرتے تھے، بہرحال۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا اور ایک طویل سانس خارج کرنے کے بعد سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا "کراچی میں داخل ہوتے ہی تم جس قسم کی صورت حالات سے گزر رہے ہو اور میاں زاہد کا گروہ جس طرح تمہاری تلاش میں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ تم سے کچھ حاصل کرنا، کچھ چھیننا چاہتے ہیں۔ اسی ذیل میں تمہارے ایک ساتھی بوٹا سنگھ کو بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا۔ میر بخش کا اغوا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے اسے بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے!" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "تم واقعی ایک بہت اچھے تجزیہ نگار بھی ہو۔"

وہ دوستانہ انداز میں بولا "مسٹر وجدان! تم عمر میں مجھ سے آدھے سے بھی کم ہو۔ میں نے کبھی تمہیں اپنا ملازم یا "سی الیف کے" کارکن نہیں سمجھا۔ ہمیشہ ایک دوست خیال کیا ہے۔ کیا اس دوستی کے رشتے کی بنا پر میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔ ممکن ہے، میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں؟"

میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اسے یاد دلایا۔ "تم تو مجھ سے کسی بزنس کی بات کررہے تھے پھر بیچ میں میرے مسائل کہاں سے آن ٹپکے؟"

"میں تمہارے مسائل یا مسئلے پر کھڑے ہو کر ہی تو بزنس ڈیل کروں گا، ڈیئر!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہوئی تو میں اس مدد کے عوض تم سے ایک سودا طے کرلوں گا۔ یہی میرا بزنس ہے۔ میں لوگوں کے ناممکن اور پے چیدہ کاموں کے عوض اپنا معاوضہ وصول کرتا ہوں اور ان کاموں کو کرانے کے لیے میں مختلف محکموں میں اپنے لنکس کو استعمال کرتا ہوں۔ اب میری بات کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔"

"میں پوری طرح تمہارا بزنس سمجھ گیا ہوں" میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "لیکن میرے مسئلے کا تعلق کراچی سے نہیں جبکہ "سی الیف کے" صرف کراچی میں کام کرتی ہے۔"

"تم اس بات کی فکر نہ کرو" وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "اپنا مسئلہ بتاؤ۔"

میں گزشتہ ایک ماہ میں شعیب غوری اور اس کے تنظیمی معاملات کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ وہ مجھے لحاظ سے قابل اعتماد اور بھروسے کا آدمی لگا۔ اس نے اور اس کی تنظیم نے اب تک مجھے ایک مضبوط پناہ گاہ کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی مدد بھی دی تھی۔ میں اس کا ممنون احسان تھا، یلک جھپکتے میں میرے اندر سے یہ فیصلہ آگیا کہ مجھے شعیب غوری کو اپنے راز میں شریک کرلینا چاہیے۔ وہ راز جس کی قیمت کم از کم چوتھائی ارب روپے تھی۔

میں نے آئندہ ایک گھنٹے میں شعیب غوری کو بلا کر کاست مدفون سونے کے بارے میں بتادیا۔ وہ میرے لیے قابل بھروسا دوست ثابت ہوسکتا تھا۔

"تو ان سب کو اس ڈائری کی تلاش تھی جس میں مدفون سونے والے تھیلوں کی نشاندہی کی گئی ہے؟" پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا "اور وہ ڈائری اب میاں زاہد حسین کے ہتھے چڑھ چکی ہے بلکہ اب تک اس نے وہ ڈائری اپنے [illegible] چوہدری نوازش کو بھیج دی ہوگی مگر وہ ڈائری ایک خالی [illegible] سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ ایک ایسا ناگ ہے جس کا زہر تم نکال لیا ہے۔ وہ ناگ کسی حقیر کیچوے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ چند لمحات تک کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کاروباری انداز میں بولا "مسٹر وجدان میں نے بزنس ڈیل کے لیے لائحہ عمل تیار کرلیا ہے مگر اس کے لیے اعتبار شرط ہے۔"

میں نے کہا "میں نے تم پر اعتبار کرکے ہی تمہیں [illegible] راز میں شریک کیا ہے۔ تم مجھ سے کس قسم کا اعتبار چاہتے ہو؟"

"بس، میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے پر مکمل اعتبار کریں" وہ اضطراری لہجے میں بولا "کیونکہ اس بزنس ڈیل کو ہم پیسز زپر نہیں لے سکتے۔ اس قسم کے کاموں میں پارٹی کی زبان پر بھروسا کیا جاتا ہے۔"

"تم میری جانب سے بالکل بے فکر ہوجاؤ" میں نے [illegible] آمیز لہجے میں کہا "میں نے اگر تم پر اعتماد نہ کیا ہوتا تو [illegible] ساتھ دینے کا بزنس نہیں یا پھر ابتدا ہی میں چھوٹ چکا ہوتا۔ تم بتاؤ کس قسم کا بزنس ہے تمہارے ذہن میں؟"

وہ مزید سنجیدہ ہوگیا "مسٹر وجدان! میں تمہارے ساتھ وہ مزید بزنس کرنا چاہتا ہوں۔ ہم اس بزنس میں ففٹی ففٹی ون پارٹنر شپ کے پارٹنرز ہوں گے۔ تمہیں میں ففٹی پرسنٹ کی اور فورٹی نائن کے پارٹنرز رکھنا چاہتا ہوں۔"

پوزیشن میں ہمہ تن گوش رہا۔

میں خاموشی سے ہمہ تن گوش رہا۔

وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تم مجھے سونے کے درست مقام کی نشان دہی کرنے والے ڈائری کے وہ صفحات دے دو۔ میں اپنے بل بوتے پر وہ سونا وہاں سے نکلوالوں گا۔ بعد میں ہم اپنی پارٹنر شپ کے حساب سے وہ سونا بانٹ لیں گے۔ تمہیں سونے کی بازیافت کے لیے ایک تنکا بھی دہرا نہیں کرنا پڑے گا۔ کام میں کروں گا۔ حصہ دونوں پائیں گے۔ بولو منظور ہے؟"

میں نے کہا "تجویز تو اچھی ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ بازیافت کا کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا "میں اس متروک کنوئیں میں کس طرح کھدائی کرواتا ہوں، یہ میرا دردِ سر ہے۔ تم اگر اس بزنس ڈیل کے لیے تیار ہو تو ہم اپنی دوستی کو اور مضبوط بنا سکتے ہیں۔"

مجھے بیٹھے بٹھائے ایک آسانی میسر آرہی تھی۔ اس سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوتی۔ میں اگر خود رکھاں والی جاکر سونے کو نکالنے کی کوشش کرتا تو چوہدری نوازش علی میرے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کرسکتا تھا۔ میں چوہدری اور اس کے اثر و نفوذ سے خوف زدہ نہیں تھا تاہم اس کے علاقے میں جاکر کھلا کھلا متروک کنوئیں سے وہ مدفون سونا نکالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اگر مجھے دربدر وہ رہ کر یہ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا تو مجھے اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شعیب غوری ایک قابل بھروسا دوست ثابت ہورہا تھا۔ اس کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے مجھے امید تھی کہ وہ اس کام کو کر گزرے گا۔ اس طرح آدھا سونا اس کی طرف چلا جاتا، مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ غوری اس سونے سے حاصل ہونے والی رقم کو "سی الیف کے" پر خرچ کرتا تو یہ رقم نیک مقصد کے حصول پر خرچ ہوتی۔ میرا ذہن دول ہر حوالے سے مطمئن ہوگیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنی رضامندی کے طور پر دوستی کے لیے ہاتھ آگے بڑھادیا۔

غوری نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے کہا "میں کل آپ کو ڈائری کے وہ قیمتی صفحات دے دوں گا۔ آپ اپنے طور پر جیسے چاہو، وہ سونا حاصل کرلو، مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں ایک مرتبہ "رکھا والی" ضرور جانا چاہتا ہوں۔"

"اسی سونے کے سلسلے میں؟" غوری نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "سونے کا معاملہ تو میں نے تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ وہاں میں کسی اور سلسلے میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا میں اس سلسلے کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟"

"جب تم سے دوستی ہوگئی ہے تو پھر تمہیں اجازت لینے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "تم براہِ راست مجھ سے سوال کرسکتے ہو۔ خیر، میں تمہیں خود ہی بتاتا ہوں۔"

میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر غوری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا "میں پاکستان کئی مقاصد کے لیے آیا ہوں جن میں سرِفہرست چوہدری نوازش علی اور سونے کے معاملات ہیں۔ سونے کا ٹھیکا تو تم نے لے لیا مگر میں چوہدری

نوازش سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔ حساب ماضی کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے۔ علاوہ ازیں میں اس دھرتی' اس گھر اور اس مقام کو ایک مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں' جہاں میں نے جنم لیا تھا۔"

بولتے بولتے میری آواز بھرا گئی۔ غوری نے کہا "مسٹر وجدان! جہاں تک جنم بھومی کو دیکھنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے تمہیں ایک مرتبہ موضع رکھاں والی یہ نفس نفیس جانا ہوگا البتہ چوہدری والا مسئلہ میں کراچی میں بیٹھے بٹھائے حل کر سکتا ہوں۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "وہ کس طرح مسٹر غوری؟"

"ہم جب دوست بن ہی چکے ہیں تو تمہارے تمام دشمن میرے بھی دشمن ہیں" وہ نہایت ہی سنجیدگی سے بولا "میں اپنے بندوں کی مدد سے چوہدری کو ٹھکانے لگوا سکتا ہوں۔ میرے لیے یہ اتنا زیادہ مشکل نہیں۔"

میں نے نفی میں گردن ہلادی "نہیں مسٹر غوری! اگر تم چوہدری کو کسی بھی طرح ختم کروادو گے تو مجھے مزہ نہیں آئے گا۔ میرے سینے میں جو الاؤ روشن ہے' اس پر ایک چھینٹا پانی کا نہیں پڑے گا۔ جب تک میں اپنے ہاتھوں سے چوہدری نوازش کو تڑپا تڑپا کر نہیں ماروں گا' میرا انتقام پورا نہیں ہوگا۔ تم سینے میں روشن انتقام کی آگ کی تپش سے خوب واقف ہوگے۔ اس قاتل آگ کے لپکتے شعلے زہریلے ناگوں کے مانند اپنی زبانیں لہراتے رہتے ہیں۔ یہ آتش فشاں جب تک پھٹے گا نہیں' مجھے قرار نہیں آئے گا۔"

"تمہاری یہ خواہش میں یہاں کراچی میں بھی پوری کر سکتا ہوں۔" غوری نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں مسٹر غوری!" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولا "میں کسی نہ کسی طرح چوہدری نوازش کو کراچی پہنچا کر تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"کیا یہ تمہارے لیے ممکن ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں میرے دوست" میں نے پہلی مرتبہ شعیب غوری کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ وہ میری توقع سے زیادہ گہرا اور کام کا آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ جبھی تو وہ اتنی اہم تنظیم کو بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے چلا رہا تھا۔ میں نے اسی کے انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "مسٹر شعیب! اگر تم یہ کام کر دو تو تمہاری تنظیم "سی ایف کے" کو بھاری امداد دوں گا۔"

"اس ریٹرن کی ضرورت نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "اگر میں تمہارے دشمن کو یہاں پہنچا کر تمہارے قدموں میں ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ ایک دوستانہ طرف سے دوسرے دوست کے لیے ایک ادنیٰ سا تحفہ ہوگا۔"

میں اس کے انداز دوستی کو سراہے بنا نہ رہ سکا "مسٹر غوری! تم ایک قابل فخر دوست ہو۔ مجھے بھی کبھی آزما کر دیکھنا۔ وجدان کی دوستی تمہیں پسند آئے گی۔"

"مجھے وجدان اور اس کی دوستی پسند آچکی ہے۔" وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا "اور میں دوست کو آزمانے کا قائل نہیں۔ دوستی ہر قسم کے ٹرائل سے ہونا چاہیے۔"

"میں خود بھی اسی قسم کے خیالات کا مالک ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "پھر تو خوب نبھے گی مائی ڈیئر۔"

"شیور مائی ڈیئر غوری۔" میں نے کہا۔

"تمہارا یوں بے تکلفی سے مجھے "غوری" کہنا بہت اچھا لگتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "حالانکہ ہماری عمروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہارے اس طرح پکارنے سے مجھے کوئی یاد آجاتا ہے۔"

بات ختم کر کے وہ خیالوں میں گم ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ماضی میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ میں نے بے تکلفی کی فضا کو قائم رکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

"مسٹر غوری! کوئی یاد آجاتا ہے یا..... یاد آجاتی ہے؟"

وہ چونک اٹھا پھر اس نے بڑی خوبصورتی سے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ معاملہ رفع دفع کر دیا "مسٹر وجدان! "یاد" کا لفظ چوں کہ مونث استعمال ہوتا ہے اس لیے "یاد آجاتی ہے" کہہ دینا بھی کچھ غلط نہیں۔ تم جو کچھ سمجھ سکتے ہو!"

مجھے جو سمجھنا تھا' وہ میں سمجھ گیا۔

اس نے واپس کرنٹ ٹاپک کی طرف آتے ہوئے کہا "مسٹر وجدان! اس وقت ہمارے سامنے تین اہم کام ہیں۔ نمبر ایک' متروک کنوئیں سے سونے کے بھرے ہوئے بڑے تھیلے برآمد کرنا۔ نمبر دو' چوہدری نوازش علی سے بھائے انتقام۔ نمبر تین' تمہاری جنم بھومی کی یاترا۔ میرا یہ خیال ہے' ہمیں یہ کام ایک خاص ترتیب اور ٹائمنگ سے کرنا چاہئیں۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔" میں نے تائید کی "پلاننگ اور ٹائمنگ ہر کامیاب منصوبے کی شرائط اولین ہیں۔ تمہارے ذہن میں اس بارے میں کیا لائحہ عمل ہے؟"

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "پہلے میں اس متروک کنوئیں کی تلاش اور کھدائی کا محفوظ بندوبست کروں گا۔ کھدائی سے ایک روز قبل میں چوہدری نوازش علی کو تمہارے پاس پہنچانے کا انتظام کروں گا۔ میں چاہتا ہوں' یہ دونوں کام ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں ہو جائیں۔ جس روز چوہدری تمہارے ہتھے چڑھے' اسی روز کنوئیں کی تہ سے سونے والے تھیلے نکال لیے جائیں۔ میجر' کھدائی کا کام میں پہلے کروالوں گا۔" وہ چند لمحے سانس لینے کے لیے رکا پھر اپنی تجویز کو تکمیل کے مراحل سے گزارتے ہوئے بولا "ان واقعات کے چند روز بعد تم اپنی جنم بھومی کی یاترا کو جا سکتے ہو۔"

"ویل ڈن۔" میں نے ستائشی نظروں سے غوری کو دیکھا "مجھے تمہارا پروگرام پسند آیا۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

"تھینک یو مسٹر وجدان!" وہ سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا "میرے پاس تمہارے لیے ایک اور بھی تجویز ہے۔" میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا' وہ بولا "اگر تم سونے کا حصہ نہ لینا چاہو تو میں اس سونے کی مالیت کے برابر تمہیں رقم بھی دے سکتا ہوں۔ جس بھی کرنسی میں تم چاہو۔ یو۔ایس۔ اسٹرلنگ..... یا جو بھی تمہاری خواہش ہو۔ میں وہ تمام سونا اپنے انگریز دوست مسٹر نیل آرمر کے حوالے کر دوں گا۔ تم تو جانتے ہی ہو' وہ گولڈ اکاؤنٹ بینک چلاتے ہیں۔ ہم اس سونے کے عوض کرنسی حاصل کر سکتے ہیں۔" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا "ویسے تو عنقریب سنگاپور سے بھی ایک بہت بڑی رقم یو۔ایس کی شکل میں تمہارے پاس پہنچنے والی ہے۔ مجھے لگتا ہے' تم راتوں رات بلینئر کیا' ٹریلینئر ہونے والے ہو!"

آخری جملہ اس نے مذاق کے رنگ میں کہا تھا۔

میں نے قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "مسٹر غوری! ہماری پارٹنرشپ کا دارومدار اس سونے کے حصول پر ہے۔ اگر بالفرض' تم وہ سونا برآمد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو تمہاری اس محنت کو کون ادا کرے گا۔"

"سوال اچھا ہے۔" وہ بھی سنجیدہ ہو گیا "لیکن میں تم سے ضرور پوچھوں گا کہ یہ سوال تمہارے ذہن میں کس بنا پر آیا ہے؟"

میں نے کہا "اس بات کے امکانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ سونے کی کھدائی کے سلسلے میں اچانک حکومتی سطح پر کوئی رکاوٹ سامنے آسکتی ہے۔ بہرحال وہ سونا اسمگلنگ کے مال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر حکومتی اداروں کو اس کی کھدائی کی سن گن مل گئی تو تمہارا کام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔"

"حکومت اور حکومتی اداروں کی تم پروا نہ کرو۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا "میرے ذہن میں ایک اچھوتا اور شفاف منصوبہ ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ میں کس مقصد کے لیے وہ کھدائی کروا رہا ہوں۔ بلکہ میں تو حکومت کی سرپرستی میں وہ کام کروں گا۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "وہ کس طرح دوست؟"

"میں نے کہا نا' یہ معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" وہ ہاتھ کو تسلی کے انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولا "میں جانتا ہوں' اس ملک میں قانون کی مدد سے غیر قانونی کام کس طرح کیے جا سکتے ہیں۔ تم اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔ ہاں' اگر تمہارے ذہن میں کوئی اور بوجھ ہو تو وہ بھی اتار دو۔"

میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا "ایک خدشہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم سے پہلے ہی وہ سونا وہاں سے نکالا جا چکا ہو!"

میں نے یہ بات دانستہ صرف غوری کو چیک کرنے کے لیے کی تھی ورنہ میں جانتا تھا' اگر صحیح نشاندہی کے بغیر اس مدفون سونے کی بازیابی ممکن ہوتی تو چوہدری اب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہ رہتا۔

شعیب غوری نے کہا "مسٹر وجدان! اگر وہ سونا متروک کنوئیں سے نکالا جا چکا ہوتا تو یہ بات چوہدری نوازش سے چھپی نہ رہتی۔ یا تو وہ خود سونے کو وہاں سے نکلوا تا یا نکالنے والوں کی جان کو آجاتا۔ اس صورت حال میں وہ حالات پیش نہ آتے جو پاکستان..... خصوصاً کراچی میں داخل ہوتے ہی تمہیں درپیش ہیں۔ چوہدری کے نمک خواروں نے ڈائری کے حصول کے لیے بوٹا سنگھ کو ہلاک کر دیا' تمہارے ساتھی میر بخش کو بھی اسی سلسلے میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ وہ بھاری مالیت کا سونا ابھی تک اسی متروک کنوئیں کے اندر' کینوس کے "سیلپنگ بیگ" میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔" وہ ایک لمحے کو اچانک خاموش ہوا پھر مضطرب انداز میں دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا "مجھے ایک اچھوتا آئیڈیا سوجھ رہا ہے مسٹر وجدان!"

"کیسا آئیڈیا؟"

"میاں جی سے دل لگی کا آئیڈیا۔"

"میں سمجھ نہیں سکا مسٹر غوری!" میں نے کہا۔

وہ بولا "ہم میاں زاہد حسین سے کچھ اٹکھیلیاں کر سکتے ہیں۔"

میں اب بھی اس کی بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا اور پوچھا "کیسی اٹکھیلیاں؟"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "مسٹر وجدان! تم "کام" کے دو صفحات نکال کر وہ ڈائری ہوٹل کے کمرے ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ میاں زاہد نے وہ ڈائری فوری طور پر اپنے باس چوہدری نوازش کو بھجوا دی ہوگی۔ یہ بات صرف ہم جانتے ہیں کہ وہ ڈائری ایک بے کار اور بے مصرف کتاب بن کر رہ گئی ہے۔ ورنہ میاں زاہد اور چوہدری نوازش تو خوشی سے بغلیں بجا رہے ... ہوں گے۔ ہمیں انہیں اسی خوش فہمی میں مبتلا رکھتے ہوئے ان کی خوشی کا سوا ستیاناس مارنا ہے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہو کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا "اب تم اس ڈائری کے حصول کے لیے میاں زاہد کا تعاقب کرو گے۔ یہ تعاقب میاں زاہد اور اس کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے ہوگا۔ آڑ اس ڈائری کی استعمال کی جائے گی۔ اس سے ہمیں دہرا فائدہ پہنچے گا۔ تمہارا ڈائری کے پیچھے بھاگنا ان کی خوش فہمی کو اور زیادہ مضبوط کر دے گا کہ سونے کا راز اسی ڈائری کے اندر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس بھاگ دوڑ میں چند جرائم پیشہ بُرے لوگ بھی اس شہر سے کم ہو جائیں گے۔ خس کم، جہاں پاک.... والی مثال تو تم نے سن رکھی ہوگی مسٹر وجدان!"

میں نے اس کے آئیڈیے کو سراہا پھر ہمارے درمیان باہمی امور پر کچھ باتیں ہوئیں اور جب میں شعیب غوری کے ٹھکانے "ایسٹ" سے رخصت ہونے لگا تو اس نے مجھے ایک مرتبہ پھر حیران کر دیا۔ وہ میری جانب ایک خاکی لفافہ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مسٹر وجدان! یہ تحفہ میری طرف سے رکھ لو۔"

"کیا ہے، اس لفافے کے اندر؟"

"کھول کر دیکھ لو۔"

میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ خاکی لفافہ وہیں کھول لیا۔ اندر سے دو کی رنگ برآمد ہوئے۔ دونوں رنگز میں چند چابیاں جھول رہی تھیں۔ میں نے سوالیہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ تبسم ریز لہجے میں بولا "ان میں ایک گچھے میں گاڑی کی چابیاں ہیں، نئی نویلی نیلے رنگ کی شیرڈ۔ دوسرا کی رنگ فلیٹ کی چابیوں والا ہے۔ یہ فلیٹ ساحل سمندر پر ایک کثیر المنزلہ اپارٹمنٹس بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر ہے۔ نیلی شیرڈ اسی بلڈنگ کی پارکنگ میں موجود ہے۔ گاڑی نمبر اور فلیٹ کا ایڈریس ایک پرچے پر لکھا ہوا ہے اور وہ بھی اسی بھورے لفافے کے اندر ہے، شاید تم نکالنا بھول گئے!"

میں نے بے اختیار اس خاکی لفافے کے اندر جھانکا اور مذکورہ پرچہ برآمد کر لیا۔ وہ پرچہ غوری کے بیان کی تصدیق کر رہا تھا۔ گاڑی کا نمبر اور فلیٹ کا ایڈریس اس پر درج تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا "یہ سب کیا ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں مسٹر وجدان، یہ ایک حقیر سا تحفہ میری جانب سے۔"

کسی کے پُرخلوص تحفے کو ٹھکرانا نہیں چاہیے جب وہ شخص سے نئی نئی دوستی بھی ہوئی ہو۔ میں نے وہ خاکی لفافہ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "مسٹر غوری! تمہارے یہ تحفے خاصے وزنی ہیں!"

انداز مذاق کا تھا، وہ بھی اسی رنگ میں بولا "اگر بوجھ زیادہ محسوس کرنے لگو تو ساتھ ساتھ اتارتے بھی جانا۔ میں دوستوں سے تحفے لے کر بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "اب تم ہم دوست بن گئے ہیں اس لیے یہ "مسٹر" کا تکلف اچھا نہیں لگتا۔ ہم ایک دوسرے کو وجدان اور شعیب بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"اوکے۔" وہ زیر لب مسکرایا پھر بولا "وجدان! تم نے ہی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس فلیٹ پر شفٹ ہو جانا ہے۔ میں نے بجلی، گیس اور ٹیلی فون کے بل ایڈوانس پے کر رکھے ہیں۔ ایک سال تک تو یہ بل مائنس میں آئیں گے۔ فلیٹ فل فرنشڈ ہے۔ کچن میں فریج سمیت ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔ تمہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس بلڈنگ میں ہر فلور پر صرف دو فلیٹ آمنے سامنے ہوئے ہیں۔ وہاں سب اپنے کام سے کام رکھنے والے ہیں۔ کوئی کسی کی ٹوہ میں نہیں ہے اور نہ ہی کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کسی کے پاس فرصت ہے۔ نہایت ہی سکون اور آرام سے وہاں وقت گزار سکتے ہو۔"

میں نے شعیب غوری کے اس تحفے کو خوش دلی سے قبول کیا اور "ایسٹ" سے باہر نکل آیا۔

❂✲❂

روبی اور امتیاز خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

ان کی خوشی میں حزن کی آمیزش تھی "سی ایف کے" کے باس شعیب غوری سے ہونے والی میری ملاقات اور اس کے نتائج نے انہیں جہاں بے پناہ خوشی دی تھی' وہیں وہ اس احساس سے خاصے رنجیدہ تھے کہ اب ہم ان سے رخصت ہونے والے تھے۔ ہماری رہائش طارق روڈ سے سمندر کے کنارے جانے والی تھی۔ میں نے امتیاز کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "یار! دل چھوٹا کیوں کرتے ہو۔ ہم ایک ہی شہر میں ہیں اور ملنے ملانے پر کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی۔"

"جگر! اگر تبدیلی رہائش کا فیصلہ باس کا نہ ہوتا تو میں تمہیں کسی قیمت پر جانے نہ دیتا۔" امتیاز نے خلوصِ دل سے کہا۔

"میں تمہارے دلی جذبات کو سمجھتا ہوں یار!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ کسی فوری خیال کے تحت بولا "آج رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے' یہ ایک طرح سے فیئرویل ڈنر ہوگا۔"

ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا' پھر خود ہی امتیاز نے مینیو کا انتخاب بھی کرلیا۔ کچھ دیر بعد ہم سب امتیاز کی گاڑی میں ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بوفے ڈنر کرنے جا رہے تھے۔ امتیاز نے بتایا کہ وہ پہلے بھی وہاں کئی مرتبہ آچکا تھا۔ وہاں کا مینیو خاصا صحت مند اور کھانے صحت بخش تھے۔ روبی نے بھی وہاں کے کھانوں کی بہت تعریف کی۔

اس اوپن ائر ریسٹورنٹ کا ماحول مجھے بہت پسند آیا۔ ہم ایک گوشے کی میز پر بیٹھ گئے۔ بوفے ڈنر کے اصولوں اور تکنیک سے میں بہ خوبی آگاہ تھا۔ ایسے مقامات پر وقت بہت اچھا گزرتا ہے۔ تھوڑا تھوڑا کھاتے رہو اور انجوائے کرتے رہو۔

ہم کھانے کے دوران میں خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک مجھے اپنے پاؤں کے نزدیک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے میں سمجھ گیا کہ کوئی جان دار وہاں موجود تھا۔ اس کے مخصوص لمس نے مجھے بتادیا کہ وہ کوئی بلی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے معیاری ریسٹورنٹ میں وہ بلی کہاں سے آگئی تھی۔

میں نے اپنے پاؤں کو تھوڑی حرکت دی تو وہ "میاؤں" کی آواز نکالتے ہوئے دوسری میزوں کی جانب دوڑ گئی۔ سب نے اس بلی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت سفید بلی تھی جو عام بلیوں کی بہ نسبت انتہائی صاف اور خوش نما تھی۔

امتیاز نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "یہ کم بخت کہاں سے آگئی۔ میں اس ریسٹورنٹ کی مینجمنٹ سے شکایت کروں گا۔"

"اب چھوڑو بھی" روبی نے بے پروائی سے کہا "یہ اوپن ائر ریسٹورنٹ ہے۔ اس میں کسی بلی کا گھس آنا کوئی خاص بات ہے۔ پھر اس نے ہمیں کون سا نقصان پہنچایا ہے۔"

ساحل نے بہ ظاہر سنجیدہ رہتے ہوئے ایک خوبصورت مذاق کیا "یہ بلی وجدان سے اپنی برادری کا بدلہ لینے آئی تھی' چھوڑے گی نہیں اسے۔"

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر خاموش رہا۔ امتیاز نے پوچھا "بھئی' یہ بلیوں کی برادری کا کیا قصہ ہے؟"

"پچھلے دنوں وجدان ایک تجربہ کرنے کے لیے چند بلیوں کو اپنا جھوٹا کھلاتا رہا ہے" ساحل نے امتیاز کو بتایا "اپنے کنبے کی سردار بھی ہے۔ اس نے اپنی تحقیق سے معلوم کرلیا ہے کہ وجدان کتنا خطرناک تجربہ کر رہا تھا۔ میں بلیوں کی جان کو صد فیصد خطرہ تھا۔"

اب روبی اور امتیاز بھی بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ عنبر کی ہدایت پر میں نے چند ایسے تجربات کیے تھے۔ خدا کا شکر ہے' ان تجربات اور لیبارٹری ٹیسٹ کا نتیجہ تسلی بخش ہوا تھا۔ کسی بھی بلی کو میرے جھوٹے سے کوئی نقصان اور ٹیسٹ کی رپورٹس میں بھی ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جس سے پتا چلتا' میں ایک زہریلا انسان ہوں۔

ہومیوڈاکٹر عنبر نے رپورٹس دیکھنے کے بعد میری طرف ایسی نظر سے دیکھا تھا جیسے وہ سمجھ رہی ہو' میں خواہ مخواہ الجھنے کے لیے اپنے زہریلے پن کی کہانی لے کر اس کے پاس پہنچا تھا ورنہ میرے بلڈ اور اسپوٹم کی رپورٹ تو کلیئر تھیں۔

میں خود بھی حیرت زدہ تھا۔ دو مرتبہ انتہائی خطرناک زہریلے سانپ مجھے ڈسنے کے بعد تڑپ تڑپ کر مرگئے تھے۔ میں نے دوبارہ ان کا حوالہ دیا تو ڈاکٹر عنبر نے کہا تھا "ہو سکتا ہے' آپ کسی جان دار کو اپنے دانتوں سے کاٹ کر دیکھیں۔ ویسے میرے خیال میں آپ کے ساتھ زہریلے پن کا کوئی مسئلہ نہیں۔"

میں نہ تو ڈاکٹر کے ساتھ کوئی مباحثہ کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اپنے تجربات کو نظرانداز کرسکتا تھا۔ یہ تو ممکن تھا' اس نے مجھے اپنے لیے مخصوص رکھنے کی خاطر میری توجہ میرے زہریلے پن کی طرف دلائی ہو لیکن میں ان دونوں زہریلے سانپوں کی موت کو نہیں بھول سکتا تھا۔ میرے استاد سرپرنگ پائی نے پتا نہیں' مجھے کون کون سی جڑی بوٹیوں کے خواص پلائے تھے کہ میں ہر قسم کے زہر سے محفوظ ہو گیا تھا لیکن میرے وجود کے اندر پایا جانے والا زہر کسی ٹیسٹ کی پکڑ میں نہیں آرہا تھا۔

ایک وقت کا کھانا انسان زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں کھالیتا ہے لیکن بوفے میں جانے والے لوگ بعض اوقات تین چار گھنٹے سے زیادہ لگادیتے ہیں کیونکہ اس ماحول میں کھانا کم اور باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ہم نے بھی اس روز جی بھر کر مختلف موضوعات پر باتیں کیں۔ امتیاز اور روبی ہمارے میزبان تھے تاہم وہاں میزبانی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

جب ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم سروس روڈ پر کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آئے۔ امتیاز کو گاڑی نکالنے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ہمارے عقب میں کسی نے اپنی گاڑی بڑے بے ہودہ انداز میں کھڑی کر رکھی تھی۔ امتیاز نے اس گاڑی کے مالک کو کئی صلواتیں بھی سنا ڈالیں تاہم یہ سب اس کے دل کا غبار تھا اور اُڑکر گاڑی کے مالک کی سماعت تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اس فلیٹ کی جانب روانہ ہوگئے جو شعیب غوری نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔ امتیاز نے کہا "جگر! بڑے پوش علاقے میں جا رہے ہو اور وہ بھی سمندر کے کنارے۔ میں نے وہ فلیٹ دیکھ رکھا ہے۔ بہت انجوائے کروگے۔ کنگ سائز سلائیڈنگ ڈور میں سے ٹھاٹھیں مارتا سمندر بڑا سحر کار دکھائی دیتا ہے۔"

روبی بولی "چلیں' ہم بھی ویک اینڈ پر پکنک منانے ان کے پاس چلے جایا کریں گے۔"

اس وقت میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میری راہنمائی کے لیے بیک سیٹ پر امتیاز موجود تھا۔ روبی اور ساحل گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھی تھیں اور دھیمی آواز میں مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ میر بخش بھی امتیاز کے ساتھ ہی پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔

میں امتیاز کی فرمائش پر گاڑی چلا رہا تھا حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ کا کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس نے بے پروائی سے کہا تھا "سب بھگت لیں گے جگر! ویسے بھی ہم جس علاقے میں جا رہے ہیں وہاں ان چھوٹی موٹی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔" وہ اس روز خاصا موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔

راستے میں ایک دو مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوا' کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے بے اختیار اپنے عقبی منظر کا جائزہ بھی لیا۔ اپنے پیچھے خاصے فاصلے پر مجھے ایک گرے جیپ کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ لگ بھگ نصف شب کا وقت تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام رہ گیا تھا۔

کلفٹن کا برج عبور کرنے کے بعد میں نے اپنے عقب میں اسی گرے جیپ کی جھلک دیکھی تو چونکا ہو گیا۔ میں نے امتیاز سے کہا "یار! میں محسوس کر رہا ہوں' ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔"

امتیاز نے بھی گاڑی کے عقبی منظر کا جائزہ لیا اور چونک اٹھا "جگر! تمہارا اشارہ اس گرے جیپ کی طرف تو نہیں؟"

"تم بالکل نشانے پر پہنچے ہو" میں نے کہا "میں نے پہلے

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات
ضیاء تسنیم بخاری کے قلم سے
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بخاری کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ
وہ فن پارے جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ
جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت -/100 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

-/500 روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف
یہ سہولت پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی حاصل ہوگی

کتاب پبلی کیشنز
فون: 5802561 فیکس: 5802562-5805313
Email: kitabistan@usa.net

بھی ایک دو مرتبہ اسے دیکھا ہے تاہم فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں نے اس کا خاص نوٹس نہیں لیا۔"

"اب تو وہ بتدریج فاصلہ کم کررہی ہے" وہ تشویش ناک لہجے میں بولا پھر اس کی چونکی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "ارے جگر! یہ تو وہی گاڑی ہے؟"

عقبی نشست پر موجود روبی اور ساحل بھی ہماری جانب متوجہ ہوگئیں۔

میں نے امتیاز سے پوچھا "تم کون سی گاڑی کا ذکر کررہے ہو؟"

"وہ... جو ریسٹورنٹ کے سامنے ہماری گاڑی کے پیچھے پارک تھی" امتیاز نے محتاط لہجے میں کہا "اسی گرے جیپ کے باعث تو مجھے گاڑی نکالنے میں خاصی دشواری ہوئی تھی۔"

اب میں نے توجہ سے اس جیپ کو دیکھا تو مجھے یاد آگیا۔ امتیاز واقعی درست کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کی قوتِ مشاہدہ کی داد دینا پڑی۔ میں نے عقبی نشست پر موجود اپنی ساتھیوں کو تنبیہہ کی کہ وہ ہرگز ہرگز پیچھے مڑکر نہ دیکھیں۔ پھر میں امتیاز کی طرف متوجہ ہوگیا۔

وہ کہہ رہا تھا "جگر! میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں، ریسٹورنٹ پہنچنے سے پہلے ہی ہمارا تعاقب کیا جارہا ہے۔ کوئی بہت پہلے ہمارے پیچھے لگ گیا تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

سپرمارکیٹ کے چوراہے سے میں نے، امتیاز کی ہدایت پر گاڑی دائیں جانب موڑلی اور اس کے ساتھ ہی اس کی رفتار بھی بڑھادی۔ امتیاز عقابی نگاہ سے متعاقب گاڑی کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب گرے جیپ بھی ہماری تقلید میں مڑگئی تو امتیاز نے گمبھیر آواز میں کہا "ہمارے پاس اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟"

میربخش نے بتایا "ہمارے پاس جو بھی ہتھیار ہیں، وہ ہمارے بیگ میں بند ہیں اور دونوں بیگز گاڑی کی ڈکی میں ہیں۔"

"پھر تو بے کار ہے" امتیاز نے اضطراری لہجے میں کہا "اتنا وقت نہیں کہ ہم گاڑی روک کر ڈکی سے وہ ہتھیار نکالیں۔ اب تو ہمیں صرف اسی پسٹل سے گزارہ چلانا ہوگا جو میری جیب میں ہے۔"

اس کے ساتھ ہی امتیاز نے اپنی جیب سے اسٹیل باڈی چائنا میڈ پسٹل برآمد کرلیا۔ یہ وہی پسٹل تھا جو گرین بیلٹ والے بنگلے پر کارروائی کے لیے امتیاز نے مجھے دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے یہ پسٹل اسے واپس دے دیا تھا۔

بوٹ بیسن سے گزرتے ہوئے دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ اس حد تک کم ہوچکا تھا کہ تعاقب کے سلسلے میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ وہ گرے جیپ سیاہ شیشوں والی پجارو تھی جس کے اندر موجود افراد کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

امتیاز نے کہا "یہ تھوڑا آگے جاکر ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ بوٹ بیسن کا پُررونق علاقہ گزر گیا تو پھر دور دور تک یہ سڑک تاریک اور ویران ہی ملے گی۔"

"یہ کون ہوسکتے ہیں؟" میربخش نے سوال کیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "یقیناً ہمارے دشمن!"

پھر جیسے ہی ہماری گاڑی بوٹ بیسن سے خرکار چورنگی کی جانب بڑھی، پجارو نے ہماری گاڑی کو اوورٹیک کیا اور بریک کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ جیپ ہم سے کچھ فاصلے پر رک گئی، مجبوراً مجھے بھی گاڑی روکنا پڑی۔ اگر میں بریک لگانے میں ایک لمحے کی غفلت بھی کرتا تو خطرناک قسم کا حادثہ ہوسکتا تھا۔ پھر پجارو اس زاویے سے رکی تھی کہ سڑک تقریباً بلاک ہوکر رہ گئی تھی۔

جیپ رکتے ہی دھڑادھڑ اس کے عقبی دروازے کھلے اور دو افراد لپک کر پجارو سے باہر آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں "کے کے" دبلی ہوئی تھیں جن کی ہلاکت خیز نال کا رخ ہماری جانب تھا۔

ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی خود حفاظتی کارروائی کرسکتے۔ وہ دونوں گن بردار بجلی کی سی سرعت سے ہماری گاڑی کے نزدیک پہنچے پھر اپنے ہاتھوں میں موجود کلاشنکوفز کو بڑے جارحانہ انداز میں ہم پر تان لیا۔ اس کے ساتھ ہی ان میں سے ایک نے غراکر استفسار کیا۔

"تم میں سے وجدان کون ہے؟"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ سوال کرنے والا مجھ سے صرف ایک فٹ کی دوری پر تھا۔ اس کے ہاتھ میں دبی کلاشنکوف کی بیرل کا رخ میرے سینے کی جانب تھا اور گن بردار مارنے مرنے پر پوری طرح آمادہ نظر آتا تھا۔

ان نازک لمحات میں کلاشنکوف کے آہنی بیرل کے اندر میں نے موت کو بڑے تمسخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھا!

گن بردار کے سوال سے عیاں تھا، وہ میرا صورت شناس نہیں ورنہ وہ میرے بارے میں استفسار نہ کرتا۔ ویسے میں نے گزشتہ ایک ماہ میں اپنے حلیے میں اتنی تبدیلی کرلی تھی کہ وہ پہلے والا وجدان نہیں دکھتا تھا۔

میرا پورا بدن تن کر ریڈ الرٹ ہوگیا اور حواس اپنی عمل فعالیت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ گرے پجارو ریسٹورنٹ سے ہمارے تعاقب میں یہاں تک پہنچی تھی۔ اس تاریک مقام پر ہمیں گھیرنے سے یہی ظاہر ہوتا تھا، ان کے ارادے ہرگز نیک نہیں ہوسکتے تھے پھر جیپ سے برآمد ہونے والے دونوں گن بردار خاصے جارحانہ موڈ میں دکھائی دیتے تھے۔ ان نازک لمحات میں بہت سنجیدگی سے قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

پہلا قدم میربخش نے اٹھایا اور اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولنے کے بعد وہ اچھل کر گاڑی سے باہر نکل آیا پھر اس نے گن بردار کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سینے پر زوردار ہاتھ مارا اور بڑے فخریہ لہجے میں بولا۔

"میں ہوں وجدان۔ بولو کیا کام ہے مجھ سے؟"

میربخش کو اس سوال کا بڑا دھماکہ خیز جواب موصول ہوا۔ گن بردار نے بجلی کی سی سرعت سے کلاشنکوف کا بٹ میربخش کے منہ پر رسید کرتے ہوئے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

"لالا! ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو۔ تم کسی بھی طور وجدان نہیں ہوسکتے۔"

یہ بڑی الجھی ہوئی صورت حال تھی۔ وہ لوگ مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے اور میربخش کو وجدان ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پتا نہیں، یہ ہمارے کس قسم کے دشمن تھے۔ میں اور امتیاز گاڑی کے اندر کسی ایکشن کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

میں اس وقت اپنے نزدیکی گن بردار کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میں نے اس مرحلے میں "چی" کی قوت کو آزمانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن میرے اس فیصلے پر عمل سے پہلے ہی وہ واقعہ پیش آگیا جسے میں نے عجیب کہا ہے۔ میرا ارتکاز پلک جھپکنے میں منتشر ہوکر رہ گیا۔

اچانک تاریکی میں سے کوئی سفید شے اڑتی ہوئی آئی اور کلاشنکوف بردار کے ہاتھوں پر کسی دزنی ہتھوڑے کے مانند لگی۔ گن مین بوکھلاہٹ میں کچھ بڑبڑایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کی طرف گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں کسی خونخوار بلی کی غراہٹ ابھری اور وہ سفید شے بھاگتی ہوئی رات کی تاریکی میں غائب ہوگئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کوئی بلی تھی مگر... اس کی جسامت عام بلیوں کے مقابلے میں کافی زیادہ تھی!

یہ بلی کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ان لمحات سے بھرپور استفادہ کیا اور ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آگیا۔ امتیاز نے میری تقلید کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی۔ وہ گاڑی سے نکلتے ہی اس جانب دوڑا جدھر میربخش موجود تھا۔ میں، لڑکھڑاتے ہوئے کلاشن بردار کی سمت بڑھا۔ وہ زمین پر گرتے گرتے بچا تھا۔

بلی کی جست اور جھپٹنے والا واقعہ سیکنڈ کے دسویں حصے میں پیش آیا تھا۔ لہٰذا میربخش کو گن کی ٹھوکر لگانے والا مسلح شخص، اپنے بڑبڑاتے ہوئے ساتھی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ ہم دونوں نے ان دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس دوران میں باریش میربخش بھی سنبھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوچکا تھا۔

میں نے سنبھلنے کی کوشش میں مصروف گن بردار کے جبڑے پر ایک دھواں دھار گھونسا رسید کیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آگے بڑھ کر اس کی کلاشن پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک مروڑا دیتے ہوئے اس کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔

وہ پہلے ہی اچھی خاصی تکلیف میں مبتلا تھا۔ ناف کے مقام پر گھٹنا کھانے کے بعد وہ ذبح ہوتے ہوئے جانور کے مانند ڈکرانے لگا۔ میں نے اس کی دردانگیز غفلت سے فائدہ اٹھاکر ایک جھٹکے سے کلاشنکوف کو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کرالیا۔ گن پوائنٹ پر آتے ہی وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی مجھے عجیب سا محسوس ہوا۔

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے خونخوار لہجے میں دریافت کیا۔

میرے سوال کے جواب میں اس شخص نے ایک ناقابلِ فہم حرکت کی۔ اس نے چونکنے والے انداز میں میرے عقب میں دیکھا اور تیز رفتاری سے ایک جانب دوڑ لگادی۔ ردعمل کے طور پر میں اس کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ میں نے مزید اس کے پیچھے جانا مناسب نہ سمجھا اور امتیاز کی جانب متوجہ ہوگیا۔

میربخش اور امتیاز اپنے مدمقابل کو رگیدتے اور کھدیڑتے ہوئے کافی دور چلے گئے تھے۔ اس طرف اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ وہ مجھے واضح طور پر نظر تو نہیں آرہے تھے

تاہم ان کی حرکات و سکنات سے میں نے بہ آسانی ان کی سمت کا تعین کرلیا۔

دونوں گاڑیوں کے درمیان دس گز سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور حیرت انگیزیات یہ تھی کہ سیاہ شیشوں والی پجارو میں مزید کوئی شخص برآمد ہوا تھا اور نہ گاڑی نے کسی قسم کی کوئی حرکت کی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ گرے پجارو آڑی حالت میں خاموش اور ساکن کھڑی تھی' جیسے وہاں ہونے والے ہنگامے سے وہ قطعی طور پر لاتعلق ہو۔

میں نے براؤن مزدا کے نزدیک آکر کلاشنکوف ساحل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اسے رکھ لو۔ بہ وقتِ ضرورت اس کے استعمال میں جھجکنے کی زحمت نہ کرنا۔"

ساحل نے بڑے ماہرانہ انداز میں کلاشنکوف کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے اسلحے کے ادب و آداب سے خاصی آگاہی حاصل کرچکی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اس نے لب کشائی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

روبی نے پوچھا "وجدان بھائی! یہ کیا چکر چل پڑا ہے؟"

"ابھی آکر بتاتا ہوں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور امتیاز وغیرہ کی طرف بڑھ گیا۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے جب ان کے نزدیک پہنچا تو امتیاز کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں مجھے کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ میں نے ایک لمحے میں پہچان لیا۔ وہ اسٹیل باڈی چائنا میڈ پسٹل تھا۔ وہ گویا کسی پر فائر کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔

پھر اسی لمحے امتیاز نے اندھیرے میں فائر جھونک دیا۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ خاموشی اور سناٹے کے باعث گولی چلنے کی آواز کچھ زیادہ ہی گونج پیدا کرگئی۔ میں نے عقب میں پہنچ کر امتیاز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کیا ہوا یار! تم نے کس پر فائر کیا ہے؟"

"بھاگ گیا سالا۔" وہ اندھیرے میں گھورتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا "بھگوڑا کہیں کا۔"

میں سمجھ گیا' وہ کس کا ذکر کررہا تھا۔ "میر بخش کہاں ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"آں... میر بخش!" وہ چونک کر بولا پھر اندھیرے میں ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا "وہ وہاں گرا تھا۔"

"گرا تھا... کیا مطلب؟" میں نے امتیاز کے اشارے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے تشویش ناک انداز میں استفسار کیا۔ "میر بخش کس طرح گرگیا؟"

وہ میرے قدم سے قدم ملاتے ہوئے بولا "وہ ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔ میں اس کے پاس رکنے یا اسے دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں اس کم بخت' فرار ہونے والے گرے پجارو کا ہوا تھا مگر وہ بھی ہاتھ نہ آیا۔ ایک گولی بھی خواہ مخواہ ضائع کرکر دی میں نے۔"

امتیاز کے لہجے میں ایک افسوس شامل تھا۔ اس دوران میں ہم دونوں میر بخش کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اپنا دایاں بازو تھام کر دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس کی کہنی میں ایک ماہ پہلے فریکچر ہوگیا تھا۔ میں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر میر بخش کو کھڑا کیا اور اسے چلاتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

گرے پجارو پر نگاہ پڑتے ہی امتیاز چونک پڑا "جگر! یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ ابھی تک یہاں "بے حس و حرکت" کیوں کھڑی ہے؟"

"مجھے بھی اس کے قیام پر حیرت ہو رہی ہے یار۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

امتیاز نے پوچھا "وہ تمہارے والا کہاں گیا؟"

میں نے اس کے سوال کو سمجھتے ہوئے جواب دیا "وہ بھی بھاگ گیا... تمہارے والے کی طرح۔"

"عجیب بھگوڑے دشمنوں سے واسطہ پڑا ہے جگر؟"

"گرے جیپ کو بھگوڑا نہ کہنا دوست۔" میں نے کہا۔ "دیکھ لو' یہ ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔"

"اور یہ بہت تشویش کی بات ہے!" امتیاز نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے پوچھا "تمہارے والے بھگوڑے کی کلاشنکوف کہاں ہے؟"

"چھوڑ کر بھاگ گیا۔" وہ حقارت سے بولا "گدھا خالی گن سے ہمیں ڈرانے آیا تھا۔ میں نے اس آہنی اوزار کو جھاڑیوں میں پھینک دیا۔"

ہم دھیمے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے محتاط قدموں کے ساتھ اپنی براؤن مزدا کے قریب پہنچ گئے۔ میر بخش کی کراہوں میں شدت آگئی۔ اس کی کہنی میں شاید دوبارہ تکلیف جاگ اٹھی تھی۔ یہ بہت برا ہوا تھا۔ گزشتہ ایک ماہ کی کوشش سے بہ مشکل اس کا فریکچر ٹھیک ہوپایا تھا۔

امتیاز نے سیاہ شیشوں والی گرے پجارو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کیا معما ہے جگر؟"

"معما حل کرنے سے ہی سمجھ میں آئے گا۔" میں نے کہا "ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ فائر کی آواز

بہت دور تک گئی ہے۔ یہ ایسا بھی ویران علاقہ نہیں کہ کوئی ہماری جانب متوجہ نہ ہو۔ پولیس کی کوئی گشتی گاڑی ادھر کا رخ کرسکتی ہے۔"

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے جگر لیکن کیا ہم اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے کا رسک لے سکتے ہیں۔ وہ جیپ مزدا سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے؟"

"یہ رسک تو ہم کافی دیر پہلے ہی لے چکے ہیں۔" میں نے براؤن مزدا کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کہا "بلکہ روبی اور ساحل مستقل رسک پر ہیں مگر معلوم ہوتا ہے' گرے جیپ نے مکمل چپ سادھ لی ہے۔ اس جانب سے کسی قسم کی پیش رفت سامنے نہیں آئی۔"

"واقعی جگر! یہ تو بڑے انوکھے دشمن ثابت ہو رہے ہیں۔" امتیاز نے گاڑی کے نزدیک پہنچ کر کہا "میں تو سخت حیران ہوں' ان کی دشمنی کے اسٹائل پر!"

میں نے ساحل سے پوچھا "کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

روبی نے کہا "ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"ہم یہی کررہے ہیں۔" میں نے کہا۔

پھر ہم دونوں نے مل کر میر بخش کو سہارا دیا اور بہ آہستگی اسے گاڑی کی پسنجرز سیٹ پر بیٹھا دیا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ امتیاز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آگے بڑھنے کے لیے ہمیں اس گرے جیپ کی پشت پر ایک ٹکر رسید کرنا ہوگی۔ یہ ایسے بے ہودہ انداز میں کھڑی ہے کہ راستہ بلاک ہوکر رہ گیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ گناہِ عظیم ہوگا یار۔ سوئے ہوئے کی نیند میں خلل ڈالنا کہاں کی شرافت ہے۔ تم کسی اور راستے سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

"راستوں کی کمی نہیں ہے۔" وہ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے ریورس کرتے ہوئے بولا "منزل تک پہنچنے کے دس راستے ہیں یہاں سے لیکن وہ منحوس پجارو...؟"

روبی نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا "امتیاز! اب پھر ڈوبھی اس جیپ کے ذکر کو۔ وجدان جو کہہ رہا ہے وہی کرو۔ جب اس بے چاری نے ہمیں کچھ نہیں کہا تو تم بھی اسے معاف ہی کردو تو اچھا ہے۔"

"وہی کر رہا ہوں۔" وہ مزدا کو بائیں سمت ایک اسٹریٹ میں داخل کرتے ہوئے بولا "تم واقعی ٹھیک کہتی ہو۔ اس بے چاری جیپ نے ہمیں کچھ کہا ہے اور نہ ہی اس سے برآمد ہونے والے کھوکھلے گن بردار بھگوڑوں نے۔"

لفظ "کھوکھلے" کے استعمال پر مجھے کچھ یاد آگیا۔ تھوڑی دیر پہلے امتیاز نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے مدِمقابل کی خالی کلاشنکوف جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ میں نے ساحل کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ذرا یہ گن مجھے دکھانا۔"

اس نے کلاشنکوف میری طرف بڑھا دی۔

میں نے گن سے میگزین جدا کردیا اور اسی وقت مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ کلاشنکوف کا میگزین بالکل خالی تھا۔ میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوگئی۔

امتیاز نے کہا "کیا ہوا جگر' کیوں ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہو؟"

"بھئی! یہ تو بڑے ہی شریف النفس دشمن واقع ہوئے ہیں۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "خالی ہتھیاروں سے ہم پر چڑھ دوڑے تھے۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ فضا ایک مخصوص قسم کے سائرن کی آواز سے گونج اٹھی۔ وہ سائرن یقیناً پولیس کی کسی موبائل پر نصب تھا۔ وہ مخصوص آواز... لمحہ بہ لمحہ اس جانب بڑھ رہی تھی جدھر اندھیرے شیشوں والی گونگی بہری گرے پجارو کھڑی تھی۔

ہم بروقت وہاں سے نکل آئے جگر!" امتیاز نے پُرسکون لہجے میں کہا "ورنہ پولیس والے خواہ مخواہ ہمیں پریشان کرتے۔"

میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "اس اسٹریٹ کے راستے ہم کس طرف نکلیں گے؟"

"ہم ایک دو مزید اسٹریٹ گھومنے کے بعد ہیلی پیڈ پر پہنچ جائیں گے۔ یہ مین کلفٹن کا ساحل ہے۔" امتیاز نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا "ہیلی پیڈ سے ایک سڑک خرکار چورنگی کی طرف جاتی ہے۔ ہم وہ راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔"

میں نے بہ دستور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امتیاز سے پوچھا "یہ بورڈز کس چیز کے ہیں۔ کیا اس طرف کوئی آسٹریلین ہوٹل یا ریسٹورنٹ کھلا ہے؟"

اس اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مجھے مخصوص بورڈز دکھائی دیے تھے جس پر "آسٹریلین کانسیپٹ" کے جلی حروف درج تھے۔

امتیاز نے بتایا "جگر! یہ ہوٹل یا ریسٹورنٹ نہیں بلکہ

اسے ایک کلینک یا اسپتال سمجھ لو۔ یہاں بے اولاد جوڑوں کا جدید ترین علاج کیا جاتا ہے۔ جس میں "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" بھی شامل ہے۔"

"اچھا اچھا۔ اب سمجھا۔" میں نے جلدی سے کہا "یہ طریقۂ علاج آج کل پوری دنیا میں بہت تیزی سے رائج ہو رہا ہے۔"

ہماری گاڑی ہیلی پیڈ پر پہنچ کر دائیں جانب مڑ گئی۔ بائیں جانب تاحد نگاہ سمندر پھیلا ہوا تھا جو رات کی تاریکی میں بہت بپھرا ہوا تھا اور وحشت ناک دکھائی دیتا تھا۔ اگلے دس منٹ میں ہم خرکار چورنگی سے گزر کر اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں داخل ہو گئے جہاں وہ فلیٹ واقع تھا جو شعیب غوری کی طرف سے میرے لیے ایک تحفہ تھا۔

✪✲✪

میرا ذہن مختلف سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا!

سوالات لاتعداد تھے اور سب کی نوعیت بھی جدا تھی۔ مثلاً گرے پجارو نے ہماری گاڑی کا تعاقب کیوں کیا؟ انہوں نے ہمیں خرکار چورنگی سے تھوڑا پہلے گھیرا مگر خالی کلاشنکوف سے ہمیں دھمکانے کی کوشش کیوں کی؟ ایک گن بردار نے میرا نام لے کر استفسار کیا لیکن میر بخش کو وجدان ماننے کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ اس کی بڑھی ہوئی سندھی اسٹائل کی داڑھی کے باعث گن مین نے اس کے چہرے پر بٹ رسید کرتے ہوئے اسے ملا کہہ کر ڈانٹا تھا' گویا وہ نہ تو میر بخش کو پہچانتے تھے اور نہ ہی میری شکل سے واقف تھے پھر وہ مجھے کیوں پوچھ رہے تھے؟ یہ بات تو طے ہے' وہ ہمارے دوست ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑے ہونے والا عمل بھی کچھ کم احمقانہ اور حیرت انگیز نہیں تھا اور ــــ گرے جیپ کی مسلسل "خاموشی" بھی کسی معمے کی طرح تھی۔ سڑک پر اس کا "بے حس و حرکت" قیام یہی ظاہر کرتا تھا کہ پجارو میں صرف دو ہی افراد تھے جو کلاشنکوف اٹھائے ہماری جانب بڑھے تھے۔

یہ بات میرا ذہن کسی بھی طور ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا' جب وہ گرے پجارو ٹائروں کی چرچراہٹ کے ساتھ رکی تھی تو اس کے دونوں طرف کے عقبی دروازے کھلے تھے جہاں سے کلاشنکوف بردار برآمد ہوئے تھے۔ اس کا واضح مطلب تو یہی تھا کہ پجارو میں کم از کم ... ایک شخص اور موجود تھا جو اس جیپ کو ڈرائیو کر کے وہاں تک پہنچا تھا۔ عقبی نشست پر بیٹھے ہوئے افراد گاڑی ڈرائیو نہیں کر سکتے تھے۔ اگر پجارو کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی ڈرائیور موجود تھا تو پھر اس مارا ماری اور افراتفری کی کارروائی کے دوران میں اس شخص نے کسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا؟ خاص طور پر اس وقت جب ہر شخص سلامت اور محفوظ انداز میں وہاں سے فرار ہو رہے تھے۔ وہی وقت تھا جب فضا پولیس والوں کے سائرن سے گونج رہی تھی۔ یہ ایسا اطمینان بخش اور سکون آور موقع نہیں تھا کہ چپ چاپ دم سادھے وہ ڈرائیور پجارو میں بیٹھا رہتا۔ اس کا عمل غیر فطری تھا۔ اور میرے ذہن کو الجھا رہا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے پہلو میں کچھ فاصلے پر ساحل گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ اس وقت رات کے گیارہ بھگ تین بجے تھے مگر انہی سوچوں کے باعث مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں کنگ سائز ڈبل بیڈ سے نیچے اتر آیا اور سلائیڈنگ ڈور کے قریب کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔

سمندر اس وقت خاصی موج میں تھا۔ رات کی تاریکی میں' سمندر کی سطح پر دور' بہت دور بحری جہازوں کی بتیاں جھلملاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ جہاز میلوں کے فاصلے پر اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ میں سمندر کی سطح کو کالی دیوار تک موجیں اچھالتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس وقت رات کے سناٹے نے ان موجوں کی آواز میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اگرچہ سلائیڈنگ ڈور بند تھا تاہم پھر بھی پانی کے اچھال کی مہیب آواز ہمارے بیڈ روم میں پہنچ رہی تھی۔ سلائیڈنگ ڈور کھلا ہونے کی صورت میں سونا شاید ممکن نہ رہتا۔ سمندر کی مخصوص آواز اور تیز ہوا کی سرسراہٹ نیند میں خلل کا باعث بن سکتی تھی۔

میں بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں آ گیا۔ یہ فلیٹ بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر واقع تھا اور اس کا نمبر آٹھ سو ایک تھا۔ وہاں ہر فلور پر صرف دو فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ اس فلیٹ کا رقبہ سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔ جس پر دو بیڈ روم' ایک ڈرائنگ روم اور ایک کشادہ لاؤنج بنایا گیا تھا۔ اس لاؤنج میں بیٹھنے کے لیے صوفہ سیٹ اور سینٹر ٹیبل بھی موجود تھی۔ وہ لاؤنج گویا ڈرائنگ روم کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بیڈ رومز میں ایک چھوٹا اور دوسرا قدرے کشادہ تھا جہاں اس وقت ساحل سو رہی تھی۔ کچن' اس بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کے درمیان واقع تھا۔ دونوں بیڈ رومز میں سمندر کے رخ سلائیڈنگ ڈور لگے ہوئے تھے جن سے آگے ایک خوبصورت گیلری بھی بنی ہوئی تھی۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی میری نگاہ ٹیلی فون اسٹینڈ کی جانب اٹھ گئی۔ میں اسٹینڈ کے نزدیک بچھے صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹیلی فون سیٹ کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اچانک میرے ذہن میں امتیاز کو فون کرنے کا خیال آیا تھا۔ اس خیال کی تحریک میری یادداشت میں محفوظ ایک منظر نے دی تھی۔ جب میں نے کلاشنکوف بردار شخص سے گن چھین کر اسے ٹارگٹ بنایا تھا تو اس کے چہرے پر ابھرنے والی وحشت نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ایک ثانیے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ کب؟ کہاں؟ ــــ یہ سب کچھ سوچنے اور جاننے کا وہاں وقت تھا اور نہ ہی موقع لیکن اس وقت وہ چہرہ دوبارہ میری یادداشت سے نکل کر سامنے آ گیا تھا اور مجھے شک ہو رہا تھا' میں نے اس شخص کو "ساؤتھ" میں دیکھا ہے۔ اپنے اسی شک کی تصدیق یا تردید کے لیے میں امتیاز کو فون کرنا چاہتا تھا۔

امتیاز اور روبی ہمیں بہ حفاظت فلیٹ پر پہنچا کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور یہ رات اپنے پاس گزارنے کا مشورہ بھی دیا تھا لیکن امتیاز نہیں مانا۔ اس نے اپنی بعض تنظیمی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جگر! مجھے ہر حال میں اپنے فلیٹ پر پہنچنا ہے۔ رات کے آخری پہر ممکن ہے' باس مجھ سے رابطہ کرے۔ تم تو سمجھتے ہو ــ باس از باس!"

میں اس کی مجبوری سمجھ گیا۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر تم ضرور جاؤ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "اور جاتے جاتے میرا بھی ایک ضروری کام کرتے جاؤ۔"

"حکم کرو جگر! تمہارے لیے دل و جان حاضر ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا تھا۔

میں نے بھی مزاح کے انداز میں کہا "فی الحال تمہارے دل و جان کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں چیزیں کسی جانِ من کی تحویل کے لیے ــــ"

وہ قدرے جھینپ گیا اور کن انکھیوں سے روبی کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے میر بخش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہمارا ساتھی اس وقت سخت تکلیف میں ہے۔ اس کی کہنی والے فریکچر میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ یہاں فوری طور پر اسے طبی امداد بہم نہیں پہنچائی جا سکتی۔ تم ایسا کرو' میر بخش کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ڈاکٹر فیروز کے اسپتال میں جو بیس گھنٹے ایمرجنسی کی سہولت موجود ہے۔ تم اپنے فلیٹ جانے سے پہلے اسے اسپتال دکھا دینا۔ یہ کل آرام سے ہمارے پاس آ جائے گا۔"

"تمہارا مشورہ اور تجویز بالکل درست ہے۔" امتیاز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

پھر وہ تینوں اس فلیٹ سے رخصت ہو گئے تھے۔

میں یہ سب سوچتے ہوئے طارق روڈ والے فلیٹ کے نمبرز ڈائل کرنے لگا۔ امتیاز وغیرہ لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے فلیٹ سے گئے تھے۔ میرے خیال میں انہیں اب تک اسپتال سے ہو کر واپس فلیٹ پہنچ جانا چاہیے تھا۔

ڈائلنگ مکمل ہونے کے بعد گھنٹی بجنے لگی پھر وہ گھنٹی بجتی چلی گئی۔ دوسری جانب سے کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید میں نے نمبرز ڈائل کرنے میں کوئی گڑبڑ کر دی ہو۔ اس فون میں "ری ڈائل" اور "سی ایل آئی" وغیرہ کی سہولیات موجود نہیں تھیں لہٰذا میں نے سنبھل سنبھل کر وہ نمبرز دوبارہ ڈائل کیے مگر نتیجہ پہلے والا برآمد ہوا۔ آخر مایوس ہو کر میں نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

امتیاز وغیرہ کی طرف سے ایک بے نام الجھن نے میرے ذہن کو گھیر لیا جس میں گہری تشویش پائی جاتی تھی۔ اسے اس وقت گھر پر ہونا چاہیے تھا کیوں کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ رات کے آخری پہر اس سے اس کی ضروری بات ہونے والی تھی اور اس وقت رات کا آخری پہر ہی چل رہا تھا۔

میرے دل میں ایک مرتبہ پھر ڈائل کرنے کی خواہش نے سر ابھارا۔ میں نے گود میں رکھے ہوئے فون کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید دوسری جانب امتیاز ہو' ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

ایک مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وجدان! یہ میں ہوں' شعیب غوری۔"

"ہاں' میں نے پہچان لیا۔" میں نے کہا "خیریت' اس وقت فون کی نوبت کیسے آ گئی؟"

"خیریت نہیں ہے وجدان!" شعیب غوری گمبھیر آواز میں بولا "تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔ بہت ہی بری!"

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا "کیسی بری خبر شعیب؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا "امتیاز کو ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔"

"حادثہ ــــ کس قسم کا حادثہ؟" میں بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا "وہ تینوں یہاں سے تو ٹھیک ٹھاک گئے تھے۔"

"مگر اب وہ ٹھیک ٹھاک نہیں رہے۔"

"اس حادثے کی تفصیل کیا ہے شعیب؟"

"ان تینوں کو بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا ہے۔"

"کیا؟" میں سناٹے میں رہ گیا۔

دوسری جانب شعیب غوری اس المناک واقعے کی تفصیل سنا رہا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا ذہن دھواں دھواں ہو رہا ہو۔ شعیب کی آواز دور کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میری طرف سے کامل خاموشی پا کر شعیب نے پوچھا "وجدان! تم میری بات سن رہے ہو نا؟"

"ہاں' میں سن رہا ہوں۔" میں نے اپنی جگہ حاضر ہوتے ہوئے کہا۔

وہ بتانے لگا "آج رات دو بجے میں نے چند ضروری امور پر امتیاز سے تفصیلی بات کرنا تھی۔ اس نے تمہارے فلیٹ سے رخصت ہونے کے بعد مجھے فون پر تمہارے یہاں بہ حفاظت پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی لیکن جب میں نے ٹھیک دو بجے طارق روڈ والے فلیٹ پر فون کیا تو وہاں کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اس کوشش میں جب مجھے مسلسل ناکامیابی ہوئی تو میں نے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے کچھ چھان بین کی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے معلوم ہوا ہے کہ لگ بھگ رات ایک بجے گورا قبرستان کے نزدیک' امتیاز کی براؤن مزدا پر زبردست فائرنگ کی گئی ہے جس کے نتیجے میں وہ تینوں گاڑی کے اندر ہی ہلاک ہوگئے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر وزنی ہتھوڑے سے ایک شدید ضرب لگائی ہو۔ میر بخش نے بڑے کٹھن اور صبر آزما لمحات میں میرے کندھے سے کندھا ملا کر دشمنوں کا پتا پانی کیا تھا۔ امتیاز اور روبی بھی میری زندگی میں بہت اہمیت اختیار کر چکے تھے۔ بہت کم عرصے میں وہ بڑی سرعت سے میرے دل میں اتر گئے تھے۔ میں اس جذباتی نقصان کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ نقصان وجدان اور "سی ایف کے" کو مشترکہ طور پر پہنچایا گیا تھا۔

میں نے غم و غصے کی ملی جلی کیفیت کے درمیان کہا "شعیب! تمہاری تفتیش سے حملہ آوروں کے بارے میں بھی کچھ پتا چلا؟"

"میں اپنے ان دشمنوں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "فی الحال صرف اتنا ہی پتا چلا ہے' ان پر فائرنگ ایک تیز رفتار جیپ سے کی گئی تھی جس کا رنگ گرے بتایا جاتا ہے۔"

میں گرے جیپ کے ذکر پر اچھل کر رہ گیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "کیا وہ گرے جیپ پجارو تھی؟"

"ہاں' بالکل پجارو ہی سے ان پر گولیوں کی برسات کی گئی ہے۔" شعیب نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا "وجدان! تمہیں کیسے پتا چلا' وہ جیپ پجارو ہو سکتی ہے؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا "شعیب! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا ہے کہ امتیاز نے میرے فلیٹ سے رخصت ہونے کے بعد تم سے فون پر بات کی تھی؟"

"ہاں' میں نے یہی بتایا ہے۔" وہ بولا "کیوں' کوئی خاص بات ہے؟"

میں الجھ کر رہ گیا۔ شعیب کے انداز سے یہی ظاہر ہو رہا تھا' امتیاز نے اسے بوٹ بیسن والے واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں نے ماؤتھ پیس میں کہا "ہاں شعیب! بات تو خاص ہی ہے۔"

"کہو۔۔۔ جلدی کہو۔" وہ بے تابی سے بولا "کیا تمہاری بات سے امتیاز' روبی اور میر بخش کے قاتلوں تک پہنچنے میں کوئی راہ نمائی مل سکتی ہے؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے مگر غم زدہ لہجے میں کہا "میرے خیال میں ایسا ہو سکتا ہے۔ دراصل ریسٹورنٹ سے نکل کر اس فلیٹ کی طرف آتے ہوئے راستے میں ہمارے ساتھ ایک سنگین اور ناقابل فہم واقعہ پیش آگیا تھا۔ جس میں ایک گرے کلر پجارو جیپ نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔" بات کے اختتام پر میں نے اس سے سوال کیا "کیا امتیاز نے فون پر تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"بالکل نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے مختصر الفاظ میں شعیب غوری کو اس عجیب و غریب واقعے کے متعلق بتایا۔ میری بات مکمل ہونے پر اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے وجدان! اس قسم کے دشمن میں نے پہلے کبھی دیکھے ہیں اور نہ ان کے بارے میں کہیں سنا ہے جو خالی گنوں کے ساتھ یوں کارروائی کریں اور پھر موقع پا کر فرار بھی ہو جائیں۔ خاص طور پر تم نے جیپ کے حوالے سے جو کچھ بتایا ہے' وہ ناقابل یقین لگتا ہے۔" ایک لمحے کو وہ خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ویسے میرے لیے سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امتیاز نے اتنے بڑے واقعے کا مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ وہ تو معمولی سے معمولی بات بھی مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "ہاں' یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا "وجدان! میں نے کسی طرح فائرنگ کرنے والی گرے پجارو کا نمبر معلوم کر لیا ہے۔ کیا تمہارے ذہن میں تم لوگوں کا تعاقب کرنے والی جیپ کا نمبر موجود ہے؟"

"ہاں' موجود ہے۔" میں نے بے دھڑک کہا "وہ نمبر تو مرے ذہن سے چپک کر رہ گیا ہے۔ تعاقب کے دوران میں متعدد بار پجارو کی نمبر پلیٹ پر میری نگاہ پڑی تھی پھر جائے وقوعہ پر خاموش کھڑی اس جیپ کو بھی میں نے بہت غور سے دیکھا تھا۔"

وہ ہیجان خیز انداز میں بولا "وجدان! پہلی فرصت میں اپنے ذہن سے چپکے ہوئے اس نمبر کو کھرچ کر میری طرف اچھال دو۔"

میں نے نہایت ہی سکون سے پجارو کی نمبر پلیٹ پر درج ہندسے زبان سے ادا کر دیے "تھری' ون' فائیو' ون۔"

"ایگزیکٹلی!" وہ پرجوش لہجے میں تقریباً چیخ کر بولا "یہی نمبر ہے۔ بالکل یہی نمبر ہے اس گرے پجارو کا جس نے ہمارے ساتھیوں پر فائرنگ کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں چھوڑوں گا نہیں۔۔۔ بڑی عبرت ناک سزا دلاؤں گا انہیں۔ تم دیکھ لینا وجدان! میں بہت جلد اس جیپ کے مالک تک پہنچ جاؤں گا۔ اس بدبخت اور اس کے ہم قسمت ساتھیوں کی گردنیں آہنی شکنجوں میں کس کر رکھ دوں گا۔"

وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "شعیب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے' وہ پجارو چوری کی ہو اور اس کے اصل مالک کو اس واردات میں ملوث ہونے کی خبر نہ ہو کہ اس کی جیپ کس نوعیت کی سنگین وارداتوں میں ملوث ہو چکی ہے؟"

"ہاں' ایسا ممکن ہے۔" وہ قدرے سنبھل کر بولا "حقیقت جو بھی ہے' بہت جلد سامنے آجائے گی۔ میں کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اپنے بے گناہ ساتھیوں کے قاتلوں تک پہنچ جاؤں گا وجدان!"

میں نے دکھی لہجے میں اس سے اپنے ساتھیوں کی تدفین اور قبر کی لوکیشن کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ ان تینوں کی لاشوں کو ایک سرکاری اسپتال میں پہنچا دیا ہے۔ ضروری کارروائی کے بعد پولیس وہ لاشیں ورثا کے حوالے کر دے گی۔

"ورثا۔۔۔!"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ شعیب غوری میری بات کی تہ تک پہنچ گیا' میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے تسلی آمیز انداز میں کہا "تم فکر نہ کرو۔ ان تینوں کی تجہیز و تکفین بڑے مناسب طریقے سے ہو گی۔ میں صبح ہی اس بندوبست میں لگ جاؤں گا۔ ہمارے مخلص ساتھی لاوارث افراد کی طرح دفن نہیں کیے جائیں گے۔"

"میں بھی ان کی تدفین میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

شعیب غوری بولا "ضرور۔۔۔ ضرور۔ میں تمہیں بروقت اس کی اطلاع دے دوں گا میں خود تمہارے ساتھ قبرستان چلوں گا وجدان لیکن ہمیں اپنے حلیوں میں مناسب تبدیلی کرنا ہو گی کیوں کہ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں ہمارے دشمنوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہو گا۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو شعیب۔" میں نے اس کی تائید کی "ایسا ہو سکتا ہے۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "تمہیں میں یہی مشورہ دوں گا کہ تم دونوں اپنے فلیٹ سے باہر قدم نہ نکالنا۔ جب تک کہ میرا ڈرائیور تمہیں لینے خود وہاں نہ آجائے۔ میں عین وقت پر ڈرائیور بھیج کر تم دونوں کو منگوالوں گا پھر ہم ایک ساتھ قبرستان جائیں گے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "وجدان! یہ نہ سمجھنا کہ میں خدانخواستہ تم پر کوئی پابندی عائد کر رہا ہوں۔ میں یہ تمام انتظام حفاظت اور احتیاط کے پیش نظر کر رہا ہوں۔ ان تینوں کے بعد دشمن اب تم دونوں کی تاک میں ہوں گے۔"

میں نے اس کی تجویز پر کوئی اعتراض اٹھائے بغیر ایک اہم نکتے کی جانب اس کی توجہ مبذول کرواتے ہوئے کہا۔ "شعیب! جب ہم اپنے ساتھیوں کے ورثا کی حیثیت سے ان کی تدفین میں شریک ہوں گے تو بھی دشمن ہماری جانب متوجہ ہو سکتے ہیں!"

"میں نے کہا نا' میں اس سلسلے میں بہت محفوظ بندوبست کروں گا۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولا "ہم دونوں کی شرکت سے یہ ظاہر نہیں ہو گا کہ ہمارا تعلق براہ راست ان تینوں سے ہے۔ تم اس بارے میں ذہن کو نہ الجھاؤ۔ میں ہوں نا!"

شعیب غوری نے اتنی اپنائیت سے "میں ہوں ناں!" کہا کہ میرا ذہن قدرے مطمئن ہو گیا۔ اسی وقت میرے ذہن میں اس گن بردار کا حلیہ بھی روشن ہو گیا جس کے ہاتھوں سے میں نے کلاشنکوف چھینی تھی۔

میں نے شعیب غوری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دوست! میرے ذہن کے جس حصے پر گرے پچارو کا نمبر چیک کر رہ گیا تھا وہیں ایک چہرہ بھی چسپاں ہے۔ اور وقفے وقفے سے میری سوچ کو منتشر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"کیسا چہرہ وجدان؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے بتایا "بوٹ بیسن والے واقعے میں' میں نے جس کلاشنکوف بردار سے اس کی گن چھینی تھی' اس شخص کا چہرہ۔"

وہ زود فہم انسان فوراً میری بات کی تہ تک پہنچ گیا اور پوچھنے لگا "کیا تم نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟"

"میں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے؟"

"میرا خیال ہے' ساؤتھ میں۔" میں نے بتایا۔

"کیا کہہ رہے ہو وجدان؟" وہ متعجب انداز میں بولا۔

میں نے کہا "مجھے خود حیرت ہے اسی لیے تو سوچ سوچ کر الجھ رہا ہوں۔"

"وجدان! میرے ٹھکانوں کا کوئی آدمی اس قسم کی کارروائی میں شامل نہیں ہو سکتا۔" وہ پروثوق انداز میں بولا "ممکن ہے' تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو!"

میں نے الجھن آمیز تائیدی انداز میں کہا "خدا کرے' یہ میری غلط فہمی ہی ہو۔ بہرحال' میں نے جو کچھ محسوس کیا وہ من و عن تم تک پہنچا رہا ہوں کیوں کہ میں تمہیں اپنا سچا دوست سمجھتا ہوں۔"

"مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے وجدان!" وہ سنجیدگی سے بولا "اور اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے اپنے دلی جذبات اور محسوسات کو مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔" وہ چند لمحات کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری بات کو نظرانداز کر کے خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔ تم مجھے اس گن بردار کا حلیہ بتاؤ۔ صرف "ساؤتھ" ہی نہیں بلکہ میں اپنے تمام ٹھکانوں کے آدمیوں کو خاموشی سے چیک کروں گا۔ اگر تمہارا مطلوبہ بندہ ہاتھ آگیا تو اس سے بھی "ڈائیلاگ" کر لیں گے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

شعیب نے لفظ "ڈائیلاگ" پر اچھا خاصا زور دیا تھا۔ میں نے کہا "اچھی طرح سمجھ رہا ہوں شعیب۔"

وہ بولا "دنیا کا کوئی ایسا ادارہ یا محکمہ نہیں جس میں کالی بھیڑیں موجود نہ ہوں۔ ممکن ہے' میرے کیمپ میں بھی کوئی بچھو پرورش پا رہا ہو۔"

میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "شعیب' ویسے تمہارے خیال میں ہمارے کس دشمن کی کارروائی کی ہو گی؟"

"مجھے نوے فیصد تو یہی امید ہے کہ میاں زاہد حسین نے شیر کے جبڑے میں ہاتھ دینے کی کوشش کی ہے۔" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا "پچھلے دنوں' ہم نے اسے بہت سے نقصانات پہنچائے ہیں۔ وہائٹ شیر ڈوالے تیل اور عبرت ناک موت' ہوٹل میں ہونے والی مار ماری' ہوٹل کے باہر گرے سوزوکی ایف ایکس والے دو نقلی پولیس والوں کا ہولناک انجام' پھر گرین بیلٹ والے بنگلے پر شاہ کے ساتھ جو "شاندار" سلوک کیا گیا ہے۔ اس میں ہم دونوں کا بھرپور ہاتھ رہا ہے۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے' وہ شب خون مارنے کی تاک میں رہا ہو اور آج رات موقع اسے مل گیا۔"

میں نے کہا "میرا ذہن بھی گھوم پھر کر میاں زاہد کی طرف جا رہا ہے۔"

"تم مجھے اس شخص کا تفصیلی حلیہ بتاؤ۔" شعیب نے دوبارہ پوچھا۔

میں نے کہا "قد لگ بھگ پانچ فٹ دس انچ' جسم بہ فربہی' چہرہ کرخت' رنگ سانولا اور ہلکی مونچھیں۔"

"یہ ایک عام سا حلیہ ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا "بہرحال' میں اسے اپنے کیمپ میں تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔" پھر اس نے مجھ سے استفسار کیا "فون کے بارے میں میری تجاویز کو ذہن میں رکھو گے نا!"

"ہاں!" میں نے اثبات میں جواب دیا "جب تک تمہارا ڈرائیور ہمیں لینے نہیں آئے گا' ہم اس فلیٹ سے قدم بھی نہیں نکالیں گے۔"

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "وجدان! یہ زندگی اور خوشی کا مرقع ہے۔ کبھی خوشی' کبھی غم۔ تم تو میری پوزیشن اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ تم نے بھی بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے۔ آگ کے دریا کو پار کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔" وہ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد بولا "اپنے ساتھیوں کی اندوہناک موت کا یقیناً بہت دکھ ہے۔ اس صدمے کو اپنی اپنی برداشت کے مطابق سب نے اس کے ساتھ ہی زندگی کے چکر میں کسی قسم کا فرق نہیں ہونے دیں گے۔ کل جب میرا ڈرائیور آئے تو ڈائری کے وہ اہم ترین صفحات اپنے پاس رکھنا بھولنا!"

شعیب کی باتوں سے سفاکی ٹپکتی تھی لیکن وہ مجھے باتیں غلط بری نہیں لگیں کیوں کہ وہ زندگی کی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ میں بھی اسی سوچ کا حامل تھا کہ سکھ دکھ کے سائے میں زندگی کے پہیے کو مسلسل حرکت میں رہنا چاہیے۔

"تم فکر نہ کرو شعیب۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں نے تم سے یہی کہا تھا نا' کل وہ صفحات میں تمہارے حوالے کر دوں گا تو اس کا ہرگز ہرگز یہی مطلب تھا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔"

آگے پیچھے کے دو صفحات پر مشتمل ڈائری کا وہ نہایت ہی قیمتی ورق ہر وقت میری پینٹ کی ایک خفیہ جیب میں موجود رہتا تھا۔ میں نے دانستہ شعیب سے دوسرے دن کا وعدہ کیا تھا۔ اگر میں چاہتا تو اسی ملاقات کے دوران میں وہ ورق اس کے حوالے کر سکتا تھا۔

"اوکے!" شعیب ٹیلی فونک گفتگو کو ختم کرتے ہوئے بولا "اب تم سو جاؤ۔ کل کا دن بہت مختصر ہے ہمارے لیے۔"

"ٹف بھی۔۔۔ اور رف بھی۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

پھر ہمارے درمیان وہ رابطہ ختم ہو گیا۔

❂❂❂

حالت نیند میں ساحل کی معصومیت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ میں واپس بیڈ روم میں آیا تو وہ بہ دستور سو رہی تھی۔ وہ لگ بھگ ڈیڑھ بجے سو گئی تھی اور اس وقت چار بجنے والے تھے۔ شعیب سے فون پر ہونے والی گفتگو کا وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

میں جن جذباتی اور صدماتی کیفیات سے گزر رہا تھا ان میں کسی قسم کے رومانس کی گنجائش نہیں تھی لیکن ساحل کے نزدیک پہنچتے ہی میرا دل بے طرح مچل اٹھا۔ وہ بڑی بے فکری اور سکون کی نیند سو رہی تھی۔ میرے جی میں آئی کہ نیت بھر کر اسے پیار کروں۔ پتا نہیں' پچھلے کچھ دنوں سے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ساحل کے پاس پہنچتے ہی میں بے اختیار ہو جاتا تھا۔ ساحل کے اندر کوئی ایسی شے ضرور موجود تھی جو مجھے کمزور بنا دیتی تھی یا یوں کہہ لیں' وہ دھیرے دھیرے میری کمزوری بنتی جا رہی تھی۔

میں پیشانی چومنے کے لیے اس کے چہرے پر جھکا ہی تھا کہ یک بارگی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا' وہ پہلے سے جاگ رہی تھی' بس آنکھیں بند کیے سوتی بنی ہوئی تھی یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا' میری گرم سانسوں کے لمس نے اسے گہری نیند سے جگا دیا ہو۔ ان لمحات میں' میرے تنفس میں جنسی حدت سرایت کر گئی تھی۔

ساحل کی آنکھیں کھولنے پر میں گڑبڑا کر پیچھے ہٹا تو وہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "پانی۔۔۔ مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی ہے۔"

میں ایک گہری سانس لے کر بیڈ سے نیچے اتر آیا پھر فریج میں سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا کر ساحل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس دوران میں وہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

اس نے ایک ہی سانس میں ٹھنڈا پانی اپنے حلق میں انڈیلا پھر میرے چہرے کو گھورتے ہوئے بولی "کیا بات ہے وجدان! تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"

وہ گہری لڑکی میری فکرمندی کو بھانپ گئی تھی۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا "کچھ نہیں ساحل! میں اس وقت بہت زیادہ پریشان ہوں۔۔۔ بلکہ غم زدہ اور دکھی ہوں۔"

"کیا ہوا۔۔۔ کیا ہو گیا وجدان؟" وہ بے پناہ اضطرار کے ساتھ بولی۔

"تمہارے لیے ایک بہت ہی بری خبر ہے میرے پاس۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا "تمہارے لیے اس طرح کہہ رہا ہوں کہ میں وہ خبر پہلے ہی سن چکا ہوں۔"

وہ بے چینی سے بولی "کچھ بتاؤ بھی تو سہی۔" پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "لارڈ بدھا خیر کرے۔"

اگلے دس منٹ میں' میں نے ساحل کو اپنے ساتھیوں کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے کے بارے میں بتایا۔ میر بخش اور روبی سے اس کی گہری دوستی ہو چکی تھی۔ امتیاز بھی ہمارا مخلص دوست تھا۔ ہم درد اور جاں نثار دوستوں کی موت پر جتنا دکھی انسان کو ہونا چاہیے' ساحل اس حقیقی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ میں نے اسے شعیب غوری سے ہونے والی گفتگو اور گرے پچارو کے بارے میں بتایا۔ شعیب کی طرح ساحل کا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ حملہ میاں زاہد حسین کی کارستانی ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا "زیادہ امکانات تو اسی بات کے ہیں لیکن میرا ذہن گرے جیپ کے غیر منطقی اور ان نیچرل "رویے" پر اٹکا ہوا ہے۔ بوٹ بیسن کے نزدیک جو کچھ ہوا' وہ میرے حلق سے نہیں اتر رہا۔ اگر گرے پچارو والے میاں زاہد کے بھیجے ہوئے تھے تو ان کا بھگوڑا پن سمجھ سے باہر ہے۔"

"وجدان! بوٹ بیسن والی سڑک پر آج رات جو کچھ پیش آیا اس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی توجیہہ فی الحال نظر نہیں آتی۔" ساحل نے گمبھیر لہجے میں کہا "تم ایک

گرے جیپ پر ہی کیوں الجھ رہے ہو؟"

ساحل نے یہ سوال ایسے انداز میں کیا تھا کہ میں چونک اٹھا پھر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟"

وہ مزید سنجیدہ ہوگئی "کیا تم اس سفید بلی کو بھول گئے؟"

ساحل کے اس سوال نے میرے رگ و پے میں ایک کرنٹ سا دوڑا دیا اور نگاہ کے سامنے اس جھپٹا مار سفید بلی کا سراپا ابھر آیا جس نے کلاشنکوف بردار کے حواس کی ایسی کم تیسی کردی تھی۔ وہ آنِ واحد میں تاریکی سے نمودار ہوئی تھی اور اپنا "کام" کرکے پلک جھپکتے میں تاریکی ہی کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کا یہ کام ہمارے لیے نہایت مفید ثابت ہوا تھا۔

ساحل کے یاد دلانے پر مجھے حیرت ہونے لگی کہ میں اب تک اس غیر معمولی جسامت کی بلی کو کیوں بھولا ہوا تھا۔ ممکن ہے' یہ حالات کا اثر ہو۔ بوٹ بیسن والی اس سڑک پر ہم ہنگامی صورتِ حال سے گزرے تھے اور فلیٹ پر پہنچنے کے بعد بھی میر بخش کی کہنی ہی زیرِ بحث رہی تھی۔۔۔ اور اس کے بعد تو شعیب غوری کی کال نے میرے ذہن کو وہ زیر و زبر کیا تھا کہ میں کسی اور شے کے بارے میں سوچنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اسی ذہنی پراگندگی میں وہ فربہ متعاون بلی میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا "ہاں واقعی' میں تو اس بلی کو بھول ہی گیا تھا۔ پتا نہیں' وہ بلی تھی بھی یا۔۔۔!"

میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اس بلی کے تصور میں کھو گیا۔ وہ مہربان دوست بلی کسی صحت مند کتے کی جسامت رکھتی تھی۔ اس کی جھپٹ میں چیتے کی لپک اور غراہٹ میں شیر کا دبدبہ تھا۔ میں اس عجیب و غریب بلی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ساحل کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بلی کے ذکر کو موقوف کرکے اصل موضوع کی طرف آگئی تھی۔

"وجدان! ہمارے ساتھیوں کی المناک موت کسی جاں گسل صدمے سے کم نہیں۔ آئندہ کے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟"

میں جذباتی ہوگیا "ساحل! میں ان تینوں کے قاتلوں سے بہت بھیانک انتقام لوں گا۔ ایک بار وہ میرے ہتھے چڑھ جائیں پھر تم دیکھنا' میں ان کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

"وہ ہتھے کیسے چڑھیں گے؟"

"شعیب غوری کی مدد سے ان کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔" میں نے کہا "اسے جیپ کا نمبر معلوم ہو چکا ہے۔ بہت جلد وہ اصل مجرموں تک پہنچ جائے گا۔"

ساحل نے پوچھا "وجدان! کیا ہم ان قاتلوں کے سراغ کے لیے شعیب غوری پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا "شعیب ایک مخلص دوست ثابت ہو رہا ہے۔ اس شہر میں اس کا ایک فعال نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ ظاہر ہے' وہ ہماری بہ نسبت زیادہ ذرائع کا مالک اور واقف ہے۔ اس کی مدد لینے میں کوئی حرج نہیں۔" میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا "ویسے میں بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا نہیں رہوں گا۔ اپنے طور پر بھی بھرپور کوشش کروں گا۔"

ساحل چند لمحات تک خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی "شعیب دوبارہ رابطہ کب کرے گا؟"

"میرا خیال ہے' دس بجے کے بعد۔" میں نے کہا "ابھی تو اس نے مجھے سونے کا مشورہ دیا ہے اور یقیناً وہ خود بھی سو گیا ہوگا۔"

"تو پھر تم سونے کی کوشش کرو۔" وہ مشورہ دینے والے انداز میں بولی "تھوڑی نیند لے لو تاکہ فریش ہو جاؤ۔ تم نے کافی نیند لے لی۔"

"کافی۔۔۔!" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "ڈھائی گھنٹے میں تمہاری نیند پوری ہوگئی؟"

"ہاں' ہوگئی۔" وہ سنجیدگی سے بولی "تم تو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوئے ہو؟"

میں نے بوجھل آواز میں کہا "مجھے نیند نہیں آرہی۔"

"تم بہت ذہنی دباؤ میں ہو۔" وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔

"یہ موقع ہی ایسا ہے ساحل۔" میں نے طول لہجے میں کہا "میں کوشش کے باوجود بھی سو نہیں پاؤں گا۔" "ایک کو رک کریں نے اضافہ کیا "اگر تمہیں اب مزید نیند نہیں آرہی فوراً تیار ہو جاؤ' ہم باہر جا رہے ہیں۔"

"باہر۔۔۔!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا "کیا کرنے کا ارادہ ہے وجدان۔ کہیں کوئی الٹا سیدھا قدم اٹھانے کا فیصلہ تو نہیں کرلیا؟"

میں نے گہری نظر سے ساحل کو دیکھا۔ کچھ عرصے سے اس کے مزاج اور رویے میں جو تبدیلی آئی تھی اس میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس کا انداز استانیوں والا ہو گیا تھا۔ اس کی ایسی ادائیں میرے دل کو بھاتی تھیں۔

اس لیے بھی کہ پچھلے چند ماہ سے کوئی مجھے روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا تھا۔ بہرحال' اس کی روک ٹوک سے مجھے خاصی تقویت ملتی تھی۔

میں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "یہ تو قدم اٹھانے کے بعد پتا چلے گا' وہ الٹا پڑا یا سیدھا۔ فی الحال' میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل نہیں۔ جو بھی سوچنا ہے' باہر جا کر ہی سوچوں گا۔ فلیٹ کے اندر مجھے بہت گھٹن کا احساس ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے' ہم تھوڑی دیر باہر ٹہل آتے ہیں۔" وہ نیم رضامند ہوتے ہوئے بولی "ساحل کی ٹھنڈی ریت پر چہل قدمی ہمارے ذہنوں کو سکون دے گی۔"

"ساحل کی ٹھنڈی ریت!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ذو معنی انداز میں کہا "ٹھیک کہہ رہی ہو' ساحل کی ٹھنڈک ذہنی سکون کے لیے بہترین شے ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے' دلی سکون کے لیے یہ اس سے بھی زیادہ مفید ہوتی ہے۔"

اس نے ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا جیسے بیان کرنے کے لیے دفتر درکار ہیں پھر وہ خاموشی سے اٹھی اور واش روم میں گھس گئی۔

میں ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بیڈ روم میں آگیا۔ یہ کمرا نسبتاً چھوٹا تھا اور اس میں بھی اٹیچ باتھ کی سہولت موجود تھی۔ اس بیڈ روم میں سنگل بیڈ بچھا تھا۔ میر بخش نے اپنے لیے اس کمرے کا انتخاب کیا تھا مگر اسے ایک رات بھی یہاں گزارنا نصیب نہیں ہوئی تھی اور وہ دو ہاکنوں کے بیچ میں مارا گیا تھا۔ میر بخش کی یاد سے میرا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ غم میر بخش کے لیے تھا اور غصہ اس کے قاتلوں پر۔

میں نے ایک جھٹکے سے واش روم کا دروازہ کھولا اور آنکھوں کو نیند سے بچانے کے لیے واش بیسن پر جا کھڑا ہوا۔

جب میں واپس اپنے کمرے میں آیا تو ساحل کارپٹ پر گاؤ تکیہ (پوم آسن) جمائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اپنی بالشت کو اس نے ناک اور پیشانی پر اس انداز سے ٹکا رکھا تھا کہ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی' وہ سانس کی مشق میں مصروف تھی جس میں باری باری دونوں نتھنوں کا استعمال کرتے ہوئے "اِن ہیل" اور "اگزہیل" کیا جاتا تھا۔ دماغ و جسم اور جاں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

اکثر لوگ یوگا کو باڈی بلڈنگ ویٹ لفٹنگ اور مارشل آرٹس کی طرح ورزشوں اور ریاضتوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ اس سوچ کے حامل افراد غلطی پر ہیں۔ اول تو یوگا کوئی کھیل نہیں ہے۔ درحقیقت' یہ ایک آرٹ ہے۔ "آرٹ آف لائف"۔ زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کا فن ہے۔ ہم سب لوگ زندہ ہیں اور کسی نہ کسی طور زندگی گزارتے بھی ہیں لیکن یوگا بہتر انداز میں زندگی گزارنا سکھاتا ہے۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں مگر جو بھی کام بہتر انداز میں کیا جائے اس کی افادیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ یوگا میں کسی قسم کا جبر' سختی اور زبردستی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں آسانیاں اور فراوانیاں پیدا کرتا ہے۔

ساحل جس لگن اور ثابت قدمی سے یوگا' مارشل آرٹس اور "چی" وغیرہ کو سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اس سے لگتا تھا' وہ بہت جلد' بہت اوپر تک پہنچ جائے گی۔ "ہتھ یوگ" کے کم و بیش تمام آسن (POSTURES) وہ بڑی سہولت سے لگانے لگی تھی۔ اسی طرح مارشل آرٹس میں وہ ہلکی پھلکی فائٹ تک پہنچ گئی تھی اور "چی" کی مخصوص مشق نے اسے اس قابل کردیا تھا کہ وہ بہ آسانی پچاس گرام تک کی اشیا کو متحرک کرلیتی تھی۔

ہم فلیٹ سے نکلنے لگے تو میں نے فلیٹ کی چابیوں کے ساتھ ہی گاڑی کی چابیاں بھی اٹھالیں۔ ساحل نے میرے اس عمل پر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا "میں تو سمجھ رہی تھی' ہم صرف ٹہلنے جا رہے ہیں۔"

"ہم ٹہلیں گے بھی۔" میں نے فلیٹ کو لاک کرتے ہوئے کہا "لیکن مناسب اور موزوں جگہ دیکھ کر ورنہ رات کے اس پہر ہماری چہل قدمی پولیس والوں کو سخت "ناگوار" گزرے گی اور خواہ مخواہ ہمیں ان کے ناقابلِ جواب سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "گاڑی پاس ہوگی تو ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں۔"

ساحل نے مزید نہیں پوچھا "کہیں" سے میری کیا مراد ہے اور ہم لفٹ کے ذریعے نیچے آگئے۔ رات کو اوپر جاتے وقت میں نے اس نئی نویلی شیر ڈ کا دیدار کرلیا تھا جو شعیب نے مجھے تحفے میں دی تھی۔ امتیاز نے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے چوکیدار سے بھی میری تعارفی ملاقات کروادی تھی اور ہمیں شعیب غوری کا مہمان بتایا تھا۔ شعیب کے لیے چوکیدار کے سامنے امتیاز نے صرف "صاحب" کا لفظ ادا کیا تھا۔ چوکیدار کی کھلتی ہوئی باچھوں اور پھیلتی ہوئی آنکھوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ "صاحب" کا بہت احترام کرتا تھا۔

جب ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر بلڈنگ سے نکلے تو

چوکیدار نے ہمیں ایک بھرپور سلام کیا۔ ساحل نے کہا "وجدان! اگر اس دوران میں شعیب غوری کا فون آگیا تو؟"

"میرا خیال ہے' وہ نو بجے سے پہلے فون نہیں کرے گا۔" میں نے گاڑی کو چائنا ٹاؤن کی طرف موڑتے ہوئے کہا "اس وقت تک ہم واپس آجائیں گے۔"

ساحل پر پہنچ کر ہم تقریباً آدھا گھنٹا ننگے پاؤں ریت پر ٹہلتے رہے۔ ذہن تھوڑا پُرسکون تو ہوا لیکن اپنے تین ساتھیوں کی اموات کا صدمہ اتنا بھاری تھا کہ بے کلی میں خاطر خواہ کمی نہ آسکی۔ انتقام ایک لاوے کی صورت میرے رگ و پے کو جلا رہا تھا۔

میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا "ساحل! چلتے ہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے واپس گاڑی میں آگئے۔ جب میں نے نیلی شیرڈ کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا تو ساحل نے پوچھا "وجدان! میرا ذہن ایک مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔ کیا اس سلسلے میں تم میری کچھ مدد کرسکتے ہو؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے دھیمے انداز میں استفسار کیا۔

وہ جواب دینے کے بجائے ہنگامی لہجے میں بولی "اوررے رے! یہ تم کہاں جا رہے ہو۔ ہماری بلڈنگ کی جانب جانے والا راستہ تو پیچھے رہ گیا۔"

"جانتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا "میں ایک بہت خاص جگہ جا رہا ہوں۔ تم اپنا مسئلہ بتاؤ جو تمہارے ذہن کو الجھا رہا ہے۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "وجدان! بوٹ بیسن والی سڑک پر جب پجارو والوں نے ہمیں گھیرا تھا تو گن بردار نے تمہارا مطالبہ کیا تھا جس سے ان کے عزائم کا پتا چلتا تھا۔ انہیں صرف وجدان سے غرض تھی۔ یا تو وہ تمہیں موقع پر ہی شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا پھر اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی "لیکن گورا قبرستان کے نزدیک پیش آنے والا واقعہ اس کی نفی کرتا ہے۔ تم نے بتایا ہے کہ اس گورے کلر پجارو سے امتیاز وغیرہ پر فائرنگ کی گئی۔"

"میں نے نہیں' یہ بات شعیب غوری نے بتائی ہے۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "جو بھی ہو' براؤن مزدا پر فائرنگ کر کے ہمارے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سیدھا سیدھا مطلب ہے' وہ انہیں قتل کرنا چاہتے تھے جب کہ وہ لوگ تمہارے طلب گار تھے؟"

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "ہاں' یہ معاملہ مجھے بھی الجھا رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آج رات کی بعض سی باتیں ناقابل یقین اور الجھاؤ کا باعث ہیں۔ مثلاً ہمیں گھیرنے والوں کی خالی گنیں' کنگ سائز سفید بلی کا اچانک حملہ اور روپوشی اور یہی الجھن تو تم نے ابھی بیان کی ہے۔ خیر' کل شام تک سب کچھ کھل کر سامنے آ ہی جائے گا۔ فی الحال اس سلسلے میں' میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔"

"کیا اس سوال کا جواب بھی کہ اس وقت تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس نے تیکھی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس وقت میر بخش وغیرہ کی طرف جا رہا ہوں۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو وجدان؟" وہ تڑپ کر بولی۔

میں نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے وضاحت کر دی "میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں' ہم اس وقت اس اسپتال کی طرف جا رہے ہیں جہاں ہمارے ساتھیوں کی لاشیں رکھی ہیں۔"

"اوہ!" وہ قدرے مطمئن ہو گئی پھر پوچھا "کیا تمہیں معلوم ہے' وہ کس اسپتال میں پہنچائے گئے ہیں؟"

"شعیب نے بتایا تھا' انہیں سرکاری اسپتال لے جایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوں۔" وہ گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولی "میں تو اس شہر کے دو تین سرکاری اسپتالوں سے ہی واقف ہوں۔ پتا نہیں' وہ کہاں ملیں گے۔ ہمیں اچھی خاصی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔"

میں نے قطعیت سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم سب سے پہلے جائے وقوعہ کے سب سے نزدیک پائے جانے والے اسپتال میں جائیں گے۔ مجھے امید ہے' وہ وہیں ملیں گے۔"

اس دوران میں ساحل گاڑی کے ڈیش بورڈ سے ملکی پھلکی چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھی۔ شیرڈ چونکہ بالکل نئی گاڑی تھی اس لیے اسے چھونے اور "چیک" کرنے کو خواہ مخواہ دل چاہتا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے وقت صرف "فیول انڈی کیٹر ڈائل" پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور

یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ ڈائل کا کانٹا ٹینکی فل ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

ساحل کی چھیڑ چھاڑ نے رنگ دکھایا۔ اس نے جیسے ہی ایک خانے کو کھولا' ایک بڑے سائز کا لفافہ اچھل کر باہر آگیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "یہ کیا ہے؟"

وہ لفافہ ساحل کی گود میں گرا تھا۔ میں نے کہا "کھول کر دیکھو۔ پتا چل جائے گا۔ تمہاری طرح میں بھی اس گاڑی میں پہلی بار بیٹھا ہوں۔ جتنی اجنبی تم ہو' میں بھی اتنا ہی ہوں۔"

وہ تولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے مبہم سے لہجے میں بولی "کیا ہم واقعی اجنبی ہیں؟"

یہ ایک عام سا سوال تھا اور موقع محل کی مناسبت سے بھی تھا لیکن ساحل کے استفسار کا انداز خاص تھا اس لیے مجھے چونکنا پڑا۔ میں کوئی جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بڑبڑاتے ہوئے لفافہ کھولنے میں مصروف ہو گئی۔ "پتا نہیں' ہم کب تک اجنبی رہیں گے!"

میں اس کے اس بے ظاہر نہ پوچھے گئے سوال کا کیا جواب دیتا!

لفافے کے اندر سے ہمارے لیے حیرت کا سامان برآمد ہوا۔ وہ ہمارے ضروری ڈاکومنٹس تھے جن میں شناختی کارڈز' پاسپورٹس اور ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ دس ہزار روپے کے استعمال شدہ نوٹ بھی تھے۔ پچھلے دنوں امتیاز نے ہمارے کاغذات کی تیاری کے لیے ہماری تصاویر بنوائی تھیں جو ان دستاویزات پر نظر آرہی تھیں۔ شعیب غوری بڑا سرپرائزنگ فرینڈ ثابت ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے' یہ سب کچھ اسی کے اشارے پر کیا گیا ہوگا۔ ان کاغذات کے مطابق میں وجیہ اور ساحل الماس تھی۔ ہم دونوں کا تعلق کراچی سے تھا۔ گویا ہم قانونی طور پر کراچوی ہو گئے تھے۔

امتیاز اور روبی ہمارے ان فرضی ناموں سے کتنے خوش ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ہم یہ نام استعمال کرتے' وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے تھے۔ میرے رگ و پے میں ایک آگ سی بھر گئی اور اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ میرے تین ساتھیوں کے چہرے میرے تصور کو تہ و بالا کرنے لگے اور ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ہوتی محسوس ہونے لگی۔

"انتقام۔ انتقام۔ بھیانک انتقام!"

ساحل نے فوراً میری کیفیت کو بھانپ لیا۔ اس نے جلدی سے تمام کاغذات لفافے میں ڈال کر اسے ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھا اور میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

"وجدان! تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نظر نہیں آرہی۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

اپنے لیے اس کی تشویش نے مجھے ناقابل بیان سکون سے گزارا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ساحل! تم بالکل درست کہہ رہی ہو۔ میں اس وقت شدت غم کی کیفیت سے گزر رہا ہوں مگر اس کا علاج واپسی میں نہیں بلکہ پیش قدمی میں ہے۔ میں فلیٹ کی طرف نہیں بلکہ اسپتال کی جانب جاؤں گا۔"

اس کی تشویش اور گہری ہو گئی' ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی "وجدان! تم اس وقت ہوش و حواس میں نہیں ہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ہاں' میرے ہوش و حواس واقعی گم ہو چکے ہیں۔" میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا "ان تینوں کی موت کو میں کس طرح بھول سکتا ہوں۔ وہ میری وجہ سے مارے گئے۔ میری بھینٹ چڑھ گئے وہ تینوں۔ گرے پجارو والے میرے طلب گار تھے۔ مجھے مارنے آئے تھے۔ اپنی ناکامیابی کو مٹانے کے لیے وہ ان تینوں کے خون سے ہولی کھیل کر چلے گئے۔"

"تم جذبات میں غلط سوچ رہے ہو۔" وہ میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے داغ دل پر ٹھنڈا مرہم رکھا ہو۔ اس نے کہا "ان کی موت میں تمہارا کوئی ہاتھ ہے اور نہ ہی کوئی 'دش'۔ تم خود کو مورد الزام نہ ٹھہراؤ۔ ابھی تک تو یہ بھی تصدیق نہیں ہوئی کہ مزدا پر فائرنگ کرنے والی گرے پجارو وہی تھی جس نے ہمیں بوٹ بیسن کے علاقے میں گھیرا تھا!"

"تصدیق ہو چکی ہے ساحل۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ قدرے چڑ کر بولی "تصدیق کرنے والا شعیب غوری ہے اور یہ ضروری نہیں' اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ حقیقت کا درجہ رکھتا ہو۔ وہ بھی ہماری طرح انسان ہے' اسے اندازہ لگانے یا نتیجہ اخذ کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔"

"اس بات میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے ساحل!" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا پھر اسے گرے پجارو کی نمبر پلیٹ کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد کہا "ہمیں گھیرنے والی اور مزدا پر فائرنگ کرنے والی پجارو کا نمبر ایک ہے۔ تھری' ون' فائیو' ون۔ اس کا مطلب یہی ہوا نا' کسی

غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔ کیا کہتی ہو تم؟"

وہ شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی "کچھ بھی ہو۔ میں تمہیں اسپتال کی طرف نہیں جانے دوں گی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ کا دباؤ میرے بازو پر بڑھا دیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ میں ڈرائیونگ کی وجہ سے اس کی طرف مسلسل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاہم میں نے چند لمحات میں' اس کی آنکھوں میں اپنے لیے جس "خیال" کی تصویر دیکھی وہ میری زندگی میں اب ناپید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت میرے تخیل میں اپنی ماں شگفتہ کا چہرہ چمک اٹھا۔ ماں سے زیادہ خیال رکھنے والی کوئی اور ہستی اس دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ پتا نہیں کیوں' ساحل کی اس تیزی سے بڑھتی ہوئی وابستگی سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔

میں نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں کہا "ساحل! میں جاؤں گا' ضرور جاؤں گا اسپتال۔"

"کیوں۔۔۔ تم اسپتال کیوں جانا چاہتے ہو؟" وہ بھی ضد پر اتر آئی۔

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ان تینوں کو دیکھنے۔۔۔ ان کے چھلنی بدن اور لہولہو تن دیکھنے کے لیے میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے تحریک ملے گی۔" میں اس وقت اچھا خاصا جنونی ہو رہا تھا "بے بسی' بے کسی اور بے رسی کی تصویر وہ تین لاشیں میرے انتقام کو مہمیز کریں گی۔"

وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولی "ان تینوں کی ناگہانی موت نے تمہیں خاصا متاثر کیا ہے ورنہ تم ایسے تو نہ تھے وجدان۔"

میں نے پلٹ کر پوچھا "کیا تم متاثر نہیں ہوئی ہو؟"

"ہوئی ہوں۔۔۔ بہت زیادہ ہوئی ہوں۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی "لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اپنی اس شکست و ریخت کا تماشا بنایا جائے۔ ہمیں ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ تمہاری ان جذباتی حرکتوں سے دشمن کوئی مزید نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔"

میں حیرت سے اس چھوئی موئی لڑکی کو سنتا رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا' معصوم اور سادہ سی دھنو اس وجود کے اندر سے غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ ایک سمجھ دار اور بردبار ساحل نے لے لی تھی۔ نام کی تبدیلی انسان پر اس قدر اثر انداز ہو سکتی ہے' یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس وقت میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی ساحل کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں ایک سادہ' دیہاتی زندگی گزار رہی تھی۔

اپنی اس مختصر سی ناصحانہ تقریر کے اختتام پر اس نے کہا "گاڑی موڑ لو وجدان! میں تمہیں ہرگز اسپتال کی طرف نہیں جانے دوں گی!"

ساحل کا لہجہ اتنا دوٹوک اور مستحکم تھا مجھے اس میں تحکم کا احساس ہوا۔ اس تحکم میں اپنائیت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ میری وحشت اور سرکشی پر جیسے کسی نے منوں یخ بستہ پانی ڈال دیا تھا۔ اپنے اندر دور۔۔۔ کہیں بہت دور مجھے بے بسی کا شدید احساس ہوا۔

میں نے سرایت کرتی ہوئی ایک نگاہ اس پر ڈالی اور کسی الوہی جذبے کے تحت اس کی بات مان لی۔

✪✪✪

میں نے اپنے انگوٹھے کے ہلکے دباؤ کی مدد سے خنجر کی دھار کو چیک کیا اور تسلی بخش انداز میں گردن ہلا دی۔ یہ وہی ظالم خنجر تھا جس کے لحاتی کرشمے نے میاں زاہد حسین کے ایک خاص آدمی شاکر علی کی رگِ پا کا "مزاج" پوچھا تھا۔ میں نے خنجر کی کارکردگی کی تعریف کی تو امتیاز نے یہ خنجر مجھے بطور تحفہ دے دیا۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا' ایک روز یہی خنجر امتیاز کے قاتلوں پر آسمانی بجلی بن کر گرے گا اور انہیں اتنے ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گا کہ دنیا کا کوئی کمپیوٹر اس تعداد کو شمار نہیں کر سکے گا۔

امتیاز اور میر بخش کا تصور میرا سینہ سلگا دیتا تھا اور نہ بولی بہن روبی کی یاد مجھے ملول و غم زدہ کر دیتی۔ یہ میری برداشت تھی کہ میں اپنے پیاروں کے صدمات میں اپنے آنسو روکے بیٹھا تھا ورنہ میری جگہ اور کوئی ہوتا تو شاید دھاڑیں مار مار کر رو دیتا۔ دراصل' میں نے بچپن ہی سے رونگٹے کھڑے کر دینے والی زندگی گزاری تھی جس میں قدم قدم پر مجھے جذباتی دکھ سہنے پڑے تھے۔ اس وجہ سے بھی میں خاصا حوصلہ مند ہو گیا تھا۔

ساحل اس وقت کچن میں ناشتا بنا رہی تھی۔ میں اس کی محبت بھری ضد سے مجبور ہو کر واپس آ گیا تھا اور اسی کی فرمائش پر میں نے دو تین گھنٹے کی نیند بھی لے لی تھی۔ ان صدماتی لمحات میں وہ کسی شفیق اور مہربان نرس کا رول ادا کر رہی تھی۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وال کلاک دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے رعبیلے لہجے میں کہا "ہیلو۔"

"وجدان مبارک ہو۔" ایرپیس میں شعیب غوری کی آواز ابھری۔

میں سمجھ نہیں سکا' وہ کس سلسلے میں مجھے مبارک باد پیش کر رہا تھا۔ میں نے کہا "اس مبارک باد کی کچھ وضاحت کریں گے؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میں نے ایک خاص معاملے میں تلافی کے لیے فون کیا ہے۔"

"کون سا خاص معاملہ؟"

وہ بولا "میں نے لگ بھگ سات گھنٹے پہلے تمہیں ایک بری خبر سنائی تھی۔۔۔ اپنے تین ساتھیوں کی ہلاکت کی خبر" اس کی آواز میں گہری سنجیدگی پائی جاتی تھی "اسی سلسلے میں ایک اچھی خبر بھی اس وقت میرے پاس ہے۔"

"تم نے ان تینوں کے قاتلوں کا سراغ لگا لیا ہے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا "ہے نا' یہی بات؟"

"ویری گڈ!" شعیب نے سراہنے والے انداز میں کہا "تمہاری سوچ بالکل نشانے پر پہنچی ہے۔"

میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا "ہمارے ساتھیوں کا قاتل کون ہے؟"

"میاں زاہد حسین!" شعیب غوری نے سرسراتی آواز میں بتایا۔

"میاں زاہد حسین۔" میں نے ایک ایک لفظ کو چبا کر ادا کیا "میں تمہاری شہ رگ کاٹ کر تمہارے وجود میں پایا جانے والا سارا غلیظ خون بہا دوں گا۔" میں تصور میں میاں زاہد سے مخاطب تھا تاہم واقعتاً یہ گفتگو شعیب غوری سے ہو رہی تھی۔ میں نے شعیب سے پوچھا "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھیوں کے قتل میں میاں زاہد ملوث ہے۔"

"میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ظاہر ہے' فائرنگ اس نے نہیں کی ہو گی بلکہ یہ آپریشن اس کے ایما پر کیا گیا ہو گا۔"

"میری بات پوری ہونے پر شعیب غوری نے بتایا "تم سے بچا کر لو' "تھری' ون' فائیو' ون" کا معاملہ تو صاف ہو گیا تھا۔ تینوں نے اپنی کوشش سے اس کے مالک کا پتا چلا لیا۔ وہ شخص عرف قوبا نامی ایک شخص کی ملکیت ہے اور قوبا زاہد حسین کا خاص آدمی ہے۔ اب تم میری بات کو سمجھ گئے ہو گے؟" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا "یہ قوبا تمہارے لیے اجنبی تو نہیں!"

"بالکل نہیں۔" میں نے قطعیت سے کہا "ایک ڈیڑھ ماہ پہلے میں نے گرین بیلٹ والے بنگلے پر اس شخص کی اچھی طرح درگت بنائی تھی۔"

شعیب نے کہا "میرا خیال ہے' قوبا کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ مجھے پتا چلا ہے' قوبا تمہیں اپنے بھائی اسحاق کا قاتل سمجھتا ہے۔"

"حالانکہ۔۔۔" میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولا "جانتا ہوں' سب جانتا ہوں۔ اسحاق اور اس کے دو شیرڈ نشین ساتھیوں کی موت "سی ایف کے" کے کھاتے پر درج ہے۔ وہ کھاتا۔۔۔ جو میرے پاس ہے ورنہ اس شہر کی عوام کو تو یہی باور کرایا گیا تھا کہ اس خوں ریز واقعے میں "را" کے دو خطرناک ایجنٹوں (وجدان + دھنو) کا ہاتھ ہے۔"

"موجودہ واقعے سے تو یہی لگتا ہے' میاں زاہد اور قوبا بھی یہی سمجھتے ہیں۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "گرین بیلٹ والے بنگلے پر شاکر علی نے قوبا سے میرا "تعارف" اسی حوالے سے کرایا تھا جب کہ تم اچھی طرح جانتے ہو' ہمیں اس واردات میں ملوث کرنے والا میاں زاہد ہی ہے۔"

"میاں زاہد بہت ہی کائیاں اور چال باز شخص ہے۔" شعیب نے کہا "کیا حقیقت ہے اور کیا فسانہ یہ بات وہ بہ خوبی جانتا ہے۔ وہ قوبا پر جذباتی دباؤ ڈال کر اسے تمہارے سامنے لے آیا ہے۔ قوبا کو اس نے باور کرا دیا ہو گا کہ تم ہی اس کے بھائی کے قاتل ہو۔ یہ کام میاں زاہد کے لیے چنداں مشکل نہیں۔ آخر کو وہ ان سب کا باس ہے۔"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ گرین بیلٹ والے بنگلے پر میں اور امتیاز میر بخش کو رہا کروانے گئے تھے۔ یہ دو کردار اب اس دنیا میں نہیں تھے یعنی امتیاز اور میر بخش مگر وہ دو کردار ابھی زندہ تھے یعنی شاکر علی اور قوبا۔ وہ نہ صرف زندہ تھے بلکہ اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے پوری طرح سرگرم عمل بھی تھے۔ میں ان ناسوروں کو کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتا تھا۔

"تم خاموش کیوں ہو وجدان۔" شعیب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "کیا کوئی پرابلم ہے؟"

"پرابلم یہ ہے کہ میں جلد از جلد قوبا اور میاں زاہد حسین تک پہنچنا چاہتا ہوں۔" میں نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا "مجھے اپنی پیاس بجھانے کے لیے ان کے خون کی

ضرورت ہے۔"

شعیب نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں تمہیں ان کے نرخروں تک پہنچا دوں گا۔ بس ایک دن اور صبر کر لو وجدان!"

"ایک دن بعد کیوں۔" میرے لہجے میں احتجاج شامل ہو گیا "ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں؟"

وہ دوستانہ لہجے میں بولا "میں تمہاری جذباتی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ تم یہ مت سمجھو کہ مجھے امتیاز' روبی اور میر بخش کی موت سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ میں ان کے غم میں دکھی ہوں اور بہت سوچ سمجھ کر شائی انتقام لینا چاہتا ہوں۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے' یہ انتقامی کارروائی تمہارے ہاتھوں انجام کو پہنچے گی۔"

"تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "آج کا دن ہم اپنے ساتھیوں کے سوگ میں گزاریں گے۔ میں نے ان کی لاشیں وصول کرنے اور تجہیز و تکفین کا مکمل بندوبست کر دیا ہے۔ امتیاز علی کا "چھوٹا بھائی" اشتیاق احمد ایک آدھ گھنٹے میں "دبئی" سے آنے والا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

"چھوٹا بھائی" اور "دبئی" کے الفاظ پر اس نے قدرے زور ڈالا تھا کہ میں یہ خوبی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"شام کو پانچ اور چھ بجے کے درمیان تدفین کا پروگرام ہے۔ تم چار بجے تک "ساؤتھ" آجاؤ۔ ہم ایک ساتھ قبرستان چلیں گے۔ اوہ "ساؤتھ" کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ میں نے تمہارے شک کی تصدیق یا تردید کے لیے اپنے تمام اسٹاف کو چیک کر لیا ہے۔ تمہارے بتائے ہوئے حلیے کا کوئی شخص ان میں شامل نہیں۔ اب میں یہی کہوں گا' تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ویسے اگر تم کہو گے تو میں اپنے پورے اسٹاف کی شناخت پریڈ کرا دوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مجھے تمہاری زبان پر اعتبار ہے۔" پھر پوچھا "کیا تم نے صرف "ساؤتھ" کو چیک کیا ہے؟"

"میں کوئی بھی کام کچا نہیں کرتا وجدان!" وہ ٹھوس انداز میں بولا "میں نے پانچوں مقامات کی چھان بین کی ہے۔"

میں مطمئن ہو گیا۔

شعیب نے کہا "تم تو ابھی تک فلیٹ سے باہر نہیں نکلے ہو گے اور ظاہر ہے' کوئی اخبار بھی تمہاری نظر سے نہیں گزرا ہو گا!"

"کیوں' کوئی خاص خبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "گورا قبرستان والے اس اندوہ ناک واقعے پولیس والوں نے بڑی آسانی سے جان چھڑالی ہے۔ تقریباً سبھی اخبارات میں اس قاتلانہ کارروائی کی چھپی ہیں جسے دہشت گردوں کی معمول کی سرگرمی بتایا ہے۔"

"گویا جو معاملہ سمجھ میں نہ آئے یا جس کو چھپانا ہو اسے نامعلوم دہشت گردوں کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے میرے دوست۔" وہ خیال آرائی آواز میں بولا۔

میں نے پوچھا "اپنے ساتھیوں کے خون کا حساب چکانے کے سلسلے میں ہم ایک دن مزید کیوں انتظار کریں۔ تدفین کا کام تو مغرب سے پہلے ہو جائے گا۔ اس کے بعد پوری رات پڑی ہے' ہمیں اپنے ہاتھ پاؤں کھولنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔"

"کل رات کا انتظار ایک مصلحت کی بنا پر ہے۔" اس نے کہا۔

میں نے استفسار کیا "کیسی مصلحت؟"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا "کل رات میاں زاہد حسین اپنے بنگلے پر ایک شاندار جشن منا رہا ہے۔ میں بہت خاص الخاص لوگ شرکت کریں گے۔ مجھے ہے' اس شراب و شباب کی تقریب میں کچھ غیر ملکی مہمان موجود ہیں جن میں دو افراد سنگاپور سے آرہے ہیں۔ وہ اپنی کامیابی کی خوشی میں منا رہا ہے۔"

میں نے اس کی فراہم کردہ معلومات پر چونکتے سوال کیا "تمہیں یہ تفصیل کیوں کر معلوم ہوئی شعیب؟"

"ویری گڈ تو سپچن!" وہ سراہنے والے انداز میں بتانے لگا "وجدان! کسی بھی تنظیم کو کامیابی سے چلانے ضروری ہے کہ اپنے تمام مخالفین کی خبر رکھی میری تنظیم "سی ایف کے" اصلاحی اور تعمیری مقاصد حامل ہے چنانچہ تمام منفی افکار کی حامل تنظیموں میں مجھے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ مخالف کیمپوں میں میرے بندے گاہے بہ گاہے مجھے خاص خاص باتوں سے رہتے ہیں۔ یہ تمام معلومات مجھے اس شخص نے ہیں جو میاں زاہد حسین کے نیٹ ورک میں اس وفادار کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' سی ایف کے میں بھی دوسری تنظیموں کے جاسوس خفیہ طور پر کام کر رہے ہوں گے؟" میں نے ایک خدشے کا اظہار کیا "یہ تو ایک منطقی سی بات ہے!"

"ہاں' یہ ممکن ہے۔" اس نے کہا "میں اس سلسلے میں کوتاہی نہیں کرتا اور اپنے بندوں پر گہری نظر رکھتا ہوں۔ میرے اسٹاف کے ہر ممبر پر کوئی دوسرا ممبر نگراں مقرر ہے۔ اس طرح مجھے نیچے سے اوپر تک ہر سطح پر ایک ایک بات کی خبر ملتی رہتی ہے اور جیسے ہی کوئی شخص میری نظر میں مشکوک ہو جاتا ہے۔ میں اس کے کچے چٹھے کے ساتھ اسے بہت ہی پُرسکون مقام پر منتقل کر دیتا ہوں۔"

"گویا اس کا انتقال ہو جاتا ہے!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم کافی سمجھ دار ہو' میں کیا سمجھاؤں!"

میں نے پوچھا "شعیب! میں چوہدری نوازش علی اور اس کے بدطینت باپ چوہدری رمضان کے کرتوتوں سے تو بڑی حد تک واقف ہوں۔ دیگر جرائم کے ساتھ ساتھ وہ اسمگلنگ کے دھندے میں بھی ملوث تھے۔ ملک رمضان تو فنا ہو گیا۔ چوہدری نوازش کا خاص بندہ میاں زاہد حسین یہاں کراچی میں سرگرم عمل ہے۔ وہ ایک فعال نیٹ ورک کو آپریٹ کر رہا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں' ان کی مصروفیات کی نوعیت کیا ہیں؟"

"میں تمہارا سوال بڑی وضاحت سے سمجھ گیا ہوں۔" شعیب نے میری بات پوری ہونے پر کہا "میاں زاہد درحقیقت منشیات خصوصاً ہیروئن کی اسمگلنگ کا دھندا کرتا ہے۔ اس کا بگ باس موضع "رکھاں والی" میں بیٹھ کر صرف ڈوریاں ہلاتا ہے۔ ملک نوازش کے اشاروں پر یہ منشیات امریکا' یورپ اور جنوبی ایشیا کے ممالک کو بھیج دی جاتی ہے۔ میں اپنی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملک نوازش علی کوئی عام روایتی سازمیندار یا چوہدری نہیں بلکہ جرائم کی دنیا کا ایک بہت بڑا برج ہے۔"

"یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہو گا۔" میں نے سلگتے ہوئے انداز میں کہا "میں نے اس کے بچھائے ہوئے انگاروں کی ایک دہکتی راہ گزر پر بہت طویل سفر کیا ہے۔ بلکہ اب تک کر رہا ہوں۔"

شعیب نے تو صیفی انداز میں کہا "ملک نوازش اور اس کی طاقت کو جان لینے کے بعد میں یہی کہوں گا کہ تم اور تمہارا عزم ماؤنٹ ایورسٹ سے ایک سوت بھی نیچے نہیں۔"

"اس تعریف کا شکریہ دوست۔" میں نے کہا "اب تو مجھے تم جیسے مخلص دوست کا تعاون بھی حاصل ہو گیا ہے۔ چوہدری نوازش کے دانت کھٹے کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔"

"میرا تعاون تو زندگی بھر تمہیں حاصل رہے گا۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

میں نے ڈاکومنٹس کے سلسلے میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "گاڑی کے ڈیش بورڈ سے برآمد ہونے والا تعاون بھی مجھے پسند آیا۔"

وہ مذاق کے رنگ میں بولا "لیکن یار! وہ دس ہزار روپے کی رقم قرضہ ہے۔ جب سنگاپور سے تمہاری رقم آئے تو لوٹانا نہ بھولنا!"

"میں دوستوں اور دشمنوں کا قرض یکساں طور پر یاد رکھتا ہوں۔" میں نے بھی اسی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ دشمنوں کا حساب سود در سود ہوتا ہے اور حساب دوستاں در دل۔"

"شکر ہے' تمہارے لہجے میں کچھ شگفتگی تو آئی۔" وہ چہک کر بولا "میں نے تمہاری رنجیدگی کو کم کرنے کے لیے قرضے والی بات کی تھی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "ویسے اگر تمہیں مزید رقم کی ضرورت ہو تو بلاتکلف یہ بات میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"

"بتا دوں گا۔" میں نے بھی سنجیدگی سے کہا "فی الحال ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' پھر چار بجے ساؤتھ میں ملاقات ہو گی۔" گفتگو کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا "مجھے خود آنا ہو گا یا تمہاری طرف سے کوئی لینے آئے گا؟"

"کیا تم از خود ساؤتھ پہنچ سکتے ہو؟"

"ڈیفینیٹلی۔" میں نے پروثوق لہجے میں کہا "میں کراچی کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں۔"

وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولا "پھر ٹھیک ہے' تم ٹھیک چار بجے ساؤتھ پہنچ جانا۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔ دراصل دوپہر دو بجے دوپہر ٹیلی فون پر نیل آرمر سے میری چند ضروری پر تفصیلی بات ہو گی۔ مدفون سونا بھی زیر بحث آئے گا۔"

"تو کیا تم نیل آرمر کو بھی سونے کی بازیابی میں شریک کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔" وہ محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے بولا "اس وقت میرے پاس دو

راستے ایسے ہیں جن کے ذریعے بڑی صفائی سے ہم اس تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان دونوں راستوں میں دو آدمیوں سے واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ ایک نیشنل ہے اور دوسرا انٹرنیشنل۔ انٹرنیشنل راہ اختیار کرتے ہوئے مجھے نیل آرمر کی مدد لینا ہو گی۔"

میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "تمہاری ایک بھی بات میرے پلے نہیں پڑی۔"

"میں سمجھا دوں گا' سب سمجھا دوں گا۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا "تم چار بجے ڈائری کے وہ صفحات لے کر ساؤتھ آؤ۔ میں مدفون سونے کی لوکیشن دیکھنے کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچوں گا۔ ویسے تم نے متروک کنویں اور سرحدی زمین کی جو تفصیل مجھے بتائی ہے وہ میرے ذہن میں نقش ہے۔ مجھے امید ہے' ڈائری کے صفحات میں بنے ہوئے نقشے میں وہ متروک کنواں سرحد سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہو گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

"اوکے۔" وہ گفتگو ختم کرتے ہوئے بولا "چار بجے ملاقات ہو گی۔ تم ایک بات کا خیال رکھنا۔ زیادہ سے زیادہ وقت فلیٹ کے اندر ہی گزارنا۔ باہر حالات سازگار نہیں ہیں۔"

"ہاں' تمہارا مشورہ میرے ذہن میں ہے۔" میں نے کہا پھر پوچھا "ذرا یہ بھی بتا دو ساؤتھ میں میرے تنہا آنے کی تو کوئی پابندی نہیں ہے نا؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار!" وہ قدرے خفگی سے بولا "تم میرے دوست ہو تو تمہارا ہر دوست میرا دوست ہے۔ ویسے بھی اکیلی ساحل کو تم وہاں کہاں چھوڑ کر آؤ گے۔"

"میں نے بھی اسی خیال سے پوچھا تھا۔" میں نے کہا۔

"سو سٹ ویلکم!" وہ خوش دلی سے بولا۔

پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔ میں نے ریسیور کریڈل کیا ہی تھا کہ ساحل کے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ وہ یک طرفہ گفتگو تو سن ہی رہی تھی تاہم جو باتیں ادھوری تھیں' ان کے بارے میں وہ جاننا چاہتی تھی۔ میں نے آئندہ پندرہ بیس منٹ میں اسے تفصیل سنا دی۔ وہ نہایت ہی اطمینان اور سنجیدگی سے میری بات سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وجدان! کیا تم اکیلے ساؤتھ نہیں جا سکتے؟"

"جا سکتا ہوں۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا "لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

وہ بولی "میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو کیا فلیٹ پر تنہا رہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا اس میں کوئی پریشانی ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

میں نے کہا "مجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن تمہیں ہو سکتی ہے۔ کیا تمہیں اکیلے فلیٹ پر رہتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا۔"

"ڈر کیسا وجدان!" وہ مستحکم لہجے میں بولی "ڈر تو انسان کے اندر ہوتا ہے اور میں نے وہ ڈر نکال دیا ہے۔ ویسے بھی تین چار گھنٹے کی تو بات ہے۔ تم چار بجے جاؤ گے اور سات آٹھ بجے تک لوٹ ہی آؤ گے۔ میں تھوڑا آرام کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے ساتھیوں کی المناک موت نے مجھے نڈھال کر دیا ہے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ میں ان تین چار گھنٹوں کے دوران میں تمہیں گاہے بہ گاہے فون کرتا رہوں گا۔"

پھر ہمارے درمیان تازہ ترین حالات پر گفتگو ہونے لگی۔ اچانک مجھے انسپکٹر چیانگ شو کا خیال آگیا۔ پچھلے کئی دنوں سے اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے اس نے بتایا تھا کہ مکان اور اسٹور کے لیے اس نے الگ الگ دو پارٹیاں تیار کر لیں ہیں اور بہت جلد یہ سودا فائنل ہو جائے گا۔

میں نے ساحل سے کہا "سنگاپور میں انسپکٹر چیانگ شو سے بات کرتے ہیں۔"

وہ میری سنگاپور والی پراپرٹی کی فروخت کے معاملات سے آگاہ تھی۔ اس نے کہا "ہاں وجدان' تمہارے انسپکٹر دوست نے اب تک وہ کام کر ہی دیا ہو گا۔ اس کے پاس یہاں کا فون نمبر نہیں ہے۔ تم ہی اسے فون کرو تو اچھا ہے۔"

میں نے ٹیلی فون ایکسچینج کی خدمات حاصل کرتے ہوئے سنگاپور پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر لے لیا۔ اتفاق سے چیانگ شو اس وقت ہیڈ کوارٹر ہی میں موجود تھا۔ مجھے ایریا پیس میں اس کی مخصوص آواز سنائی دی تو میں نے کہا۔

"انکل! یہ میں ہوں' وجدان۔"

"پہچان لیا مائی سن۔" وہ خوش دلی سے بولا "تم ہو کہاں۔ میں نے کل رات تمہیں فون کیا تھا لیکن کسی نے اٹینڈ نہیں کیا۔"

میں نے اسے بتایا "ہاں انکل! بس کل کی رات خاصی افراتفری میں گزری ہے۔ میں گھر پر نہیں تھا اور آپ میرا نیا فون نمبر نوٹ کر لیں۔ میں نے اپنی رہائش تبدیل کر لی ہے۔"

وہ تشویش ناک لہجے میں بولا "افراتفری زیادہ خطرناک تو نہیں تھی۔ کیا تم خیریت سے ہو؟"

"ہاں' سب ٹھیک ہے انکل۔" میں نے گول مول جواب دیا "آپ کوئی فکر نہ کریں۔"

وہ فوراً اصل موضوع کی طرف آگیا "وجدان! میں نے تمہاری دکان اور مکان کی فروخت کا معاملہ نمٹا دیا ہے۔ کل دونوں پارٹیاں پے منٹ کر رہی ہیں۔ تین دکانوں پر مشتمل شعبہ جاتی اسٹور اپنے تمام سامان کے ساتھ اٹھارہ لاکھ ڈالر میں گیا ہے۔ میرے خیال میں "عابد علی اینڈ سن" کی بہت اچھی قیمت مل گئی ہے۔ دراصل جانا ٹاؤن اور خصوصاً ساگو اسٹریٹ پر پراپرٹی کی بہت ویلیو ہے اور تمہارا شعبہ جاتی اسٹور تو بہت چلتا تھا۔ اس کی ساکھ بہت مشہور ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ اٹھارہ لاکھ کا ریٹ امریکی ڈالر میں ہے یا سنگاپورین؟"

"مائی سن!" چیانگ شو نے بڑی محبت سے کہا "میں یہ ڈیل امریکی ڈالر میں کر رہا ہوں۔ میں نے "عابد علی اینڈ سن" کو اٹھارہ لاکھ یو۔ ایس میں فروخت کیا ہے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی پھر پوچھا "میرا مکان کتنے میں فروخت ہوا؟"

"وجدان! تم خوش قسمت ہو۔" انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تمہارا مکان بھی ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں پراپرٹی کی قیمت پچھلے کچھ عرصے سے بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ فورٹ کیننگ روڈ (FORT KENNING ROAD) والا وہ مکان زیادہ بڑا نہیں لیکن بہ آسانی سات لاکھ یو۔ ایس میں بک گیا۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بولا "اس طرح تمہاری پراپرٹی پچیس لاکھ امریکی ڈالر میں' میں نے فروخت کردی ہے جو کہ بہت بڑی رقم ہے۔"

"ہاں انکل' رقم تو واقعی بہت بڑی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا "آپ یہ رقم کب تک مجھے بھیج دیں گے؟ ویسٹرن یونین بینک والے تو آپ کے پولیس ہیڈ کوارٹر سے زیادہ دور نہیں ہیں۔"

"ہاں انکل' وہ تو ہمارے نزدیک ہیں۔" چیانگ شو بولا "لیکن میں تمہیں یہ رقم بینک کے ذریعے نہیں بھیجوں گا۔"

میں نے حیرت سے کہا "کیوں انکل! میں نے تو سنا ہے' ویسٹرن یونین بینک والوں کی سروس اور ریپوٹیشن بہت اچھی ہے۔"

"تم نے بالکل درست سنا ہے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "میں دو اہم وجوہات کی بنا پر منی ٹرانسفر کے لیے بینک کی خدمات سے بچنا چاہتا ہوں۔"

"وہ دو وجوہات کون سی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

انسپکٹر چیانگ شو نے بتایا "نمبر ایک۔۔۔ اس طریقے میں اچھی خاصی رقم بینک کمیشن کے طور پر ہمیں ویسٹرن یونین والوں کو ادا کرنا ہوگی۔ نمبر دو۔۔۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چند لمحے خاموش رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "وجدان! تم میری اولاد کی طرح ہو اس لیے مجھے امید ہے تم میری بات کا برا نہیں مناؤ گے۔ دراصل پاکستان کے حالات کے بارے میں' میں نے جو کچھ سن رکھا ہے وہ انتہائی غیر اطمینان بخش ہے۔ مجھے امید ہے' وہاں یہ خبر چھپی نہیں رہ سکے گی کہ تمہارے پاس ایک بہت بڑی رقم آئی ہے۔ چوری' ڈکیتی یا اس قسم کی کسی سنگین واردات کے امکانات خاصے قوی ہیں لہٰذا میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔"

میں نے کشادہ دلی سے کہا "انکل! میں نے آپ کی بات کا ہرگز برا نہیں مانا کیوں کہ آپ میرے ملک کو نہیں بلکہ یہاں پائے جانے والے بُرے لوگوں کو برا کہہ رہے ہیں۔ اچھے بُرے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کو بدنامی یا نیک نامی ملتی ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے استفسار کیا "منی ٹرانسفر کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے۔"

"میں ہنڈی کے ذریعے یہ رقم تمہیں بھیج دوں گا۔" اس نے بتایا۔

"یہ ہنڈی کیا چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"منی ٹرانسفر کا بین الاقوامی' غیر قانونی اور محفوظ ترین طریقہ۔" چیانگ شو نے بڑے پُراعتماد انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے انکل! میں نے یہ سارے معاملات آپ پر چھوڑ دیے ہیں۔" میں نے کہا "آپ جو مناسب اور موزوں سمجھتے ہیں وہ کریں لیکن۔۔۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے پوچھا۔

"لیکن کیا وجدان؟"

میں نے کہا "میں نے ایک ماہ پہلے جب اس فروخت کے بارے میں آپ سے بات کی تھی تو کہا تھا' مجھے رقم امریکی ڈالرز میں چاہیے لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ یہاں نقلی ڈالر بھی گردش میں ہیں اس لیے آپ کچھ ایسا بندوبست کردیں کہ مجھے وہ رقم پاکستانی کرنسی میں مل جائے۔"

"ہو جائے گا مائی سن!" وہ بڑی شفقت سے بولا "میں

ہنڈی کا کاروبار کرنے والوں سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہیں پاکستانی کرنسی میں ادائیگی کریں۔ ان کے لیے یہ عام سی بات ہے۔ میں تمہارا فون نمبر اور ایڈریس انہیں بتا دوں گا۔ وہ خود تم سے رابطہ کرلیں گے۔ رقم جیسے ہی تمہارے ہاتھ آئے تم ایک فون مجھے کھڑکا دینا۔ بس معاملہ کلیئر۔"

میں نے اپنے ذہن میں پچیس کو پینسٹھ سے ضرب دی اور پانچ زیرو کو بدستور ساتھ رکھتے ہوئے حساب جوڑ لیا۔ یہ تقریباً ساڑھے سولہ کروڑ پچیس لاکھ روپے بنتی تھی۔ ان دنوں اوپن کرنسی مارکیٹ میں ڈالر پینسٹھ روپے کا چل رہا تھا۔ پاکستانی کرنسی میں یہ واقعی بہت بڑی رقم تھی۔

میں نے انسپکٹر چیانگ شو سے کہا "انکل! آپ میرے مرحوم والد عابد علی کے چند اچھے دوستوں میں سے ایک ہیں۔ جب تک والد صاحب زندہ رہے' آپ نے ہر ہر قدم پر اپنی دوستی کو نبھایا ہے۔ بعد میں میرے ساتھ بھی آپ کا رویہ بہت شفقانہ اور تعاون دوستانہ رہا۔ آج میں آپ سے ایک فرمائش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے' آپ یہ فرمائش ضرور پوری کریں گے!"

"بولو مائی سن!" چیانگ شو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "تمہاری کیا فرمائش ہے؟"

"آپ کو ہر صورت میں میری ایک بات ماننا ہوگی۔" میں نے اصراری لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا' بولو۔ میں تمہاری فرمائش پوری کردوں گا۔"

میں نے کہا "آپ اس رقم میں سے ایک لاکھ یو۔ ایس میری طرف سے یہ طور تحفہ قبول کریں گے۔ تمام اخراجات نکال کر باقی جو رقم بچے وہ مجھے ارسال کریں گے۔ دیٹس فائنل!"

"اوہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو مائی سن؟" انسپکٹر کی آواز میں لرزش اتر آئی۔

مجھ پر اور میری فیملی پر چیانگ شو کے ان گنت احسانات تھے۔ وہ ایک فرض شناس اور محنتی پولیس آفیسر تھا۔ یہ ایک لاکھ امریکی ڈالر اس کے بہت سے خوابوں کو تعبیر دے سکتے تھے بلاشبہ وہ اس کا حق بھی رکھتا تھا۔

ایک لاکھ امریکی ڈالر کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ میں نے چیانگ شو کی حیرت نما ہچکچاہٹ کے پیش نظر کہا "انکل! آپ نے میری یہ فرمائش پوری نہ کی تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔"

وہ اضطراری لہجے میں جلدی سے بولا "اوکے۔۔۔ اوکے مائی لونگ سن!"

چند معاملاتی باتوں کے بعد ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔

❂✕❂

ساؤتھ میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

شعیب غوری کے کمرے میں جب میں پہنچا تو وہ نیل آرمسٹرانگ سے فون پر اپنی گفتگو سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے پرجوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا "وجدان! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا "میں تو ٹھیک وقت پر پہنچا ہوں!"

"تم لیٹ نہیں ہو۔" اس نے کہا "لیکن میں ہی کچھ جلدی میں ہوں۔ آج کی ہنگامہ خیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"اب کون سی نئی بات ہو گئی شعیب؟"

وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملتے ہوئے بولا "مجھے ایک ایمرجنسی میں فوری طور پر ملک سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ ٹھیک پانچ بجے مجھے ائرپورٹ پہنچنا ہوگا۔ ہمارے پاس باہمی گفتگو کے لیے بس یہی گھنٹا' آدھا گھنٹا ہے۔"

میں نے کہا "شعیب! میں تمہاری ایمرجنسی کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا بتا دو' تم کس ملک کی طرف جا رہے ہو؟"

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا "ماریشس!"

"اوہ!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "اپنے ساتھیوں کی تدفین میں تو تم کسی طور بھی شرکت نہیں کر سکو گے مجھے تو لگ رہا ہے کہ کل رات والے مشن میں بھی تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گے۔"

"میں پوری کوشش کروں گا' کل رات کسی بھی وقت واپس آنے کی۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا "مجھے بس جانا' آنا ہی کرنا ہے۔ ماریشس (MAURITIUS) میں بہ مشکل ایک گھنٹے کا کام ہے۔ جو بھی فرسٹ یا سیبل فلائٹ دستیاب ہوئی' میں واپس آجاؤں گا۔ ویسے بھی کل رات والا ہمارا مشن' رات کے آخری حصے میں ہی آغاز ہو گا۔"

تھوڑے توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا "ویسے میں نے احتیاطاً کبیر شاہ کو خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ وہ میرا خاص آدمی ہے اور میری غیر موجودگی میں ساؤتھ کے سارے معاملات کو وہی آپریٹ کرتا ہے۔ خدانخواستہ میں نہ پہنچ سکا تو کبیر شاہ تمہیں میری کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ میں

یہاں سے روانہ ہونے سے قبل اس سے تمہاری ملاقات بھی کرادوں گا۔"

میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے شعیب' تمہاری مجبوری کو میں محسوس کرتا ہوں۔"

"مجھے خود سخت افسوس ہے کہ اپنے ساتھیوں کی تدفین میں شرکت نہیں کرسکوں گا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولا "کراچی سے ماریشس ہفتے میں چار فلیٹس ہیں۔ اگر میں نے اس فلائٹ کو مس کردیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ تم سمجھ دار ہو۔ میری تنظیمی پیچیدگیوں کو محسوس کرسکتے ہو۔" میں نے اثبات میں سرہلایا تو اس نے کہا "یہ لگ بھگ آٹھ گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ میں کوشش کروں گا' ادھر سے بھی دوپہر تک مجھے کسی فلائٹ میں سیٹ مل جائے۔"

میں نے شعیب سے پوچھا "مسٹر نیل آرمر سے تفصیلی بات ہوگئی؟"

"ہاں' ہوگئی۔" وہ بولا "مسٹر نیل آرمر نے سونے کی بازیافت میں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا ہے۔ ویسے تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔ نیل آرمر اگلے ہفتے کراچی آرہا ہے۔ وہ تم سے بھی چند امور پر بات چیت کرنا چاہتا ہے۔"

"ضرور۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

شعیب نے اپنی میز کی دراز سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور بڑی احتیاط سے اس کی تہیں کھولنے کے بعد میز پر پھیلا دیا۔ میں نے اس بڑے سائز کے کاغذ کو بہ غور دیکھا تو پتا چلا' وہ ایک نقشہ تھا۔ انڈوپاک کا تفصیلی سرحدی نقشہ۔ ایک مقام پر سیاہ مارکر سے بڑا سا دائرہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اس دائرے کے اندر نگاہ ڈالی تو مجھے بارڈر کے ادھر اور ادھر لاہور اور امرتسر نظر آیا۔ شعیب نے پاکستانی حدود میں' سرحدی مقام کے قریب انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"وجدان! یہ تمہارا آبائی گاؤں موضع "رکھاں والی ہے۔"

میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس جگہ کو دیکھا جہاں میرا گاؤں آباد تھا۔ اسی گاؤں کے ایک متروک کنویں میں چوتھائی ارب کی مالیت کا سونا دفن تھا۔

شعیب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ سرحد کے اس پار ایک جگہ پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے بتا رہا تھا "اور یہ ہے ضلع امرتسر کا چھوٹا سا گاؤں' رام پور۔"

اپنے باپ کی ڈائری میں لکھی ہوئی تفصیل میرے ذہن میں روشن ہوگئی۔ رام پور کا چوہدری کرم داس' چوہدری محمد رمضان کا گہرا دوست تھا کیوں کہ وہ ایک [illegible] کے چٹے بٹے تھے۔ دونوں کا خفیہ پیشہ ایک تھا یعنی وہ اسمگلنگ کے دھندے میں گردن گردن تک دھنسے ہوئے تھے۔"

میں نے پرخیال انداز میں کہا "چوہدری نوازش علی' باپ ملک رمضان تو گھوڑی سے گر کر مرگیا۔ پتا نہیں رام پور کا چوہدری کرم داس بھی زندہ ہے یا ختم ہوگیا!"

"پتا ہے۔ کیوں کہ میں نے پتا چلا لیا ہے۔" شعیب گمبھیر لہجے میں کہا "کرم داس اب اس دنیا میں نہیں۔ اس کا بیٹا رام داس! آج کل "رام پور" کا چوہدری ہے۔"

"تمہارا کام کرنے کا انداز بہت تیز رفتار ہے شعیب!" میں نے متعجب نظر سے اسے دیکھا۔

"مجبوری ہے۔" وہ خفیف انداز میں مسکرایا "یہ زمانہ ہی تیزی کا ہے۔ جو لوگ زمانے یا وقت کا ساتھ نہیں دیتے' بری طرح روند دیے جاتے ہیں۔ وقت اور زمانہ انہیں کچلتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔"

"میں تمہارے خیالات سے صد فیصد متفق ہوں۔" میں نے کہا "میرے تجربے نے بھی مجھے یہی بتایا ہے۔"

وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا "وجدان! ڈائری کے وہ صفحات کہاں ہیں؟"

میں نے اپنی پینٹ کی خفیہ جیب سے دو صفحات پر مشتمل وہ ورق نکال کر شعیب کی طرف بڑھا دیا۔ ڈائری کے صفحات میں مختلف لکیروں کی مدد سے متروک کنویں کی' بڑے واضح انداز میں نقشہ بنا کر نشان دہی کی گئی تھی اور دائرے کی شکل میں کنویں کے مقام کو سرحد کے قریب دکھایا گیا تھا۔

شعیب غوری ڈائری کے صفحات کو' اپنی میز پر پھیلے ہوئے نقشے سے ملا کر غور و فکر کرتا رہا پھر چٹکی بجاتے ہوئے بولا "بن گئی بات!"

"کون سی بات بن گئی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "دیکھو وجدان!" اس مرتبہ اس نے اپنے نقشے کے ایک مقام پر انگلی رکھی ہوئی تھی "یہ رکھاں والی کی زمین ہے جہاں وہ متروک کنواں واقع تھا۔ تھا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پتا نہیں' اب بھی ہوگا یا نہیں! خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا!" وہ کندھے اچکاتے ہوئے دوبارہ اپنے نقشے کی جانب متوجہ ہوگیا اور اِدھر اُدھر انگلی کو حرکت دیتے ہوئے بولا "ہمارا مطلوبہ متروک کنواں سرحد کے بہت قریب واقع ہے اور سرحد کی دوسری جانب چوہدری رام داس کی زمینیں شروع ہو جاتی ہیں۔" ایک لمحے کو رک کر اس

رضاجتی انداز میں کہا "تم یہ نہ سمجھنا کہ دونوں ملکوں کے درمیان یہاں باقاعدہ کوئی بارڈر موجود ہے۔ ہرگز نہیں! صرف نگرانی پر مامور افراد ہی جانتے ہیں کہ کہاں پاکستان کی حد ختم ہوئی اور کہاں سے بھارت کی زمین شروع ہوگئی۔ ورنہ یہ ساری اراضی آپس میں ملی ہوئی ہے اور تاحدِ نگاہ لہلہاتے ہوئے کھیت دکھائی دیتے ہیں۔"

میں کوئی سوال کیے بغیر خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ ایک اور مقام پر انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہ چوہدری نظام دین کی زمینیں ہیں جو پاکستانی حدود میں ملک نوازش علی کی زمینوں سے ملی ہوئی ہیں لیکن متروک کنویں سے ان کا فاصلہ بہت زیادہ ہے۔"

بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا "میں اس ساری تفصیل کا مقصد نہیں سمجھ سکا!"

"مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم کھلم کھلا اور علی الاعلان اس متروک کنویں کی کھدائی نہیں کرسکتے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "اس کام کے لیے ہمیں آس پاس کی کوئی زمین استعمال کرنا ہوگی۔ ظاہر ہے' وہ زمین ملک نوازش کی تو نہیں ہوسکتی!"

میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھا اور کہا "کسی سرنگ وغیرہ کا ارادہ ہے؟"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" وہ تصدیقی لہجے میں بولا "اور یہ آئیڈیا بھی مسٹر نیل آرمر ہی کا ہے۔ کل جب تم "ایسٹ" میں مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد روانہ ہوئے تو تمہارے جاتے ہی نیل آرمر کا فون آگیا تھا۔ وہ میرا اتنا بے تکلف گہرا اور مخلص دوست ہے کہ میں اپنے اوپن برزنس کے اکثر معاملات اس سے ضرور ڈسکس کرتا ہوں پھر ہم چوں کہ سونے کے سلسلے میں اس کے "گولڈ اکاؤنٹ بینک" کو بھی استعمال کریں گے تو اس وجہ سے بھی میں نے اسے اس سنگ پروجیکٹ سے آگاہ کردیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے مشورہ دیا کہ کنویں کھود کر یہ مقصد حاصل کرنا انتہائی خطرناک ہوگا۔ ملک نوازش علی کوئی بہت بڑا پھڈا کھڑا کرسکتا ہے۔ مجھے بھی نیل آرمر کی یہ بات پسند آئی اور میں نے کھدائی وغیرہ کا پروگرام ختم کردیا۔ یقیناً تمہیں بھی' نیل آرمر کی سرنگ والی تجویز زیادہ جان دار لگے گی۔"

"ہاں' یہ زیادہ محفوظ اور جان دار ہے۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

وہ بولا "میں نے صبح تمہیں فون پر بتایا تھا کہ دفینے تک رسائی کے لیے ہمارے پاس صرف دو راستے ہیں۔ ایک نیشنل اور دوسرا انٹرنیشنل۔ ان دونوں راستوں پر دو مختلف آدمیوں سے ہمارا واسطہ پڑے گا۔ وہ دو آدمی ہیں' چوہدری نظام دین اور چوہدری رام داس!"

وہ خاموش ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے مدبرانہ لہجے میں کہا "ان دو آدمیوں سے ہمارا واسطہ اس لیے پڑے گا کہ ہمیں متروک کنویں تک سرنگ لگانے کے لیے ان میں سے کسی ایک کی زمین استعمال کرنا ہوگی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں' تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "میں اور نیل آرمر اس بات پر متفق ہیں کہ ہمیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے رام داس کی زمین کو استعمال میں لانا چاہیے کیوں کہ وہاں سے متروک کنویں کا فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں۔ بہت ہوا' بہت ہوا تو آدھا فرلانگ ہوگا جب کہ چوہدری نظام کی زمین سے یہ فاصلہ پندرہ بیس گنا ہوگا۔"

میں نے نقشے کی باریکیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ چوہدری نظام دین کی زمین کو استعمال کرنے کی صورت میں ہمیں کم از کم ایک میل کی سرنگ نکالنا ہوگی جو کہ خاصا مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تم دونوں کا اتفاق بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا!"

"تمہیں کون سی بات الجھا رہی ہے؟" شعیب نے پوچھا۔

میں نے کہا "میری معلومات کے مطابق ملک نوازش علی کا باپ ملک رمضان اور رام داس کے باپ کرم داس میں بڑا گہرا یارانہ تھا لہٰذا ملک نوازش اور رام داس بھی آپس میں دوست ہوں گے۔ چوہدری رام داس ایک دوست کے خلاف ہمیں اپنی زمین کیوں استعمال کرنے دے گا؟ پھر اگر ہم وہ سونا رام پور کی زمینوں کی مدد سے نکالیں گے تو وہ پاکستان کس طرح لایا جائے گا کیوں کہ موضع رام پور تو امرتسر میں ہے اور امرتسر بھارت میں؟"

"تمہارے دونوں سوالات کے جواب ہیں میرے پاس۔" وہ دھیمے انداز میں مسکرایا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض کردوں کہ آج کل ملک نوازش اور رام داس میں شدید قسم کی دشمنی چل رہی ہے اور بعض اسمگلنگ کے تنازعات کے سبب وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور جہاں تک سوال ہے' بھاری مالیت کے سونے کو بھارت سے پاکستان لانے کا تو یہ ہمارا دردِ سر نہیں ہے۔ نیل آرمر "برآمدت" کو وہیں' رام پور گاؤں ہی میں اپنی

تحویل میں لے لے گا۔"

"ہوں!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "اس کا مطلب ہے' نیل آرمر پوری طرح اس پروجیکٹ میں اِن ہو چکا ہے۔"

شعیب غوری نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا "نیل آرمر ایک مصروف بزنس مین ہے۔ وہ اگر ہمارے پروجیکٹ میں اتنی زیادہ دلچسپی لے رہا ہے تو یقیناً اس کے بدلے وہ کوئی مالی فائدہ بھی چاہے گا۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" شعیب نے کہا "سونے کا وہ بیوپاری فائدے کا خواہاں تو ہے لیکن میں اسے کم سے کم پر راضی کر لوں گا۔ تم فکر نہ کرو' ہم دونوں کی بزنس پارٹنر شپ زیادہ متاثر نہیں ہوگی۔ میں نیل آرمر کے مزاج کو سمجھتا ہوں۔ وہ میری بات مان لے گا۔"

"وہ تمہاری بات اس لیے مان لے گا کہ تمہارا دوست ہے۔" میں نے کہا "مگر رام داس کو اتنی آسانی سے نہیں ٹرخایا جا سکے گا۔ وہ بھی اس دفینے میں سے کچھ نہ کچھ ضرور طلب کرے گا!"

"ہاں' یہ اس کا حق ہوگا۔" شعیب نے کہا "ایسے معاملات میں دل اور ہاتھ کو ذرا کھلا رکھنا پڑتا ہے وجدان۔ یہ ایک طرح سے جوائنٹ وینچر ہوگا جس کے مرکزی کردار ہم دونوں ہیں۔"

میں نے پوچھا "سرحد پار کے معاملات تم لوگ خود ہی دیکھو گے نا؟"

"ہاں وجدان!" شعیب نے یقینی لہجے میں کہا "ادھر اور ادھر کے تمام مسائل کو حل کرنا میرا کام ہے۔ انٹرنیشنل معاملات میں نیل آرمر نے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے۔ تم نے یہ پروجیکٹ مجھے سونپ دیا ہے۔ اب تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا۔ یہ ساری باتیں تو میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ایک دوست ہونے کے ناتے تم ہر معاملے سے باخبر رہو۔"

شعیب کی تسلی نے میرے کندھوں کا بوجھ اتار پھینکا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک آدھ روز میں ہنڈی کے ذریعے میری رقم سنگاپور سے کراچی آ رہی ہے۔ میں نے اسے اماؤنٹ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس نے اتنی بڑی رقم کی خبر پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اتنا زیادہ مال دار بن جانے کے بعد اپنے اس دوست کو بھول نہ جانا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا دوست۔" میں نے غمزدہ لہجے میں کہا "مگر ہنڈی والا معاملہ مجھے الجھا رہا ہے حالانکہ میرے خیر خواہ چیانگ شو نے ہنڈی کے کاروبار کی خاصی تعریف کی ہے!"..... شعیب غوری نے کہا۔

"تم مطمئن رہو۔ یہ انتہائی ایمان دارانہ کاروبار ہے۔ میں کراچی کے ہنڈی والوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان میں چند میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ تمہاری رقم کی ایک پائی بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوگی۔"

شعیب کے اطمینان دلانے پر میں بالکل بے فکر ہو گیا۔

✪✲✪

میں جب واپس فلیٹ پر پہنچا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ساحل ٹی وی کے سامنے بیٹھی کوئی تفریحی چینل دیکھ رہی تھی۔ مجھے سب سے پہلے ساحل کو اپنے ساتھیوں کی تدفین کی تفصیلات سے آگاہ کرنا پڑا۔ قبرستان میں سب خیریت گزری تھی اور کسی بھی قسم کا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ شعیب غوری مجھ سے ملاقات کے بعد ماریشس روانہ ہو گیا تھا تاہم اس کا نائب کبیر شاہ قبرستان میں قدم قدم پر میرے ساتھ رہا تھا۔ قبرستان سے نکلتے وقت کبیر شاہ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل دن میں کسی وقت مجھ سے رابطہ کرے گا تاکہ رات والے "آپریشن" کا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ شعیب غوری کے پروگرام کے مطابق' میں نے کبیر شاہ کی سنگت میں وہ معرکہ سر کرنا تھا۔

میری پوری بات سننے کے بعد ساحل نے کہا "وجدان! مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ چلو کہیں باہر چل کر ڈنر کرتے ہیں۔"

آں جہانی جانکی دیوی کی طرح ساحل بھی بھوک کی بہت کمزور تھی اور خاص طور پر جب سے اس نے مارشل آرٹس اور یوگا کی پریکٹس شروع کی تھی' اس کی بھوک دوچند ہو گئی تھی تاہم میں اسے گاہے بہ گاہے ٹوکتا رہتا تھا یہ کھاؤ اور وہ نہ کھاؤ۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر اس نے کھانے پینے کے معاملات کو بے قاعدہ اور کھلا چھوڑ دیا تو تیزی سے فربہ ہوتی چلی جائے گی۔ کیونکہ مردوں کی بہ نسبت عورتوں میں موٹاپا ہونے کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔

پندرہ منٹ بعد ہم دونوں نیلی شیرڈ میں بیٹھ کر کسی اچھے سے ریسٹورنٹ کی تلاش میں کلفٹن کی سڑکوں کو ناپ رہے تھے۔ ساحل نے کہا "کل رات آتے ہوئے [illegible]

میں کھانے پینے کے کئی مقامات ایک ہی جگہ دیکھے تھے۔"

وہ بوٹ بیسن کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے کہا "اس طرف پھر کبھی چلیں گے۔ فی الحال تو مجھے بھی ٹھیک ٹھاک بھوک لگ رہی ہے۔ آج اسی کو چیک کرتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے گاڑی سے باہر ایک معقول صورت ریسٹورنٹ کی جانب اشارہ کر دیا۔ اس وقت ہم زمزمہ کے علاقے سے گزر کر سپر مارکیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ساحل نے میری تائید کی تو ہم اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

وہ ریسٹورنٹ معقول صورت ہی نہیں بلکہ معقول سیرت بھی واقع ہوا۔ ہم دونوں نے پیٹ بھر کر خوش ذائقہ اور معیاری کھانا کھایا۔ جب میں نے ویٹر سے بل لانے کو کہا تو ساحل بولی۔

"تم بل کے معاملات سے نمٹو۔ میں ذرا واش روم ہو آؤں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

پانچ چھے منٹ بعد وہ واپس آ گئی۔ ساحل اکیلی واش روم کی طرف گئی تھی لیکن واپسی میں وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ دو اور بھی تھیں اور ان دو میں سے ایک کو پہچاننے میں' میں نے ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ وہ بلاشبہ ممتاز تھی۔ مدھوری ڈکشت کی مماثل وہ حسین و جمیل لڑکی بہت کم وقت کے لیے میرے ساتھ رہی تھی۔ میں نبی سرکے قاضی سلطان کی اس اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے میری جانب بڑھ رہی تھیں۔ ممتاز سے میری نگاہ ملی تو اس کے ہونٹ خود بہ خود مسکرانے لگے۔ اس کی ساتھی دوسری لڑکی کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

"وجدان! تم اس قدر بدل گئے ہو!" ممتاز نے میرے نزدیک آنے پر حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ اس نے اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا کہ رسمی علیک سلیک کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔

میں نے اپنی سیٹ سے کھڑے ہو کر اس کا حال احوال دریافت کیا پھر تینوں اسی میز کے گرد بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ آج کل میں نے اپنے حلیے میں چوں کہ بہت زیادہ تبدیلی کر لی تھی اس لیے ممتاز نے میرے بدل جانے پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"یہ شبانہ ہے۔" ممتاز اپنی ساتھی لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی "انکل باقر کی بیٹی۔ تم منہاس باقر سے تو واقف ہو نا!"

میں نے شبانہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ مطلب یہ تھا کہ میں منہاس باقر سے واقف ہوں۔ وہ شبانہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"وجدان کا ذکر تو میں تم سے اتنی مرتبہ کر چکی ہوں کہ اس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔"

ممتاز کا انداز بہت معنی خیز اور بولڈ تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ممتاز کی بے باکی میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور خاص طور پر اس نے نبی سر میں پولیس والوں کے سامنے جتنے کھلے ڈلے انداز میں میری حمایت کی تھی اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' وہ مجھ میں سنجیدہ قسم کی دلچسپی لے رہی ہے۔ میرے تعارف پر شبانہ بھی مجھے ایسی نگاہ سے دیکھنے لگی جیسے دال میں کچھ کالا ہو۔

ممتاز کی ساتھی شبانہ کی عمر پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ گداز بدن کی مالک ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ نمکین چہرے والی اس سانولی لڑکی کے نقوش میں ایک تیکھا پن موجود تھا جو بے پناہ کشش پیدا کر رہا تھا۔

میں نے ممتاز سے پوچھا "تم یہاں کراچی میں؟"

"دو دن پہلے آئی ہوں۔" اس نے شوخی سے بتایا "پاپا چھوڑ گئے ہیں۔ کم از کم ایک ماہ رہوں گی یہاں۔" پھر وہ شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "دو ہفتے بعد اس کی شادی ہے۔ بس اسی سلسلے میں شاپنگ وغیرہ چل رہی ہے۔" اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے سوال داغ دیا "اور تم تو ایسے بے مروت نکلے کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔"

اس کے انداز میں شیریں شکوہ تھا۔ ساحل جو اس دوران میں بالکل خاموش بیٹھی تھی' اچانک بول اٹھی۔ اس نے ممتاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وجدان نے جب تمہیں ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا تھا تو اپنا تعارف کرواتے ہوئے خدائی فوج دار کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس سے بے مروتی کا گلہ نہ کرو۔ یہ مشکل وقت میں ہی سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ اب!"

ساحل کے آخری جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں یہ بات تو جان گیا تھا کہ ساحل کسی بھی لڑکی یا عورت کو مجھ سے بے باک یا بے تکلف ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ ممتاز کی موجودگی میں وہ جیسے آف ہو جاتی تھی لیکن اس وقت ممتاز کے حوالے سے اس نے جس طرح اپنی بات کو ختم کیا تھا اس کے پیشِ نظر میں ممتاز سے پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔

"اس وقت کون سی افتاد آن پڑی ہے؟"

ممتاز کے بجائے ساحل نے میرے سوال کا جواب دیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میز پر پہنچنے سے پہلے ممتاز کی موجودہ صورتِ حال سے آگاہ ہو چکی تھی۔

"وجدان! دو غنڈے ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔"

میں فوراً الرٹ ہو گیا "کیا وہ دونوں اس وقت ریسٹورنٹ میں موجود ہیں؟" میں نے بہ دستور شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "وہ اندر داخل نہیں ہوئے بلکہ ہمارے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جیسا پہلے کرتے رہے ہیں۔"

"یہ کس قسم کے غنڈے ہیں بھئی۔" میں نے شبانہ سے استفسار کیا "اور کب سے تم لوگوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟"

اس نے بتایا "ہم تین چار گھنٹے سے نکلے ہوئے ہیں۔ مختلف اسٹورز سے شاپنگ کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ میں ٹھیک ٹھیک تو نہیں بتا سکتی کہ وہ کب سے ہمارے تعاقب میں ہیں لیکن گزشتہ ایک گھنٹے سے ہم نے انہیں مسلسل تعاقب میں دیکھا ہے۔ ہم جس بھی دکان یا اسٹور کے اندر جاتے ہیں' وہ ہمارے پیچھے اندر داخل نہیں ہوتے بلکہ باہر ہی ہمارا انتظار کرتے رہتے ہیں اور جیسے ہی ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آگے بڑھتے ہیں' وہ ہمارے تعاقب میں لگ جاتے ہیں۔"

"کیا ان کے پاس بھی گاڑی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دونوں موٹر سائیکل پر ہیں۔" شبانہ نے کہا "ان کے پاس ہنڈا ون ٹوفائیو ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا انہوں نے ابھی تک آپ سے کوئی بات کی ہے یا کسی قسم کی اور کوئی حرکت؟"

شبانہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

ممتاز نے کہا "مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ ہمارے ٹھکانے کا سراغ لگانا چاہتے ہوں۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم کہاں رہتے ہیں۔"

"بہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا "خیر' دیکھ لیتے ہیں ان سراغ رسانوں کو بھی۔"

شبانہ بے پروائی سے بولی "مجھے تو اس ایڈونچر میں بہت مزہ آ رہا ہے لیکن ممتاز خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہے۔ اسی کے اصرار پر میں اس ریسٹورنٹ کے اندر آئی ہوں۔ یہاں سے ہم ڈیڈی کو فون کر کے ان دونوں غنڈوں کے بارے میں اطلاع دینا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے ہی ہماری ساحل پر نظر پڑ گئی اور ہم فون کرنے کے بجائے تمہارے پاس آ گئے۔"

ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "ویسے اگر انہیں ہمارے بنگلے کا پتا چل بھی جائے تو وہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ اس شہر کے ہزاروں لوگ میرے ڈیڈی اور ہمارے گھر سے واقف ہیں۔"

میں نے محسوس کیا' شبانہ خاصی پُراعتماد اور بے پروا لڑکی تھی اور اس کی وجہ بھی صاف ظاہر تھی۔ وہ اخبار کے مالک اور ایڈیٹر کی بیٹی تھی۔ پریس والوں سے تو اچھے اچھے بارسوخ لوگ بھی ڈرتے ہیں۔ اور جن لوگوں سے دوسرے ڈرتے ہوں' ان میں خود اعتمادی تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔

ممتاز نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں ان موٹر سائیکل سوار غنڈوں سے خوف زدہ نہیں ہوں بلکہ احتیاط میں کیا حرج ہے۔ انجوائے کرنے کے لیے زندگی میں اور بہت کچھ پڑا ہے۔"

میں نے کہا "اب تم دونوں اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں ان دونوں سے خود ہی نمٹ لیتا ہوں۔"

"تم نے اس سلسلے میں کیا سوچا ہے وجدان!" ساحل نے پوچھا۔

میں نے بتایا "ممتاز اور شبانہ معمول کے انداز میں اس ریسٹورنٹ سے نکلیں گی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہو جائیں گی۔" اتنا کہہ کر میں نے شبانہ کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا اور پوچھا "آپ لوگوں کو مزید کوئی شاپنگ تو نہیں کرنا؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "حسبِ معمول وہ دونوں ان کے تعاقب میں لگ جائیں گے اور اگر وہ واقعی ان کا ٹھکانا جاننا چاہتے ہیں تو انہیں بنگلے کے دروازے تک چھوڑ آئیں گے۔" میں نے سانس لینے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر کہا "ہنڈا ون ٹو فائیو کے پیچھے ہم اپنی گاڑی لگا دیں گے مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے ہم ان کا تعاقب کریں گے۔ جب آپ دونوں گھر پہنچ جائیں گی تو میں ان کی 'خیر خیریت' بڑے شائستہ طریقے سے پوچھ لوں گا۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔" شبانہ نے سراہنے والے انداز میں کہا "لیکن وجدان! اس کے لیے تمہیں ہم سے ایک وعدہ کرنا ہو گا!"

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ساحل نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کس قسم کا وعدہ شبانہ؟"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی "جب تم ان غنڈوں کو

ٹھنڈا کا دودھ یا دہلا کر فارغ ہو جاؤ تو سیدھے ہمارے گھر آؤ گے۔" وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

میں نے کہا "تمہارا بنگلا یہاں سے کتنی دور ہے؟"

ممتاز بولی "بابا نے تمہیں باقر انکل کے گھر کا ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر دیا تھا۔ شاید تم بھول گئے ہو۔"

"میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔" میں نے شوخ نظر سے ممتاز کی طرف دیکھا۔

ساحل کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات ابھرے جسے اسے میری وہ شوخ حرکت پسند نہ آئی۔ تاہم وہ بدستور خاموش رہی۔

شبانہ نے بتایا "ہمارا بنگلا یہاں نزدیک ہی ہے۔ عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے جو راستہ "سی ویو" کی طرف جاتا ہے' یہ بنگلا اسی راستے پر واقع ہے۔"

"تم آج کل کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟" ممتاز نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے اپنی اپارٹ منٹس بلڈنگ کا نام' فلیٹ کا نمبر اور فون نمبر ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔ میری اس جسارت کو ساحل کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ وہ کسی روایتی بیوی کی طرح میرے معاملات پر نظر رکھے ہوئے تھی!

شبانہ نے پُرجوش انداز میں کہا "تو ایڈونچر شروع کیا جائے۔"

ہل میں اڈا کر چکا تھا اس لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ممتاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ دونوں نکلو۔ ہم ایک منٹ بعد باہر آتے ہیں۔ جب تک آپ ہماری جھلک نہ دیکھ لو' گاڑی کو آگے نہ بڑھانا۔"

"ٹھیک ہے' میں سمجھ گئی۔" شبانہ نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

جب وہ دونوں ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کو پار کر گئیں تو ساحل نے گہری سنجیدگی سے کہا "وجدان! لگتا ہے' تم کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کا فیصلہ کر چکے ہو!"

"غنڈوں سے نمٹنے کے لیے ناصحانہ لیکچروں سے کام نہیں چلتا ساحل۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہنگامہ پرور لوگوں کو قابو کرنے کے لیے ہنگامہ آرائی ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا "تمہیں تو خوش ہونا چاہیے ساحل۔ قدرت نے تمہیں بہت اچھا موقع دیا ہے۔"

"کیسا موقع؟" اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "اپنی محنت کو آزمانے کا موقع۔ تم نے بھی تو مارشل آرٹس میں خاصی مہارت حاصل کر رکھی ہے۔ اس فن کو کب کام میں لاؤ گی؟"

وہ اپنی مٹھیوں کو اضطراری انداز میں کھولنے بند کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ساحل کے چہرے پر دبا دبا جوش بھی نظر آنے لگا۔ مجھے اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی۔

میں نے حتمی لہجے میں کہا "چلو ساحل! وہ دونوں باہر اپنی گاڑی میں بیٹھی ہماری جھلک دیکھنے کی منتظر ہوں گی۔"

ہم دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے اور بڑے نارمل انداز میں چلتے ہوئے اپنی شیرڈ میں آ بیٹھے۔ میں نے دیکھا' اس وقت شبانہ کی کریم کلر ٹویوٹا کرولا حرکت میں آئی اور ایک جانب بڑھ گئی۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ رکھتے ہوئے ہونڈا ون ٹو فائیو بھی ان کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی۔ شبانہ اپنے بنگلے کی لوکیشن مجھے بتا چکی تھی اس لیے میں نے شیرڈ اور ون ٹو فائیو کے درمیان اتنا فاصلہ رکھا کہ وہ دونوں غنڈے اپنے تعاقب کو محسوس نہ کر سکیں۔ اس تعاقب کے دوران میں اگر یہ فاصلہ بڑھ بھی جاتا تو میں انہیں بہ آسانی تڑیس کر سکتا تھا۔ کیوں کہ یہ تمام راستے اچھی طرح میرے دیکھے بھالے ہوئے تھے۔

موٹر سائیکل پر سوار وہ دونوں افراد اپنے حلیے اور صورت ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے بلیو جینز پر فی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ایک کی شرٹ گرے اور دوسرے کی بلیک تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے ٹویوٹا کرولا کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

ساحل نے مجھ سے پوچھا "وجدان! ان دونوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ظاہر ہے' وہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں۔"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔" وہ الجھ کر بولی "دراصل میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں' شبانہ کے بنگلے پر پہنچ کر ان کا رویہ کیا ہو گا؟"

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "وہ دو قسم کا رویہ ظاہر کر سکتے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنی بات کی وضاحت بھی کر دی "نمبر ایک' وہ اپنی موٹر سائیکل کو روکے بغیر آگے نکل جائیں گے اور کسی دوسرے راستے سے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔ ایسا اس صورت میں ہو گا' اگر وہ صرف منہاس باقر کا بنگلا دیکھنا چاہتے ہوں گے یا شبانہ اور ممتاز کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے ہوں۔"

"اور دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے؟"

"دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ وہ بنگلے سے تھوڑا آگے جا کر واپس لوٹ آئیں۔" میں نے گنبھیر انداز میں کہا "اس صورت میں وہ کسی کارروائی کا پروگرام بھی رکھتے ہوں گے۔ واپس آکر وہ اس بنگلے اور بنگلے کے مکینوں کے خلاف کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتے ہیں۔"

"ہوں۔" ساحل نے بوجھل لہجے میں کہا "اس کا مطلب ہے' کوئی بڑا پھڈا ابھی کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"بالکل ہو سکتا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "انہوں نے خواہ مخواہ صرف منہاس باقر کا گھر دیکھنے کے لیے اتنا کھٹ راگ نہیں پھیلایا ہوگا۔ باقر اس شہر کا معروف صحافی' پبلشر اور ایڈیٹر ہے۔ اسے لاکھوں افراد جانتے ہوں گے اور شبانہ کے بہ قول' ہزاروں لوگوں نے ان کا بنگلا بھی دیکھ رکھا ہوگا۔"

ساحل اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہمیں ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"وہ تو ہم ہیں۔" میں نے کہا "بلکہ میں تو ایور ریڈی قسم کا بندہ ہوں۔ ہر وقت کسی بھی سنگین اور رنگین مسئلے کے لیے بالکل تیار رہتا ہوں۔"

"صرف مسئلے کے لیے یا معاملے کے لیے بھی؟" وہ چبھتے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"معاملے" سے اس کی مراد کو میں بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ اس کا واضح اشارہ ممتاز کی طرف تھا۔

میں نے مصنوعی سنجیدگی چہرے پر طاری کرتے ہوئے کہا "بھئی! معاملہ ہو یا مسئلہ' احتیاط اور تیاری میں کیا قباحت ہے۔ محتاط اور تیار آدمی کم سے کم نقصان اٹھاتا ہے بلکہ میرا خیال ہے' نقصان اٹھاتا ہی نہیں۔"

وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی "ہاں وجدان! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مسئلے کا تو مجھے پتا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں' تم معاملے کے سلسلے میں کبھی نقصان نہیں اٹھاتے ہو' ہمیشہ فائدے ہی میں رہتے ہو۔"

"میں تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں کروں گا ساحل۔" میں نے بہ دستور ون ٹو فائیو کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا "ایک معاملے میں تو میں ابھی تک کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ میں جتنا اس معاملے کی طرف بڑھتا ہوں' وہ اتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتا ہے۔ ہم بہ ظاہر ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں لیکن ریل کی دو پٹریوں کی طرح ہمارے درمیان ایک مخصوص فاصلہ حائل ہے۔ پتا نہیں' میں اپنے معاملے کو کب اور کیسے سود مند بنا سکوں گا۔"

"فلسفہ اچھا بول لیتے ہو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی' پھر پوچھنے لگی "تمہارے اور تمہارے معاملے کے درمیان یہ فاصلہ کس نے حائل کیا ہے؟"

"وقت نے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"وقت تو اسی کا غلام ہے جو اس کی قدر کرتا ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں وقت کی ناقدری کرتا ہوں؟"

"میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی!"

"پھر تمہارا مطلب کیا تھا؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے محسوس کیا' اس کے وجود میں بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ شاید وہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔ ہم اس وقت جس قسم کی مہم پر پیش قدمی کر رہے تھے' اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ ہم ذہنی طور پر بالکل پُرسکون رہیں تاکہ ہمارے اعصاب اور ہاتھ پاؤں حالات کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں۔

میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ ساحل کے ہاتھ پر رکھ دیا اور ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بہت بدلے ہوئے اور خوشگوار لہجے میں کہا "ساحل! تم نے دیکھا' موسم کتنا حسین ہو رہا ہے۔ لگتا ہے' تھوڑی دیر میں بارش شروع ہو جائے گی۔"

وہ شانت لہجے میں بولی "ٹھیک کہتے ہو' سنگین موسم کے بعد حسین موسم آتا ہے اور پھر بارش بھی ہوتی ہے' جس میں دھل کر ہر شے نکھر جاتی ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں ساحل کی بات کے جواب میں کچھ کہتا' کریم کلر ٹویوٹا کرولا اس اسٹریٹ میں داخل ہوئی جہاں منہاس باقر کا بنگلا واقع تھا۔ میں پوری طرح اس طرف متوجہ ہو گیا۔

شبانہ کی گاڑی اپنے عالی شان بنگلے کے گیٹ پر رکی تو موٹر سائیکل سوار نہایت ہی دھیمی رفتار سے آگے بڑھ گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ معمول کے مطابق وہاں سے گزر رہا ہوں۔ میں اس اسٹریٹ کی ابتدا ہی میں اپنی گاڑی کو روک چکا تھا۔

ساحل نے کہا "وجدان! وہ تو آگے نکل گئے!"

"میرا خیال ہے' وہ پلٹ کر ضرور آئیں گے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے پُرتشویش انداز میں کہا "اگر نہ آئے تو تمہارا تعاقب کا مقصد ادھورا رہ جائے گا۔"

میں نے شبانہ کی ٹویوٹا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "اس گاڑی کو اندر جانے دو۔ مجھے امید ہے' وہ بنگلے کا نمبر وغیرہ نوٹ کرنے کے لیے ضرور ایک چکر ادھر کا لگائیں گے اور۔"

میں نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کیا "اگر وہ سیدھے نکل گئے تو ہم ان کے پیچھے لگ جائیں گے۔ یہ اسٹریٹ خاصی طویل ہے۔ میں انہیں نظر سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ون ٹو فائیو واپس پلٹ آئی۔ میری پیش گوئی کے مطابق وہ بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند ساعت کے لیے رکے۔ گیٹ کے پہلو میں آویزاں نیم پلیٹ کو بہ غور دیکھا اور موٹر سائیکل گھما کر بالکل نارمل انداز میں ایک طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنی نیلی شیرڈ کو ان کے پیچھے ڈال دیا تاہم اتنا فاصلہ رکھا کہ انہیں تعاقب کا احساس نہ ہو۔

"تمہارے اندازے اتنے درست کیوں ثابت ہوتے ہیں؟" ساحل نے سرسری سے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے کہا "کیوں کہ وہ منطقی ہوتے ہیں۔"

وہ بولی "اس اندازے میں کیا منطق پوشیدہ تھی؟"

میں سمجھ گیا' وہ مجھے چھیڑنے کے لیے اس قسم کے سوالات کر رہی تھی ورنہ یہ تو سامنے کی بات تھی کہ موٹر سائیکل سوار اگر ان دونوں کے تعاقب میں تھے تو یقیناً وہ اس وقت تک واپسی کا قصد نہ کرتے جب تک کہ وہ ان کے پتے ٹھکانے سے آگاہی حاصل نہ کر لیتے یا پھر کسی قسم کی کارروائی نہ ڈال دیتے۔ یہ اتنی پیچیدہ اور پوشیدہ بات نہ تھی جو ساحل کی سمجھ میں نہ آسکے۔ میں جانتا تھا' وہ کتنی ناسمجھ تھی!

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "ساحل! میری زندگی کا زیادہ حصہ جرائم پیشہ افراد سے دست و پنجہ کرتے ہوئے گزرا ہے۔ میں ان کی نفسیات پر اتھارٹی ہو چکا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔"

اسی دوران میں موٹر سائیکل ایک دو گلیاں گھوم کر ہوٹل پر آگئی جو ساحل کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ سمندر کا یہ کنارہ "سی ویو" کہلاتا ہے۔ ساحل نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں یہ دونوں کس کے تعاقب میں ہوں گے۔ شبانہ یا ممتاز؟"

میں نے کہا "زیادہ امکان تو اسی بات کا ہے کہ وہ شبانہ کا راز پہلے یہاں پہنچی ہے۔ کراچی میں اس کی کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔" ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد میں نے مزید کہا "اس سلسلے میں اپنے ذہن کو زیادہ نہ تھکاؤ۔ بلی تھیلے میں سے باہر آنے ہی والی ہے۔"

"کہیں یہ وہی بلی تو نہیں جو بوٹ بیسن والے واقعے میں انٹری مار کر غائب ہو گئی تھی!"

ساحل نے مزاح کے رنگ میں کہا اور دھیرے سے مسکرا دی۔

اس کی مسکراہٹ سے گاڑی جگمگا اٹھی۔ بڑی فورس تھی اس مسکراہٹ میں۔ ایک تازگی اور فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے وہ غیر معمولی سنجیدہ رہنے لگی تھی۔ میں اس کی اس خود اختیاری سنجیدگی سے سخت پریشان تھا۔ خود اختیاری اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ ظاہر اس کا سبب نظر نہیں آتا تھا ورنہ وہ تو ایک چنچل اور شوخ لڑکی تھی۔ ساحل ایک ایسی ساتھی تھی جس کی ہمراہی میں' ویرانے میں بھی بہار اتر آتی تھی۔ اس کی اداسی آمیز سنجیدگی نے میری بہاروں کو خزاں کے سپرد کر رکھا تھا۔

یہ سارے خیالات و احساسات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ میں نے اس کے جواب میں اسی کا رنگ اختیار کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے' یہ وہ بلی نہیں ہوگی۔ وہ سفید تھی' یہ کالی ہوگی۔"

ہم موٹر سائیکل والوں کا تعاقب کرتے ہوئے کافی آگے نکل آئے "کنارہ" اور "دی بلیچ" جب پیچھے رہ گئے تو ساحل نے پُرتشویش لہجے میں دریافت کیا "ان کو کہاں گھیرنے کا ارادہ ہے؟"

"گھیرنے کے لیے مناسب مقام کا آغاز تو ہو چکا ہے۔" میں نے گاڑی سے باہر اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا۔ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے وہ آگے جا کر کہیں کورنگی کے اریب قریب نکلتی تھی۔ یہ علاقہ تقریباً سنسان ہی تھا اور رات کی تاریکی نے اس کے سنسان پن میں رچ کر اضافہ کیا تھا۔ میں نے اچانک گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا "ہم انہیں نہیں گھیریں گے بلکہ یہ دونوں ہمیں گھیریں گے۔"

"کیا مطلب؟" ساحل کے سوال میں حیرت آمیز الجھن تھی۔

"دیکھتی جاؤ' آگے کیا کیا ہوتا ہے۔" میں نے کہا "اپنے ہاتھ پاؤں اور دماغ کو فائٹنگ فائی کے لیے تیار کر لو۔ دماغ کو اس لیے کہ ہاتھ پاؤں اسی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں تیز رفتاری سے موٹر سائیکل کو اوورٹیک کر کے بہت آگے نکل گیا جب ہمارے درمیان حائل فاصلہ ایک فرلانگ سے بڑھ گیا تو میں نے نیلی شیرڈ کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ ساحل کو میں نے پسنجر سیٹ پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود گاڑی سے باہر آگر اس کے انجن سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔

تھوڑی ہی دیر میں میری توقع کے عین مطابق دن ٹو فائیو ہمارے پاس آکر رک گئی۔ میں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ ڈرائیو کرنے والے نے خاصے درشت لہجے میں استفسار کیا۔

"کیا ہو گیا ہے بھائی؟"

"انجن میں کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔" میں نے کہا "گاڑی اچانک بند ہو گئی ہے۔ اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اگر تمہیں انجن کے معاملات سے کچھ واقفیت ہے تو مدد کردو۔"

وہ دونوں موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے نیچے اتر آئے۔ ان میں ایک دراز قامت تھا اور دوسرا متناسب القد۔ وہ جب شیرڈ کے نزدیک آئے تو انجن کو فراموش کر کے گاڑی کے اندر دیکھنے لگا۔ ان کی نظر میں حریصانہ چمک کو میں نے تاڑ لیا۔ وہ نہایت ہی عامیانہ انداز میں ساحل کو گھور رہے تھے۔ میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے ان سے کہا۔

"بھائی! انجن اس طرف ہے۔" ساتھ ہی میں نے انجن کی جانب اشارہ بھی کر دیا "پہلے ذرا اسے دیکھ لو۔"

"گاڑی کے انجن کو تو ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔" دراز قامت بولا "پہلے ذرا تمہارے انجن کا معائنہ کر لیں۔" اس کی بھوکی نگاہ ساحل پر جمی ہوئی تھی۔

اب مزید کسی ڈانیلاگ کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "حرام زادے! ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔ میرا انجن تو اس طرف ہے۔"

وہ غصے سے میری جانب پلٹا تو میں نے ایک دھواں دھار پنچ اس کی خبیث صورت پر رسید کر دیا۔ وہ چلاتے ہوئے دو قدم پیچھے گیا اور حیرت آمیز نفرت سے مجھے تکنے لگا۔ شاید میری طرف سے اسے اس قسم کے ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔

وہ خوں خوار انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا اور پینترے بدل بدل کر مجھ پر وار کرنے لگا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مارشل آرٹسٹ تھا۔ اس احساس نے مجھے خوشی دی کیوں کہ اب مقابلہ کرتے ہوئے کسی مزے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

وہ ابتدا میں کراٹے کی تکنیک آزماتا رہا۔ میں نے اس کے ہر ہاتھ کا جواب دیا۔ اس کی پیش نہ چلتی دیکھ کر اس کا ساتھی بھی میدان میں اتر آیا۔ اسی وقت شیرڈ کا دروازہ کھلا اور ساحل بھی باہر آکر اس "تماشے" میں شامل ہو گئی پھر ہمارے درمیان باقاعدہ گروپ فائٹ شروع ہو گئی۔ ساحل نے دراز قامت کو سنبھال لیا اور میں اس کے ساتھی پر "توجہ" دینے لگا۔

وہ بھی مارشل آرٹسٹ تھا اور اچھل اچھل کر مجھ پر حملے کر رہا تھا۔ میں نے دو چار خوفناک کِکس میں اس کی ٹانگ تمام شد کر دی۔ زخمی ہونے کے بعد وہ اچانک کسی بندر کے مانند اچھلنے لگا پھر بندر ہی کی طرح اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا وہ "منکی اسٹائل" کے مظاہرے کا ارادہ رکھتا تھا۔

کنگ فو (KUNG-FU) میں مختلف جانوروں کے لڑنے کے انداز کو باقاعدہ شکل دے کر طویل ایکسرسائز پر مشتمل "فارم" بنائے گئے ہیں۔ کراٹے میں جو اہمیت "کاتا" کی ہے۔ وہی اہمیت کنگ فو میں "فارم" کی بھی ہے۔

منکی اسٹائل (بندر کا انداز) میں سب سے زیادہ استعمال پنجوں اور کندھوں کا کیا جاتا ہے۔ میں نے قدِمقابل کے اسٹانس سے بھانپ لیا کہ وہ پنجوں کا کچا تھا' یہی ناپختگی مجھے اس کے کندھوں کے زاویے میں بھی نظر آئی۔ گویا اس نے باقاعدہ کسی چینی کنگ فو ماسٹر سے وہ اسٹائل نہیں سیکھا تھا بلکہ فلمیں دیکھ دیکھ کر کچھ پریکٹس کر لی ہوگی۔ وہ ایسا موقع اور وقت نہیں تھا کہ میں فائٹ کو طول دے کر انجوائے کرتا۔

میں نے "فن شاٹ" اور "سوئپ" مار مار کر قدِمقابل کا منکی اسٹائل اس کی ناک کے راستے نکال باہر کیا۔ وہ لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش ہی میں تھا کہ میری پریشر کک نے اس کا ایک کندھا بیکار کر دیا۔

ساحل ڈٹ کر اپنے قدِمقابل کا مقابلہ کر رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص ساحل پر بھاری پڑ رہا تھا۔ میں لپک کر اس جانب بڑھا اور ایک بھرپور سائیڈ کک دراز قامت شخص کی پشت پر رسید کر دی۔

وہ تھوڑا لڑکھڑایا اور ڈگمگاتے قدموں سے پیچھے چلا گیا۔ میں نے فضا میں پرواز کی اور میرے پاؤں کا بلیڈ اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ یہ ایک بھرپور فلائنگ کک تھی۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے زمین چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔

اسی وقت مجھے عقب میں ساحل کی چیخ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' وہ "بندر کا بچہ" ساحل کو اپنے ناقص فن سے ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک کندھا بیکار ہو جانے کے سبب اس کی اچھل کود کچھ زیادہ ہی مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔

میں نے لپک کر ساحل کی مدد کی اور منکی اسٹائل کا مظاہرہ کرنے والے غنڈے پر اسنیک اسٹائل کے دو چار اسٹیپ آزما کر اسے لمبا لٹا دیا۔ شاؤلن ٹیمپل میں تربیت کے دوران میں' میں نے ووشو کنگ فو (WU-SHU-KUNGFU) کے مروج پانچ قدیم اسٹائل بھی سیکھے تھے۔ جن میں ڈریگن' ٹائیگر' لیپارڈ' کرین اور اسنیک اسٹائل شامل ہیں۔ اژدہا' شیر' چیتا' کونج اور سانپ کے لڑائی کے انداز میں "چی" بنیادی کروار ادا کرتی ہے۔

موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ بندر کے بچے سے میری "مصروفیت" کے دوران میں' مجھ سے بری طرح پٹنے والا وہ دراز قامت سنبھل کر موٹر سائیکل پر سوار ہو چکا تھا اور اپنے ساتھی کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ ہونڈا ون ٹوفائیو کے انجن کی خوبیوں سے واقف افراد جانتے ہیں کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ بڑی بڑی وارداتوں میں فرار کے لیے "یہ گاڑی" بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔

میں بھگوڑے موٹر سائیکل سوار کے تعاقب کو ذہن سے جھٹک کر بندر کے بچے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ سڑک کے کنارے پڑا دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ میں نے اپنی پنڈلی پر چرمی کیس میں موجود خنجر کو نکالا اور شکست خوردہ شخص کے پاس بیٹھ گیا پھر دہاڑ سے مشابہ لہجے میں پوچھا۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے آٹھ انچ پھل والے ہلاکت خیز خنجر کو بھی لہرایا۔

وہ گھگیا کر بولا "خدا کے لیے مجھے جانے دو۔"

"تمہارا ساتھی دُم دبا کر بھاگ گیا۔" میں نے خنجر کی نوک کو اس کے گال پر چبھوتے ہوئے کہا "تم بھی سر پر پاؤں رکھ کر نکل جانا۔ میں تمہیں روکوں گا تھوڑا ہی۔ بس جاتے جاتے میرے چند سوالات کے جواب دیتے جاؤ۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے خنجر کی نوک پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ تکلیف زدہ لہجے میں بولا "اس قاتل خنجر کو ہٹا لو پلیز۔ تم جو پوچھو گے' میں بتاؤں گا۔"

"یہ خنجر فی الحال نہیں ہٹ سکتا۔ پہلے تم سچ بول کر خود کو قابلِ اعتماد ثابت کرو۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وہ کوئی جائے فرار نہ پا کر منمنایا "پوچھو' کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"میں سوال کر چکا ہوں۔" میں نے خنجر کے دستے پر کچھ اور دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا "تم کون ہو اور کس کے لیے کام کرتے ہو؟"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا "ہم فری لانسر ہیں۔ جو بھی ہم سے کام لینا چاہے' ہم معقول معاوضے پر اس کا کام کر دیتے ہیں۔"

"فری لانسر!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "گویا کرایے کے غنڈے ہو؟" میں نے غصیلی نظر سے اسے دیکھا۔ "تم معاوضے پر جو کچھ بھی کرتے ہو' اس میں کون کون سے کام شامل ہیں؟"

"ہر قسم کے کام۔" اس نے بتایا "جیب تراشی سے لے کر قتل تک ہر نوعیت کا کام!"

"ماشاءاللہ!" میں نے زہرخند انداز میں کہا "تمہارا پیشہ نہایت معزز اور قابلِ فخر ہے۔"

وہ بولا "کیا کریں۔ پیٹ کا دوزخ تو کسی نہ کسی طور بھرنا ہی پڑتا ہے نا!"

"پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے خود کو جہنمی کیوں بنا رہے ہو؟" میں نے خنجر کی نوک سے اس کے گال پر خون کی ایک لکیر کھینچتے ہوئے کہا "اپنی ان سیاہ کاریوں میں مارشل آرٹس کو کیوں بے حرمت کر رہے ہو؟"

وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میں نے جیسے اس کے گال میں مرچیں سی بھر دی تھیں۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں مستفسر ہوا "تت۔۔۔ تم۔۔۔ کون ہو؟"

"اگر میں تمہارے سوال کے جواب میں کہوں' تمہارا باپ۔۔۔ تو تمہیں قطعاً یقین نہیں آئے گا۔" میں نے بات کے اختتام پر اس کے دوسرے گال کو بھی رنگین کر دیا اور سخت لہجے میں بولا "اس لیے تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔۔۔ اور اچھے بچوں کی طرح شرافت سے میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ۔"

میرے وحشیانہ انداز و اطوار دیکھ کر وہ ہیبت زدہ ہو گیا اور میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی "نہ پائے رفتن' نہ جائے ماندن" جیسی صورتِ حال میں بڑے سے بڑا پھنے خان بھی تعاون پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

زیرِ دام آئے ہوئے انسان نما اس بندر کے بچے نے بتایا کہ اس کا نام وقار ہے اور جو آدمی فرار ہوا تھا اس کا نام عارف تھا۔ وہ دونوں کورنگی کے علاقے میں رہتے تھے اور "آرڈر" پر مختلف قسم کے جرائم کرتے رہتے تھے۔ یہی ان کا روزگار تھا اور وہ اپنے کام سے کام رکھنے کے عادی تھے۔ اپنے فائدے نقصان پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے وہ یہ دھندا کر رہے تھے۔

میں نے پوچھا "تم دونوں کریم کلر ٹویوٹا کرولا کا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟"

ٹویوٹا کرولا کے ذکر پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ میں کس حوالے سے اس کی جان پر عذاب بنا ہوا ہوں۔ اس کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ خفیف آواز میں بولا۔

"ہم۔۔۔ اس لڑکی کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے تھے۔"

"کون سی لڑکی؟" میں نے پوچھا "ٹویوٹا کرولا میں تو دو لڑکیاں تھیں؟"

"وہ۔۔۔ وہ جو انڈین ہیروئن مدھوری ڈکشت جیسی ہے۔"

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ ممتاز کا ذکر کر رہا تھا۔ ہمارا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ ہمارا خیال تھا' وہ دونوں منہاس باقر کی بیٹی شبانہ کا تعاقب کر رہے ہوں گے۔

میں نے وقار سے پوچھا "تم انڈین ہیروئن کی کاپی کا ٹھکانا کیوں معلوم کرنا چاہتے تھے۔ میرا مطلب ہے' یہ کام تم کس کے ایما پر کر رہے تھے؟"

مجھے گہری تشویش ہونے لگی تھی کہ کراچی میں ممتاز کا ایسا کون سا دشمن پیدا ہو گیا تھا جو اس کی قیام گاہ کا پتا چلانے کے لیے کرایے کے غنڈوں کی خدمات حاصل کر رہا تھا۔

"اصل آدمی سے نہ تو ہم ملے ہیں اور نہ ہی اسے جانتے ہیں۔"

"تم سے یہ ڈیل کس نے کی تھی؟"

"اس شخص کا نام شاہد ہے۔" اس نے بتایا "یہ کام اس کے "صاحب" کا تھا۔ شاہد کا صاحب کوئی بہت بڑا سیاست داں ہے۔ شاہد اس سیاست داں کے بنگلے پر کام کرتا ہے۔"

"اور اس سیاست داں کا بنگلا کہاں ہے؟"

وہ متامل نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے غرا کر کہا "اگر تمہیں چکر دینے کی کوشش کی تو اس دنیا سے رفو چکر کر دوں گا۔ تمہاری آنکھیں گواہی دے رہی ہیں' تم سیاست داں کے بنگلے کا ایڈریس جانتے ہو بلکہ وہاں جا بھی چکے ہو۔ مجھ سے جھوٹ بول کر تم اپنی مصیبتوں میں اضافہ کرو گے۔"

وہ فوراً پٹڑی پر آ گیا "تم سچ کہتے ہو' میں ایک مرتبہ عارف کے ساتھ اس بنگلے پر جا چکا ہوں۔ ہم اس "کام" کا ایڈوانس پیسا لینے وہاں گئے تھے۔ شاہد نے وہاں کے کسی بااختیار شخص سے ملوا کر ہمیں مذکورہ رقم دلوائی تھی۔"

"تم نے یہ کیس کتنے میں ڈن کیا تھا؟"

"دس ہزار میں۔" اس نے بتایا "پانچ ہزار ہم ایڈوانس لے چکے ہیں' پانچ ہزار باقی ہیں جو کام کی تکمیل پر ملنا تھے لیکن اب تو لگتا ہے۔۔۔۔!"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مایوسی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ پانچ ہزار کی رقم بھی تمہیں مل جائے گی۔ تم اس سیاست داں کو مدھوری ڈکشت جیسی لڑکی کے بنگلے کا پتا بتا دینا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"یہ تو میں اس وقت کروں گا نا جب تم مجھے یہاں سے جانے دو گے۔"

"اگر تم میرے سوالوں کے جواب میں شرافت کا مظاہرہ کرو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" میں نے کہا "تمہارا ساتھی عارف تو فرار ہو ہی چکا ہے۔ کیا میں تمہارا اچار ڈالوں گا۔"

اس قسم کی حوصلہ افزا باتیں میں اسے چکر دینے کے لیے کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا "اگر تم مجھے بہ حفاظت جانے دو تو میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ سب کچھ بتا دوں گا جو تم پوچھنا چاہو گے۔"

"یہ اگر مگر کی شرائط لگانے کی احمقانہ کوشش نہ کرو۔" میں نے خنجر کی دھار کو اس کی گردن پر ٹکاتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا "میری بات کو غور سے سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے یہ کہا ہے کہ اگر تم مجھے سب کچھ سچ بتاؤ گے تو اس کے بعد میں تمہیں جانے کی اجازت دوں گا۔"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا "اس بنگلے کی لوکیشن اور ایڈریس بتاؤ جہاں وہ سیاست داں رہتا ہے جس کے ایما پر تم لڑکی کی قیام گاہ کا سراغ لگانے نکلے تھے؟"

"وہ بنگلا ڈیفنس میں واقع ہے۔" اس نے بتایا۔

"میں نے لوکیشن اور ایڈریس بھی پوچھا ہے؟"

لوکیشن کی وضاحت کرنے کے بعد اس نے کہا "بنگلے کا نمبر ہی۔ اڑتیس ہے۔ بنگلے کے بالکل سامنے ایک انگلش میڈیم پرائیویٹ اسکول ہے۔ بنگلے کے گیٹ کا رنگ سیاہ ہے۔"

اس کی بیان کردہ لوکیشن بہت آسان تھی۔ خاص طور پر اسکول والی نشانی بہت اہم تھی۔ میں نے استفسار کیا۔

"بنگلے کے باہر کوئی نیم پلیٹ بھی لگی ہوگی؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں پلکیں جھپکائیں "نیم پلیٹ پر "محمود لاشانی" کا نام لکھا ہوا ہے۔"

میں نے محمود لاشانی اور B-38 کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا اور وقار کو گھورتے ہوئے کہا "اگر تمہاری فراہم کردہ معلومات میں سے کوئی بات بعد میں غلط ثابت ہوئی تو۔۔۔"

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی گھگیا اٹھا "میں اپنے خدا کو حاظر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اب تک میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اب اسی خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں' میری جان بخش دو۔"

اس کے لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی۔ موت کو سامنے دیکھ کر وہ جھوٹ بولنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کے نرخرے سے خنجر ہٹا لیا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہم جا رہے ہیں۔" میں نے گاڑی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا "تم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ گھر جا کر اپنے ساتھی عارف کو بھی یہ بات سمجھاؤ اور تم دونوں معمول کے مطابق اس سیاست داں تک اس کی مطلوبہ معلومات پہنچا کر اپنے بقایا پانچ ہزار بھی کھرے کر لو۔"

وہ حیران اور ویران نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ شاید اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ میں اسے زندہ چھوڑ دوں گا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس نے سچ بولا ہو گا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور واپسی کے راستے پر ڈال دی۔

جب ہم "ویسیج" اور "کنارہ" کے درمیان تھے تو ساحل نے کہا "وجدان! میں نے آج کی فائٹ میں محسوس کیا ہے کہ ابھی میرا فن کچا ہے۔"

"جو رفتہ رفتہ پک رہا ہے۔" میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا "میں اپنی محنت کے نتائج سے مطمئن ہوں۔ تم نے بہت ڈٹ کر ایک باقاعدہ مارشل آرٹسٹ کا مقابلہ کیا ہے۔"

"میرا دل رکھنے کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہو!" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے سادگی سے پوچھا "کیا تم اپنا دل کہیں رکھوانا چاہتی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموشی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہی۔ اس کی خاموشی میں ایک مضطرب طوفان چھپا ہوا تھا۔ کبھی وہ پورے سازوسامان سے لیس ہو کر مجھے "ہراساں" کرنے پر کمربستہ رہتی تھی۔ اب میں اس کی جانب راغب ہوا تو وہ کنی کاٹنے لگی تھی۔ جلوت میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور نارمل رہتا تھا لیکن خلوت میسر آتے ہی اس کے نازونداز ہی بدل جاتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا' میں ایک کنویں سے دو ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا ہوں مگر مجھے اس کی حرکات و سکنات پر اختیار نہیں۔ میں اپنی پیاس بجھانے کے لیے دو ہاتھ کا فاصلہ طے نہیں کر پاتا تھا۔ پیاسے کو تو ریگ زار کی چمکتی ہوئی ریت بھی پانی ہی نظر آتی ہے' میرے سامنے تو ایک' جیتا جاگتا محبت کا ساگر ٹھاٹھیں مار تا رہتا ہے۔ جس کے ساحل پر' ساحل کا رویہ کسی کوسٹ گارڈ کا کردار ادا کر رہا تھا۔

وہ ساحل ہی تھی جس نے میرے دل میں محبت کی تڑپ جگائی تھی۔ میری زندگی میں درجنوں لڑکیاں آئیں اور چلی گئیں۔ میں ابتدا میں ساحل کو بھی انہی لڑکیوں میں سمجھ رہا تھا لیکن یہ آئی ضرور' پر گئی نہیں۔ ساحل میرے اندر ہی کہیں کھو گئی تھی۔ پتا نہیں' یہ ساحہ میری تڑپ کو کس ڈگری تک پہنچانے کا ارادہ رکھتی تھی؟

ساحل کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں اس کے تصور سے حقیقت کی طرف لوٹ آیا۔ وہ پوچھ رہی تھی "وعدہ پورا نہیں کرو گے؟"

فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا "کون سا وعدہ؟" میں نے کہا۔

وہ اپنے لہجے کی شرارت آمیز سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولی "وہی وعدہ جو تم نے ریسٹورنٹ میں "ان" سے کیا تھا!"

میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور اسی وقت مجھے یاد آگیا کہ میں نے واپسی پر منہاس باقر کے گھر آنے کی ہامی بھری تھی۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے گاڑی سے باہر کے منظر کا جائزہ لیا۔ اس وقت ہم عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے گزر کر ہیلی پیڈ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ساحل نے بروقت مجھے یاد دلایا تھا۔

میں نے گاڑی کو واپسی کے راستے پر موڑنے کے دوران میں کہا "انسان کو ہر ممکنہ حد تک وعدہ پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم منہاس باقر کے بنگلے پر جا رہے ہیں۔"

وہ زیرِلب خفیف سا مسکرائی مگر زبان سے ایک لفظ نہ بولی۔

بنگلے پر ممتاز اور شبانہ ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ہمیں گھر کے افراد کی طرح ٹریٹ کیا گیا۔ منہاس باقر' ممتاز کے باپ قاضی سلطان کا گہرا دوست تھا۔ جب میں نبی سر سے کراچی کی طرف آ رہا تھا تو قاضی سلطان نے مجھے منہاس باقر کا پتا اور فون نمبر دیا تھا تاکہ مجھے کراچی میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے لیکن یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ یہاں پہنچتے ہی پے در پے مسائل میں الجھتا چلا گیا اور منہاس باقر سے کوئی سنجیدہ رابطہ نہ کر سکا۔ جب کچھ فرصت میسر آئی تو میں اس وقت تک "سی ایف کے" سے وابستہ ہو چکا تھا اور رہائش وغیرہ کا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔

بنگلے کی جانب آتے ہوئے میں نے ساحل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے کسی بھی طور سی ایف کے کا ذکر نہ کرے۔ یہ راز صرف ہم دونوں تک محدود رہنا چاہیے۔ سب کو یہی بتایا جائے کہ یہاں مجھے ایک دیرینہ دوست مل گیا تھا اور ہم اسی کے ایک فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ شبانہ اور ممتاز نے موٹر سائیکل والوں کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے انہیں "چور اچکے" کا خطاب دے کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ دراصل میں ممتاز کو کسی قسم کے خوف و ہراس میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہوتی رہتی۔ البتہ جب مجھے منہاس باقر سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ یہاں میں نے مصلحتاً یا دانستہ کہہ لیں' تھوڑی کی ڈنڈی ماری تھی اور اس سیاست داں کا ذکر گول کر دیا تھا۔ جو "لی۔ تھری ایٹ" میں رہتا تھا۔ پہلے میں اپنے طور پر محمود لاشانی نامی اس شخص کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ منہاس سے میں نے یہی کہا تھا کہ وہ دونوں غنڈے اچھی خاصی مار کھانے کے بعد اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور میں ان کا تفصیلی "انٹرویو" نہیں کر سکا۔

منہاس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اپنے دوست کی بیٹی ممتاز کی حفاظت کا معقول بندوبست کرے گا۔ اگر اسے گھر سے باہر جانا ہوا تو وہ مسلح گارڈ کے ساتھ نکلے گی۔ اس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ قاضی سلطان کا کوئی دشمن ممتاز کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا ہو گا۔

میں نے منہاس باقر کو بہت گہرا آدمی پایا۔ وہ اپنے چہرے سے اندرونی کیفیت کو ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ تو اکا پوائنٹ اور پُراعتماد بات کرتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو موٹر سائیکل والوں کا تعاقب سن کر پریشان ہو جاتا۔ منہاس تشویش میں مبتلا ہوا تھا مگر ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے ردِعمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

منہاس باقر ایسا آدمی نہیں تھا کہ بیٹھ کر اس کے ساتھ طویل گپ شپ کی جاتی۔ جب کام کی دو چار باتوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اٹھنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میں نے اپنے ذہن میں کلبلاتے ہوئے ایک سوال کو اس کے سامنے رکھ دیا۔

"باقر صاحب! آپ تو ماشاءاللہ ایک سینئر صحافی اور ایڈیٹر و پبلشر بھی ہیں۔ شہر کے حالات کے بارے میں آپ سے زیادہ باخبر اور کون ہو گا۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں یہ "نامعلوم دہشت گرد" کون لوگ ہوتے ہیں؟"

"بہت ہی نازک سوال کر دیا ہے تم نے!" وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "اس نازک سوال نے میرے ذہن پر بہت بوجھ ڈال رکھا ہے۔"

وہ اپنی پیشانی کو کھجانے کے بعد بولا "یہ لوگ دراصل کرایے کے قاتل ہوتے ہیں۔ جو ملک دشمن تنظیموں کے آلۂ کار کا کردار ادا کرتے ہوئے شہر میں خوف و ہراس پھیلاتے ہیں جس سے ہمارا ملک عالمی برادری میں بدنام ہوتا ہے۔"

"ان مذموم سرگرمیوں کا کوئی مقصد تو ہوتا ہو گا؟"

"مختلف قسم کی تنظیمیں مختلف نوعیت کے مقاصد رکھتی ہیں۔" منہاس باقر نے بتایا "یہ کوئی چھوٹی موٹی تنظیمیں نہیں ہوتیں بلکہ بین الاقوامی اثر و رسوخ کی حامل ہوتی ہیں جس کی پشت پناہی سپر طاقتیں کرتی ہیں۔ جب کسی بڑی طاقت کو کسی کمزور ملک سے کوئی بات منوانا ہوتی ہے۔۔۔ تو زبانی کلامی کوشش کے بعد وہ یہ راستہ اختیار کرتی ہے جس ملک کا کرتا دھرتا ان کے عزائم پر صاد نہیں کرتا۔ وہ اس کے ملک میں ایسے واقعات کو جنم دیتے ہیں جس سے حکومت کی نااہلی ثابت ہوتی ہے۔ اس کھینچا تانی میں یا تو وہ ملک بڑی طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے یا پھر اس کی ثابت قدمی اس کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ پے در پے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ حکومت' عوام کی نظر میں ذلیل و رسوا ہو کر رہ جاتی ہے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"آج کل اس شہر میں ایک بہت بڑی یہودی قوت سرگرمِ عمل ہے۔ فائرنگ اور قتل و غارت گری کی یہ وارداتیں وہی لوگ کر رہے ہیں۔ اس طرح عوام کے مختلف

طبقوں میں بھی منافرت پھیل رہی ہے۔ نامعلوم افراد کی فائرنگ سے متاثر ہونے والے لوگ اپنے مخالفین کو اس کا ذمے دار قرار دینے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتے۔ یہ شہر اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا پورا ملک پوری دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ دار کمپنیاں یہاں سرمایہ کاری کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لاتیں۔ عجیب واہیات اور افسوس ناک صورتِ حال ہے۔"

میں نے پوچھا "اس کا کوئی نہ کوئی سدِباب تو ہونا چاہیے نا۔ ایسی تخریبی غیر ملکی قوتوں کو بے نقاب کرنے کے لیے حکومت کو سخت اقدامات کرنا چاہئیں تاکہ عوام میں' اس کی توقیر میں اضافہ ہو۔"

منہاس باقر نے کہا "اگرچہ حکومت ایسی کوششیں کرتی رہتی ہے لیکن یہ اتنا بھی آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ دراصل پرابلم یہ ہے کہ غیر ملکی خود یہاں آکر ہمارے سر پر ڈنڈا نہیں مارتے بلکہ ان کے آلۂ کار ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ اسی ملک' اسی شہر میں رہنے والے مگر غیروں کے ہاتھوں میں بکے ہوئے۔ وہ جس ملک کی فضا میں سانس لیتے ہیں' جس زمین کا اگلا ہوا اناج کھاتے ہیں اور جو ملک ان کی شناخت کا باعث ہے وہ اسی کے سینے کو کھودنے میں مصروف ہیں۔ اغیار کے اشاروں پر وہ اپنے بہن بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ مسٹر وجدان! ایسے دشمن کو تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا جو آپ کے خیر خواہوں کی فہرست میں شامل ہو اور خود کو' آپ سے زیادہ آپ کے دشمن کا دشمن ظاہر کرتا ہو۔ بہرحال۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا "امید ہے' عن قریب سب ٹھیک ہو جائے گا!"

منہاس باقر کی لاتعلقی اور بے پروائی میں ایک گہرا کرب پوشیدہ تھا جو اس کے چہرے کے تاثرات اور حرکات و سکنات سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ ایسے افراد اندر سے بہت دکھی ہوتے ہیں جو کمال ضبط سے دل کے حال کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

ممتاز اور شبانہ کا تو اصرار یہ تھا کہ ہم دونوں بھی رات وہیں' اسی بنگلے پر بسر کریں لیکن میں واپس فلیٹ پر آنا چاہتا تھا لہٰذا انہوں نے میری مرضی کو دیکھتے ہوئے زیادہ ضد نہیں کی اور ہم رات ایک بجے منہاس باقر کے بنگلے سے نکل آئے۔

ہماری اپارٹ منٹس بلڈنگ میں انتظامی سہولیات بہت عمدہ تھیں۔ سیکیورٹی کا نظام بہت فعال تھا۔ مین گیٹ پر انٹرکام سسٹم موجود تھا۔ کوئی بھی ملاقاتی اپنی مرضی سے منہ اٹھائے اندر نہیں آسکتا تھا۔ چوکیدار نما مسلح گارڈ پہلے متعلقہ فلیٹ سے رابطہ کر کے اس ملاقاتی کے بارے میں تصدیق کرتا پھر اسے داخلے کی اجازت ملتی تھی۔ گویا حفاظتی اقدامات کے حوالے سے وہ آئیڈیل رہائش گاہ تھی۔

فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد جب ہم اپنے بیڈ روم میں پہنچے تو وہاں ہمارے لیے حیرت کا سامان موجود تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر تنگ سائز بیڈ کی طرف تکنے لگے۔

بیڈ کے عین وسط میں ایک خوبصورت سفید بلی لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ وہ بیگم کے اس انداز میں مجھے گھور رہی تھی جیسے دیر سے گھر آنے پر کوئی بیوی اپنے شوہر کو دیکھتی ہے۔

"یہ کہاں سے آگئی وجدان!" ساحل نے اچنبھے کی نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہوگی۔" پھر میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔

ساحل بولی "اب اس بدبخت کو بھگاؤ بھی۔ دیکھو تو کتنی ڈھٹائی سے تمہیں دیکھے جا رہی ہے۔"

میں نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے بستر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

"میاؤں۔" بیڈ روم میں ایک مخصوص آواز ابھری۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بلی دھیرے سے مسکرائی ہو۔ بے اختیار میں بھی زیرِ لب مسکرانے لگا۔ اسی وقت اس سفید بلی نے چھلانگ لگائی اور بستر کے نیچے گھس گئی۔

"وجدان! اس چلتر کو فلیٹ سے باہر نکالو۔ ورنہ میں سو نہیں سکوں گی۔" ساحل نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

میں جھک کر بیڈ کے نیچے سے بلی کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ لگ بھگ پانچ منٹ تک میری یہ کوشش جاری رہی بالآخر بلی کو ہار ماننا پڑی اور وہ احتجاجی انداز میں "میاؤں' میاؤں" کرتے ہوئے بیڈ روم سے نکل کر کچن کی جانب دوڑ گئی۔

میں اس کے پیچھے لپکا۔ کچن میں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ وہاں کھڑکی ادھ کھلی تھی۔ بلی اس ادھ کھلی کھڑکی میں بیٹھی تھی۔ میں کچن میں داخل ہونے کے بعد اس کی جانب بڑھا تو وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر الوادعی انداز میں مسکرائی اور باہر کود گئی۔

کھڑکی بند کرنے سے قبل میں نے باہر جھانکا۔ ہمارا فلیٹ آٹھویں فلور پر تھا۔ یہ اچھی خاصی بلندی ہوتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کچن کی کھڑکی کے باہر کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں کودنے کے بعد وہ ٹھہر سکتی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میرے ذہن میں ایک خیال چمکا۔ کیا وہ بلی آٹھویں فلور سے براہِ راست سڑک پر کودی تھی؟

بہ ظاہر یہ ناممکن سی بات نظر آتی تھی۔ میں نے ایک انگلش فلم میں بلی کے ایسے کمالات دیکھے تھے جو بلند ترین مناروں سے بہ سہولت کود کر یہ حفاظتِ زمین پر پہنچ جاتی تھی مگر وہ فلمی بلی تھی اور ہم جیتی جاگتی زندگی میں سانس لے رہے تھے۔

میں اس حیرت انگیز بلی کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر واپس بیڈ روم میں آگیا۔ اس دوران میں ساحل بیڈ کے نزدیک ہی کارپٹ پر ایک شیٹ بچھا چکی تھی۔ جب سے اس نے یوگا کی باقاعدہ پریکٹس شروع کی تھی' سونے سے قبل وہ ایک دو آسن ضرور لگاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا "اس دیدہ دلیر بلی کو نکال دیا نا؟"

"ہاں' اب تم اطمینان سے سو سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

وہ قالین پر بچھی ہوئی چادر پر چت لیٹ گئی۔ میں خاموشی سے واش روم میں گھس گیا۔ دو منٹ بعد جب میں واش روم سے نکلا تو وہ یوگا کا ایک نہایت ہی مفید انداز' ہل آسن (PLOUGH POSTURE) لگائے ہوئے تھی۔

میں ساحل کے پوسچر کی طرف سے نظر چرا کر بستر پر آگیا!

✪✪✪

شعیب غوری کے دستِ راست اور ساؤتھ کے عبوری گران کبیر شاہ نے دوپہر کے وقت مجھ سے رابطہ کرنے کو کہا تھا لیکن اس کا فون آنے سے پہلے ہی ممتاز کی کال آگئی۔ وہ شام میں ہم سے ملنے آنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ تھوڑی دیر بعد میں اسے فون کروں گا۔ اگر ہمیں شام میں کہیں جانا نہ ہوا تو مل بیٹھنے کا پروگرام رکھ لیں گے۔ دراصل جب تک کبیر شاہ سے میری بات نہ ہو جاتی' میں شام یا رات کی کوئی مصروفیت کنفرم نہیں کر سکتا تھا۔

آج رات ہم میاں زاہد حسین کے ساتھ جو کچھ کرنے والے تھے اس مشن میں' میں ساحل کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا اور یہ اچھا ہی تھا کہ ممتاز ہمارے فلیٹ پر آ جاتی۔ اس طرح ساحل کو تنہائی کا احساس نہ ہوتا حالانکہ مجھے امید نہیں تھی' وہ مجھے اکیلا جانے دیتی۔ وہ میرے ساتھ جانے کی ضد ضرور کرتی۔

ہم لنچ سے فارغ ہوئے تو کبیر شاہ کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ چند منٹ پہلے شعیب غوری سے اس کی بات ہوئی تھی۔ وہ مجھے بھی فون کرے گا۔ کبیر شاہ کی زبانی پتا چلا کہ شعیب غوری آج رات واپس نہیں آئے گا لہٰذا ہمیں خود ہی اپنے پروگرام پر عمل کرنا تھا۔ شعیب واپسی پر ہم سے کوئی بڑی خوش خبری سننا چاہتا تھا۔

میں نے کبیر شاہ سے پوچھا "تم کسی محمود لاشانی کو جانتے ہو؟"

"کون محمود لاشانی؟"

"کوئی سیاست داں ہے۔"

وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اس کی آسانی کے لیے کہا "یہ محمود لاشانی ڈیفنس کے بنگلا نمبر "ٹی تھرٹی ایٹ" میں رہتا ہے۔" پھر میں نے اسے مذکورہ بنگلے کی لوکیشن سمجھائی اور کہا "اس بنگلے کے سامنے ایک پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکول بھی ہے۔"

وہ پھڑک اٹھا "تمہیں اس بنگلے کے بارے میں کس نے بتایا ہے؟"

"کیوں کیا ہوا؟" الٹا میں نے اسی سے سوال کر ڈالا "تم محمود لاشانی سے اپنی ناواقفیت ظاہر کر چکے ہو!"

وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا "وجدان! تم نے جس بنگلے کا ذکر کیا ہے' وہی تو ہمارا ٹارگٹ ہے۔ میاں زاہد ہمیں وہیں ملے گا۔"

میں اچھل پڑا "کیا واقعی؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں وجدان۔" کبیر شاہ تصدیقی لہجے میں بولا "اس بنگلے کے سامنے جو پرائیویٹ اسکول ہے وہ ہمارا مورچا ہوگا۔ میں نے اسکول کے چوکیدار کی مٹھی گرم کر کے اسے اس بات کے لیے آمادہ کر لیا ہے کہ وہ رات بھر کے لیے ہمیں اسکول کی عمارت کو استعمال کرنے دے گا۔ وہ لالچی شخص اس بات پر فوراً تیار ہو گیا ہے۔ ویسے بھی آج کل اسکول کی چھٹیاں ہیں اس لیے چوکیدار کو زیادہ پروا نہیں ہوگی۔"

"اگر وہ میاں زاہد حسین کا بنگلا ہے تو اس کے گیٹ پر محمود لاشانی کے نام کی نیم پلیٹ کیوں نصب ہے؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

کبیر شاہ نے بتایا "اب مجھے یاد آیا۔ محمود لاشانی نامی ایک سیاست داں میاں زاہد کا رشتے دار ہے۔ ممکن ہے' میاں زاہد نے کسی مصلحت کی بنا پر اس کی نیم پلیٹ لگا رکھی ہو۔"

"یہ نیم پلیٹ تمہاری نظر سے نہیں گزری تھی؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔" وہ کھسیانا انداز میں بولا "ہم اس بنگلے کو لوکیشن کے اعتبار سے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "تمہارا باس شعیب غوری تو آ نہیں رہا۔ تم نے رات والے مشن کے بارے میں کیا لائحہ عمل بنایا ہے؟"

وہ بولا "لائحہ عمل میں نے باس کے مشورے سے ہی ترتیب دیا ہے۔ تم شام میں ساؤتھ آ جاؤ۔ پھر میں تمہیں تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔ ہم رات کے پہلے پہر ہی اس اسکول میں ڈیرا جما کر بیٹھ جائیں گے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ وغیرہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ ہم اسکول میں رہتے ہوئے پہلے خاموشی سے "بی۔ تھرٹی ایٹ" والوں کی گہما گہمیوں کا نظارہ کرتے رہیں گے پھر مناسب وقت پر اپنی کارروائی کریں گے۔ تم آ جاؤ تو تفصیلاً بات کرتے ہیں۔"

مزید دو چار منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

ساحل کو میں بتا چکا تھا کہ آج رات دشمنوں پر بہت بھاری ہے۔ امتیاز' روبی اور میر بخش کے قاتلوں کو اس رات روئے زمین پر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں ان کو اس طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا کہ ہمارے ساتھیوں کی روحیں بے پناہ سکون محسوس کریں گی اور۔۔۔ یہ ساری کارروائی چوں کہ میاں زاہد کے زیرِ سایہ ہوئی ہے اس لیے میاں جی کی توہین ایسی کم تیسی کر کے رکھ دوں گا۔

ساحل نے پوچھا "ابھی تم نے فون پر شعیب کے خاص آدمی کبیر شاہ سے گفتگو کرتے ہوئے محمود لاثانی اور "بی تھرٹی ایٹ" کا ذکر کیا تھا۔ کیا کچھ معلوم ہوا؟ ممتاز کا تعاقب کروانے والا یہ سیاست داں محمود لاثانی کون ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟"

میں نے جواب میں جب ساحل کو یہ بتایا کہ مذکورہ بنگلے میں میاں زاہد حسین کی رہائش ہے جہاں آج رات وہ اپنی کامیابی پر جشن منا رہا ہے تو میری طرح اسے بھی شدید حیرت ہوئی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے' ہم سب کے دشمن ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہیں۔" پھر اس نے پوچھا "کیا تم نے کبیر شاہ سے محمود لاثانی کے بارے میں کچھ معلوم کیا؟"

"میں نے دانستہ اسے اس حوالے سے زیادہ نہیں کریدا۔" میں نے کہا "جواب میں وہ مجھے بھی کرید سکتا تھا اور میں فی الحال ممتاز کے معاملات اور سی ایف کے کو الگ الگ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر یہ معاملات تو اب یک جا ہو چکے ہیں۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "وجدان! یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ میاں زاہد حسین یا اس کا کوئی آدمی ممتاز میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے' ان لوگوں کی ممتاز سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"یہ بات غور طلب اور فکر انگیز ہے۔" میں نے کہا "خیر' آج کی رات تمام سوالات کے جواب مہیا کر دے گی۔ سب معلوم ہو جائے گا' اس بنگلے کے اندر کون کیا کھچڑی پکا رہا ہے!"

پھر ہمارے درمیان کافی دیر تک حالات حاضرہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں نے ساحل سے کہا کہ اس مشن میں میں اسے اپنے ساتھ رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تو وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا اور نہ ہی ضد۔ نہایت ہی سنجیدگی سے بولی۔

"اگر ممتاز یہاں آ جاتی ہے تو میں رات بھر کے لیے اسے روک لوں گی۔ بہ صورتِ دیگر تم مجھے منہاس باقر کے بنگلے پر چھوڑ دینا۔"

اس نے کتنی سادگی سے اس مسئلے کا حل پیش کر دیا تھا۔ میں نے حیرت' دلچسپی اور لگاوٹ کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا "میرا تو خیال تھا' تم ساتھ جانے کی ضد کرو گی!"

اس وقت میں ساحل کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے نظر چراتے ہوئے بولی "میں تمہارے ساتھ جانے کی ضد کروں گی تو میری وجہ سے خواہ مخواہ تمہاری جان مصیبت میں پڑ جائے گی۔ میری حفاظت کے خیال سے تم ٹینس رہو گے۔ میں اپنی ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔ اس لیے میں فلیٹ پر ہی رہوں تو زیادہ اچھا ہے۔"

وہ اپنی ذات سے مجھے تکلیف نہ پہنچانے کی بات کر رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا' اس کی ذات اب میری ذات میں شامل ہو چکی ہے۔ میں نے کہا "میں کوشش کروں گا' ممتاز رات بھر کے لیے تمہاری پاس رک جائے مگر مجھے امید نہیں ہے' اس کا انکل منہاس باقر اس بات کے لیے تیار ہو خصوصاً تعاقب والے واقعے کے بعد سے وہ لوگ بہت محتاط ہو گئے ہوں گے۔"

ساحل نے دزدیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "میرا خیال ہے' ممتاز تمہاربات نہیں ٹالے گی چاہے اس کے لیے اسے اپنے میزبان انکل کی ناراضی ہی کیوں نہ مول لینا پڑے!"

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا' وہ اس وقت کس فری

ہنسی پر بول رہی تھی۔ ممتاز کی مجھ میں بڑھتی ہوئی دلچسپی ساحل کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے کھل کر اگرچہ اس کی مخالفت نہیں کی تھی تاہم اس قسم کے جذبے چھپائے چھپتے ہیں اور نہ ہی زبان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ انسان کا رویہ اور طرزِ عمل ہر بات کی وضاحت کے لیے کافی ہوتا ہے۔

میں نے اس موضوع کو پھیلانا مناسب نہ سمجھا اور منہاس باقر کے بنگلے کے نمبر ڈائل کرنے کے لیے فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا پھر اس سے پہلے کہ میں ریسیور اٹھاتا' فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

میں نے اپنے "ہیلو" کے جواب میں ایک مانوس آواز سنی "وجدان! آئی ایم رئیلی سوری۔ تمہیں کبیر شاہ سے معلوم ہو چکا ہو گا' میں اس مشن میں تمہارے پاس موجود نہیں ہوں۔"

"ہاں' کبیر شاہ نے مجھے بتا دیا ہے۔" شعیب غوری کی معذرت کے جواب میں' میں نے کہا "تم ٹھیک ٹھاک تو ہو نا؟ جس کام سے ماریشس گئے تھے' وہ ہوا یا نہیں؟ واپسی میں تاخیر کا سبب کیا ہے؟"

"ایک سانس میں تین سوال!" شعیب غوری نے ایک گہری سانس لینے کے بعد کہا "میں بالکل خیریت سے ہوں۔ جس کام سے یہاں آیا تھا وہ ہو گیا۔ واپسی میں تاخیر کا سبب خراب موسم ہے۔ اس اچانک موسمی تبدیلی کی وجہ سے اکثر فلائٹس کینسل کر دی گئی ہیں۔ جو جا بھی رہی ہیں اور وہ اپنے مقررہ وقت سے گھنٹوں لیٹ ہیں۔ آج کے دن میں کسی فلائٹ میں سیٹ نہیں مل سکتی۔ میں انشاءاللہ کل رات میں تمہارے پاس ہوں گا' کراچی میں۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "لیکن تم نے آج کی رات کو ضائع نہیں کرنا۔ میں نے کبیر شاہ کو خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ ویسے مخالف کیمپ میں موجود میرا بندہ تم لوگوں کی مدد اور راہ نمائی کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہو گا۔ میں نے کبیر شاہ کو فرخ سے کنٹکٹ کر دیا ہے۔ اپنی واپسی پر میں بہت بڑی خوشخبری سننا چاہتا ہوں وجدان!"

"تم فکر نہ کرو شعیب۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ کیش ہو گا۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ مجھے محسوس ہوا' میرے لہجے میں سفاکی اتر آئی تھی۔ "تم کل یہاں پہنچ کر خوشخبری نہیں بلکہ خوشخبریاں سنو گے!"

"تمہارے اس پُرعزم اور بااعتماد لہجے نے کلیجے میں ٹھنڈک اتار دی ہے۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولا "ایسے تو تم اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہو' میں تمہیں سمجھتا تا اچھا نہیں لگتا لیکن اس لیے محتاط رہنے کی ہدایت ضرور کروں گا کہ یہ پاکستان ہے۔ یہاں کی پولیس بے گناہوں سے زیادہ مجرموں کا ساتھ دیتی ہے اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے' تم میری بات کو سمجھ گئے ہو گے؟"

"بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "اگر تم نے میاں زاہد کو عبرت ناک انجام سے دوچار کر دیا تو سمجھ لو' تم نے چوہدری نوازش علی کی کمر توڑ دی۔ وہ میاں زاہد کی کارکردگی سے بہت خوش ہے۔ اس نے کراچی کے نیٹ ورک کو بڑی مشاقی سے کنٹرول کر رکھا ہے۔"

میں نے کہا "میں عملاً بھی نوازش علی کی کمر توڑ کر رکھ دوں گا۔"

"انشاءاللہ! ایک دن ایسا ضرور ہو گا۔" شعیب نے معتدل انداز میں کہا "میاں زاہد کا خاتمہ چوہدری نوازش کی دُم پر پاؤں رکھنے کے مترادف ہے۔ وہ اپنے ایک بہترین اور مفید آدمی کی موت پر چکرا کر رہ جائے گا اور پہلی فرصت میں کراچی کا رخ کرے گا' گویا شکار خود چل کر شکاری کے پاس آ جائے گا۔" ایک لمحے کے لیے اس نے توقف کیا پھر نہایت ہی سنجیدہ انداز میں بولا۔

"وجدان! شکار کرنے کے دو بڑے طریقے ہیں۔ نمبر ایک' شکاری کیل کانٹے سے لیس ہو کر شکار کے تعاقب میں لگ جائے۔ جب شکار دوڑ دوڑ کر تھک جائے' رک کر ہانپنے لگے اور گر کر کانپنے لگے تو اسے اپنی مرضی کے مطابق شکار کر لے۔

نمبر دو' شکاری ایک مقام پر مناسب بندوبست کے ساتھ شکار کے انتظار میں سکون سے بیٹھ جائے۔ اس کا بندوبست شکار کو مذکورہ مقام تک لے آئے تو وہ شکار کر لے۔ آج رات کا مشن ایسا ہی طریقہ ہے۔ زاہد حسین کا "بندوبست" چوہدری نوازش کو کراچی پہنچا دے گا جہاں شکاری پہلے سے گھات لگائے بیٹھا ہو گا۔ میں شکار کا یہ طریقہ اپنا تا ہوں۔"

اس کی پوری بات سننے کے بعد میں نے کہا "میرے نزدیک یہ تن آسانی اور سہل پسندی ہے۔ مجھے تو شکار کو دوڑا دوڑا کر گرانے میں مزہ آتا ہے۔ میں چوہدری کی آخری سانس تک اس کے تعاقب میں رہوں گا۔ اسے تڑپا تڑپا کر' سسکا سسکا کر مارنے میں مجھے بہت مزہ آئے گا۔ اتنے بڑے شیطان کو یوں آسانی سے گھیر کر شکار کرنا اس کے شایانِ شان نہیں شعیب!"

"ایز یو وش وجدان۔" شعیب غوری نے کشادہ دلی سے کہا "میں ہر صورت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وش یو گڈ لک۔"

پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہوگیا۔

میں نے اگلے ہی لمحے منہاس باقر کے بنگلے کا نمبر ملایا اور تھوڑی دیر بعد ممتاز لائن پر آگئی۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے ممتاز، تم شام سے تھوڑا پہلے آجاؤ اور کوشش کرو کہ آج کی رات ہمارے پاس رک جاؤ۔"

"تو تم کیا سمجھ رہے ہو، میں دو چار گھنٹوں کی گپ شپ کے لیے آرہی ہوں!" وہ اٹھلا کر بولی۔ اس کے لہجے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ "میں نے انکل باقر سے اجازت لے لی ہے۔ آج کی رات میں تمہارے فلیٹ پر ہی گزاروں گی۔ وہ میری حفاظت کی طرف سے خاصے فکر مند ہیں لیکن میری ضد کے سامنے انہوں نے زیادہ مخالفت نہیں کی۔ وہ تمہارے اس کارنامے سے بہ خوبی آگاہ ہیں جب تم نے مجھے خطرناک ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑا کر بابا کے پاس پہنچایا تھا۔"

ممتاز کی بے باکی اور خود اعتمادی میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میرے بارے میں اس کا رویہ فکر انگیز تھا۔ مدھوری ڈکشٹ سے مشابہ وہ لڑکی اپنے انداز سے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ نئی سرمیں ممتاز کے باپ قاضی سلطان کا رویہ بھی پُرمعنی تھا۔ وہ مجھے برخوردار کی طرح ٹریٹ کرتا تھا اور ہر لمحے مشفق و مہربان نظر آتا تھا۔

چاہت ایک ایسا جذبہ ہے جو پہلی نگاہ ہی میں نظر میں آجاتا ہے۔ ممتاز کے جذبات کو مجھ سے زیادہ ساحل نے محسوس کیا تھا جیسے کسی گھر کا پہرے دار اس گھر کے مکینوں سے پہلے کسی بیرونی خطرے کو بھانپ لیتا ہے۔ ساحل کسی چوکیدار سے کم نہیں تھی!

ممتاز میری معیت میں رات گزارنے آرہی تھی۔ وہ بے چاری یہ نہیں جانتی تھی، میری یہ رات دشمنوں کی میت کے ساتھ گزرنے والی تھی!

○*○

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

میں اس وقت کیپر شاہ کے ساتھ انگلش میڈیم اسکول کی بالائی منزل پر تھا۔ یہاں سے ہم ٹیلی اسکوپ کی مدد سے میاں زاہد کے بنگلے کی ممکنہ حد تک تفصیلات دیکھ سکتے تھے۔ میں اپنی نیلی شیرڈ سادھ ہی میں چھوڑ آیا تھا اور یہاں تک ہم دونوں طاقت ور انجنوں والی دو موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر پہنچے تھے جو اس وقت زیریں منزل پر اسکول کے احاطے میں کھڑی تھیں۔ کیپر شاہ نے لالچی چوکیدار کو ایسا رام کیا تھا کہ وہ ایک رات کے لیے وہاں سے غیر حاضر رہنے پر تیار ہوگیا تھا۔ اسلحے کے نام پر ہمارے پاس دو کلاشنکوفز، ایک ایک پستول اور میری پنڈلی پر موجود وہ خنجر بھی شامل تھا جو امتیاز کے قاتلوں کے خون کا پیاسا تھا۔

ہم نے ٹیلی اسکوپ کو ایک ایسی کھڑکی میں سیٹ کیا تھا کہ باہر سے یا سامنے والے بنگلے سے ہمیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم ہم سب کو بڑی وضاحت سے دیکھ پا رہے تھے۔ اس اسکول میں ٹیلی فون بھی تھا جو زیریں منزل پر آفس میں رکھا تھا۔ کیپر شاہ نے اس کا تار بڑھا کر اسے بالائی منزل پر پہنچا دیا تھا تاکہ کسی قسم کی ہنگامی صورتِ حال میں امدادی کمک کے لیے ساؤتھ سے رابطہ کیا جاسکے۔ میں نے اسکول میں آنے کے بعد اپنے فلیٹ پر فون کرکے ممتاز اور ساحل کی خیر خیریت دریافت کرلی تھی اور ساحل کو اس ٹیلی فون کا نمبر بھی لکھوا دیا تھا تاکہ کسی ایمرجنسی میں وہ مجھے اطلاع دے سکے۔

اب تک سامنے والے بنگلے میں، میں نے جن لوگوں کی آمد و شد دیکھی تھی ان میں میرے کام کے صرف تین ہی افراد تھے۔ اول پستہ قامت میاں زاہد حسین جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مکاری اور سفاکی ٹپکتی تھی۔ دوم یعقوب عرف قوبا جس کی ملکیت گرے پجارو والوں نے میرے ساتھیوں پر فائرنگ کرکے انہیں مجھ سے چھین لیا تھا اور سوم شاکر علی جو وہیل چیئر پر تھا۔ گرین بیلٹ والے بنگلے پر ڈیڑھ ماہ پہلے مرحوم امتیاز علی نے ایک ہلاکت مآب خنجر سے اس کے قدموں میں "زنجیریں" ڈال دی تھیں۔

ان تینوں شیطانوں کے لیے میرے دل و دماغ میں حد درجہ نفرت اور غصہ بھرا ہوا تھا اور آج ان تینوں کو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہونا تھا۔

میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ کیپر شاہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وجدان! میں نے دوپہر میں فون پر تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔ اب میں اسی سوال کو دہرا رہا ہوں کیوں کہ تم نے جواب نہیں دیا تھا۔"

میں ٹیلی اسکوپ کی مدد سے سامنے والے بنگلے کا جائزہ لیتے ہوئے کیپر شاہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"وجدان! تمہیں اس بنگلے کا ایڈریس کس نے بتایا تھا؟ میری معلومات کے مطابق باس نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"تمہاری معلومات درست ہیں کیپر شاہ۔" میں نے بنگلے کی جانب متوجہ رہتے ہوئے کہا "دراصل بات یہ ہے کہ کل رات دو غنڈے میری ایک ساتھی کا تعاقب کر رہے تھے۔ میں نے انہیں گھیر کر جب مرمت کی تو ان میں سے ایک نے بتایا کہ وہ محمود لاشانی کے ایما پر تعاقب کر رہے تھے جو ڈیفنس سوسائٹی کے بنگلہ نمبر "بی۔ تھرٹی ایٹ" میں رہتا ہے۔ اسی حوالے سے میں نے تم سے محمود لاشانی کا پوچھا تھا۔"

"کیا وہ دونوں غنڈے تمہاری ساتھی ساحل کا تعاقب کر رہے تھے؟"

"نہیں، وہ کوئی اور ساتھی تھی۔" میں نے بتایا۔

کیپر شاہ نے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ہمارے درمیان چند لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران میں، میں بہ دستور بنگلے کے احاطے، پہلوؤں اور گیٹ کے سامنے والے تمام مناظر کو باریک بینی سے واچ کر رہا تھا۔ ایک وقت میں ایک ہی شخص ٹیلی اسکوپ سے استفادہ کرسکتا تھا لہٰذا کیپر شاہ کلاشنکوفز کے میگزینز کی چیکنگ میں مصروف تھا۔

میری اس دوربینی (ٹیلی اسکوپک) تاک جھانک میں اچانک ایک گاڑی نے تہلکہ ڈال دیا۔ وہ لمبی چوڑی چمچماتی گاڑی بڑے اسٹائل سے سیاہ گیٹ کے سامنے آکر رکی تھی پھر اس سے پہلے کہ چوکیدار اس کے لیے بنگلے کا گیٹ کھولتا، گاڑی کی پسنجرز سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں اس دراز قامت شخص کو پہلی نظر میں پہچان گیا۔ وہ تارا تھا!

"یہ شیطان یہاں کیسے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

کیپر شاہ نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کس شیطان کی بات کر رہے ہو؟"

میں کیپر شاہ کے سوال کا جواب نہ دے سکا کیوں کہ باہر کے مناظر میں سنسنی خیزی اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں جیسے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ گاڑی کے پچھلے دونوں دروازوں سے دو سوٹڈ بوٹڈ افراد برآمد ہوئے اور ان کے چہروں پر نگاہ پڑتے ہی میں پندرہ سال پیچھے ماضی کی بھول بھلیوں میں پہنچ گیا۔ میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو بھی ٹھیک پہچان لیا تھا لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ وہ ہزاروں میل دور یہاں کراچی میں کیسے پہنچے تھے۔

اسی وقت مجھے اپنے کندھے پر دباؤ محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کیپر شاہ کی آواز میری سماعت میں داخل ہوئی "لگتا ہے، میاں زاہد کے غیر ملکی مہمان آگئے ہیں!"

میرے ہاتھ میں تو ٹیلی اسکوپ تھی۔ میں گاڑی کی ڈکی سے برآمد ہونے والے سوٹ کیسوں کو واضح طور پر دیکھ رہا تھا جن پر لگے سنگاپور ائرلائن کے ٹیگ بتا رہے تھے کہ وہ دونوں سنگاپور سے پاکستان آئے تھے "مگر وہ۔۔۔ وہ تو سنگاپور کی جیل میں تھے!"

یہ جملہ بڑبڑانے والے انداز میں میرے ہونٹوں سے جدا ہوا تھا اور اس بڑبڑاہٹ میں تشویش ناک حیرت شامل تھی۔

"تم نے پہلے کسی شیطان کا ذکر کیا اور اب سنگاپور کی کسی جیل کا تذکرہ کر رہے ہو۔" مجھے اپنی پشت پر کیپر شاہ کی آواز سنائی دی "وجدان! یہ کیا قصہ ہے؟"

تارا کو کراچی میں دیکھ کر مجھے حیرت تو ہوئی تھی لیکن اس سے "ممتاز کے تعاقب" والا معاملہ صاف ہوگیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ تارا ہی نے ممتاز کا سراغ لگانے کے لیے وہ حرکت کی ہوگی کیوں کہ ممتاز کی مضبوط گواہی پر تارا اور روڈیرا اکبر سومرو کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ تارا عمر کوٹ پولیس

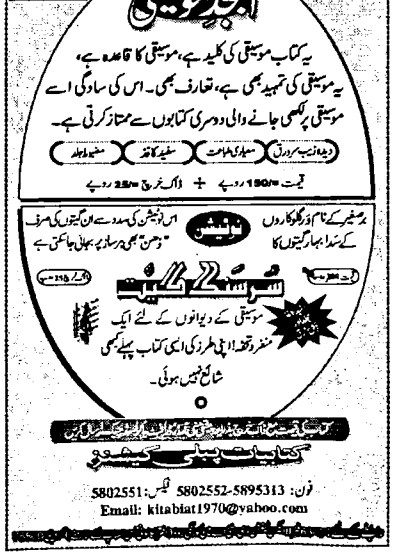
گانا سیکھنے کے لئے نہایت موزوں کتابیں
انجم اقبال کے قلم سے
امجد موسیقی
یہ کتاب موسیقی کی کلید ہے، موسیقی کا قاعدہ ہے، یہ موسیقی کی تمہید بھی ہے، تعارف بھی۔ اس کی سادگی اسے موسیقی پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔
دیدہ زیب سرورق
سفید کاغذ
مضبوط جلد
قیمت 150/- روپے + ڈاک خرچ 25/- روپے
ہر شعبے کے نام ور گلوکاروں
نایاب
اس نوٹیشن کی مدد سے ان گیتوں کی صرف
"دھن بھی ہر ساز پر بجائی جاسکتی ہے"
سُر سنگیت گائیڈ
موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک
منفرد تحفہ۔ اپنی طرز کی ایسی کتاب پہلے کبھی
شائع نہیں ہوئی۔
کتابیات پبلی کیشنز
فون: 5895313 5802552 فیکس: 5802551
Email: kitabiat1970@yahoo.com

کی تحویل میں تھا اور وہ دونوں سنگاپور کی جیل میں۔ میں نے سنگاپور میں انسپکٹر چیانگ شو کی مدد سے دارا کے سنڈیکیٹ کو تہ وبالا کر دیا تھا۔ دارا تو اس آپریشن میں ہاتھ نہیں لگا تھا لیکن اس کے سنڈیکیٹ کے تین عہدے داروں کو چیانگ شو نے چھاپ لیا۔ ایک یورپین عہدے دار پولیس مقابلے میں مارا گیا جب کہ انڈین بھولا ناتھ اور پاکستانی جمال کو پولیس نے گرفتار کرلیا۔ بھولا ناتھ کے قبضے سے دس کلو ہیروئن برآمد ہوئی تھی۔ جمال' اس سنڈیکیٹ کے روحِ رواں دارا کا فرسٹ کزن تھا۔ یہ دونوں سزا پا کر جیل چلے گئے تھے۔ یہ تمام خیالات ایک سیکنڈ میں میرے ذہن سے گزر گئے۔

اس الجھی ہوئی صورتِ حال کو میں خود کچھ سمجھ نہیں پایا تھا' کبیر شاہ کو اس بارے میں کیا بتاتا۔ اس سے پہلے کہ کبیر شاہ دوبارہ اس سلسلے میں استفسار کرتا' فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کبیر نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے کہا "وجدان! تمہارے لیے کال ہے۔"

میں نے یہاں کا فون نمبر صرف ساحل اور ممتاز کو دیا تھا۔ یہ انہی کی کال ہو سکتی تھی۔ الجھے ہوئے ذہن اور دھڑکتے دل کے ساتھ میں ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا۔ ٹیلی اسکوپ میں نے کبیر شاہ کو تھما دی۔

"ہیلو۔" میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف سے ساحل بولی "وجدان! لائٹ چلی گئی ہے۔"

"اس میں ایسی پریشانی کی کون سی بات ہے۔" میں نے اس کے لہجے میں موجود گھبراہٹ کے پیشِ نظر کہا "بلڈنگ میں اسٹینڈ بائی جنریٹر موجود ہے۔ وہ اسے آن کر دیں گے۔"

وہ تشویش ناک انداز میں بولی "پورے فلیٹ میں اندھیرے کا راج ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے سلائیڈنگ ڈور کے پاس جا کر تمہیں فون کیا ہے۔"

میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم ممتاز کی مدد سے دونوں کمروں کے سلائیڈنگ ڈور کھول دو۔ اس کے علاوہ کچن میں جا کر چولھا بھی آن کر دو۔ کچھ نہ کچھ اجالا ہو ہی جائے گا۔"

"ٹھیک ہے' میں کچن میں جا رہی ہوں۔" وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولی "تم ممتاز سے بات کر لو۔ یہ خاصی سہمی ہوئی ہے۔ اس پورے علاقے کی لائٹ ایک ساتھ چلی گئی ہے شاید کوئی ٹیکنیکل فالٹ پیدا ہو گیا ہے۔"

ساحل کا جملہ ختم ہوا تو ممتاز کی آواز میرے کان میں پہنچی "وجدان! یہ تم کس بہت ہی اہم کام میں مصروف ہو۔ جلدی سے یہاں نہیں آ سکتے؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ریسیور میں ساحل کی چیخ ابھری۔ میں نے تڑپ کر ممتاز سے پوچھا "کیا ہوا؟"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" اس کی آواز میں بے پناہ خوف شامل ہو گیا۔

میں نے کہا "وہ' وہ سے آگے بھی تو کچھ بولو۔ ساحل کیوں چیخی تھی؟"

ممتاز نے بہ مشکل اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے بتایا "وجدان! فلیٹ میں ایک۔۔۔ سفید چیتا۔۔۔ گھس آیا ہے۔۔۔ وہ کچن میں۔۔۔ ساحل بھی کچن۔۔۔"

اس کے بعد ممتاز کی آواز معدوم ہو گئی۔ میں پہلے ہی ذہنی طور پر بری طرح الجھا ہوا تھا' یہ ایک نئی افتاد آن پڑی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میں نے چیخ کر ریسیور میں کہا۔

"تم یہ کیا بکواس کر رہی ہو ممتاز۔ کوئی سفید چیتا فلیٹ میں کیسے آ سکتا ہے؟"

دوسری جانب خاموشی رہی۔ مکمل خاموشی۔

میری وحشت جنون کی شکل اختیار کر گئی "تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ میری بات کا جواب دو۔ ہیلو ممتاز! تم میری بات سن رہی ہو نا؟ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو؟"

میری اس "ہیلو ہیلو" کی تکرار کے جواب میں جو آواز ایرپیس میں ابھری اسے سن کر میں پسینے میں نہا گیا۔ جسم کا سارا خون دماغ کو چڑھ کر کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ میری سماعت کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ میرے کان نے یہی مخصوص گونج دار لفظ سنا تھا۔۔۔ "میاؤں"۔

میرے تصور میں وہ غیر معمولی جسامت کی سفید بلی گھوم گئی جس کی برقی جست نے کلاشنکوف بردار کو بے بس کر دیا تھا۔

میں آخری کوشش کے طور پر حلق کی پوری قوت سے چلایا "ممتاز۔۔۔ ساحل۔۔۔ تم تک میری آواز پہنچ رہی ہو؟ تم لوگ خاموش کیوں ہو؟"

میرے اس سوال کا جواب کون دیتا۔ ٹیلی فون کی لائن بے جان ہو چکی تھی۔

میں اس وقت ایک دوراہے پر کھڑا تھا!

وہ دوراہا جو ہینگنگ گارڈن ایسے عجوبے کی مانند ہوا میں معلق تھا۔ اس کے نیچے آگ کا دریا بہہ رہا تھا جس میں مجھے کود کر پار اترنا پڑتا ہے۔ اس دوراہے کی ایک طرف میرے جانی دشمن تھے جنہیں سنگین اتفاق نے یک جا کر دیا تھا۔ دوسری جانب ساحل اور ممتاز تھیں۔ میں انہیں کوئی گزند پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میری ان چاہنے والیوں پر اچانک ایک افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔ انہیں فوری طور پر اس مصیبت سے نکالنا ضروری تھا کیوں کہ ان کی پتا حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تھی۔۔۔ اور دشمنوں پر قہر بن کر نازل ہونے کا یہی موقع بھی بار بار ہاتھ نہیں آتا' میں ہاتھ آئے اس موقع کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا' انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانا اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ سانس لینا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے تک میں ادھر اور ادھر کے بیچ ٹلتا رہا پھر ایک پُرعزم نتیجے پر پہنچ گیا۔ میرے قدم مضبوطی سے زمین پر آگے تھے۔ میں نے اپنے فلیٹ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جان لینے سے جان بچانا زیادہ اہم ہوتا ہے۔

اسی لمحے میرے عقب میں کبیر شاہ کی آواز ابھری۔ وہ مجھے فون پر چیختے ہوئے سن چکا تھا۔ اس نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا "کیا ہوا وجدان' تم اس قدر چلا کیوں رہے ہو۔ خیریت تو ہے نا' کس کا فون تھا؟"

"ساحل کا فون تھا۔" میں اس وقت تک ذہنی طور پر سنبھل چکا تھا "وہاں فلیٹ میں لائٹ چلی گئی ہے۔ وہ سو رہی تھی' گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور پریشانی میں مجھے فون کر ڈالا۔"

وہ شک آمیز نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تمہاری بوکھلائی ہوئی گفتگو میں کسی سفید چیتے کا ذکر بھی آیا تھا۔ یہ کیا سلسلہ ہے وجدان؟"

کبیر شاہ کا شک اور تشویش بجا تھی لیکن میں بھی ایسے سوالوں کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں نے متحمل انداز میں کہا "گھبراہٹ میں بتایا تو ہے' ساحل سو رہی تھی۔ اس نے خواب میں کسی سفید چیتے کو فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھلی تو لائٹ جا چکی تھی۔ اس نے سمجھا' واقعی کوئی درندہ فلیٹ میں گھس آیا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"یہ لڑکیاں بہت ہی جذباتی اور ڈرپوک ہوتی ہیں۔" وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا پھر پوچھا "کیا اب ساحل نارمل ہو چکی ہے؟"

میں نے اندرونی کیفیات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا "نہیں شاہ جی! وہ سخت خوف زدہ ہے۔ مجھے جانا ہو گا۔"

"کہاں جانا ہو گا؟" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"فلیٹ پر۔" میں نے قطعیت سے کہا "میں بس آنا جانا ہی کروں گا۔ تم فکر نہ کرو' میں جلدی لوٹ آؤں گا۔"

وہ بولا "تم نے تو بتایا تھا' کوئی اور لڑکی بھی وہاں فلیٹ پر موجود ہے؟"

"ہاں' ہے تو۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "مگر وہ بھی ساحل کی طرح ایک لڑکی ہے اور تم تو جانتے ہو۔۔۔ لڑکیاں کتنی ڈرپوک ہوتی ہیں!"

میں نے کبیر شاہ کے الفاظ اسی پر لوٹا دیے تو وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے کے بعد گویا ہوا "تو کیا تم ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آ رہے ہو؟"

"یہ رسک تو میں کسی قیمت پر نہیں لے سکتا شاہ جی۔" کبیر شاہ کو عام طور پر "شاہ جی" کہا جاتا تھا اس لیے میں نے بھی یہی انداز تخاطب اختیار کیا "یہ اسکول اور وہ سامنے والا بنگلہ کسی بھی وقت میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر سکتے ہیں۔"

"پھر؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "میں انہیں کہیں اور چھوڑ کر آؤں گا۔ یہ بھی ممکن ہے' ساحل کی ساتھی کے گھر ہی پہنچا آؤں۔"

میں نہیں جانتا تھا' وہاں فلیٹ پر پہنچ کر مجھے کس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ پڑے گا۔ میں تو کبیر شاہ کے اطمینان کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہا تھا تاکہ جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو سکوں۔ میں فی الحال کبیر شاہ کو کھل کر کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے کہا "تم چاہو تو انہیں ساؤتھ بھی چھوڑ کر آ سکتے ہو!"

"دیکھتا ہوں۔" میں نے مبہم انداز میں کہا "جو بھی مناسب ہو گا' کروں گا۔"

آئندہ دو منٹ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے میری موٹر سائیکل فلیٹ کی سمت اڑی جا رہی تھی۔ اس وقت میرا ذہن صرف ایک ہی شے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور وہ شے تھی سفید بلی۔ اس بلی کی انٹری اوپن ائیر ریسٹورنٹ سے ہوئی تھی۔ وہ میرے قدموں کا مزاج پوچھ کر کھسک گئی تھی پھر قدرے بڑی جسامت کے ساتھ بوٹ بیسن والے واقعے میں اس نے ہماری مدد کی۔ ازاں بعد گزشتہ رات وہ ہمارے بیڈ روم میں بھی پائی گئی تھی مگر جب میں نے اسے کھدیڑا تو وہ کچن کی کھڑکی کے راستے نیچے کود گئی تھی۔ مجھے

اس کی "کود" پر شدید حیرت بھی ہوئی تھی۔ آٹھواں فلور اچھی خاصی بلندی پر تھا۔ بلی کا وہاں سے چھلانگ لگانا خاصا خطرناک تھا جب کہ وہ کہیں آس پاس بھی نظر نہیں آئی تھی۔ کھڑکی سے نیچے سڑک تک اس کے "قیام" کے لیے کوئی "مقام" بھی دکھائی نہیں دیتا تھا اور اب..... فلیٹ میں کہیں سفید چیتے کی آمد..... اور وہ بھی کچن کی کھڑکی کے راستے؟

یہ ایک عجیب و غریب معما تھا۔ چیتا..... اور وہ بھی سفید! سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ شہر کے انتہائی پوش اور محفوظ حصے میں جنگلی درندے کا کیا کام' پھر میں نے آج تک سفید چیتے کے بارے میں کہیں سنا تھا اور نہ پڑھا تھا۔ انہی سوچوں میں الجھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک سنسنی خیز سوال نے سر ابھارا۔

"کہیں یہ سارے روپ ایک ہی بلی کے تو نہیں! وہ موقع اور وقت کی مناسبت سے اپنی جسامت میں کمی بیشی کر لیتی ہو؟"

اس خیال کے ساتھ ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بہ ظاہر ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی بلی اپنی جسامت میں تبدیلی پر کیسے قادر ہو سکتی ہے..... اور اگر یہ حقیقت تھی پھر وہ بہت ہی پُراسرار بلی تھی۔ پتا نہیں' وہ بلی تھی بھی یا نہیں!

ڈرائیونگ کے دوران میں وہ عجوبہ روزگار بلی میرے تصور میں سمائی رہی۔ کبھی وہ نوازئیدہ بلونگڑے کی شکل اختیار کر لیتی اور کبھی اس کی جسامت اس قدر بڑھ جاتی کہ غراتا' دہاڑتا چیتا دکھائی دیتی۔ میں انہیں پراگندہ خیالات کے ساتھ اپارٹ منٹس بلڈنگ تک پہنچ گیا۔

وہ بلڈنگ اور گرد و نواح کا سارا علاقہ روشن تھا۔ یعنی لائٹ آگئی تھی۔ میں نے سیکیورٹی گارڈ کے سلام کا جواب دیا اور اس سے کسی قسم کا استفسار کیے بغیر لفٹ کے ذریعے آٹھویں فلور پر پہنچ گیا۔ ڈور بیل کے جواب میں ممتاز نے دروازہ کھولا۔

اس کا چہرہ خوف اور تشویش کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا "کیا ہوا تھا؟"

"اندر تو آؤ' سب بتاتی ہوں۔" وہ اضطراری انداز میں بولی۔

میں نے فلیٹ کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور ممتاز کے ساتھ چلتے ہوئے استفسار کیا "ساحل کہاں ہے..... اور وہ چیتا.....؟"

میری بات ختم ہونے تک ہم بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ ساحل بیڈ پر نیم دراز تھی اور اس کی سنجیدگی پہلے سے ہزار گنا بڑھ چکی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی' ساحل کی اس سنجیدگی میں خوف کے بجائے متانت تھی جس نے اس کی گہرائی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

میں نے جب ان سے سفید چیتے کے حوالے سے پوچھ تاچھ کی تو انہوں نے باری باری مجھے اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ ساحل نے بیچ میں کہیں کہیں گرہیں لگائی تھیں ورنہ زیادہ تر باتیں ممتاز کی زبانی مجھ تک پہنچیں۔

ان کے مطابق' وہ دونوں ٹی وی کے سامنے بیٹھی کوئی دلچسپ گیم شو دیکھ رہی تھیں کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ اس پورے علاقے کی لائٹ غائب ہو گئی تھی اس لیے فلیٹ کے اندر گھپ اندھیرے نے ڈیرا جما لیا۔ اسٹینڈ بائی جنریٹر کی سہولت کے باعث چوں کہ اطمینان تھا اس لیے ہم نے فلیٹ کے اندر کسی ایمرجنسی لائٹ کا بندوبست بھی نہیں کیا تھا۔ فلیٹ کے باہر لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ جنریٹر میں کوئی فالٹ ہو گیا ہے چنانچہ ساحل نے فوراً مجھے فون کر دیا اور جب وہ میرے مشورے پر چولھا جلانے کچن کی طرف گئی تو اسی وقت کچن کی کھڑکی میں سے ایک سفید چیتا جست بھر کر اندر گھس آیا تھا جسے دیکھ کر ساحل کی چیخ نکل گئی اور شدید خوف کے باعث ممتاز کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ میرے ٹیلی فونک سوالات کے جوابات نہ دے سکی۔

ان کی فراہم کردہ معلومات سے میری تشفی نہ ہوئی۔ میں نے ممتاز سے پوچھا "تم فون چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں؟"

میری آمد کے بعد اس کا خوف نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی "میں نے جیسے ہی اس چیتے کو ساحل کی طرف بڑھتے دیکھا تو میرے اعصاب مفلوج ہو کر رہ گئے۔ میں تمہارے سوالات کے جواب میں بھی کچھ نہ بول سکی۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔"

میں نے پوچھا "اس سفید چیتے نے تم میں سے کسی کو نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

دونوں نے باری باری نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "وہ چیتا اب کہاں ہے؟"

اس سوال سے پہلے میں نے فلیٹ کے کونے کونے میں اچھی طرح جھانک لیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "شاید تمہیں ہماری بات کا یقین نہ آئے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے چیتے کو دیکھ کر بے ساختہ چیخ ماری تھی اس کے فوراً بعد لائٹ آگئی اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ فلیٹ

روشن ہوتے ہی سب کچھ معمول پر تھا۔ میں نے محتاط قدموں سے بیڈ روم میں آ کر دیکھا۔ ممتاز قالین پر خوف زدگی کے عالم میں پڑی تھی۔ مجھے صحیح سالم دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ہم نے ہمت کر کے ہر کمرے میں جا کر دیکھ لیا مگر وہ خوں خوار جانور ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔

ساحل مجھ سے جھوٹ بول سکتی تھی اور نہ ہی فینٹسی میں فکشن کی آمیزش کر سکتی تھی' اس نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہی بیان کر رہی تھی۔ سفید چیتے کی آمد اور شد واقعی حیرت ناک اور ناقابلِ یقین تھی۔ میں نے ممتاز کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جب تم دونوں ٹی وی دیکھ رہی تھیں تو فلیٹ کا داخلی دروازہ بند تھا؟"

یہ سوال میں نے اس امکان کے پیشِ نظر کیا تھا کہ اگر دروازہ کھلا تھا تو چیتا وہاں سے "رخصت" ہو سکتا تھا اگرچہ مجھے اس امکان کی قطعی کوئی امید نہیں تھی۔

ممتاز نے جواب دیا "مجھے اچھی طرح یاد ہے تمہارے جاتے ہی ہم نے دروازے کو اندر سے لاک کر لیا تھا۔ یہ بات میں اتنے وثوق سے اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے دروازہ بند کیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے' چیتا دروازے سے باہر نہیں گیا۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

ساحل گمبھیر انداز میں بولی "ممکن ہے' وہ کچن کی کھڑکی میں سے واپس چلا گیا ہو!"

"ہاں' یہ ممکن ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "جیسے وہ گزشتہ رات اس کھڑکی سے باہر کود گئی تھی۔"

ساحل نے چونک کر مجھے دیکھا اور پیشانی سہلاتے ہوئے بولی "جدعان! مجھے یاد آ رہا ہے۔ اس سفید چیتے کی شکل بلی ہی کی طرح تھی۔"

میں ساحل کی بات کو یہ سوچ کر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ بلی اور چیتے کی صورت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا اور خوف و دہشت کے عالم میں تو یہ فرق اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس نے ٹیلی فون پر اپنے کان سے ایک مخصوص قسم کی گونج ٹکرانے کی "میاؤں" سنی تھی۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا اور آسان نہیں دکھائی دیتا نظر آ رہا تھا۔ اس واقعے میں بہت سارے پُراسرار عوامل بھی شامل تھے۔ میں نے ہندوستان سے نیپال اور نیپال سے ہمالیہ کی گود تک سفر کے دوران میں سفلی اور علوی علوم و فنون کے اتنے کمالات دیکھے تھے کہ میری نگاہ میں بہت سے اسرار و رموز سے پردے اٹھ گئے تھے۔ یوگی گوتم بھوش اور اس کا چیلا پنڈت دھیراج واہے تخلیق کرنے کے ماہر تھے۔ وہ اپنی پُراسرار شکتیوں سے محیّر العقول واقعات کو جنم دیتے تھے۔ کومپو کی عبادت گاہ میں کیسا کیسا طلسم میری نظر سے گزرا تھا۔ تلکو قبیلے کی سردارنی کاشی' اندھا راہ نما توبان اور ہمالیہ کی سپر شکتی نیلگری میری چشمِ تصور میں گھوم گئے۔

نیلگری کے لمحاتی خیال نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں اپنے اس اندرونی اضطراب کو فوری طور پر کوئی نام نہ دے سکا اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔ میرا یہ عمل میکانکی تھا۔ ساحل نے چونک کر پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو وجدان؟"

"میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔"

"کیا تم فلیٹ سے باہر جانا چاہتے ہو؟" ممتاز نے سوال کیا۔

"ہاں' میں ذرا سیکیورٹی گارڈ کے پاس جا رہا ہوں۔" ساحل نے کہا "سیکیورٹی گارڈ سے تو یہاں بیٹھے بیٹھے بھی بات ہو سکتی ہے۔ فلیٹ میں انٹرکام سسٹم موجود ہے۔"

"ہاں' سسٹم کی موجودگی میرے علم میں ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "میں گھوم پھر کر کچھ اور بھی دیکھنا چاہتا ہوں' محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارے غیاب میں اگر دوبارہ لائٹ چلی گئی تو؟" ممتاز نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔

"اب لائٹ نہیں جائے گی۔" میرے لہجے میں بلا کی سختی اور تیقن تھا۔

ممتاز نے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

میں نے ایک نظر ساحل کی طرف دیکھا اور فلیٹ سے باہر آ گیا۔

میں مختلف فلورز پر لفٹ سے باہر نکلتا رہا' سوار ہوتا رہا پھر ایک چکر کار پارکنگ کا لگایا اور کوشش کی وہاں سے گزروں جہاں دو چار افراد کھڑے ہوں۔ یہ ساری مشقت میں اس لیے کر رہا تھا کہ اگر واقعی اس بلڈنگ میں کوئی سفید چیتا گھس آیا تھا تو آیا کسی اور نے بھی اسے دیکھا تھا! چیتے کی آمد پر جو افراتفری اور کھلبلی مچنا چاہیے تھی وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ "چیتے کی کہانی" میرے فلیٹ کے اندر سے شروع ہو کر اندر ہی ختم ہو گئی تھی۔ بلڈنگ کی "سیر" کے بعد میں سیکیورٹی گارڈ کی طرف چلا گیا اور اس سے جنریٹر کے فالٹ سے متعلق پوچھا۔

"صاحب! مشین تو پھر مشین ہے نا۔" وہ فلسفیانہ انداز

میں بولا "اور الیکٹریکل مشین تو کچھ زیادہ ہی ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے حالانکہ میں روزانہ اسے چیک کرواتا ہوں۔ پتا نہیں' اسے کیا ہو گیا تھا!" ایک لمحے کا توقف کرکے اس نے معذرت خواہانہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا "بہرحال' میں نے دو تین منٹ میں اس کا نقص ٹھیک کروا دیا تھا اور اس سے پہلے کہ جنریٹر کو آن کیا جاتا' لائٹ آگئی۔ بہ مشکل دس منٹ تک بلڈنگ میں اندھیرا رہا ہوگا۔"

میں اپنی تفتیش مکمل کرکے واپس فلیٹ میں آگیا۔

ممتاز نے پوچھا "کچھ پتا چلا اس درندے کے بارے میں؟"

"اس بلڈنگ میں تم دونوں کے سوا کسی تیسرے شخص نے کوئی درندہ نہیں دیکھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "کیوں کہ چیتا نامی کوئی جنگلی حیات نہ تو بلڈنگ میں داخل ہوئی ہے اور نہ ہی یہاں سے رخصت ہوئی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے کہا "میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں ممتاز۔"

"مگر میں نے خود..... میرا مطلب ہے' ہم دونوں نے اپنی آنکھوں سے ایک چیتے جاگتے سفید چیتے کو دیکھا ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آرہا تو ساحل سے....."

"مجھے تمہاری بات کا صد فی صد یقین ہے ممتاز۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم دونوں نے جو کچھ بتایا ہے وہ غلط نہیں لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بھی سچ ہے۔"

"وجدان! یہ کیسے ممکن ہے؟" ممتاز کی الجھن بڑھ گئی۔

اس کے برعکس ساحل کا چہرہ پُرسکون تھا تاہم وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں نے ممتاز کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"انسانی آنکھ بعض اوقات دھوکا کھا جاتی ہے۔ وہم کو حقیقت سمجھ لیتی ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ بھی دھوکا ہوا ہے۔ تم جس شے کو سفید چیتا' سمجھ رہی ہو وہ چیتا نہیں' کچھ اور تھا۔"

"کچھ اور تھا..... کچھ اور کیا؟" ممتاز کی الجھن اضطراب میں بدل گئی۔

ساحل نے سمجھانے والے انداز میں کہا "ممتاز! تم اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ نہ ڈالو اور فی الحال اس "چیتے" کی سوچ کو جھٹک دو۔ یہ پُراسرار چکر تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

ساحل کی بات سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ اس معاملے کی تہ میں اتر چکی تھی۔ میں نے ممتاز سے کہا "کل میں نے ریسٹورنٹ میں تم سے ایک وعدہ کیا تھا' والیں میں تمہارے انکل کے بنگلے پر آنے کا۔ آج تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"وعدے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ سادگی سے بولی "تم جو کہو' میں کرنے کو تیار ہوں۔ ویسے کل رات والا وعدہ تم نے شبانہ سے کیا تھا!"

"بہ ظاہر ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "لیکن درحقیقت وہ وعدہ میں نے تمہاری وجہ سے کیا تھا۔"

وہ خوش ہوتے ہوئے بولی "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اگر تم نے میری خاطر شبانہ سے وعدہ کیا تھا تو پھر میں آنکھیں بند کرکے تمہارا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔ بولو' کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

میں نے ممتاز کو خوف و دہشت کی کیفیت سے نکالنے کے لیے وہ وعدے کا چکر چلایا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا' میری یہ کوشش خاصی حد تک کامیاب رہی تھی۔ وہ اب نارمل انداز میں بات کر رہی تھی۔

میں نے کہا "ممتاز! اس فلیٹ میں جو کچھ ہوا' اسے ذہن سے جھٹک دو۔ چیتے والی حیرت انگیز کہانی صرف اور صرف تم تک محدود رہے گی۔ تم اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کرو گی' خصوصاً اپنے اخباری انکل (منہاس باقر) کے سلسلے میں تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

میں نے منہاس باقر کا تذکرہ خاص طور پر اس لیے کیا تھا کہ وہ ایک شام کے اخبار کے ایڈیٹر و پبلشر تھے۔ شام کے اخبارات چٹپٹی اور مسالے دار خبروں کے حوالے سے بہت مشہور ہیں۔ معمولی سی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور بعض اوقات بے بنیاد خبریں شائع کرنا ان کے معمول میں شامل ہوتا ہے۔ اگر منہاس باقر تک سفید چیتے کی کہانی پہنچی تو وہ فوری طور پر میرے کندھوں کو استعمال میں لے آتا۔ اس مرچ مسالے والی خبر سے خواہ مخواہ ہماری تشہیر ہوتی اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں ممتاز اور ساحل کے سوا کسی اور شخص نے اس طلسماتی چیتے کو نہیں دیکھا تھا۔ میرے حوالے سے یا ممتاز اور ساحل کے بیان کے ساتھ ایسی کوئی ناقابلِ یقین خبر اخبارات کی زینت بنتی تو اس بلڈنگ میں ہماری شخصیت خاصی متاثر ہوتی۔ لوگ تمسخرانہ نظروں سے ہمیں دیکھنے

لگتے۔ ممتاز کو اور دو نمبر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے۔

ممتاز نے میری تاکید کے جواب میں کہا "ٹھیک ہے ساحل! یہ کہانی صرف میرے ذہن کے اندر محفوظ رہے گی اور میں وعدہ کرتی ہوں' آج کے بعد میں مجھے اس سفید چیتے کی حقیقت سے آگاہ کرو گے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پُراسرار انداز میں کہا "مجھے یقین ہے' تمہارے پاس اس کی بھرپور توجیہہ موجود ہے!"

اس کے لہجے میں شامل اعتماد کو دیکھتے ہوئے میں نے اس سلسلے میں اسے تفصیل سے آگاہ کرنے کی ہامی بھر لی۔ ساحل نے کہا "اب تم فوراً تیار ہو جاؤ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

دیوار گیر کلاک کی سوئیاں نصف شب گزرنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ ساحل نے مجھ سے پوچھا "کیا تم واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"ہاں' میں جس کام سے گیا تھا' وہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔" میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں کہا تاکہ ساحل میری بات سمجھ جائے۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "تم تو ممتاز کو بھی فوراً تیار ہونے کو کہہ رہے ہو۔ کیا یہ بھی تمہارے ساتھ جائے گی؟"

"تم دونوں میرے ساتھ چلو گی۔" میں نے کہا "میں منہاس باقر کے بنگلے پر چھوڑ کر اپنے دوستوں کی طرف چلا جاؤں گا۔"

ممتاز نے کہا "اگر تم ہمیں ہمارے پاس رک جاتے تو بہتر تھا۔ کیا تمہارا اپنے ان دوستوں کے پاس جانا بہت ضروری ہے؟"

"بہت ضروری۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی "پھر تو کوئی بات نہیں ہے۔"

ممتاز لباس تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں گئی تو ساحل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے پُرسوچ انداز میں کہا "وجدان! مجھے تو لگتا ہے' تمہارے ساتھ پھر کوئی پُراسرار واقعہ رونما ہونے والا ہے۔"

"اور میرا خیال ہے' یہ چکر شروع ہو چکا ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

ہم دونوں دھیمے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میرے انداز کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا "مجھے یقین ہے' وہ سفید چیتا ہمارے سوا کسی اور کو دکھائی نہیں دیا ہوگا۔ اس سلسلے میں میرا ذہن بار بار اسی کم بخت بلی کی طرف جا رہا ہے۔ وجدان! وہ کوئی عام سی بلی نہیں تھی۔"

"تم بھی بالکل میرے ہی انداز میں سوچ رہی ہو۔" میں نے تائیدی لہجے میں کہا "اگر یہ سب چکر اسی بلی کا چلایا ہوا ہے تو پھر ماننا ہوگا' وہ کوئی طلسماتی جانور ہے۔ وہ بہ وقتِ ضرورت اپنی جسامت میں کمی بیشی کرنے پر قادر ہے لیکن اس کا رویہ مجھے الجھا رہا ہے۔"

"مثلاً تمہارے ذہن میں کس قسم کی الجھن ہے؟"

میں نے کہا "بوٹ بیسن والے واقعے میں اس نے ایک دوست کا کردار ادا کیا تھا اور اب اس نے تم دونوں کو خوف زدہ کرکے ثابت کیا ہے کہ اس کا انداز معاندانہ ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے وضاحتی لہجے میں کہا "ہمارے سارے اندازے اور قیاسات کی بنیاد اس بات پر ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ سارے کردار ایک ہی حیرت انگیز بلی نے ادا کیے ہوں۔"

وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی "وجدان! اس معمے کو جلد از جلد حل کرنے کی کوشش کرو۔ میں اپنے اندر بہت اضطراب اور بے کیفی محسوس کر رہی ہوں۔"

"تم فکر نہ کرو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "بہت جلد سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ پہلے میں وہ کام نمٹا لوں جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ آج کی رات بہت اہم ہے ساحل' بہت اہم۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو' میاں زاہد حسین کے بنگلے پر کیسے کیسے "پیس" اکٹھا ہو چکے ہیں۔"

"لارڈ بدھا تمہاری حفاظت کرے۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

اسی وقت ممتاز واش روم سے نکل آئی۔ اگلے پانچ منٹ میں ہم تینوں اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر تھے۔ میری نیلی شیرڈ تو سامنے سڑک میں کھڑی تھی۔ یہاں میں موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ چائنا ٹاؤن کے کارنر سے میں نے ان دونوں کو ایک ٹیکسی میں بٹھایا اور خود موٹر سائیکل پر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

جب ہم بنگلے پر پہنچے تو منہاس باقر وہاں موجود تھا۔ میں نے راستے میں اس اچانک "آمد" کا جواز سوچ لیا تھا۔ باقر کے استفسار پر میں نے بتایا "انکل! ادھر تو لائٹ چلی گئی اور جنریٹر خراب پڑا ہے۔ یہ دونوں بہت بوریت محسوس کر رہی تھیں۔ بجلی کی واپسی کا انتظار کرنے کے بجائے میں انہیں یہاں لے آیا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" وہ معتدل انداز میں بولا

"لائٹ سخت ناقابلِ اعتبار چیز ہو کر رہ گئی ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ لگژری اپارٹمنٹس بلڈنگ والوں کے اسٹینڈ بائی جنریٹر بھی ایسے مواقع پر اکثر دھوکا دے جاتے ہیں۔ خیر تمہارا فیصلہ مجھے پسند آیا۔ تم لوگ یہاں آرام سے رہو گے۔"

منہاس باقر مختصر اور ٹودی پوائنٹ بات کرنے کا عادی تھا اس لیے اس سے زیادہ دیر گفتگو ممکن نہیں تھی ویسے بھی میں اپنے پیچھے جو صورتِ حالات چھوڑ آیا تھا' اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ منہاس باقر کے بنگلے سے نکلنے سے قبل مجھے چند لمحات کے لیے ساحل سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔

وہ موجودہ حالات کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ تھی۔ میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی "اپنا خیال رکھنا وجدان!"

اس کی انتہائی گہری سنجیدگی میں چھپے ہوئے جذبات کو میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ جذبات میرے لیے تھے اور اتنے بھرپور تھے کہ اس کا گریز اور بے اعتنائی بالکل مصنوعی ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ذومعنی انداز میں کہا۔

"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اب تم میرا خیال نہیں رکھو گی؟"

اس کے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے وہ اندر سے تڑپ کر رہ گئی ہو پھر وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی "مم ـــ میرا یہ مطلب نہیں تھا ـــ ظاہر ہے' تم وہاں اکیلے جا رہے ہو ـــ تمہیں خود ہی اپنا خیال رکھنا ہو گا۔"

"میں تمہیں اس آگ میں نہیں جھونک سکتا ساحل!" میں نے چٹانی لہجے میں کہا "وہاں کچھ بھی پیش آ سکتا ہے۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ میں تم پر آنچ آتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ تم یہاں محفوظ ہو' یہ خیال مجھے بہت تقویت دے گا اور پوری حاضر دماغی سے میں اپنے دشمنوں سے نمٹ سکوں گا۔"

"لارڈ بدھا تمہاری حفاظت کرے گا" وہ یہ کہتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھ آئی۔

ہمارے درمیان فاصلہ صفر کے برابر ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے کی سانسوں کی تپش اپنے چہروں پر محسوس کر رہے تھے۔ وہ بہت ہی جذباتی اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ ہم دونوں ہی سنجیدہ تھے اور ہماری سنجیدگی میں طلب کی تڑپ موجود تھی۔ میں کسی پیش رفت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے پہل کر دی۔

ساحل نے دونوں ہاتھوں سے میرے چہرے کو تھام کر تھوڑا نیچے جھکایا پھر یکبارگی اپنے احمریں ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کر دیے۔ اس کی یہ حرکت میکانکی اور غیر متوقع تھی۔ ردِعمل کے طور پر میں نے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں باندھ لیا۔ میرے سینے میں اس کی محبت کا سمندر موجزن تھا۔ اس سرکش سمندر کی بے تاب لہریں ساحل سے ہم کنار ہونے لگیں' اس کے سینے پر سر ٹیک کر اپنے دل کا احوال سنانے لگیں۔

ساحل اور موجوں کا ملن بڑا لمحاتی اور عارضی ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہہ کر واپس سمندر میں جا ملتی ہیں۔ مجھے بھی ساحل سے جدا ہونا پڑا۔ میں نے اس کے بوسے کی گنگناتی شیرینی کو اپنے تن بدن میں اتارا' اسے ایک بھرپور الوداعی نظر سے دیکھا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں اس بنگلے سے اس طرح نکلا تھا جیسے جسم سے جان نکلتی ہے۔

✪✪✪

انگلش میڈیم پرائیویٹ اسکول میں آمد و شُد کے لیے ہم عمارت کا عقبی گیٹ استعمال کر رہے تھے۔ اسکول کے سامنے وہ بنگلا تھا جہاں اچانک میرے کئی دشمن جمع ہو گئے تھے لہٰذا ان سے شانی نمٹاؤ کے لیے احتیاط کی ضرورت تھی۔ جب میں کبیر شاہ کے پاس پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"شاہ جی! کیا خبریں ہیں؟"

"یہاں تو ابھی تک سب خیریت ہے' سوائے ایک دو تبدیلیوں کے" اس نے کہا "تم سناؤ' ادھر کی کیا رہی' تم چڑیل افراتفری میں یہاں سے روانہ ہوئے تھے؟"

میں نے کہا "وہی ہوا جو میرا اندازہ تھا۔ ساحل نے خواب میں ایک چیتے کو فلیٹ میں گھس کر اودھم مچاتے دیکھ لیا تھا۔ بہرحال میں ان دونوں کو اپنے ایک کرم فرما کے گھر چھوڑ آیا ہوں" پھر میں نے اس سے پوچھا "تم نے یہاں ہونے والی ایک دو تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے' ایسا کیوں ہو گیا؟"

"وجدان! تم نے کسی شیطان کی آمد کا ذکر کیا تھا؟" کبیر شاہ نے بتایا "وہ شیطان اس بنگلے سے رخصت ہو چکا ہے۔"

میں چونک اٹھا۔ کبیر شاہ تارا کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک نیلی گاڑی میں تارا اور دو غیر ملکی مہمان بھولا ناتھ و جمال ان بنگلے پر پہنچے تھے۔ میں خود ان کی آمد پر سخت حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ تارا عمرکوٹ پولیس کی تحویل میں تھا اور سنگاپور والے

وہ دونوں افراد جیل میں تھے۔ اچانک ان تین افراد کو ایک ساتھ یہاں کراچی میں دیکھنا انتہائی پُرتجسس اور حیران کُن تھا اور اب کیپٹن شاہ مجھے بتا رہا تھا کہ تارا وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔ تارا کو دیکھ کر میرے منہ سے "شیطان" کا لفظ ادا ہوا تھا اسی لیے کیپٹن شاہ بھی اسے شیطان ہی کہہ رہا تھا۔

کیپٹن شاہ کے انکشاف نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا "کہاں چلا گیا وہ شیطان؟"

"یہ بتانا تو فی الحال میرے لیے ممکن نہیں وجدان؟"

"کیا وہ اکیلا ہی گیا ہے یا غیر ملکی مہمان بھی اس کے ساتھ ہی چلے گئے ہیں؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا اور ٹیلی اسکوپ سے سیاہ گیٹ والے بنگلے کا جائزہ لینے لگا۔

کیپٹن شاہ نے بتایا "وہ اکیلا گیا ہے اور نہ ہی غیر ملکی مہمان اس کے ہمراہ گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

کیپٹن شاہ بولا "وہ شیطان۔ نام کیا ہے' اس شخص کا؟"

"تارا" میں نے بتایا۔

"ہاں' تارا کے ساتھ ایک نوجوان بھی یہاں سے گیا ہے" وہ جواب دیتے ہوئے بولا۔ "اور وہ دونوں لگ بھگ آدھا گھنٹا پہلے ایک سیاہ لینڈ کروزر میں یہاں سے رخصت ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ گاڑی میں ڈرائیور بھی تھا۔"

میں نے مذکورہ نوجوان کا حلیہ دریافت کیا۔ کیپٹن شاہ کے جواب پر میں نے اپنی یادداشت کو کھنگالا مگر اس وضع قطع کا کوئی شخص مجھے یاد نہ آسکا۔ میں نے پوچھا "اور ان سنگاپورین مہمانوں کی کیا خبر ہے جو تارا کے ساتھ گاڑی میں یہاں پہنچے تھے؟"

"وہ جب سے بنگلے میں گئے ہیں' ان کی جھلک دکھائی نہیں دی۔"

میں اس نوجوان کے بارے میں سوچنے لگا جو تارا کے ساتھ لینڈ کروزر میں بیٹھ کر گیا تھا۔ اسی سوچ کے دوران میں مجھے شعیب غوری کے اس آدمی کا خیال آگیا جو مخالف کیمپ میں ہمارے لیے کام کر رہا تھا۔ فرخ خان نامی وہ شخص سامنے والے بنگلے میں موجود تھا۔

میں نے کیپٹن شاہ سے پوچھا "فرخ کی جانب سے کیا اطلاعات ہیں؟"

"تمہارے جانے کے بعد اس کا فون آیا تھا" کیپٹن شاہ نے بتایا "اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس وقت بنگلے میں میاں زاہد حسین' شاکر علی' قوبا' دو سنگاپورین مہمان کے علاوہ دو گھریلو ملازم اور دو سیکیورٹی گارڈز موجود ہیں۔ ازیں علاوہ تین ایسی عورتیں بھی بنگلے میں بلائی گئی ہیں جو شعر کی معروف کال گرلز ہیں۔ یہ رات وہ بنگلے پر ہی گزاریں گی۔ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ وہ تینوں رات بھر کس قسم کی مصروفیات میں مشغول رہیں گی۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔ میں ٹیلی اسکوپ کو ہاتھ میں تھامے اسی کی جانب متوجہ تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے' فرخ کا فون تارا اینڈ کمپنی کی روانگی کے بعد آیا تھا کیونکہ اس بیان میں ان لوگوں کا کوئی ذکر نہیں!"

"ہاں' ان کے روانہ ہونے کے فوراً بعد۔" اس نے تصدیق کی۔

"دوبارہ وہ کب کال کرے گا؟"

"اب وہ کال نہیں کرے گا" کیپٹن شاہ نے بتایا "پہلے بھی اس نے بہت بڑا رسک لے کر وہ معلومات دی ہیں۔ اس نے کہا ہے' جیسے ہی بنگلے کی صورتِ حال ہماری "کارکردگی" کے لیے "سازگار" ہو گئی' وہ ہمیں اس طرح فون کرے گا کہ بس پہلی گھنٹی بجتے ہی رابطہ منقطع کر دے گا۔ یہ اس کی طرف سے ایک سگنل ہوگا۔ اس کے بعد ہمیں فوراً حرکت میں آنا ہوگا۔"

رات دو بجے تک ہمارے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ کیپٹن شاہ نے شعیب غوری کے لیے بہت سے کارنامے سرانجام دیے تھے۔ وہ مجھ سے بھی مختلف سوالات کرتا رہا جن کے میں مناسب اور محتاط جواب دیتا رہا۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہم دونوں نے چونک کر ٹیلی فون سیٹ کی جانب دیکھا۔

ایک گھنٹی کے بعد فون خاموش ہو گیا۔ ہمارے عمل میں آنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ آئندہ پانچ منٹ میں ہم اسکول کی عمارت سے نکل کر سیاہ گیٹ والے بنگلے کے عقب میں پہنچ گئے۔ اس طرف رات کے سناٹے کا راج تھا۔ ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ عقبی دیوار پھاند کر ہم بنگلے کے اندر داخل ہوں گے اور سب سے پہلے سیکیورٹی گارڈز کو پایا جائے گا' اس کے بعد گھریلو ملازموں کی باری آئے گی۔ میں اپنی موٹر سائیکلز کو عقبی دیوار کے ساتھ ایک درخت کے ساتھ کھڑا کیا اور یکے بعد دیگرے بنگلے کے اندر کود گئے۔

اسلحے اور دشمنوں کو ہم نے بڑی خوبصورتی سے تقسیم کر لیا تھا۔ امتیاز' روبی اور میر بخش کی موت کی ذمہ داری گرے پجارو کا مالک یعقوب عرف قوبا وہاں موجود تھا' ہم نے قوبا اور میاں زاہد حسین کو اپنے حصے میں لے لیا جبکہ شاکر علی' جمال اور بھولا ناتھ سے کیپٹن شاہ کو نمٹنا تھا۔ اسلحے میں سے ایک کلاشنکوف اور پستول ہم نے موٹر سائیکلز پر ہی چھوڑ دیے تھے جو ایک کینوس کے تھیلے میں محفوظ تھے۔ یہ ہمارا ریزرو ایمونیشن تھا جو واپسی میں کسی ہنگامی صورتِ حال میں ہمارے کام آتا۔ ٹیلی اسکوپ کو بھی میں نے تھیلے میں ڈال دیا۔ باقی اسلحے میں سے ایک کلاشنکوف کیپٹن شاہ نے اپنے پاس رکھ لی جبکہ ایک پسٹل میں نے اپنے لباس میں محفوظ کر لیا تھا۔ ازیں علاوہ' امتیاز اینڈ کمپنی کے قاتلوں کے خون کا پیاسا خنجر میری پنڈلی پر بندھا تھا جو کسی بھی وقت تڑپ کر اپنے چرمی کیس سے باہر آسکتا تھا۔

ہم نے بنگلے کی باؤنڈری کے اندر آتے ہی سب سے پہلے ٹیلی فون کے تار تلاش کر کے انہیں "معذور" بنا دیا۔ اب اس بنگلے کے اندر سے کہیں فون کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی باہر سے کوئی کال وہاں آسکتی تھی۔ اس نیک کام سے فارغ ہو کر ہم سیکیورٹی گارڈز کی جانب متوجہ ہو گئے۔

دونوں سیکیورٹی گارڈز بنگلے کے سامنے والے حصے میں گیٹ کے نزدیک ہی بنے ہوئے گارڈ روم میں تھے۔ میں نے ایک گملے کے قریب ہی پڑے ہوئے پتھر کو اٹھایا اور بنگلے کے گیٹ کا نشانہ لے کر اسے اپنے ہاتھ سے "روانہ" کر دیا۔

پتھر زیادہ بڑا نہیں تھا تاہم اس نے گیٹ کی فولادی چادر سے ٹکرا کر اتنی آواز ضرور پیدا کر دی کہ دونوں سیکیورٹی گارڈز چونک گئے۔ وہ محتاط نظروں سے گیٹ کو تکنے لگے پھر ان میں سے ایک نے اس جانب اندھیرے میں دیکھا جس طرف ہم موجود تھے۔ اسی وقت میں نے اپنے منہ سے ایک مخصوص آواز نکالی۔

اس آواز پر دوسرا گارڈ بھی ہماری جانب متوجہ ہو گیا پھر انہوں نے دھیمے لہجے میں آپس میں کوئی بات کی۔ گیٹ پر چونکہ روشنی ہو رہی تھی اس لیے ہم اندھیرے کی آڑ سے انہیں بہ آسانی دیکھ رہے تھے۔

مختصر سی باہمی مشاورت کے بعد ایک گارڈ دبے پاؤں ہماری جانب بڑھنے لگا۔ گویا اس نے ہمارا مقصد پورا کرنے کے لیے پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تھوڑے سائز کی کلاشنکوف بہت واضح دکھائی دے رہی تھی۔ تمانے کیپٹن شاہ کے کان کے پاس سرگوشی کی "یہ میرا شکار ہے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

گن بردار گارڈ محتاط قدموں اور چوکنا نگاہ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں' دو دیواروں کے ایک کونے کی آڑ میسر تھی۔ جیسے ہی وہ گارڈ مجھ سے دو فٹ کی دوری پر پہنچا' میں نے اچھل کر اس پر حملہ کر دیا۔

میرا یہ عمل اتنا برق رفتار تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جتنی دیر میں وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا' میں اسے اپنے شکنجے میں پوری طرح فٹ کر چکا تھا۔

میرا بایاں بازو کسی زہریلے ناگ کے مانند اس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ سے میں نے اس کا کلاشنکوف بردار بازو جکڑ لیا تھا۔ میں نے اس فوری حملے کے بعد گارڈ کو کھینچ کر دیوار کی آڑ میں کر لیا۔

گارڈ کے بدن میں کسی سانڈ کی سی طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ خود کو میری گرفت سے چھڑانے کے لیے زور مارنے لگا لیکن میں نے اس خیال سے اسے نہیں دبوچا تھا کہ وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس سانڈ سے اٹکھیلیوں کا وقت نہیں تھا لہٰذا میں نے اپنے بائیں بازو کو ایک مخصوص جھٹکا دے کر اسے شانت کر دیا۔ اب وہ کم از کم دو گھنٹے کے لیے اتنا غٹیل ہو گیا تھا۔

میں نے سیکیورٹی گارڈ کو اسی اندھیرے کونے میں لمبا لٹا دیا اور اس کی کلاشنکوف کو گلے میں چھپا دیا۔ اس دوران میں گارڈ کا ساتھی اسے آوازیں دیتا ہوا ہماری جانب آنے لگا۔

"طفیل! کہاں ہو تم' ادھر کوئی گڑبڑ تو نہیں؟"

کیپٹن شاہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دھیمے لہجے میں غرایا "اب میری باری ہے۔"

میں خاموشی سے ایک جانب تن کر کھڑا ہو گیا۔

طفیل کا ساتھی گارڈ جیسے ہی اس کونے پر نمودار ہوا' کیپٹن شاہ نے اپنی کلاشنکوف کا بٹ پوری قوت سے اس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ گارڈ کے حلق سے "اوں" کی ایک ہلکی آواز برآمد ہوئی اور وہ تیورا کر زمین بوس ہو گیا۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اب اس گارڈ کو کبھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونا نصیب ہوگا بھی یا نہیں۔ اس عمل نے مجھے کیپٹن شاہ کے مزاج کی جارحیت اور سفاکی سے آشنا کر دیا۔

دونوں گارڈز سے نمٹنے کے بعد ہم نے گھریلو ملازموں کا رخ کیا اور صرف پانچ منٹ کے اندر ہم نے فرخ خان سمیت دیگر دو افراد کو زیر کر کے ایک باتھ روم میں بند کر دیا۔ اس معرکے میں پروگرام کے مطابق فرخ نے تھوڑی مزاحمت بھی پیش کی تاکہ اس پر کسی قسم کا شک نہ ہو۔ ان تینوں افراد کو باتھ روم میں بند کرنے سے پہلے ہم نے یہ اطمینان ضرور کر لیا

تھا کہ وہ کسی قسم کی گڑبڑ نہ کر سکیں۔

فرخ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق شاکر علی اور قوبا بنگلے کی زیریں منزل پر تھے جب کہ غیر ملکی مہمان جمال اور بھولا ناتھ کو بالائی منزل پر ٹھہرایا گیا تھا۔ میاں زاہد حسین بھی بالائی منزل کے ایک وی آئی پی کمرے میں رات گزار رہا تھا۔ فرخ کے مطابق' بنگلے پر پہنچنے والی تینوں کال گرلز بالائی منزل پر ٹھہرنے والوں کے لیے تھیں جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ بالائی منزل پر موجود چھ افراد اس وقت جاگ رہے ہوں گے اور باہمی تعاون کے ذریعے ایک دوسرے کو جگا رہے ہوں گے۔

ہمیں صرف آٹھ افراد سے نمٹنا تھا۔ دو زیریں منزل پر اور چھ بالائی منزل پر۔ دونوں منزلوں پر مزاحمت کا امکان ففٹی پرسنٹ تھا۔ یعنی بالائی منزل والی تینوں کال گرلز سے ہماری کوئی دشمنی نہیں تھی اس لیے وہ ہماری راہ میں آنے کی کوشش نہ کرتیں۔ اسی طرح زیریں منزل پر شاکر علی وہیل چیئر کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا لہٰذا وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں نے اس آپریشن میں اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ کوئی بے گناہ خواہ مخواہ زندگی نہ ہار جائے اسی لیے ملازمین اور گارڈز کو ہم نے کچھ عرصے کے لیے "آؤٹ آف اسکرین" کر دیا تھا۔

میں نے کبیر شاہ سے کہا "شاہ جی! ہمارے بانٹے ہوئے بندے تو اوپر نیچے ہو گئے ہیں۔"

"ہم بھی اوپر نیچے ہو جاتے ہیں" وہ کلاشنکوف کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"ہاں' یہی مناسب رہے گا" میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا "اب ہمیں جو بھی کارروائی کرنا ہے' ایک ساتھ کرنا ہے۔ تم بالائی منزل کا رخ کرو۔ میں نیچے والوں کو دیکھتا ہوں لیکن ایک بات کا خیال رکھنا!"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا "میاں زاہد حسین ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ جمال اور بھولا ناتھ بھی جرائم پیشہ افراد ہیں اور ہمارے دشمنوں کے دوست کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں۔ ان تینوں کے ساتھ سخت ترین سلوک کیا جا سکتا ہے مگر وہ پیشہ ور عورتیں ہماری دشمن ہیں اور نہ ہم ان کے دشمن۔ ان کے خون میں ہاتھ رنگنے سے گریز کرنا۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بالائی منزل کی جانب بڑھ گیا۔

میں نہایت محتاط قدموں سے چلتے ہوئے اس کمرے کے دروازے پر آیا جس کے بارے میں فرخ خان کی اطلاعات یہ تھیں کہ وہاں شاکر علی اور قوبا کو ٹھہرایا گیا ہے۔ قوبا کا خیال آتے ہی میرا سارا خون دماغ کی طرف دوڑنے لگا۔ اسی شیطان صفت شخص کی ملکیت گرے پجارو سے میرے ساتھیوں پر گولیوں کی بارش برسائی گئی تھی۔ امتیاز علی' ریحانہ' میر بخش۔ ایک ایک خون آلود چہرہ میرے تصور میں نمودار ہونے لگا۔ میں نے ضبط کے دامن کو مضبوطی سے تھاما اور اس دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے پوچھا گیا۔

میں نے آواز بدل کر کہا "جی' میں ہاشم ہوں۔"

جن دو ملازمین کو ہم نے فرخ کے ساتھ بے بس کر کے باتھ روم میں مقید کیا تھا ان میں ایک ہاشم علی اور دوسرا مجیب اللہ تھا۔ فرخ خان کی فراہم کردہ معلومات قدم قدم پر ہمارے کام آ رہی تھیں۔ دروازے کا بولٹ گرنے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے قوبا میرے سامنے تھا۔

وہ میرے سامنے تھا تو اس کا یہی مطلب تھا' میں بھی اس کے سامنے ہوں۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ یک بہ یک وحشت میں مبتلا ہو گیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرتا' میں نے اس کے سینے پر ایک زوردار پریشر فرنٹ کک رسید کر دی۔ وہ توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کے مانند عقب میں اچھلا اور سیدھا بیڈ پر پہنچ کر چاروں خانے "دراز" ہو گیا۔

میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا' اس کا بولٹ چڑھایا اور خوں خوار نظر سے قوبا کو گھورتے ہوئے آتشیں لہجے میں دریافت کیا "وہ گرے پجارو تمہاری ہی ملکیت ہے نا؟"

"گرے پجارو؟" وہ اٹک اٹک کر بولا۔

"ہاں وہی منحوس جیپ' جس کا نمبر تھری' ون' فائیو' ون ہے" میں کسی درندے کے مانند غرایا "اسی جیپ سے فائرنگ کر کے گورا قبرستان کے نزدیک میرے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔"

"تمہیں شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے" وہ بیڈ پر سے اٹھتے ہوئے بولا "میرے پاس نہ تو کوئی پجارو ہے اور نہ ہی میں یا میری کوئی گاڑی تمہارے ساتھیوں کی موت کی ذمے دار ہے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے باتھ روم کے دروازے کی جانب دیکھا۔ باتھ روم کے اندر سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی اور دوسرے بیڈ کے نزدیک ہی ایک وہیل چیئر بھی نظر آ رہی تھی' اس کا ایک ہی مطلب تھا' قوبا کا ساتھی شاکر علی اس وقت باتھ روم کے اندر تھا۔

میں نے قوبا کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے دہاڑ کر کہا "غلط فہمی کے بچے! آج میں تمہیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ دیکھنے والے عبرت پکڑیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ بستر سے اٹھ کر پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ میں اسے لیتے ہوئے دوبارہ بستر پر آ گیا اور اس طرح کہ اب وہ میرے نیچے دبا تھا اور اس کی گردن میرے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں تھی۔

"بتاؤ' میرے ساتھیوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا" میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا "کیوں تم نے انہیں موت کے گھاٹ اتارا؟"

وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا "میں پھر یہی کہوں گا' تم کسی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہو۔ تمہارے ساتھیوں کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ تم نے جس گرے پجارو کا نمبر بتایا ہے' وہ میری ملکیت نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے' تم شرافت سے زبان نہیں کھولو گے" میں نے انگلیوں کے شکنجے میں اس کی تنومند گردن اکڑتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا اور میری لمحاتی غفلت سے قوبا نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے میرے نیچے رہتے ہوئے اپنی ٹانگوں کو فولڈ کیا اور میرے پیٹ پر پاؤں ٹکا کر اپنے اوپر سے مجھے پرے اچھال دیا۔

میں قالین پوش فرش پر چت گرا مگر اگلے ہی لمحے میں بیک ہینڈ اسپرنگ لگا کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اسی وقت دوبارہ دستک ہوئی اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ دستک کمرے کے دروازے پر نہیں بلکہ باتھ روم کے دروازے پر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی باتھ روم کے اندر سے شاکر علی کی آواز سنائی دی۔

"قوبا! کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ تم کس کے ساتھ ہیرا پھیری مشقی کر رہے ہو؟"

"یہ شیطان پتا نہیں' کیسے ہمارے کمرے میں گھس آیا ہے۔"

"کون شیطان؟" شاکر نے فکرمندی سے پوچھا۔

"وہی جس کا نام وجدان ہے اور... جو میرے بھائی کامران کا قاتل بھی ہے۔"

شاکر نے پوچھا "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

اس سے پہلے کہ قوبا اسے بتاتا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا' میں نے آگے بڑھ کر بڑی سرعت سے باتھ روم کے دروازے کو باہر سے بولٹ کر دیا۔ شاکر علی اپنی "معذوری" کے باعث اب کمرے کے اندر نہیں آ سکتا تھا۔ باتھ روم کے اندر اس کی چیخ پکار کو میں سننے والا نہیں تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' قوبا پوری طرح تن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ یہ وہی قوبا تھا جو مجھے اپنے بھائی کا قاتل سمجھتا تھا حالانکہ قتل کی اس سنگین واردات میں "سی ایف کے" والوں کا ہاتھ تھا یعنی امتیاز علی اور اشتیاق احمد کا۔ شعیب غوری کی تحقیق کے مطابق امتیاز اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں کا تعلق گرے پجارو سے تھا جو قوبا کی ملکیت تھی مگر وہ کسی ایسی حقیقت سے انکاری تھا۔

یہ خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ اس وقت میں پوری طرح قوبا کی جانب متوجہ تھا۔

"اس روز تو تم بچ کر نکل گئے تھے" وہ کینہ توز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "لیکن آج میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا۔ تمہاری بدقسمتی گھیر کر تمہیں یہاں لے آئی ہے۔ آج میں اپنے بھائی کے خون کا حساب بھی چکا دوں گا۔"

"اس سے بھڑنے کے بجائے ہاشم اور مجیب کو آواز دو" باتھ روم کے اندر سے شاکر علی کی آواز آئی "یہ بدبخت تمہارے اکیلے کے بس کا نہیں۔ خواہ مخواہ کوئی نقصان نہ اٹھا لینا۔"

شاکر علی کا مشورہ بروقت اور درست تھا مگر ہاشم علی اور مجیب اللہ کسی کی پکار سننے اور احکام کی تعمیل کے قابل نہیں تھے اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت تھا کہ قوبا سے فضول قسم کی ڈائیلاگنگ کرتا لہٰذا میں نے قوبا پر ایک زوردار حملہ کیا۔ میری راؤنڈ ہاؤس کک اس کے جبڑے پر پڑی۔ وہ چہرہ تھام کر ایک قدم پیچھے ہٹا تو میں نے ایک کریسنٹ کک اس کے دوسرے جبڑے پر رسید کر دی۔

وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا مگر زمین بوس نہیں ہوا۔ اس کی لڑکھڑاہٹ کا فائدہ اٹھا کر میں نے سائڈ کک اس کی پسلی پر جما دی۔ اس کک میں بے پناہ قوت تھی۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور سیدھا دیوار سے جا کر ٹکرایا۔ اس کی بدقسمتی کہ دیوار سے ٹکراؤ کے دوران میں اس کی کھوپڑی نے پہل کی جس کا خمیازہ اسے فوری طور پر بھگتنا پڑا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر نیچے بیٹھ گیا۔

گرین بیلٹ والے بنگلے پر میں نے اس کی اچھی خاصی دھنائی کی تھی۔ اس وقت مجھے مرحوم امتیاز کا ساتھ حاصل تھا اور آج میں اس کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام سے

دوچار کرنے کے لیے پاگل ہوا جارہا تھا۔

میں نے قوبا کے نزدیک آکر اسے سر کے بالوں سے جکڑلیا پھر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کرتے ہوئے پوچھا "بتاؤ' تمہاری گرے پجارو میں سے کن لوگوں نے میرے ساتھیوں پر فائرنگ کی تھی۔ مجھے ان کے نام اور ٹھکانے کا پتا چاہیے؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس کا ایک گھٹنا بڑی سرعت سے حرکت میں آیا۔ وہ میرے جسم کے نازک حصے کو نشانہ بنانا چاہتا تھا مگر میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ اپنی اس حرکت میں کیسے کامیاب ہوجاتا۔

اس کے گھٹنے کو میں نے اپنے گھٹنے سے بلاک کیا اور اس کے ساتھ ہی میرا طوفانی پنچ اس کی ناک پر پڑا یہ ایک خوفناک پنچ تھا۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ میں نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ اسے ہاتھ پاؤں کی مسلسل ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

وہ پٹتا رہا اور جواباً ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں کچھ زیادہ ہی جوش میں آیا ہوا تھا۔ اس کی ایک پیش نہ چلی اور میں نے اسے چت کردیا۔ وہ فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے بچاؤ میں دو چار ہاتھ میرے جسم پر بھی جمائے تھے مگر وہ ایک ناقابلِ ذکر حسارت تھی۔

باتھ روم کے اندر سے شاکر علی مسلسل چیخ رہا تھا۔ وہ ہاشم علی اور مجیب اللہ کو آواز دے رہا تھا' کبھی وہ سیکیورٹی گارڈز کو پکارنے لگتا۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے فرخ خان سے بھی وہاں جلدی پہنچنے کو کہا مگر اس کی چیخ پکار اور احکام کو سننے والا وہاں کوئی نہیں تھا بالآخر اس ناکامی کے بعد اس نے باتھ روم کا دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔

اس سے قبل کہ قوبا اٹھ کر کھڑا ہوتا' میں اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی ساری تن فن کسی نہ کسی راستے خارج ہوچکی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان دبوچا اور اس کی خون آلود آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے جو پوچھا ہے' جلدی سے بتادو۔ ورنہ آج تمہیں میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچاسکے گا۔ تمہارے بھائی کو تو میں نے قتل نہیں کیا لیکن میں یہ اعزاز تمہیں ضرور دوں گا۔"

وہ کمزور سی آواز میں کراہا "مجھے جو معلوم تھا وہ بتا چکا ہوں۔ تم بالکل غلط سوچ رہے ہو۔ تمہارے ساتھیوں پر ہونے والی فائرنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

"تم لوگوں کا فائرنگ سے تعلق ہو نہ ہو لیکن میرے مکوں کا تمہارے چہرے سے ایک گہرا تعلق ضرور ہے" میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور دوچار تابڑ توڑ پنچ اس کے تھوبڑے پر رسید کردیے۔

وہ تکلیف کی شدت سے چلا اٹھا۔ اس کا چہرہ پہلے ہی میری مکس اور پنچز سے بری طرح زخمی ہوچکا تھا۔ ان طوفانی مکوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور اس کی ناک سے خون جاری ہوگیا۔ اس کا خون آلود چہرہ بڑا ہیبت ناک منظر پیش کررہا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ کہیں بے ہوش نہ ہوجائے۔ وہ گرین بیلٹ والے بنگلے پر بے ہوشی کا مظاہرہ کرچکا تھا۔ وہاں تو وہ شاکر علی کے ساتھ ہونے والے "شان دار" سلوک کو دیکھ کر بے ہوش ہوا تھا اور وہ بے ہوشی بھی عارضی تھی لیکن مجھے یقین تھا' یہ بے ہوشی اس کے لیے دائمی ثابت ہوسکتی تھی۔

میں نے اس کے گالوں پر تھپڑ رسید کرکے اسے جھنجوڑ ڈالا اور دانت کچکچاتے ہوئے کہا "تمہارا آخری وقت آن پہنچا ہے قوبا! سچ کا اقرار کرلو ورنہ۔"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا اور پنڈلی پر بندھے ہوئے خنجر کو اس کے کیس میں سے باہر نکال لیا پھر اسے قوبا کی نگاہوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "اس جادوگر کو پہچانتے ہو نا۔ اس نے اپنے جنگار سے تمہارے دوست شاکر علی کو وہیل چیئر کا تحفہ دیا ہے۔ آج یہی جادوگر تمہیں کفن کاندرانہ پیش کرے گا۔"

میرے لہجے میں اتنی سنگینی تھی کہ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے اپنے نیچے اس کا وجود پھڑپھڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لبوں کو حرکت دی تو خون کے چھینٹے اڑے جو میری شرٹ کو داغ دار کرگئے۔ اسی دوران میں میری سماعت سے قوبا کی لرزتی ہوئی "خون آلود" آواز ٹکرائی۔

"تمہیں خدا کا واسطہ ہے' میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ تمہارے ساتھیوں کے قتل میں ہمارا کوئی ہاتھ۔"

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی خوں خوار لہجے میں کہا "قسمیں تو شاکر علی نے بھی بہت کھائی تھیں کہ وہ میر بخش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن اس جادوگر کو اپنا کمال دکھانا ہی پڑا تھا۔ شاکر پر اس نے پاؤں کی جانب سے عمل شروع کیا تھا' تمہاری باری سر کی طرف سے آئے گی اور

ستم گر کی نوک سب سے پہلے تمہاری آنکھوں کا مزاج پوچھے گی۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے خنجر کی نوک کو اس کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان چبھویا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اسی وقت بالائی منزل سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آنے لگیں' گویا وہاں بھی کارروائی کا آغاز ہوگیا تھا۔

"میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تم زبان کھولتے ہو یا اپنا کام شروع کروں؟"

بالائی منزل پر ابھرنے والی آواز وہ بھی سن چکا تھا' اس نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں؟"

"سوال نہیں' صرف جواب!" میں نے خنجر کے دستے پر دباؤ بڑھاتے ہوئے غرا کر کہا۔

اس نے جبڑے بھینچ کر خنجر سے پہنچنے والی تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ مجھے ایک لمحے کو شک گزرا۔ موت کو سامنے دیکھ کر زبان بے ساختہ سچ بولنے لگتی ہے۔ سچویشن کے مطابق موت قوبا سے زیادہ دور نہیں تھی بلکہ اس کے سینے پر سوار تھی۔ اگر ابھی تک وہ میرے ساتھیوں کے قتل سے انکاری تھا تو اس کا مطلب کہیں یہ تو نہیں تھا کہ وہ واقعی اس معاملے سے تعلق ہو! اس نے تو ابھی تک یہ بھی تسلیم نہیں کیا تھا کہ گرے پجارو اس کی ملکیت ہے۔ ممکن ہے' شعیب غوری کی تحویل میں کوئی سفید رہ گیا ہو! قوبا حقیقت کو تسلیم کرکے اپنی جان بچاسکتا تھا۔ اگر وہ ایسا نہیں کررہا تھا تو پھر یا تو اسے اپنی جان پیاری نہیں تھی یا پھر وہ یا اس کے ساتھی میرے ساتھیوں کی موت کے ذمے دار نہیں تھے۔ جان تو البتہ سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے انسان دوسروں کی جان لے لیتا ہے۔

میں قوبا کے ساتھ مزید "سلوک" کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بالائی منزل سے نسوانی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی کلاشن گرج اٹھی۔ اس صورتِ حال میں' میں قوبا کے ساتھ مزید وقت ضائع نہیں کرسکتا تھا لیکن میرے کسی عملی اقدام سے پہلے ہی اس نے ہاتھ جھاڑ دیے۔ میں نے پوری شدت سے اسے جھنجوڑ ڈالا لیکن اس میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ وہ گہری بے ہوشی میں چلا گیا تھا یا پھر؟

اس سے آگے سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا کیونکہ بالائی منزل پر پھر فائرنگ ہونے لگی تھی۔ میں نے قوبا کو اس کے حال پر چھوڑا اور بالائی منزل کی جانب دوڑ پڑا۔ جب میں باتھ روم کے دروازے کے نزدیک سے گزرا تو شاکر علی کی شکست خوردہ جھنجلاہٹ آمیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ فائرنگ کیسی ہورہی ہے؟ کوئی دروازہ تو کھولے۔ میں بھی تو دیکھوں' باہر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟"

"اس قیامت کو دیکھنے کے لیے تمہیں قیامت کا انتظار کرنا پڑے گا" میں نے چیخ کر کہا "اور اس فائرنگ کو تم کوئی عام سی فائرنگ مت سمجھو۔ یہ "نامعلوم" دہشت گردوں کی فائرنگ ہے جو پتا نہیں' کہاں سے آتے ہیں اور اپنا کام کرکے پتا نہیں' کہاں چلے جاتے ہیں۔ کوئی ان کے بارے میں نہیں جانتا اور نہ ہی جان سکتا ہے کیونکہ جاننے والے سب جانتے ہیں۔"

میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے دروازے کو باہر سے بولٹ کردیا اور دوڑتے ہوئے قدموں سے زینوں کی جانب بڑھ گیا۔ میں ابھی نصف زینے ہی طے کرپایا تھا کہ اوپر سے ایک انسانی جسم لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ میں اپنے پنجوں پر فضا میں اچھلا۔ وہ گولا نما جسم میرے نیچے سے گزر گیا۔ اسی وقت' کبیر شاہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"وجدان! اسے روکو۔ یہ فرار ہونے کی کوشش کررہا ہے۔"

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے کبیر شاہ سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں فرار ہونے کی کوشش کررہا ہے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے ہوا میں پرواز کی اور اس شخص کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کے سر پر پہنچ گیا۔

وہ بھولا ناتھ تھا۔ میرا نام کبیر شاہ کی زبان سے وہ سن چکا تھا' اب مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے پیٹ میں ایک فرنٹ پش کک ماری۔ وہ پیٹ پکڑ کر تکلیف کی شدت سے دُہرا ہوگیا لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے حملے میں خاصی تیزی تھی۔

اس کی راؤنڈ ہاؤس کک کو میں نے اوپن آرم بلاک کیا۔ اسی دوران میں اس نے دوسری راؤنڈ ہاؤس کک آزمائی۔ میں اسے بلاک کرنے کے بجائے ایک جھٹکے سے نیچے بیٹھا اور تیزی سے بیک سوئپ کردی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا لیکن حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ وہ خاصا چاق وچوبند دکھائی دیتا تھا۔

میں نے اسے لی شاٹ (KNEE SHOT) کا ڈاج

دیا۔ اس نے تیزی سے اپنی ٹانگ پیچھے کھینچی۔ اسی وقت میں نے برق رفتاری سے ایک سوئپ (SWEEP) اس کی پنڈلی پر رسید کردی۔ نتیجے کے طور پر وہ ایک مرتبہ پھر پشت کے بل پڑا آسمان کو تک رہا تھا۔

میں ایک قدم آگے بڑھا اور اس کے تھوبڑے کو اپنے پاؤں سے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ بھولا ناتھ نے کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے پاؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر بڑی سرعت سے ایک مروڑا دیا۔ میری جگہ اگر کوئی عام سا مارشل آرٹسٹ ہوتا تو منہ کے بل تنکی فرش پر گرتا لیکن میرے ذہن نے بروقت فیصلہ کیا تھا۔

میں نے اپنی باڈی کو ہوا میں ٹوئسٹ (TWIST) کیا اور آزاد پاؤں سے بھولا ناتھ کے چہرے کا کباڑا کرتے ہوئے فرنٹ رول کرکے دور پہنچ گیا۔ میں نے اپنے عقب میں مدمقابل کی کراہ سنی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے میرے لیے ایک ناقابل اشاعت گالی بھی پھسل گئی۔ یہ اس کی جھنجلاہٹ کی انتہا تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' بھولا ناتھ اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوچکا تھا۔ میں نے بیک فلیک (FLICK BACK) لگائی اور اس سے دو فٹ کے فاصلے پر پہنچ گیا پھر اس سے پہلے کہ اس کی سمجھ میں کچھ آتا' میں ہوا میں اچھلا اور دہیل فلائنگ کک اس کی کنپٹی پر ثبت کردی۔ یہ ایک جھٹکے وار دھانسو قسم کی کک تھی۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے پیچھے کی طرف گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا کوئی موقع نہ دیا۔ ہمارے درمیان لگ بھگ دس فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ میں نے فرنٹ سمرسالٹ لگایا اور اس کے روبرو پہنچ گیا۔

وہ اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ اسی سٹپٹاہٹ میں اس نے غیر ارادی طور پر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑلیا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ مجھے پہلی مرتبہ اس کی جسمانی طاقت کا اندازہ ہوا۔ وہ بے طرح زور لگا رہا تھا اور جھٹکے دے دے کر میری کمر کا کڑاکا نکالنے کی تگ ودو میں لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گھٹنوں کی یکے بعد دیگرے ضربوں سے میرے پیٹ کو نشانہ بنانے کی کوشش کررہا تھا۔

میں نے گھٹنوں سے بلاکنگ کرتے ہوئے اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نتیجے میں میرے بازوؤں پر اس کی گرفت بھی ڈھیلی ہوگئی۔ اسی لمحے میں نے ایک جھٹکے سے اپنے بازو اوپر کھینچ لیے۔ وہ حیرت زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی حیرت میں تڑکا لگایا۔ میرے آزاد ہاتھوں نے چوپ (CHOP) کی شکل اختیار کی اور بجلی کی سی رفتار سے ہاتھوں کے بلیڈ بھولا ناتھ کی کن پٹیوں پر پڑے۔ یہ ایک مہلک اور خطرناک وار تھا۔

مجھے یقین ہے' اس اٹیک نے اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کردیا ہوگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر جھومنے لگا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر سائڈ کک اس کی پسلی پر رسید کی اور اسے کئی فٹ پیچھے اچھال دیا۔

اسی وقت زینوں کے اوپری حصے سے کبیر شاہ نے مجھے پکارا "وجدان! اگر اس مردود سے نمٹ چکے ہو تو اوپر آجاؤ۔ یہاں حالات بگڑ گئے ہیں۔"

حالات تو پوری طرح ہمارے قابو میں تھے پھر کیسے بگڑ گئے۔ یہ سوچتے ہوئے میں زینوں کی جانب بڑھا تو بھولا ناتھ اٹھ کر کھڑا ہوچکا تھا۔ اس نے اچانک مجھ پر حملہ کردیا۔ اس کے ہاتھ میں آہنی راڈ کو میں دیکھ چکا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کوئی شدید نقصان پہنچانے میں ناکام رہا۔

اگر انسان کے ہاتھ مضبوط اور بازو طاقت سے بھرپور ہوں تو پھر کسی ہتھیار یا اوزار کے بغیر بھی وہ بہت کچھ کرکے دکھا سکتا ہے لیکن جب بازو دست کم زور پڑنے لگیں تو اسلحہ بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ بھولا ناتھ کی میں اتنی درگت بنا چکا تھا کہ وہ آہنی راڈ اس کے ہاتھ میں انتہائی مضحکہ خیز لگ رہی تھی پھر جب اس نے راڈ سے مجھ پر حملہ کیا تو اس مضحکہ خیزی میں کئی چند اضافہ ہوگیا۔

میں نے اس کے راڈ والے بازو کو ہوا ہی میں اوپر بلاک کیا پھر ایک اسٹیپ اندر آتے ہوئے خطرناک سولر پنچ (SOLAR PUNCH) اس کے سینے کے وسط میں رسید کردیا۔ وہ "اونہہ" کی آواز نکالتے ہوئے کسی کٹے ہوئے شجر کے مانند زمین بوس ہوگیا۔ اب اس زمین سے اس کے اٹھنے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔

میں بالائی منزل پر پہنچا تو ایک کمرے میں وحشت ناک منظر نے میرا استقبال کیا۔ جمال اور دو عورتیں خون میں لت پت کمرے کے فرش پر پڑے تھے۔ جمال کے ہاتھ میں ایک ریوالور دبا ہوا تھا۔ وہ تینوں زندگی سے بہت دور موت کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے کبیر شاہ کی طرف دیکھا۔ جب میں زیریں منزل پر قوباسے دست وپنجہ کررہا تھا تو میں نے بالائی منزل پر دو مرتبہ فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ ایک بار فائرنگ کے ساتھ نسوانی چیخیں بھی شامل تھیں۔

"میں کیا کرتا' یہ سب کچھ مجبوری میں کرنا پڑا۔" کبیر شاہ

نے کلائی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں برسٹ نہ مارتا تو جمال مجھے گولی کا نشانہ بنادیتا۔ ان دونوں کی کم بختی کہ یہ زخمی زدہ ہوکر جمال کے پیچھے چھپی تھیں اس لیے جان سے گئیں۔" بات ختم کرکے اس نے جمال کے نزدیک مردہ حالت میں پڑی ہوئی دونوں عورتوں کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے اس سے مزید سوال جواب کرنے کے بجائے میاں زاہد حسین کے بارے میں استفسار کیا۔

وہ بولا "میں نے حالات بگڑنے والی بات میاں زاہد حسین حوالے ہی سے کی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کو اندر سے لاک کردیا ہے اور کمرے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آرہا۔"

میں بھی تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ ہمارا سب سے "وی آئی پی" شکار تو میاں زاہد ہی تھا۔ اگر وہ ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر ہمارے پاس ہاتھ ملنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔

میں کبیر شاہ کی معیت میں اس دروازے کے سامنے پہنچا جس کے پیچھے میاں زاہد بند ہوکر رہ گیا تھا۔ دو عورتوں کی لاشیں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا لیکن میری معلومات کے مطابق اس بنگلے میں تین پیشہ ور عورتوں کی انٹری ہوئی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ تیسری میاں زاہد کے ساتھ ہوگی۔

"ہمیں ہر صورت میں اس دروازے کو کھولنا ہے" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

کبیر شاہ حتمی لہجے میں بولا "اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دروازے کے لاک پر فائرنگ کی جائے۔"

"تو کرو۔۔۔ فوراً کرو شاہ جی!" میں تحکمانہ لہجے میں بولا "اس سے پہلے بھی دو مرتبہ فائرنگ کرچکے ہو۔ اس بات کی پروا مت کرو کہ فائرنگ کی آواز سن کر کوئی اس طرف متوجہ ہوجائے گا۔ اگر کسی کو یہ نیک کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہوگا تو اب تک وہ کرچکا ہوگا" میں نے ایک لمحے کے توقف سے مسکراتے ہوئے انداز میں کہا "آج کسی بھی قیمت پر میاں زاہد حسین کو ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جانا چاہیے' اس کے لیے ہمیں خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہانا پڑیں۔"

میری بات ختم ہوتے ہی کبیر شاہ نے ایک ورنکل جیب سے نکالا اور دروازے کی لاک والی سائڈ کو ٹاپ ٹو بائم پوزیشن پر رکھ دیا۔ اسی لمحے میں نے بر۔تھنگ پاور کا استعمال کرتے ہوئے ڈبل ہینڈ پش دروازے کے تختے پر مارا۔ دروازہ "دھڑ" سے کھل گیا۔

ہم بھرا مار کر کمرے میں داخل ہوئے تو ایک خوف زدہ نسوانی چیخ نے ہماری سماعتوں کو کھرچ ڈالا۔ پھر اگلے ہی لمحے چیخنے والی کی صورت بھی نظر آگئی اور وہ صورت خاصی خوب صورت تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھی' اس وقت اپنے لباس کو پہننے کی کوشش کررہی تھی۔ فائرنگ اور پھر دروازے کے اچانک کھلنے سے وہ بری طرح بدحواس ہوگئی تھی اور اسی بدحواسی میں اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی تھی جبکہ ہاتھ سے لباس چھوٹ گیا تھا۔ اس کے بدن پر انڈر گارمنٹس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ نکلفاتی لباس اس کے کندن وجود کی پردہ پوشی کے لیے انتہائی ناکافی تھا اس لیے وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے جسم ڈھانپنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔

ہمیں اپنے سامنے موت کے فرشتوں کے روپ میں کھڑا دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی۔ وہ لرزیدہ آواز میں بولی "تت۔۔۔ تم۔۔۔ کک۔۔۔ کون لوگ ہو؟"

"ہمارے بارے میں تمہیں "پی ایچ ڈی" کرنے کی ضرورت نہیں" میں نے غرا کر کہا "اگر زندگی چاہتی ہو تو فوراً بتاؤ' میاں جی کدھر ہے؟"

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی یہ اندازہ کرلیا تھا کہ میاں زاہد حسین وہاں موجود نہیں تھا۔ اس عورت کے حلق سے میرے سوال کے جواب میں ایک سراسیمہ آواز برآمد ہوئی۔ "وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اس طرف گیا ہے۔"

ساتھ ہی اس نے مغربی دیوار میں موجود ایک بند دروازے کی سمت اشارہ کیا۔

میں نے کبیر شاہ سے کہا "تم اس عورت پر توجہ رکھتے ہوئے اسے لباس پہننے کی مہلت دو۔ میں اتنی دیر میں اس دروازے کا حال احوال معلوم کرتا ہوں" پھر میں نے خوف زدہ کال گرل سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"رخشی!" اس نے بتایا۔

"تمہارے ساتھ آنے والی دوسری دو "گرلز" تو اپنی سانسیں پوری کرچکیں۔ اگر تم مزید جینے کی خواہش مند ہو تو کسی قسم کی غلط بیانی کرنا اور نہ ہی کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرنا۔"

"تت۔۔۔ تو کیا نازش اور مُرلا۔۔۔؟" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مذکرہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ہلاک ہونے والی پیشہ ور عورتوں کے نام مجھے معلوم ہوگئے تھے۔ ان میں نازش جمال کے لیے

اور سُرلا انڈین بھولاناتھ کے لیے بلوائی گئی تھی۔ ایک ہندو غیر ملکی مہمان کے لیے میاں زاہد نے ہندو عورت کا ہی بندوبست کیا تھا۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا' وہ اندر سے لاک کیا گیا تھا۔ اس کا ہینڈل بھی اسی وجہ سے گھومنے سے انکاری تھا۔ میں نے مزید فائرنگ کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے یہاں بھی برتھنگ ٹیکنیک کو آزمایا۔ میں نے دروازے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھوں کو سر سے بلند کیا اور ایک طویل سانس اندر کی جانب کھینچی' پھر سانس چھوڑتے ہوئے بازوؤں کو کلائیوں کے مقام پر کراس (CROSS) کرتے ہوئے پشت پر لے گیا۔ اس کے بعد واپس پہلوؤں کی جانب ہاتھوں کو لاتے ہوئے میں نے اپنے پھیپھڑوں کو پوری طرح سانس سے بھرلیا۔ اب میں اٹیک کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ سانس کو ایک تھرسٹ (THRUST) کے ساتھ باہر خارج کرتے ہوئے میں نے دونوں ہتھیلیوں کو ایک زوردار جھٹکے سے دروازے پر لاک کے نزدیک استعمال کیا۔ ہتھیلیوں کے اس پش میں اتنی قوت تھی کہ دروازہ ایک مخصوص آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اس قسم کے برتھنگ پش (PUSH BREATHING) کی مدد سے بعض اوقات ایک دیوار کو بھی بہ آسانی گرایا جاسکتا ہے۔ اس ٹیکنیک میں مارشل آرٹس اور یوگا ایک ساتھ کارفرما نظر آتے ہیں۔

میں کھلے ہوئے دروازے سے گزر گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں لائٹ آن تھی۔ اس کمرے میں مجھے ایک چکردار زینہ نظر آیا۔ جگہ کی تنگی کے باعث اس ساخت کے زینے بنائے جاتے ہیں جو ایک گول چکر کی صورت میں سیدھے نیچے سے اوپر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان دائرہ وار اسٹیپس (STEPS) کے سہارے کے لیے درمیان میں ایک مضبوط ستون کھڑا کردیا جاتا ہے جو زمین اور چھت کے دو مقامات پر مضبوطی سے نصب ہوتا ہے۔

میاں زاہد حسین کمرے میں موجود نہیں تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ نیچے جاچکا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر زینہ اترنے لگا۔ اس زینے کے گرداگرد ایک تنگی خول بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس "حفاظت" کے سبب باہر سے یہ زینہ نظر نہیں آتا ہوگا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں ایک کیپسول میں قدم بہ قدم اوپر سے نیچے اتر رہا ہوں۔

اس کورڈ (COVERED) چکردار زینے کا اختتام بھی ایک دروازے پر ہی ہوا۔ اس کے ہینڈل نے مجھے بتادیا کہ دروازے کو باہر سے لاک کردیا گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس دروازے کی دوسری جانب بھی کوئی چھوٹا سا کمرا ہوگا۔ اسی لمحے ایک تشویش ناک خیال نے میری سوچ پر دستک دی ... کیا میاں زاہد حسین بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے؟

اس خیال نے میرے حلق میں کڑواہٹ بھردی۔ میں تیز رفتاری سے زینہ چڑھتے ہوئے اوپر جانے لگا۔ زیریں دروازے کو توڑ کر یا کھول کر باہر نکلنا بے کار تھا کیونکہ اگر میاں زاہد واقعی وہاں سے فرار ہوگیا تھا تو پھر وہ بنگلے کی زیریں منزل پر کہیں نہیں مل سکتا تھا۔

میں جب واپس میاں زاہد کے کمرے میں پہنچا تو رخشی نامی وہ پیشہ ور عورت مکمل لباس میں آچکی تھی۔ وہ ایک خوش شکل اور دعوت انگیز بدن کی مالک تھی جس کا سراپا دیکھنے والے میں سنسنی دوڑا دیتا۔ اس کی عمر تیس کے ارد گرد قریب ہوگی۔ میں نے چھوٹتے ہی رخشی سے سوال کیا۔

"وہ خبیث کتنی دیر پہلے اس کمرے میں گیا تھا؟"

میرا اشارہ اس دروازے کی جانب تھا جسے میں نے برتھنگ ٹیکنیک کے ذریعے کھولا تھا۔ رخشی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"جب پہلی مرتبہ فائرنگ ہوئی تو میاں جی مجھے یہیں ٹھہرنے کا کہہ کر اس دروازے میں غائب ہوگیا تھا۔"

گویا یہ پندرہ بیس منٹ پہلے کی بات تھی۔ یہ وقفہ اس کے فرار کے لیے کافی تھا لیکن اس دوران میں' میں نے بنگلے کے اندر یا باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' میاں زاہد علی وہاں سے کوئی گاڑی نہیں لے کر گیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے جب میں بھولا ناتھ کو "لپکنا جھپٹنا" سکھا رہا تھا' اس وقت میں نے بنگلے کے گیٹ کو بند دیکھا تھا۔ میاں زاہد کی اچانک روپوشی نے معاملات کو سردست الجھادیا تھا۔

میں نے کڑے لہجے میں رخشی سے سوال کیا "تم فائرنگ کی آواز اور اپنی ساتھی کال گرلز کی چیخیں سن کر کمرے سے باہر کیوں نہیں نکلی تھیں؟"

"میں ڈر گئی تھی ... سخت خوف زدہ ہوگئی تھی میں۔" وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی "مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لے سکوں۔"

"کیا تم جانتی ہو' اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟" میں نے زینوں والے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے میری حسبِ توقع جواب دیا "نہیں' میرا خیال یہ پیشہ بہت ترقی کرچکا ہے۔ لگتا ہے' اس سلسلے میں تمہاری معلومات محدود ہیں۔"

"میری معلومات تو محدود نہیں ہیں" میں نے کہا "لیکن پاکستان میں اس قسم کے کاروبار کے بارے میں اور اتنی وسعت کے ساتھ میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔"

"بھولے بادشاہ!" کبیر شاہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اس قسم کے کاروبار ملک نہیں' بلکہ لوگ کرتے ہیں جو کہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ پاکستان بھی اسی دنیا کا ایک ملک ہے۔"

کبیر شاہ کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ رات کے سناٹے میں کسی گاڑی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی مہیب آواز ابھری۔ ہم دونوں نے بہ یک وقت چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اسی لمحے بنگلے کے زیریں حصے میں گاڑی کے ٹائروں کی مخصوص "چرچراہٹ" سنائی دی۔

ہم دونوں لپک کر کمرے سے باہر آئے۔ کسی سوال جواب کا وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ یہ بات طے تھی کہ کوئی اس بنگلے سے بڑی جلدی میں روانہ ہورہا تھا اور وہ "کوئی" میاں زاہد حسین کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہاں موجود باقی تمام افراد کو ہم نے مناسب طور پر "فٹ" کردیا تھا۔

بالائی منزل کی بالکونی سے جھک کر جب نیچے دیکھا گیا تو ایک افسوس ناک منظر سے سامنا ہوا۔ بنگلے کا گیٹ پوری طرح کھلا ہوا تھا اور اس گیٹ میں سے ایک قیمتی گاڑی باہر نکل کر سڑک پر چڑھ چکی تھی۔ ہماری بے خبری میں اس نے بڑی خاموشی سے گیٹ کھول لیا تھا۔

کبیر شاہ نے ایک جھٹکے سے کلاشنکوف سیدھی کی مگر اس سے پہلے کہ وہ فائرنگ کرتا' وہ قیمتی گاڑی ایک موڑ کاٹ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

"وجدان! وہ کمینہ بھاگ گیا" کبیر شاہ نے ہیجانی لہجے میں کہا "ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "تعاقب زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگا۔ جب تک ہم بنگلے کے عقب میں پہنچ کر اپنی موٹر سائیکلز کو سنبھالیں گے' میاں زاہد کہیں سے کہیں نکل چکا ہوگا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے خاموشی سے جانے دیں گے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے ان زینوں کی جانب دوڑ لگادی جو ہمیں زیریں منزل پر پہنچاسکتے تھے۔ ہم پہلو بہ پہلو دوڑتے ہوئے نیچے آئے پھر بنگلے کے عقبی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ گیٹ میں سے نکل کر بنگلے کے عقب میں پہنچنے کے لیے

کوئی واش روم ہوگا۔ میں اس بنگلے پر پہلی مرتبہ آئی ں؟"

"اور تمہاری وہ دونوں ساتھی گرلز!"

"وہ بھی یہاں پہلے کبھی نہیں آئیں۔"

میں نے پوچھا "ان کے نام تم نے نازش اور سُرلا بتائے ں۔ سُرلا نام سے تو ظاہر ہوتا ہے' وہ کوئی ہندو عورت ی؟"

"سُرلا واقعی ہندو تھی" رخشی نے افسوس ناک انداز ں کہا۔ اسے اپنی پیشہ ور ساتھی کی موت سے دھچکا پہنچا تھا میاں جی نے اپنے ہندو مہمان بھولاناتھ کے لیے سُرلا کو لوایا تھا" پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو' پوچھنے لگی دوسرے کمرے میں بھولا ناتھ اور جمال نامی دو غیر ملکی مہمان ٹھہرے ہوئے تھے' وہ کہاں ہیں؟"

میں نے ذو معنی انداز میں کہا "وہ بے چارے مفقود الخبر دیکھے ہیں۔"

کبیر شاہ نے رخشی سے پوچھا "کیا واقعی وہ غیر ملکی مہمان یک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے؟ میں ان چاروں کو یک ہی کمرے میں' ناقابلِ بیان حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس حوالے سے میرا دماغ ابھی تک چکرا رہا ہے۔"

رخشی نے بڑے کھلے ڈلے انداز میں بتایا "ہاں یار! وہ دونوں بہت گہرے دوست ہیں۔ مجھے معلوم ہے' وہ اچھا برا ہر کام ایک ساتھ مل کر کرتے ہیں۔"

رخشی کے لہجے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھجک موجود نہیں تھی۔ اس نے جمال اور بھولاناتھ کے لیے حال کا صیغہ استعمال کیا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مفقود الخبر کی خبر سے آشنائی حاصل نہیں کرسکی تھی۔

کبیر شاہ نے رخشی سے سوال کیا "تم لوگوں کا تعلق کس کے ادارے سے ہے؟"

"میڈم روزی!" اس نے دو لفظی جواب دیا۔

"وہ درخشاں والی میڈم روزی؟"

"بالکل وہی۔"

میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے رخشی سے پوچھا "کیا تمہاری میڈم کے پاس ہندو لڑکیاں اور عورتیں بھی ہیں؟"

"سب ہیں جناب!" وہ ایک ادا سے بولی "ہر رنگ اور ہر نسل کے کھلونے مل جائیں گے میڈم روزی کے ادارے پر' آپ وزٹ کرکے دیکھیں۔"

کبیر شاہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "وجدان!

ہمیں کم از کم دس بنگلے گھوم کر آنا پڑتا جبکہ ہم جو راستہ اختیار کرکے بنگلے میں "داخل" ہوئے تھے اسی راہ سے فوری واپسی ممکن تھی۔

ہم جیسے ہی بنگلے کی عمارت کے پہلو سے گزر کر عقبی حصے میں پہنچے' ایک غراتی ہوئی آواز نے ہمیں رکنے کا حکم دیا۔ "تم دونوں اس وقت میری گن کے نشانے پر ہو۔ اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں فائرنگ کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔"

بنگلے میں داخل ہوکر ہم نے دو سیکیورٹی گارڈز کو "ناقابلِ استعمال" بنایا تھا۔ کبیر شاہ نے تو اپنے حصے کے گارڈ کی کھوپڑی چٹخادی تھی۔ اس کے ہوش میں آنے کی امید نہیں تھی' البتہ وہ میرے حصے والا گارڈ ہوسکتا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اسے دو تین گھنٹے کے لیے اتنا غفیل کردیا تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ اپنی سخت جانی کے سبب قبل از وقت ہوش میں آگیا ہوگا۔

میں نے کبیر شاہ کے کان میں سرگوشی کی "تم دوسری طرف سے گھوم کر اس کے عقب میں پہنچو میں اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

یہ بات میں نے اس بنیاد پر کہی تھی کہ وہ شخص ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اس کا دعویٰ تھا کہ ہم دونوں اس کے گن پوائنٹ پر ہیں۔ میں اس کی دھمکی کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ اگر واقعی ہم اس کی نگاہ میں تھے تو وہ کبیر شاہ کی حرکت کو نوٹ کرلیتا۔

کبیر شاہ نے جیسے ہی اپنی جگہ سے جنبش کی' دکھائی نہ دینے والے شخص نے وارننگ دی "خبردار! جو کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔ میں تمہاری ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا ہوں۔"

آواز ایک اندھیری اوٹ سے ابھر رہی تھی۔ یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ وہ ہمیں بہ خوبی دیکھ رہا تھا۔ ہم بھی اندھیرے میں تھے مگر ہم دونوں کے زوایئے میں فرق تھا۔ میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"تم ہمیں آگے بڑھنے سے بھی روک رہے ہو اور پیچھے جانے پر بھی تمہیں اعتراض ہے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"فی الحال تم لوگ اپنے ہتھیار میری جانب پھینک دو۔"

میں نے ذرا غور کیا تو اس آواز کو پہچان گیا۔ یہ طفیل نامی گارڈ کی آواز تھی۔ اس سیکیورٹی گارڈ پر میں نے طبع آزمائی کی تھی۔ مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ وہ اتنی جلدی کس طرح ہوش میں آگیا تھا۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"طفیل! بنگلے کے اندر بازی پلٹ چکی ہے۔ اس وقت ہمارا ہولڈ ہے۔ تمہارا باس میاں زاہد دم دبا کر یہاں سے فرار ہوچکا ہے بہتر یہی ہے کہ تم گن پھینک کر خود کو ہماری تحویل میں دے دو ورنہ ہم تمہارا بڑا عبرت ناک حشر کریں گے۔"

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" وہ حیرت سے متغیر ہوا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا "ہم تمہارے نام کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہیں تمہاری نجی اور پرائیویٹ زندگی کے بارے میں۔"

"تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"بالکل درست۔" میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا "اس لیے نہیں بنا سکتے کہ تم تو آل ریڈی بے وقوف ہو۔"

وہ غصے سے بولا "میں ایسا مذاق پسند نہیں کرتا۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے تین گننے سے پہلے ہتھیار پھینک دو۔" ایک لمحے کا توقف کرکے اس نے اضافہ کیا "میں گنتی شروع کرنے والا ہوں۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ "ون ٹو تھری" کا آغاز کرتا' میں نے کبیر شاہ کو ایک فوری عمل کا مخصوص اشارہ دیا اور سیکیورٹی گارڈ کی طرف منہ کرکے تیز آواز میں کہا۔

"مسٹر طفیل! تمہیں ایسا مذاق پسند نہیں اور میں ویسا مذاق کرنے کا عادی نہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہمارے "ہولڈ" پر ایمان لانا چاہتے ہو تو نگاہ اٹھا کر ذرا چھت کی طرف دیکھو۔ ہمارا ایک مسلح ساتھی اس وقت تم پر گن تانے وہاں کھڑا ہے۔"

میرا جملہ آخری الفاظ تک پہنچا ہی تھا کہ کبیر شاہ نے آگے بڑھ کر آواز کی سمت ایک برسٹ فائر کردیا۔ اس کے ساتھ ہی سیکیورٹی گارڈ کی آخری چیخیں فضا میں بلند ہوکر ہوا میں منتشر ہوگئیں۔

انسانی نفسیات کے عین مطابق میرے انکشاف پر سیکیورٹی گارڈ نے بنگلے کی چھت کی طرف دیکھا تھا۔ اس دوران میں وہ یقیناً ہماری جانب سے غافل ہوگیا تھا اور اس کی اس لمحاتی غفلت سے کبیر شاہ نے ماہرانہ انداز میں بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

اس پے در پے فائرنگ کے بعد وہاں رکنا ہمارے لیے انتہائی پُرخطر ہوچکا تھا۔ ٹھیک ہے' ہم نے اس عمارت کا ایک فونک رابطہ منقطع کردیا تھا لیکن آس پاس کے کسی بنگلے کی شب بیدار شخص قریبی تھانے فون کرکے اس غیر معمولی سرگرمی کی اطلاع دے سکتا تھا۔

کبیر شاہ نے مجھے بازو سے تھامتے ہوئے کہا "وجدان! یہاں زاہد حسین کے پیچھے جانا اب بھس کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کرنے کے مترادف ہے۔ وہ ہماری پکڑ اور پہنچ سے بہت زیادہ دور جاچکا ہوگا۔ ہمیں فوراً یہاں سے فرار ہوجانا چاہیے۔"

"ہم یہاں سے جارہے ہیں لیکن واپسی سے قبل ایک ضروری کام باقی ہے۔"

"کون سا ضروری کام؟" وہ متعجب لہجے میں بولا۔

میں نے بنگلے کے سامنے والے حصے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا "تم میرے ساتھ آؤ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس (بھوسے) کے ڈھیر میں سے ایک ننھی سی سوئی تلاش نہیں کرسکتے لیکن اس بھوسے میں ایک منی سی چنگاری تو لگا سکتے ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"دیکھتے جاؤ۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں بھولا ناتھ ٹھنڈا ٹھار پڑا تھا' سامنے سے رخشی آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ میری "فرمائش" پر کبیر شاہ نے اسے گن پوائنٹ پر رکھ لیا پھر وہ دونوں میری تقلید میں اس کمرے میں پہنچے جہاں میں یعقوب عرف قوبا کو لمبا لٹا گیا تھا۔

قوبا ہنوز دنیا و مافیہا سے بے خبر سکھ کی دائمی بانسری بجا رہا تھا۔ میں نے اس باتھ روم کا دروازہ کھولا جہاں شاکر علی کو بند کیا تھا۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی دہشت زدہ ہوگیا۔ پھر خوف آمیز لہجے میں گڑگڑانے لگا۔

"خدا کے لیے مجھے نہ مارنا۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔"

"تم نے قادرِ مطلق کا واسطہ دیا ہے تو میں تمہیں جان سے نہیں گزاروں گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔ سمجھے امید ہے' اس جان بخشی کے بدلے تم شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سچ بولو گے۔"

"میں ایک ایک بات سچ بتاؤں گا۔" وہ گھگیایا "تم پوچھو' کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں نے پوچھا "تمہارے باس میاں زاہد حسین کا اصل ٹھکانہ کہاں ہے؟"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں' اس کے اصل ٹھکانے سے میں واقف نہیں۔ میں کیا بلکہ کوئی بھی واقف نہیں۔ وہ بہت محتاط اور کایاں شخص ہے' مختلف ٹھکانوں پر پایا جاتا ہے۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا' وہ کس وقت کہاں ہوگا۔"

"تم مجھے چکر دینے کی کوشش تو نہیں کررہے؟"

"میں پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہتا ہوں' اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں۔"

میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ وہ گرین بیلٹ والے بنگلے پر ہماری سفاکی اور مشاقی کا ٹریلر دیکھ چکا تھا جس کے نتیجے میں اپنے قدموں کا نہیں رہا تھا۔ مجھے امید تھی' وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کو کسی رسک کی بھینٹ چڑھانے کی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے اس کے جواب پر یقین کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' میں تمہارے بیان کو بعد میں چیک کروں گا اور بیان غلط ثابت ہونے پر تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا' میں نے پوچھا "رات کو یہاں دو اور افراد بھی موجود تھے جن میں ایک کا نام تارا ہے۔ وہ نصف شب کے بعد ایک سیاہ لینڈ کروزر میں بنگلے سے کہیں چلے گئے تھے۔ تارا کے ساتھ وہ دوسرا پستہ قامت نوجوان کون تھا؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں سمجھ گیا' کوئی خاص بات ہے اسی لیے وہ جواب دینے میں تامل کا اظہار کررہا تھا۔ میں نے خوں خوار لہجے میں کہا۔

"تمہارے جواب سے میں تمہاری سچائی کو بھی پرکھ لوں گا کیونکہ میں مذکورہ نوجوان کو اچھی طرح جانتا ہوں" یہ جھوٹ میں نے اس سے سچ اگلوانے کی خاطر بولا تھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "وہ فیصل صاحب ہیں۔ چوہدری نوازش علی صاحب کے صاحب زادے' کچھ دنوں سے وہ یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

شاکر علی کے جواب نے میرے وجود میں سنسنی دوڑادی۔ وہ ایک بہت ہی اہم انکشاف کررہا تھا۔ ملک نوازش علی کا سپوت چھوٹا چوہدری کراچی میں موجود تھا۔ گویا چوہدری نوازش علی اور چوہدری عابد علی کی جوان اولاد آپس میں ٹکرانے والی تھی۔ فیصل میری جانب پیش قدمی نہ بھی کرتا تو میں اسے ضرور ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتا۔

اپنے اندرونی جذبات کو چہرے کے تاثرات سے ظاہر

نہ کرتے ہوئے میں نے شاکر علی سے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "تم نے سچ بول کر میرا اعتماد حاصل کرلیا ہے۔ میں فیصل کی کراچی میں آمد سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ اب تم یہ بھی بتادو' فیصل اور تارا سیاہ لینڈ کروزر میں کہاں گئے ہیں؟"

"وہ دونوں گلشن والے بنگلے پر گئے ہیں" اس نے بتایا "ان کی شب بسری کا وہیں بندوبست کیا گیا ہے۔"

میں نے پوچھا "گلشن میں وہ بنگلا کس جگہ واقع ہے؟"

اس نے بنگلے کا نمبر بتانے کے بعد لوکیشن کی جو وضاحت کی اس کے مطابق وہ بنگلا حسن اسکوائر اور نیاچور نگی کے درمیان واقع تھا۔ میں نے یہ معلومات اپنے ذہن میں محفوظ کرلیں۔ وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔

شاکر علی نے ساجت آمیز انداز میں کہا "میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر آپ کو یہ معلومات فراہم تو کردی ہیں لیکن میری ایک درخواست ہے۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا' وہ بولا "اس سلسلے میں میرا نام کہیں نہیں آنا چاہیے۔ آپ میری مجبوری کو سمجھ رہے ہیں نا۔"

"تم اس حوالے سے بے فکر ہوجاؤ" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ کہیں دور ایک مخصوص سائرن کی آواز سنائی دی' اس قسم کا سائرن یا تو پولیس موبائل سے خارج ہوتا تھا یا پھر کسی ایمبولینس سے' میں نے کبیر شاہ سے کہا۔

"شاہ جی! رخشی کو شاکر کے پاس بھیج دو۔ اب ہم یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتے۔"

کبیر شاہ نے گن کی نال سے ٹھوکا دے کر رخشی کو باتھ روم میں "منتقل" کردیا۔ شاکر نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

"آپ اس کو میرے پاس کیوں بھیج رہے ہیں؟"

"تاکہ رات کے باقی حصے کو تم یادگار بنا سکو" میں نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

وہ بوکھلا گیا "میں... میں اس کا کیا کروں گا؟"

"تم اس کے پیٹے کا تقاضا پورا کروگے؟" میں نے کہا "یعنی اپنے باس کے پیسے پورے کروگے؟"

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا' میں نے ایک دھڑاکے سے باتھ روم کا دروازہ بند کرکے باہر سے بولٹ کردیا۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کس طرح نمٹیں گے۔ میں نے تو صرف رخشی کو اس مقصد کے لیے مقید کیا تھا کہ وہ ہمارے پیچھے وہاں کوئی گند نہ کرسکے۔

مخصوص قسم کے سائرن کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آرہی تھی۔ آواز کا رخ اور زاویہ بتا رہا تھا کہ وہ گاڑی ہماری ہی سمت میں رواں دواں ہے۔ ہم نے ایک دوڑ لگا کر بنگلے کی عقبی دیوار پھاندی اور اپنی موٹر سائیکلز کے پاس پہنچ گئے۔ اس مقام پر اندھیرے اور سناٹے نے ڈیرا جمار کھا تھا۔ "سامان" سمیت موٹر سائیکلز محفوظ تھیں۔

ہم نے آنِ واحد میں اپنی "گاڑیاں" اسٹارٹ کیں اور سائرن کی مخالف سمت میں روانہ ہوگئے۔ ایک منٹ بعد وہ مخصوص آواز ہماری سماعت کے دائرہ کار سے باہر ہوگئی' گویا ہم محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تھے۔

میری شرٹ قوبا کے خون سے بری طرح آلودہ ہوگئی تھی۔ ہم زیادہ دیر تک سڑکیں ناپنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے چنانچہ جب ہمیں اطمینان ہوگیا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جارہا تو ہم نے موٹر سائیکلز کا رخ "ساوتھ" کی جانب موڑ دیا۔

جب ہم ساوتھ پہنچے تو فجر کی اذان ہورہی تھی۔

✪✲✪

سپیدۂ سحر نمودار ہورہا تھا۔ اس پارک میں لگ بھگ دو درجن افراد سحر خیزی میں مصروف تھے جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ مذکورہ پارک "ساوتھ" سے واکنگ ڈسٹینس پر تھا اور ایک جدید ترین خوبصورت مسجد سے ملحق تھا یعنی مسجد پارک ہی کے ایک کونے میں بنی ہوئی تھیں۔ ڈیفنس سوسائٹی کے اہل ثروت حضرات نے عبادت کے لیے مسجد بھی شاندار اور دلکش بنوائی تھی تاکہ یادِ الٰہی میں مصروفیت کے دوران میں بھی ان کا احساس تفاخر کی منزلوں کو چھوتا رہے۔ یہ ایک طرح سے مثبت طرزِ فکر تھا کیونکہ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے سلسلے میں لوگ سب سے زیادہ کنجوسی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بعض تو اچھے خاصے ہوتے ہوئے بھی مفلس و نادار بن جاتے ہیں۔

میں اس وقت نیوی بلیو ٹریک سوٹ (TRACK SUIT) میں تھا اور پارک کے ایک کونے میں سانس کی مشق کی تیاری کررہا تھا۔ ساوتھ پہنچ کر سب سے پہلے میں نے باتھ لے کر لباس تبدیل کیا تھا۔ کبیر شاہ نے جب سونے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے فی الحال نیند نہیں آرہی لہٰذا میں ایکسرسائز کے لیے نزدیکی پارک جاؤں گا۔ پارک اسی وقت میری نگاہ میں سمایا تھا۔ جب امتیاز نے مسٹر نیل کو ائرپورٹ سے ساوتھ پہنچایا تھا۔ جب میں نے [illegible] کا ارادہ ظاہر کیا تو کبیر شاہ نے مجھے یہ نیو برانڈ ٹریک سوٹ فراہم کردیا تھا۔

یہ پوری رات جس کی اب صبح ہورہی تھی' میں نے [illegible] افزا تنفری اور ٹینشن میں گزاری تھی اس لیے یوگا کی [illegible] مخصوص مشق کے ذریعے میں اپنے حواس اور اعصاب [illegible] سکون پہنچانا چاہتا تھا۔ میں پارک کے کونے میں شمال رخ [illegible] آسن (LOTUS POSTURE) جما کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کرکے میں نے چند ہموار اور گہری سانسیں [illegible]۔ اس کے بعد میں نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور [illegible] شہادت کو ملا کر ایک چٹکی بنائی اور اپنی ناک کو اس [illegible] کے اندر جکڑ لیا۔ یہ جکڑ بہت نرم خو تھی۔ پھر میں نے یوگا [illegible] اس مخصوص مشق کا آغاز کردیا جو پرانایام (PRANAYAM) کہلاتی ہے۔ میں نے اپنے تجربے اور [illegible] کے پیشِ نظر اس مشق میں کچھ ترمیم و اضافہ کرلیا تھا [illegible] طرح یہ زیادہ مفید اور سودمند ہوگئی تھی۔

میں نے انگشتِ شہادت سے بائیں نتھنے کو دبائے رکھا اور دائیں نتھنے پر سے انگوٹھے کی گرفت ڈھیلی کردی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دھیرے دھیرے سانس کو اندر کھینچنا یعنی (INHALE) کرنا شروع کیا۔ میرا تصور اس نکتے پر جما ہوا تھا [illegible] کائنات کی سب سے بڑی سچائی نورِ الٰہی اس سانس کے ساتھ ہی میرے نتھنے کے راستے پھیپھڑوں میں بھر رہا ہے۔ [illegible] فلٹریشن (FILTRATION) کی غرض سے جو خون [illegible] میں پمپ کررہا ہے یہ نور اس خون میں شامل [illegible] میرے پورے بدن میں گردش کررہا ہے۔ (INHALE) [illegible] تکمیل تک میں اس تصور پر قائم رہا پھر میں نے انگوٹھے [illegible] دائیں نتھنے کو دبا کر بائیں نتھنے کو آزاد کردیا۔ اس کے [illegible] سانس خارج کرنے کا عمل یعنی (EXHALE) [illegible] ہوگیا۔ میں دھیرے دھیرے سانس چھوڑتے ہوئے یہ [illegible] تھا۔ اس سانس کے ساتھ میری تمام ذہنی' جسمانی [illegible] خرابیاں بھی میری ذات سے خارج ہورہی ہیں۔ [illegible] تصور کے ساتھ ہی خارج ہوتی ہوئی سانس مجھے آلودہ اور [illegible] محسوس ہونے لگی جبکہ (INHALE) کرتے وقت [illegible] انتہائی لطیف اور نور سے معمور تھی۔

میں نے نتھنوں کی تبدیلی کے ساتھ یہ عمل چھ مرتبہ [illegible] گویا میں نے اس مشق کے چھ چکر پورے کرلیے تھے۔ [illegible] جسم اور روح بالکل تر و تازہ ہوگئے۔ مجھے اپنے [illegible] میں ایک ٹھنڈک اور جذبات میں خوش بو اترتی محسوس ہوئی۔ میری ذات معطر ہوگئی۔ اگر بھرپور تصور کے ساتھ "پرانایام" کی یہ سادہ سی مشق کی جائے تو یہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مشق کے اختتام پر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھلیں تو میری نگاہ ایک مسکراتے ہوئے حسین چہرے سے ٹکرائی۔ وہ ایک نکی بینچ پر بیٹھی تھی اور بڑے دل آویز انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ملکوتی مسکراہٹ سجی تھی۔ جواباً میں زیرِ لب مسکرایا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اس پارک کے گرداگرد' گھاس کے مستطیل قطعے کے چاروں جانب جوگنگ اور واکنگ کرنے والوں کے لیے ایک پختہ ٹریک بنا ہوا تھا۔ میں گھاس سے اٹھ کر جب اس ٹریک پر آیا تو اسی حسین چہرے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ کر کیوں مسکرا رہی تھی' میری یادداشت نے پلک جھپکتے میں مجھے بتادیا' یہ چہرہ میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس کی دلکش مسکراہٹ کیا معنی رکھتی تھی؟

میں انہی سوچوں میں غلطاں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اپنے عقب میں مجھے ایک مترنم نسوانی آواز سنائی دی "ایکسکیوزمی مسٹر...!"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو اسی حسین چہرے سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ مجھ سے پانچ فٹ کی دوری پر تھی اور بڑی گہری نظر سے میرے خال وخط کو کھوج رہی تھی۔ میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"سوری... آپ نے مجھے آواز دی ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولی "میرا نام صدف ہے۔ میں اس سامنے والے بنگلے میں رہتی ہوں" پھر اس نے پارک کے باہر ایک بنگلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ بنگلا جس کا گیٹ محرابی شکل کا ہے۔ اس پر نیلا رنگ ہوا ہے اور ہینڈل پیتل کے ہیں۔"

میں نے غیر ارادی طور پر نگاہ اٹھا کر مذکورہ بنگلے کے گیٹ کو دیکھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ مجھے اپنے بارے میں اس تفصیل سے کیوں آگاہ کررہی تھی جبکہ میں اسے جانتا تک نہیں تھا۔ اس نے میرے چہرے کی الجھن پڑھ لی۔

"آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ سے خواہ مخواہ کیوں فری ہورہی ہوں" وہ تبسم ریز انداز میں بولی "دراصل آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے شدید حیرانی ہورہی ہے۔ آپ تو انڈیا میں تھے۔"

حیران تو میں پہلے ہی تھا۔ اب اس حیرت میں کئی چند اضافہ ہوگیا۔ وہ میری ذات سے انڈیا کو منسوب کررہی تھی۔ میں فوراً ریڈ الرٹ ہوگیا۔ اپنے اندرونی جذبات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور قدرے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟"

"اگر میری آنکھیں اور یادداشت دھوکا نہیں کھا رہی ہیں تو آپ کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔" وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی "انڈیا کی پنک سٹی یعنی جے پور میں۔"

جے پور کے ذکر پر میں چونک اٹھا۔ پنک سٹی کے نام سے معروف ہندوستان کا یہ شہر ایک طویل عرصے تک میری آماجگاہ رہا تھا۔ اسی شہر میں صدف نامی یہ لڑکی مجھے دیکھنے کا دعویٰ کررہی تھی۔ میں نے اپنے جذبات اور چہرے کے تاثرات کو حتی المقدور چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو کبھی انڈیا گیا ہی نہیں، پھر جے پور اور پنک سٹی میں میرے پائے جانے کا کیا سوال؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اس سے پوچھا "آپ نے وہاں کس جگہ مجھے دیکھا تھا۔ کیا ہماری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ اگر ہوئی تھی تو مجھے کیوں یاد نہیں؟"

میں نے دانستہ اس قسم کا انداز اپنایا تھا کہ وہ میرے چور خیالات کو نہ سمجھ سکے۔ اس نے مجھے بھرپور نظر سے دیکھتے ہوئے وضاحت کی۔

"ہماری وہاں ملاقات ہوئی ہے اور نہ ہی میں نے آپ کو براہِ راست دیکھا ہے" اس نے بدستور گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "جے پور میں میرے ماموں سرفراز خان رہتے ہیں۔ وہاں ان کا لیدر کا بزنس ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں ان کے پاس جے پور گئی ہوئی تھی۔ میں نے جے پور کے اخبارات میں آپ کی تصویریں دیکھی تھیں۔ آپ نے اس شہر کے پنڈتوں کی نیندیں حرام کررکھی تھیں۔ ٹھاکر بھانوتو سنگھ نامی ایک مقامی طاقت ور شخص آپ کی پشت پناہی کررہا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ آپ کے معرکوں کی خبریں جے پور کے اخبارات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ آپ نے کسی ہندو ناری رانی روپ متی کو بھی اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ ایک مُسلے کے ہندو ناری سے تعلقات پر وہاں کے پنڈت اور پجاری سخت مشتعل تھے۔ آپ کا نام وجدان ہی ہے نا؟"

صدف نے جو کچھ بیان کیا، وہ مبنی برحقیقت تھا مگر میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ایک اجنبی لڑکی سے پہلی ہی ملاقات میں، میں کھل نہیں سکتا تھا اور خاص طور پر اس صورت میں کہ میں آگ اور خون کے دریا سے گزر رہا تھا۔ گزشتہ رات والا واقعہ اس کی مثال کے لیے کافی ہے۔

میں نے کامیاب اداکاری کا مظاہرہ جاری رکھتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بڑے ٹھہراؤ سے کہا "میں پھر کہوں گا کہ آپ اس وقت کسی سخت قسم کی غلط فہمی یا مغالطے کا شکار ہورہی ہیں۔ میرا نام وجدان نہیں بلکہ وجیہ ہے اور میں کبھی انڈیا نہیں گیا۔ ممکن ہے، آپ کے بیان کردہ وجدان کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہو جس کی وجہ سے آپ مجھے وجدان سمجھ رہی ہیں۔"

اس نے توجہ سے میری بات سنی اور بے یقینی سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "اگر آپ کی مانگ کو ختم کرکے چہرے سے مونچھوں کو ہٹا دیا جائے تو آپ وہی وجدان بن جائیں گے جس کا میں ذکر کررہی ہوں۔ خیر۔"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اپنے حلیے میں مونچھوں اور ہیئر اسٹائل کی تبدیلی میں نے امتیاز علی کے مشورے پر کی تھی۔ صدف کا مشاہدہ بہت قوی تھا۔ یہ تو میری ضد نما فن کاری تھی کہ میں اس سے اتفاق نہیں کررہا تھا ورنہ وہ تو صد فی صد مجھے پہچان گئی تھی۔

صدف کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ گداز بدن کے ساتھ یہ قامت قیامت میں بدل گئی تھی۔ اس پُرچہرے کی دلکشی اور مخصوص ملکوتی مسکراہٹ نے اس کی شخصیت کو انفرادیت دے کر ایک حسین نکھار سے نواز دیا تھا۔ مجھے اپنے سراپا سے نگاہی تعارف میں مصروف پا کر اس نے پوچھا۔

"وجیہ صاحب! میں نے آپ کو وجدان سمجھ کر خواہ مخواہ زحمت دی۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔"

"نو مینشن پلیز۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے پوچھا "کیا آپ یہیں قریب ہی رہتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں کراچی میں نیا ہوں۔ ایک دوست کے ہاں مہمان ٹھہرا ہوا ہوں۔" پھر میں نے اسے فلیٹ کا ایڈریس بتا دیا۔ "میرا دوست اسی فلیٹ میں رہتا ہے۔ دو چار دن بعد میں واپس اپنے شہر لاہور چلا جاؤں گا۔"

"اوہ! تو آپ کا تعلق لاہور سے ہے۔" وہ چونکی اور مسکراتے ہوئے بتایا "میری ممی بھی لاہور کی رہنے والی ہیں۔ پاپا مقامی ہیں۔ میری ننھیال لاہور میں شادمان کالونی میں ہے۔ آپ وہاں کس جگہ رہتے ہیں؟"

"اچھرہ!" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

جب میں دو ماہ کا تھا تو میرے والد صاحب چوہدری نوازش کے پاؤں تو غنڈے دارا سے مجھے بچاتے ہوئے لاہور کے کئی علاقوں میں روپوش ہوئے تھے۔ موضع "رکھاں والی" سے گلشن راوی اور پھر اچھرہ میں ان کا قیام رہا تھا۔ ازاں بعد وہ کراچی آگئے پھر ایک دوست کے توسط سے سنگاپور چلے گئے تھے۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر وجیہ۔" صدف کی آواز نے مجھے خیال سے چونکا دیا۔ "میں ڈاؤ میں میڈیکل پڑھ رہی ہوں۔ یہ میرا فائنل ائیر ہے۔ ایک سال بعد انشاءاللہ میں ڈاکٹر بن جاؤں گی۔ آپ کیا اسٹڈی کررہے ہیں؟"

میں نے سرسری انداز میں بتایا "میں گریجویشن سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ والد صاحب کا سونے کا بزنس ہے۔ انہی کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ انارکلی میں ہماری جیولری کی بہت بڑی دکان ہے۔"

یہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے دل میں سخت افسوس ہو رہا تھا لیکن مجھے حالات اور مصلحت کا تقاضا نبھانا بھی ضروری تھا خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ جے پور میں میری ماضی کی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ تھی۔ میں نے سوچا' بعد میں کبھی اگر ملاقات کا موقع ملا تو میں اس غلط بیانی کے لیے معذرت کرلوں گا۔

اسی لمحے صدف نے مجھے پکارا "اوکے مسٹر وجیہ! زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ میرے پاپا نماز ادا کرکے مسجد سے نکل آئے ہیں۔ اب میں ان کے ساتھ واک کروں گی۔ میں یہاں روزانہ مارننگ واک کرنے آتی ہوں۔"

آخری جملہ صدف نے کچھ اس انداز میں ادا کیا تھا جیسے مجھے کوئی خاص قسم کی اطلاع دے رہی ہو۔ میں اس کو سی آف کرکے پارک سے نکل آیا۔

واپس ساؤتھ کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ بہ ظاہر یہ دنیا بہت بڑی نظر آتی ہے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہزاروں میل پھیلی ہوئی۔ لیکن حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو یہ بہت چھوٹی سی دنیا ہے۔ یہاں ہم بار بار ایک دوسرے سے سامنا کرتے ہیں۔ کبھی پہچان کر آگے بڑھتے ہیں اور پُرجوش انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی۔۔۔ پہچان کر بھی نہیں پہچان پاتے' چند رسمی جملوں کا تبادلہ کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان دونوں کیفیات کے بیان کے لیے میری اور صدف کی ملاقات کی مثال کافی ہے۔ وہ مجھے پہچان کر آگے بڑھی تھی لیکن میں کترا کر نکل آیا تھا۔

ساؤتھ میں' واپسی پر اشتیاق احمد سے ملاقات ہوئی۔ اشتیاق میری کراچی میں آمد اور "سی ایف کے" میں شمولیت سے قبل امتیاز کے ساتھ اس کے چھوٹے بھائی کی بیٹھک سے طارق روڈ والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔

"کبیر بھائی تو سو چکے ہیں۔ انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ آپ کے ساتھ رہوں اور آپ کی ضرورتوں کا خیال رکھوں۔"

میں نے کہا "اشتیاق! فی الحال میں بھرپور ناشتہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آرام کا ارادہ ہے۔ تمہاری یہ ڈیوٹی بہت آسان ثابت ہوگی۔"

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے میرے لیے ناشتے کا بندوبست کرنے چلا گیا۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں' میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ گزشتہ پوری رات میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھ نہیں لگائی تھی۔ پیٹ میں خوراک گئی تو مجھ پر کسل مندی سوار ہونے لگی۔ رات والے خونچکاں آپریشن نے مجھے جسمانی اور اعصابی طور پر تھکا دیا تھا۔ یوگا کی مشق نے جہاں مجھے مکمل سکون بخشا تھا وہیں میری بھوک کو بھی بھڑکا دیا تھا جس کے نتیجے میں' میں تین افراد کا ناشتا معدے میں اتار چکا تھا۔

اسی اوور ایٹنگ نے مجھے ایک خمار کی سی کیفیت میں مبتلا کردیا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی تو میں اپنے لیے مخصوص کمرے میں آگیا۔

جب میں بستر پر دراز ہوا تو صدف چپکے سے میری سوچ میں داخل ہوگئی۔ تھوڑی دیر پہلے پارک میں اس سے جو ملاقات ہوئی تھی' میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے فرض کیا' اگر میں اس کی بات کی تصدیق کردیتا' خود کو وجدان تسلیم کرلیتا تو اس کا ردِعمل کیا ہوتا؟ اور اب جب کہ میں نے اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے خود کو وجیہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی تو اس سے وہ کیا تاثر لے گی؟

یہ دونوں سوالات ایسے تھے کہ میں اپنے ذہن میں ان کا کوئی حتمی جواب تلاش نہیں کرسکا۔ صدف کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا خیال آپوں آپ ساحل کی جانب پرواز کر گیا۔ میں گزشتہ رات اس کے پاس سے بڑے جذباتی انداز میں رخصت ہوا تھا۔ اپنی پیشانی پر اس کے بوسے کی خوشبو میں ابھی تک محسوس کررہا تھا۔ ساحل ایک مہکتا ہوا پھول تھی۔ اس کا قرب میرے تن بدن کو اپنی مہک سے سجا رہا تھا۔ جب سے اس نے گریز کی "پالیسی" اپنائی تھی' میری طلب میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ اس حرارت [illegible] سے قبل' میں ہفتوں سے اس کے لمس کو [illegible] تھا۔ اگر مجھے ہنگامی حالات کے پیش نظر واپس [illegible] جانا ہوتا تو میں اس کے یاقوتی لبوں کو اپنی پیشانی [illegible] ہونے دیتا۔

[illegible] دارت زندگی کا دوسرا نام ہے۔ ساحل کے شنگرفی [illegible] کسی انگارے سے کم نہیں تھے۔ وہ انگارا جو جلاتا [illegible] طاتا ہے۔ اپنی کیف آور آنچ سے جی کو برماتا ہے' [illegible] کو گرماتا ہے اور احساسات کو مہکاتا ہے۔۔۔ اس کا [illegible] کو تڑپاتا ہے!

[illegible] میں تڑپ کر بستر سے اٹھا میرا ہاتھ میکانکی انداز میں بے [illegible] سائیڈ پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ [illegible] مجھے بے طرح یاد آنے لگی تھی۔ ہمیں جدا ہوئے بہ [illegible] گھنٹے ہوئے تھے لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے [illegible] صدیاں بیت گئی ہوں۔

[illegible] میں نے منہاس باقر کے بنگلے کے نمبر ڈائل کیے اور [illegible] جانب سے فون ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ دو [illegible] ہونے لگی۔ رات والے خونچکاں آپریشن نے مجھے جسمانی اور اعصابی طور پر تھکا دیا تھا۔ یوگا کی مشق نے جہاں مجھے مکمل سکون بخشا تھا وہیں میری بھوک کو بھی بھڑکا دیا تھا جس کے نتیجے میں' میں تین افراد کا ناشتا معدے میں اتار چکا تھا۔

اسی اوور ایٹنگ نے مجھے ایک خمار کی سی کیفیت میں مبتلا کردیا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی تو میں اپنے لیے مخصوص کمرے میں آگیا۔

جب میں بستر پر دراز ہوا تو صدف چپکے سے میری سوچ میں داخل ہوگئی۔ تھوڑی دیر پہلے پارک میں اس سے جو ملاقات ہوئی تھی' میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے فرض کیا' اگر میں اس کی بات کی تصدیق کردیتا' خود کو وجدان تسلیم کرلیتا تو اس کا ردِعمل کیا ہوتا؟ اور اب جب کہ میں نے اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے خود کو وجیہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی تو اس سے وہ کیا تاثر لے گی؟

یہ دونوں سوالات ایسے تھے کہ میں اپنے ذہن میں ان کا کوئی حتمی جواب تلاش نہیں کرسکا۔ صدف کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا خیال آپوں آپ ساحل کی جانب پرواز کر گیا۔ میں گزشتہ رات اس کے پاس سے بڑے جذباتی انداز میں رخصت ہوا تھا۔ اپنی پیشانی پر اس کے بوسے کی خوشبو میں ابھی تک محسوس کررہا تھا۔ ساحل ایک مہکتا ہوا پھول تھی۔ اس کا قرب میرے تن بدن کو اپنی مہک سے سجا رہا تھا۔ جب سے اس نے گریز کی "پالیسی" اپنائی تھی' میری

[illegible] شاہ پر نظر پڑ گئی۔ وہ برآمدے میں ایک کرسی پر نیم دراز تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

"اچھا ہوا' تم خود ہی اٹھ گئے ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں جگانا پڑے گا۔"

"کیوں' کوئی خاص بات؟" میں یہ کہتے ہوئے اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ کھانے کا وقت ہے اور مجھے ٹھیک ٹھاک بھوک بھی لگ رہی ہے۔ کھانے کے دوران میں دوسری خاص باتیں بھی ہو جائیں گی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "ویسے تمہارے لیے سب سے خاص اطلاع یہ ہے کہ آج شام چھ بجے غوری صاحب یہاں پہنچ رہے ہیں۔ انہوں نے وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے فون کیا تھا۔ تم اس وقت سو رہے تھے۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے میں نے غوری صاحب کو گزشتہ رات والی کارروائی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ وہ ہماری کارکردگی پر بہت خوش ہیں البتہ میاں زاہد کے نکل جانے کا انہیں خاصا افسوس ہے۔"

"ہاں شاہ جی! افسوس تو مجھے بھی بہت ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا اور میرے تصور میں وہ تمام مناظر گھوم گئے جو ڈیفنس کے بنگلا نمبر "بی۔ تھری ایٹ" میں دیکھنے کو ملے تھے۔

کبیر شاہ نے کہا "تم فکر نہ کرو وجدان! وہ زیادہ دیر تک ہم سے دور نہیں رہ سکے گا ہمیں زاہد حسین کے گلشن والے ٹھکانے کا پتا چل چکا ہے۔ آج رات ہم وہاں ریڈ (RAID) کریں گے۔ پاس بھی جب تک یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ ان کا مشورہ اس سلسلے میں ہمارے لیے مفید ثابت ہوگا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "شعیب ہماری بہتر طور پر راہ نمائی کرسکتا ہے۔ میں میاں زاہد حسین کی تلاش میں ایک نہیں' ایک ہزار بلکہ ایک لاکھ اڈوں اور ٹھکانوں پر یلغار کرسکتا ہوں۔ وہ پاتال میں بھی چھپ بیٹھا تو میں اسے دم سے پکڑ کر کھینچ نکالوں گا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا "میں تمہارے جذبات کو محسوس کرسکتا ہوں۔"

"شاہ جی!" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "بی۔ تھری ایٹ میں ہم اپنے آدمی فرخ خان کو بھی باندھ کر چھوڑ آئے ہیں۔ اس کا پتا نہیں' کیا بنا ہوگا؟"

وہ ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کا ماہر ہے۔" وہ بولا "وہاں سے ہماری روانگی کے بعد فرخ اور دیگر ملازمین نے

کسی نہ کسی طرح خود کو ان بندشوں سے آزاد کرالیا ہوگا۔ میرا خیال ہے' شاکر علی کی چیخ پکار پر وہ ان دونوں کو باتھ روم سے باہر لے ہوں گے۔" کبیر شاہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر معنی خیز انداز میں بولا "پتا نہیں' شاکر علی نے اپنے باس کی پیشگی ادائی کا حق وصول کرلیا ہوگا یا نہیں!"

میں سمجھ گیا' اس کا اشارہ حشر خیز دن کی مالک کال گرل رخشی کی جانب تھا۔ میں نے رخشی کو معذور شاکر کے ساتھ باتھ روم میں بند کردیا تھا۔ رخشی اور اس کی دونوں ساتھیوں نازش اور سُرلا کو ایڈونس پے منٹ پر وہاں لایا گیا تھا۔

کبیر شاہ کے ساتھ میں نے واجبی سا لنچ کیا۔ اس کی وجہ صبح والا تگڑا ناشتا تھی۔ اس وقت مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا پھر میں کبیر شاہ سے آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

آرام تو میں اچھا خاصا کر چکا تھا۔ اس وقت میں دراصل ساحل کو فون کرنا چاہتا تھا۔ کمرے کے اندر مجھے مکمل پرائیویسی میسر آجاتی۔ ساؤتھ میں شام سے پہلے میرے لیے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ شعیب غوری شام چھ بجے آ رہا تھا جس کا مطلب تھا' وہ پاکستانی وقت کے مطابق صبح دس بجے کے قریب جہاز میں سوار ہوا ہوگا۔ کراچی اور ماریشس (Mauritius) کے درمیان کم و بیش آٹھ گھنٹے کی فلائٹ تھی۔

میں نے منہاس باقر کے بنگلے کا فون نمبر پنچ کیا۔ تیسری گھنٹی پر دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ وہ واجد تھا۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد اس سے' ساحل سے بات کرانے کو کہا۔

وہ بولا "مسٹر وجدان! وہ تینوں نکلی ہوئی ہیں' شاپنگ وغیرہ کے چکر میں۔"

"ان کی واپسی کا امکان کب تک ہے؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا "اگر آپ کہتے ہیں تو ممی سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا' وہ کب سے گئی ہوئی ہیں؟"

"نہیں' یہ بھی نہیں معلوم۔" اس نے معذرت آمیز انداز میں جواب دیا "میں ابھی تھوڑی دیر پہلے کالج سے آیا ہوں۔ وہ میری آمد سے پہلے ہی جا چکی تھیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے' میں بعد میں فون کرلوں گا۔" میں نے کہا۔

"کوئی خاص بات تھی مسٹر وجدان؟"

"نہیں' بس ایسے ہی ساحل کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔"

"خیریت کے سلسلے میں تو آپ بالکل بے فکر رہیں۔ یہ منہاس باقر کا بنگلا ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

"ہاں' وہ تو ہے۔" میں نے کہا اور اختتامی کلمات ادا کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

واجد نے بڑے فخریہ انداز میں مجھے بتایا تھا کہ وہ منہاس باقر کا بنگلا تھا۔ یہ ایک بیٹے کا اپنے باپ پر مضبوط اعتماد تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کیوں کہ آج کل کی اولاد کے رویے بہت بدل گئے ہیں۔ وہ اپنے والدین پر فخر کرنے کے بجائے اعتراضات کرتے ہیں اور پھر لمحے ان کی غلطیاں اور کوتاہیاں گنوانے میں مصروف رہتے ہیں۔

میں ساحل کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان دنوں منہاس باقر کے گھر میں شبانہ کی شادی کا ہنگامہ چل رہا تھا۔ دو ہفتے بعد اس کی شادی تھی۔ ممتاز اس کی شادی میں شرکت کے لیے ہی "نیو یارک" سے کراچی پہنچی تھی۔ جب ہماری اس سے ایک ریسٹورنٹ میں اتفاقیہ ملاقات ہوئی تو وہ اس وقت بھی شبانہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھی۔

ایسا سوچتے ہوئے میرا دھیان ان دو لفنگوں کی طرف چلا گیا جو خود کو فری لانسر کہلاتے تھے اور کرایے پر مختلف جرم کرتے تھے۔ بی۔ تھری ایٹ کے کسی محمود لاٹانی نامی سیاست دان نے انہیں ممتاز کا کھوج لگانے پر مامور کیا تھا۔ ازاں بعد مجھے پتا چلا' بی تھری ایٹ میں میاں زاہد حسین رہتا تھا۔ گزشتہ رات ہم نے مذکورہ بنگلے پر حملہ کرکے اپنے دشمنوں کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا تاہم میاں زاہد ہمیں جل دینے میں کامیاب رہا تھا۔

فری لانسر غنڈے وقار نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں محمود لاٹانی کے ایما پر مدھوری ڈکشٹ (ممتاز) کا تعاقب کر رہے تھے تو میں اس معاملے کو سمجھ نہیں سکا تھا پھر گزشتہ رات میں نے بی۔ تھری ایٹ میں تارا کی جھلک دیکھی تو ساری بات پوری وضاحت کے ساتھ میرے ذہن میں اتر گئی۔ تارا ممتاز کی جانب سے بہت ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ اس کا کھوج نکلوانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ممتاز کی مضبوط گواہی پر ہی وہ اور اس کا جوڑی دار وڈیرا اکبر سومرو پولیس کی تحویل میں گئے تھے۔ تارا کو کراچی میں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کیوں کہ ان کا جرم ایسا نہیں تھا کہ اتنی جلدی چھوٹ جاتے۔ بہرحال یہاں کی پولیس اور قانون کے چنگل میں قدم قدم پر دیکھ رہا تھا!

تارا کا خیال آتے ہی میں بے چین ہوگیا۔ گزشتہ رات تھرڈ ایٹ سے گلشن اقبال چلا گیا تھا اس لیے میرے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس سے اہم بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اس کے ساتھ چوہدری نوازش علی کا بیٹا فیصل بھی تھا۔ فیصل کو زخمی حالت میں پولیس کے حوالے کیا گیا تھا لیکن میں نے اسے بالکل ٹھیک ٹھاک اور چاق و چوبند دیکھا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ پوری طرح فٹ ہو کر ہسپتال میں اتر آیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔

میں بستر پر نیم دراز یہ باتیں سوچ رہا تھا لیکن دل ساحل کی طرف لگا ہوا تھا۔ جب بے کلی بڑھی تو میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے ساؤتھ کے قائم مقام کرتا دھرتا کبیر شاہ سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔

"کیا تم اکیلے ہی جانا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کیا میرے تنہا جانے میں کوئی قباحت ہے؟"

"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ گڑبڑا کر بولا "میں تو تمہاری حفاظت کے خیال سے پوچھ رہا تھا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "شکریہ دوست۔ میں زیادہ دیر نہیں جاؤں گا۔۔۔ اور میں اکیلے ہی جانا چاہتا ہوں۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "واپسی کب تک ہو گی؟"

"جلدی آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں یہ تو یاد ہی ہوگا کہ باس چھ بجے کی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں۔ سات ساڑھے سات بجے وہ بنگلے پر آجائیں گے۔ میں انہیں لینے ایئرپورٹ جاؤں گا۔" کبیر شاہ نے نگرانی کے طور پر کہا "جب تک تم واپس آ ہی چکے ہو گے؟"

آخری جملہ اس نے سوالیہ انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے کہا "شیور۔ ساڑھے سات بجنے میں ابھی کم از کم چار گھنٹے باقی ہیں۔ میں اس سے پہلے ہی تمہیں ساؤتھ میں موجود ملوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ مطمئن ہوگیا۔ میں اپنی نیلی شیرڈ میں ساؤتھ سے روانہ ہوگیا۔ یہ گاڑی شعیب غوری نے مجھے دوستی کی خوشی میں بہ طور تحفہ دی تھی جس کا نمبر انتہائی آسان اور مرتب تھا 'تھری ون ٹو' تھری' فور۔ اس نمبر کا مجموعہ دس بنتا تھا جس کا ہر عدد ایک ہوتا ہے۔ یہ عدد میرے نام کے عدد سے ہو بہو میچ کرتا تھا۔ وجدان کا مجموعہ انیس بنتا ہے اور اس کی مفرد صورت بھی "ایک" ہی ہے۔ نمبر کی میچنگ ایک اچھا شگون تھا۔

میں نے مسجد والے پارک سے شیرڈ کو ٹرن کیا اور نیشنل ہائی وے (مین کورنگی روڈ) پر آگیا۔ اس وقت میں ڈیفنس فیز ون اور ٹو کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ کشمیر کالونی کے سگنل سے میں نے گاڑی کو مین اتحاد پر ڈال دیا۔ یہ خیابان سیدھی سی ویو کو جاتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں منہاس باقر کے بنگلے پر پہنچ گیا۔

منہاس اس وقت گھر پر ہی تھا۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ تینوں (ساحل + ممتاز + شبانہ) ابھی تک شاپنگ سے واپس نہیں آئی تھیں۔

میں نے منہاس سے پوچھا "وہ کتنے بجے کی گئی ہوئی ہیں؟"

"میری وائف بتا رہی ہیں' وہ لنچ بھگ گیارہ بجے گھر سے نکلی تھیں۔"

"گیارہ بجے!" میں چونک اٹھا پھر رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "اس وقت چار بجنے والے ہیں۔ اس کا مطلب ہے' وہ کم و بیش پانچ گھنٹے سے باہر ہیں۔" پھر میں نے منہاس کی طرف دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا "اٹ از ٹوو مچ منہاس صاحب!"

"ہاں' اب تو مجھے بھی تشویش ہو رہی ہے۔" وہ تفکر آمیز انداز میں بولا "خاص طور پر اس صورت میں کہ شبانہ نے اس دوران میں کوئی فون بھی نہیں کیا۔ اگر اسے گھر سے زیادہ دیر باہر رہنا پڑتا ہوتا ہے تو گھنٹے دو گھنٹے میں وہ ایک آدھ بار رنگ ضرور کرلیتی ہے۔"

میں ساحل کے لیے سخت فکر مند ہوگیا۔ اس گھر میں منہاس اور اس کی مفلوج بیگم کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ واجد تھوڑی دیر پہلے اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا تھا۔

میں نے منہاس باقر سے کہا "ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان کے انتظار میں بیٹھے نہیں رہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے' ہمیں ان کی تلاش شروع کردینا چاہیے۔"

"میں نے تلاش شروع کردی ہے مسٹر وجدان!" منہاس باقر نے کمبھیر لہجے میں کہا پھر بتایا "میں نے ڈیفنس اور کلفٹن کے بڑے بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹورز پر فون کرکے ان کے بارے میں معلوم کیا ہے خاص طور پر ان اسٹورز سے میں نے رابطہ کیا ہے جہاں شبانہ اکثر شاپنگ کے لیے جاتی ہے۔"

"پھر ادھر کی کیا رپورٹ ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "دو اسٹورز نے اس بات کی تصدیق کی

ہے کہ بارہ اور ایک بجے کے درمیان انہوں نے کچھ خریداری کی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔"

"بارہ اور ایک بجے کے درمیان!" میں نے پُرخیال انداز میں دہرایا "اس بات کو بھی اب تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ کیا شبانہ پہلے بھی کبھی بغیر اطلاع اتنی دیر کے لیے گھر سے غائب رہی ہے؟"

منہاس باقر نے نفی میں سر ہلایا "ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا اور آج کل تو میں نے اسے خاص طور پر منع کر رکھا ہے۔ چند روز بعد اسے مایوں بیٹھنا ہے۔ اس کا گھر سے زیادہ باہر نکلنا ویسے بھی اچھا نہیں۔"

میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

منہاس نے کہا "میں مزید پانچ بجے تک انتظار کروں گا۔ اس کے بعد عملی طور پر انہیں تلاش کیا جائے گا" ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا "میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اس شہر کی پولیس اور انتظامیہ مجھ سے بھرپور تعاون کرے گی۔ انشاء اللہ ان بچیوں کو کچھ نہیں ہو گا۔"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے" میں نے دل سے کہا۔

اسی وقت بنگلے کے باہر کسی گاڑی کے ہارن کی تیز آواز ابھری پھر یہ ہارن بجتا ہی چلا گیا۔ منہاس باقر نے اپنے بنگلے کی حفاظت کے لیے ایک چاق وچوبند اور صحت مند سیکیورٹی گارڈ رکھا ہوا تھا۔ میری آمد پر نذر محمد نامی اسی گارڈ نے گیٹ کھولا تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے گیٹ کھلنے کی آواز سنی۔ اسی وقت منہاس باقر نے کہا "لگتا ہے' وہ واپس آ گئیں۔"

ہم بے اختیار ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ اسی لمحے کریم کلر ٹویوٹا کرولا بنگلے میں داخل ہوئی۔ یہ گاڑی شبانہ کے استعمال میں رہتی تھی اور اس وقت بھی وہ اسی کے استعمال میں تھی... یعنی وہ گاڑی میں اکیلی ہی تھی!

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ منہاس باقر پریشانی سے آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں گاڑی پورچ میں آ کر رک چکی تھی اور شبانہ بڑے تشویش ناک انداز میں اس سے برآمد ہو رہی تھی۔ منہاس باقر نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

"کیا ہوا شبانہ؟ وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"ڈیڈی! اندر چلیں" شبانہ نے روہانسی آواز میں کہا "غضب ہو گیا ڈیڈی!"

ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے اندر پہنچے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد شبانہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "مسٹر وجدان! تم نے پہلے ممتاز کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہی وقت آن پڑا ہے۔ اس بار تم نے ایک نہیں' دو لڑکیوں کو واپس لانا ہے جن میں ایک تمہاری ساتھی ساحل بھی ہے۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو' میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا" میں مضطرب لہجے میں بولا "سکون سے بتاؤ' آخر ہوا کیا ہے؟ تم ان دونوں کو کہاں چھوڑ آئی ہو؟"

"میں نے انہیں کہیں نہیں چھوڑا بلکہ وہ مجھ سے چھین لی گئی ہیں۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی پھر اس کے آنسو نکل آئے۔

منہاس باقر نے ایک اونچی کوالٹی کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا نام لیا اور کہا "بیٹی! ایک بجے تو تم وہاں شاپنگ کر رہی تھیں۔ اس کے بعد کہاں چلی گئی تھیں؟"

وہ نمناک آواز میں بتانے لگی "کلفٹن کی مارکیٹ سے ہم طارق روڈ کی طرف نکل گئے تھے۔ کچھ دیر وہاں شاپنگ کرتے رہے پھر ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے کے بعد ہم بہادر آباد چلے گئے۔ وہاں بھی چند قابلِ ذکر بین الاقوامی معیار کے اسٹور کھلے ہیں۔ بس وہیں یہ حادثہ پیش آ گیا۔"

میرے استفسار پر شبانہ نے بتایا کہ وہ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھی ہی تھیں کہ دو ہٹا کٹا پوش افراد نے انہیں گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ ان کے ہاتھوں میں خوفناک نال والی کلاشنکوفز تھیں جن کا رخ گاڑی کی عقبی نشست کی طرف تھا جہاں ساحل اور ممتاز بیٹھی تھیں۔ ایک گن بردار نے انہیں فوراً گاڑی سے نیچے اترنے کو کہا۔ میں نے مزاحمت کرنا چاہی تو ایک نے مجھے غلیظ گالی دیتے ہوئے پھنکار کر کہا۔ چپ چاپ بیٹھی رہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم تمہیں زندہ سلامت چھوڑ کر جا رہے ہیں ورنہ تارا کے دشمنوں کو پناہ دینے والوں کو بھی ہم حقیر چیونٹیوں کی طرح مسل دیا کرتے ہیں۔"

تارا کے نام نے میرے ذہن میں بجلی مچا دی۔ میں نے اضطراب کی انتہا کو چھوتے ہوئے کہا "کیا... انہوں نے واقعی تارا کا نام لیا تھا؟"

"مجھے اپنی سماعت پر پورا بھروسا ہے" وہ تیقن سے بولی پھر کہا "وجدان! کیا یہ وہی تارا تو نہیں جسے ممتاز کے والد نے پولیس کے حوالے کیا تھا؟"

"بالکل وہی ہے" میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

رات جن دو موٹر سائیکل سواروں نے تمہارا تعاقب کیا تھا وہ تارا ہی کے ہرکارے تھے۔ وہ خبیث خصلت ممتاز کی تلاش میں ہی کراچی آیا ہے اور اس رات وہ ممتاز کی قیام گاہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

"تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

"میرے اپنے ذرائع ہیں' معلومات حاصل کرنے کے" اس نے کہا۔

منہاس نے پوچھا "مسٹر وجدان! جب تمہیں اتنی اہم باتیں معلوم تھیں تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں اپنے دوست قاضی سلطان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" اس کے انداز میں ہلکا سا چانک برہمی اتر آئی۔

میں نے اس کی ناراضی کا برا منائے بغیر کہا "انکل! پہلی بات تو یہ کہ یہ معلومات مجھے آج ہی صبح حاصل ہوئی ہیں" میں نے دانستہ اس سے یہ چھوٹا سا جھوٹ بولا تھا "اور دوسری بات یہ کہ آپ ممتاز کے سلسلے میں بالکل پریشان نہ ہوں۔ ممتاز کے ساتھ ساتھ میری عزیز ترین ہستی بھی اغوا ہوئی ہے۔ میں ان دونوں کی تلاش کے لیے اپنی ہستی داؤ پر لگا دوں گا۔ تارا مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

پھر میں شبانہ کی جانب متوجہ ہو گیا "تم تارا کے بھیجے ہوئے ڈھاٹا پوش اغوا کنندگان کے بارے میں بتا رہی تھیں؟"

اس نے بتایا "مجھے خاموش رہنے کی دھمکی دینے کے بعد انہوں نے ممتاز اور ساحل کو گن پوائنٹ پر گاڑی سے نیچے اتار لیا پھر بڑی تیزی سے وہ انہیں' میری گاڑی کے آگے کھڑی سیاہ لینڈ کروزر میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لینڈ کروزر کے تمام شیشے سیاہ تھے۔ میں دیکھ نہیں سکی' جیپ میں اور کون موجود تھا۔ ونڈ اسکرین اس زاویے سے مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔"

سیاہ لینڈ کروزر نے تارا پر میرا شک اور پختہ کر دیا۔ وہ گزشتہ رات ایک سیاہ لینڈ کروزر ہی میں فیصل کے ساتھ فی گرینی ایٹ سے روانہ ہوا تھا۔ ان کی منزل شاکر علی کی زبانی مجھے گلشن اقبال کا ایک بنگلا معلوم ہوئی تھی۔

منہاس باقر نے اپنی بیٹی سے پوچھا "بہادر آباد میں یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا ہے؟"

"مین بہادر آباد میں" وہ شکستہ لہجے میں بولی پھر لوکیشن کی وضاحت کرنے لگی۔ وقوعہ کا وقت اس نے لگ بھگ سوا تین بجے بتایا تھا۔

میں نے کہا "انکل! میں بہادر آباد کئی مرتبہ جا چکا ہوں۔ علاقہ تو خاصا بارونق ہے پھر دن میں تین سوا تین بجے تو وہاں کی رونق بھیڑ کا منظر پیش کر رہی ہوتی ہے۔ دن دہاڑے اغوا کی واردات کا مطلب تو یہی ہے کہ..."

"میاں! تم نے دنیا دیکھی ہوئی لیکن پاکستان کو پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہو" منہاس باقر نے گہری سنجیدگی سے کہا "یہاں دن دہاڑے اور رات پچھاڑے میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں کا قانون اور جرائم کی نوعیت بہت انوکھی اور نرالی ہے۔"

پھر وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا اور نہایت ہی تحمل کے ساتھ بڑے بڑے پولیس آفیسرز سے رابطے کرنے لگا۔ اس کے انداز کا یہ ٹھہراؤ شاید اس لیے بھی تھا کہ اس کی اپنی بیٹی بہ خیریت واپس گھر پہنچ گئی تھی یا ممکن ہے' وہ ہر قسم کے کرائسس میں اسی صبر و برداشت کا مظاہرہ کرتا ہو لیکن میں اس جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔ ساحل کے اغوا کا سنتے ہی میرے تن بدن میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ مجھے اپنا وجود بھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اطمینان سے بیٹھ کر ٹیلی فونک رابطوں کے اثرات اور نتائج کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

"میں جا رہا ہوں انکل!" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "انشاء اللہ بہت جلد میں آپ کو ایک بہت بڑی خوش خبری سناؤں گا۔"

"تم جا کہاں رہے ہو؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا" میں نے گول مول جواب دیا اور اس کی بات سنے بغیر بنگلے سے باہر نکل آیا۔

یہ سوال وجواب کا وقت نہیں تھا کہ میں وہاں بیٹھ کر منہاس باقر سے طویل مناظرہ کرتا۔ عمل کے اس وقت کا ایک لمحہ ضائع کرنا بھی میرے نزدیک گناہِ کبیرہ سے کم نہیں تھا۔

✪✲✪

وہ بنگلا نیپا چورنگی اور حسن اسکوائر کے درمیان پوش علاقے میں واقع تھا۔ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے شیرڈ کو دوڑاتے ہوئے یہاں پہنچا۔ اگر میرے پاس کوئی ہوائی سواری ہوتی تو میں بلا دریغ اس کا استعمال کرتا۔ ساحل کے اغوا نے مجھے دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں اس وقت خود کو جنونی کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔

گاڑی کو میں نے بنگلے کے سامنے سڑک کے کنارے روکا اور گیٹ کے پہلو میں نصب اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھ کر بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بادردی گارڈ نے گیٹ کے پیٹ میں بنے ہوئے ایک بچہ گیٹ کو کھول کر باہر جھانکا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ یقیناً سیکیورٹی گارڈ تھا۔ میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا "بات بہت خطرناک ہے۔"

"کس سے ملنے آئے ہو؟" اس کے تیور بھی بدل گئے۔

میں نے کہا "سیف اللہ سیال سے۔"

میں نے گھنٹی بجانے سے قبل نیم پلیٹ کو بہ غور پڑھ لیا تھا۔ وہاں کسی ریٹائرڈ پولیس آفیسر سیف اللہ سیال کا نام لکھا تھا۔

سیکیورٹی گارڈ نے جواب دیا "سیال صاحب اپنی فیملی کے ساتھ یورپ کے تفریحی دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ تم کون ہو؟ اور ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

میں نے سیکیورٹی گارڈ کے سوالات کے جواب میں زبان کو زحمت دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور عملی مظاہرہ کرتے ہوئے ایک زوردار فرنٹ کک اس کے چہرے پر رسید کردی۔

اس کا اوپری دھڑ گیٹ سے باہر تھا اور دونوں ہاتھ پیچھے گیٹ کے پٹ پر ٹکے تھے۔ میرے اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے نتیجے میں وہ حلق سے ایک چیخ برآمد کرتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے میں پشتہ فرش پر گرا۔ اسی اثنا میں' میں نے بنگلے کے اندر داخل ہو کر چھوٹا گیٹ اندر سے بند کردیا۔

پشتہ فرش سے شرفِ ملاقات کے دوران میں گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ وہ میری پھرتی پر پوری طرح حیران بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ میں نے اس کے چہرے پر پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ میں نے خوں خوار لہجے میں کہا "میں تمہارا باپ ہوں اور سیال اینڈ کمپنی سے ایک پرانا حساب بے باق کرنے آیا ہوں۔ اب بتاؤ' تم نے ان کے بارے میں کتنے فیصد سچ بولا ہے؟"

"مم۔ میں نے اس سلسلے میں کوئی جھوٹ نہیں بولا" وہ اپنی گن کی طرف رینگتے ہوئے بولا "وہ لوگ واقعی ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کی حرکات کو نظر میں رکھتے ہوئے سوال کیا "اس وقت بنگلے میں اور کون کون ہے؟"

"میرے علاوہ دو ملازم اور ہیں" اس نے بتایا۔

بات ختم کرتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے گن کی جانب بڑھنے والے اس کے ہاتھ کو بری طرح کچل دیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ میں اس کو داؤ کر رہا ہوں۔

"اٹھ کر شرافت سے کھڑے ہو جاؤ" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اسے "ہینڈز اپ" کروا کے اس کی تلاشی لی۔ اس گن کے سوا اس کے پاس اور کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

اسی وقت بنگلے کے اندرونی حصے سے کسی نے پوچھا "کیا ہوا خاور! تم چیخے کیوں تھے؟"

اس سے قبل کہ خاور نامی وہ سیکیورٹی گارڈ اس سوال کا کوئی جواب دیتا' میں نے عقب سے اپنا ایک بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کردیا اور ہاتھ سے گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص رگ کو دبا کر گارڈ کو اٹنا غفیل کردیا۔

میں اس کام سے فارغ ہی ہوا تھا کہ وہ شخص بنگلے کے اندر سے نکل کر میرے سامنے آگیا' جس نے تھوڑی دیر پہلے خاور کو پکار کر اس کا حال دریافت کیا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونکا۔ اسی لمحے اس نے فرش پر پڑے بے سدھ سیکیورٹی گارڈ کو بھی دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور وحشت ابھر آئی۔ پھر اچانک اس نے ایک عجیب حرکت کی۔

میں توقع کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہو گا یا پھر میری طرف بڑھے گا لیکن اس اللہ کے بندے نے "نجیب' نجیب" پکارتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے کی طرف دوڑ لگادی۔ جواباً میں بھی اس کے تعاقب میں لپک پڑا۔

اس کی پکار سے مجھے اندازہ ہو گیا' وہ نجیب نامی اپنے ساتھی کو حالاتِ حاضرہ سے آگاہ کرنا چاہ رہا تھا۔ گارڈ نے بنگلے میں دو ملازمین کی موجودگی ظاہر کی تھی۔ میری اطلاعات کے مطابق تارا اور چوہدری نوازش علی کا بیٹا فیصل گزشتہ رات اس بنگلے پر پہنچے تھے۔ بنگلے کے باہر نصب نیم پلیٹ مجھے الجھا رہی تھی اور اس الجھن کو نجیب اور اس کا ساتھی ہی سلجھا سکتے تھے۔

میں نے اس "مفرور" کو ایک کمرے کے دروازے کے سامنے جالیا۔ اس کا ہاتھ دستک کے لیے دروازے کی جانب اٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ دروازے سے پانچ فٹ دور جا گرا۔ وہ شام سے پہلے کا وقت تھا مگر مجھ پر ایک وحشت سوار تھی اور میں ہر مصلحت' ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اپنی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

میرا دھکا کھانے والا اپنی کوشش میں تو کامیاب نہ ہو سکا البتہ وہ زمین پر گرنے سے قبل تیز چیختی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی نجیب کو پکار چکا تھا۔ اس کی پکار نے رنگ دکھایا اور کمرے کے اندر سے ایک بوجھل آواز برآمد ہوئی۔

"مشتاق! تم حلق پھاڑ کر کیوں چلا رہے ہو؟"

اس دوران میں مشتاق نامی وہ شخص زمین سے اٹھ چکا تھا۔ میں نے اسے بالوں سے دبوچا اور گھسیٹ کر دروازے کی طرف لاتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی "اپنے ساتھی سے کہو' اس کا باپ اس سے ملنے آیا ہے لہٰذا دروازہ کھولنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ وہ کس پوزیشن میں ہے۔"

مشتاق کے لہجاتی رویے نے مجھے باور کرادیا تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی سے دور رہنے والا ایک عام گھریلو ملازم ہے ورنہ وہ اتنی آسانی سے میرے قابو میں نہ آتا۔ اس نے میرے احکام کی تعمیل کی تو ایک جھٹکے سے وہ دروازہ کھل گیا۔

میرے سامنے ایک طویل قامت تنومند باڈی بلڈر کھڑا تھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے کم نہیں تھا اور اس کے باڈی بلڈر ہونے کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ اس نے صرف جینز پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم کا اوپری حصہ بالکل کھلا تھا اور چہرے پر پھول مارکا صحت مند مونچھیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ میں نے ایک لمحے میں اس کا ایکس رے کرلیا۔

ہماری نگاہیں ملیں' میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت ابھرتے دیکھی اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا' میں نے مشتاق کو ایک دھکے سے اس کی جانب پھینک دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے کمرے کے فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

اسی لمحے واش روم کے اندر سے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نجیب اپنی جزوی برہنگی کے توسط سے وہاں کیا گل کھلا رہا تھا۔ سینٹرل میز پر کھلی ہوئی بوتل اور اس کے گرد رکھے جام بھی اس کارفرمائی کی تصدیق کر رہے تھے۔ بنگلے کے باہر نصب نیم پلیٹ مجھے الجھا رہی تھی اور اس الجھن کو نجیب اور اس کا ساتھی ہی سلجھا سکتے تھے۔

میں نے اس "مفرور" کو ایک کمرے کے دروازے کے سامنے جالیا۔ اس کا ہاتھ دستک کے لیے دروازے کی جانب اٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ دروازے سے پانچ فٹ دور جا گرا۔ وہ شام سے پہلے کا وقت تھا مگر مجھ پر ایک وحشت سوار تھی اور میں ہر مصلحت' ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اپنی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

میرا دھکا کھانے والا اپنی کوشش میں تو کامیاب نہ ہو سکا البتہ وہ زمین پر گرنے سے قبل تیز چیختی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی نجیب کو پکار چکا تھا۔ اس کی پکار نے رنگ دکھایا اور کمرے کے اندر سے ایک بوجھل آواز برآمد ہوئی۔

"مشتاق! تم حلق پھاڑ کر کیوں چلا رہے ہو؟"

وہ دوران میں مشتاق نامی وہ شخص زمین سے اٹھ چکا تھا۔ میں نے اسے بالوں سے دبوچا اور گھسیٹ کر دروازے کی طرف لاتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی "اپنے ساتھی سے کہو' اس کا باپ اس سے ملنے آیا ہے لہٰذا دروازہ کھولنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ وہ کس پوزیشن میں ہے۔"

مشتاق کے لہجاتی رویے نے مجھے باور کرادیا تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی سے دور رہنے والا ایک عام گھریلو ملازم ہے ورنہ وہ اتنی آسانی سے میرے قابو میں نہ آتا۔ اس نے میرے احکام کی تعمیل کی تو ایک جھٹکے سے وہ دروازہ کھل گیا۔

میرے سامنے ایک طویل قامت تنومند باڈی بلڈر کھڑا تھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے کم نہیں تھا اور اس کے باڈی بلڈر ہونے کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ اس نے صرف جینز پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم کا اوپری حصہ بالکل کھلا تھا اور چہرے پر پھول مارکا صحت مند مونچھیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ میں نے ایک لمحے میں اس کا ایکس رے کرلیا۔

ہماری نگاہیں ملیں' میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت ابھرتے دیکھی اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا' میں نے مشتاق کو ایک دھکے سے اس کی جانب پھینک دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے کمرے کے فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

اسی لمحے واش روم کے اندر سے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نجیب اپنی جزوی برہنگی کے توسط سے وہاں کیا گل کھلا رہا تھا۔ سینٹرل میز پر کھلی ہوئی بوتل اور اس کے گرد رکھے جام بھی اس کارفرمائی کی تصدیق کر رہے تھے۔ جتنی دیر میں' میں دروازے کو اندر سے بولٹ کرتا' نجیب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

اس نے حقارت سے مجھے دیکھا اور آتشیں لہجے میں بولا "تم کون ہو اور بنگلے کے اندر کس طرح داخل ہوئے؟"

"تمہارے پہلے سوال کا جواب دروازہ کھلنے سے قبل مشتاق نے دے دیا تھا" میں نے اس پر نظر رکھتے ہوئے کہا "دوسرے سوال کا جواب تمہارا سیکیورٹی گارڈ دے گا۔"

اس نے سیکیورٹی گارڈ کے ذکر پر مشتاق کو دیکھا جو سہما ہوا ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ میں نے خاور کو لمبا لٹا دیا ہے۔ یہ سنتے ہی نجیب نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں چونکہ پہلے سے محتاط تھا اس لیے میں نے اس کا وار خالی کردیا۔

وہ اپنی پہلی ہی ناکامی پر جھنجلا گیا اور اسٹانس (STANCE) بنا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی اس "حرکت" سے مجھے خوشی ہوئی۔ میں بھی جوابًا ٹی اسٹانس میں آگیا۔ (T-STANCE) میں فرنٹ فٹ' بیک فٹ کی لوکیشن پر نوے درجے کا زاویہ بنا کر اسٹانس کو "ٹی" کی شکل دیتا ہے۔ تنگ جگہ پر فائٹ کے لیے ٹی اسٹانس بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

نجیب نے حملے میں پہل کی۔ فرنٹ اسٹیپ کے ساتھ اس کا پنچ میرے چہرے کی جانب آیا۔ میں نے نیک جرک (NECK JERK) سے اپنے چہرے کا دفاع کیا۔ اسی لمحے اس نے دوسرا پنچ آزمایا جو میرے شانے پر لگا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے مضروب کندھے کو ایک دائرے کی شکل میں حرکت دینے لگا۔ نجیب کے پنچ میں بلا کی قوت تھی۔ اس نے اس قوت کے حصول کے لیے کافی محنت کی ہو گی۔

وہ ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا "نجیب کے دشمن اپنے قدموں پر چل کر اس تک رسائی تو حاصل کرلیتے ہیں مگر جاتے وہ دوسروں کے کندھوں پر ہیں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کی ہڈیوں کا سُرمہ بنادوں گا۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے مجھے ایک راؤنڈ ہاؤس کک ماری۔ میں ایک اسٹیپ پیچھے ہٹا' اس نے دوسری راؤنڈ ہاؤس چلائی۔ اسی لمحے میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک وہیل کک (WHEEL KICK) اس کے جبڑے پر رسید کردی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھامتے ہوئے کراہا اور لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے کہا "میں کسی نجیب وجیب کا دشمن نہیں بلکہ تارا کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ میری اس تلاش کے راستے میں جو بھی آئے گا' میرے دشمنوں میں شمار ہو گا۔ بتاؤ' وہ شیطان کا چیلا کہاں چھپا ہے؟"

تارا کے ذکر پر اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا اور جلدی سے بولا "یہاں کوئی تارا نہیں رہتا' تم کسی غلط فہمی کی بنا پر یہاں آگئے ہو۔"

"مجھے غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔" میں نے شعلہ بار لہجے میں کہا "وہ نطفۂ ناتصدیق اپنی بے بے کے یار فیصل کے ساتھ رات کو یہاں آیا تھا' کالی لینڈ کروزر میں۔ میرے پاس پکی انفارمیشن ہے۔ تم مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔"

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے مجھ پر چھلانگ لگادی۔ میں بیک فلپ لگاتے ہوئے چھ فٹ دور چلا گیا۔ نجیب سیدھا جا کر مشتاق سے ٹکرایا اور جھنجلاہٹ میں اس کے سر کو پکڑ کر دیوار سے ٹکرادیا۔ مشتاق ایک خوفناک

آواز نکالتے ہوئے زمین بوس ہوگیا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا، وہ یوم حشر سے پہلے اٹھ بھی سکے گا۔ نجیب کے ایک ہی پنچ نے مجھے اس کی سانڈ ایسی طاقت سے روشناس کرادیا تھا۔

واش روم کے اندر سے نظر نہ آنے والی نے نجیب سے پوچھا "ڈارلنگ! تم کمرے میں کس سے الجھ رہے ہو' یہ کون شخص تمہیں دھمکیاں دے رہا ہے؟"

"ہے ایک بدبخت!" نجیب نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ مجھ پر چھلانگ لگادی۔

اس مرتبہ اس کے ہاتھ سیدھے میری گردن پر آئے۔ وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرا گلا دبانے لگا۔

مجھے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے ہاتھوں کی گرفت سے میرا گلا توڑ ہی رہا تھا' اس کے ساتھ ہی وہ مجھے اٹھا کر فرش سے بلند بھی کرتا جارہا تھا۔ اسے اپنے قد اور طاقت کا ایڈوانٹیج حاصل تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جمائے اور ٹانگوں کو رول کرتے ہوئے ایک جرکی ڈبل فرنٹ فلائنگ کک اس کے پیٹ میں رسید کردی۔

میری گردن پر سے اس کے ہاتھوں کی گرفت چھوٹ گئی اور وہ کسی طوفان کے مانند باتھ روم کے دروازے سے جا ٹکرایا۔ یہ ٹکراؤ اتنا شدید تھا کہ باتھ روم کا دروازہ قبضوں سے نکل گیا۔ چوبی پٹ اندر موجود' وجود زن سے جا ٹکرایا جس کے نتیجے میں ایک سریلی مگر وحشت زدہ چیخ سننے کو ملی۔

میری نگاہ نے اس کرب ناک آواز کا تعاقب کیا اور باتھ روم کے اندر اس کے ماخذ و مخرج تک جا پہنچی۔ ایک اوسط شکل کی لڑکی بدن پر تولیا لپیٹے باتھ روم کے فرش سے اٹھنے کی کوشش کررہی تھی اور اس مضطرب کوشش میں وہ تولیا اس کے بدن پر سے بار بار پھسل رہا تھا۔ وہ بائیس تیئس سال کی بھرے بھرے جسم کی لڑکی تھی۔ صورت کی کمی کو اس کے بدن نے پورا کردیا تھا۔ اس پر زیادہ دیر تک نظر جمائے رکھنا آسان کام نہیں تھا۔

لڑکی سے پہلے نجیب سنبھل گیا اور ایک دھکے سے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے وہ باتھ روم سے باہر آگیا۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ مار کھانے کے بعد اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا اور وحشیانہ انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں اس کے فائٹنگ اسٹائل سے سمجھ گیا تھا کہ وہ سیم کمبی نیشن (SAME COMBINATION) کا عادی تھا۔ یعنی یکے بعد دیگرے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کے اٹیک کو دہراتا تھا۔ لیفٹ راؤنڈ ہاؤس کے بعد رائٹ راؤنڈ ہاؤس اور رائٹ پنچ کے بعد لیفٹ پنچ۔ اس مرتبہ اس نے مجھے بیک کک ماری۔ میں نے ذہن میں کیلکولیٹ کیا' لیفٹ بیک کے بعد وہ رائٹ بیک مارے گا چنانچہ اس کے عمل سے پہلے ہی میں نے اس کی پشت پر فرنٹ تھرسٹ (THRUST FRONT) کک جڑدی۔ اس کک میں بے پناہ پش (PUSH) شامل تھا۔ وہ کسی میل ٹرین کے انجن کی طرح روانہ ہوا اور کمرے کی دوسری دیوار سے جا ٹکرایا۔

اس کی جگہ اگر کوئی عام جثے کا فائٹر ہوتا تو کمر پکڑ کر بیٹھ جاتا لیکن وہ کسی گینڈے سے کم نہیں تھا۔ دیوار سے ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ کیرم کے اسٹرائیکر کے مانند واپس پلٹا اور جنگلی بھینسے کی طرح پھنکارتا ہوا میری جانب آیا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ وہ میرے نزدیک آکر ایک لمحے کو رکا پھر اس نے ایک لوئر کک ماری۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ اس نے اچانک راؤنڈ ہاؤس (ROUNDHOUSE) اٹھادی۔ میں ایک قدم آگے آیا۔ نتیجے میں اس کی کک میرے کندھے پر ہولڈ ہوکر رہ گئی۔ میں نے اس کی ران پر دونوں ہاتھوں کا پش آزمایا۔ وہ پشت کے بل زمین پر جا گرا۔

اس مرتبہ اسے اٹھنے میں چند سیکنڈ لگے۔ اس دوران میں باتھ روم والی لڑکی مناسب لباس پہن کر باہر آگئی تاہم وہ اس افراتفری سے بری طرح خوف زدہ تھی۔ میں نے غراتے ہوئے اسے حکم دیا "ایک طرف آرام سے خاموش ہوکر بیٹھ جاؤ۔ تم سے میں بعد میں بات کروں گا' پہلے اس سور سے نمٹ لوں۔"

اس نے ۔ فرمانبرداری سے میرے حکم کی تعمیل کی۔

میں نجیب کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے میز پر سے پیتل کا ایک گل دان اٹھالیا اور حملہ آور ہونے والے انداز میں مجھ پر جھپٹا۔ میں پلک جھپکتے میں زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے کو جھک گیا۔ اس کا جھکا ہوا بدن میرے سر کے اوپر تھا۔

میں نے اس کی جینز کے بیلٹ میں ہاتھ ڈالا' دوسرا ہاتھ میں نے اس کی بغل میں دیا اور کسی اول درجے کے ویٹ لفٹر کی طرح ایک جھٹکے سے اٹھا کر اسے سر سے بلند کردیا۔ وہ فضا میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا اور مجھے مغلظات میں تولنے لگا۔ میں نے اسے پنکھے کی پنکھڑیوں کی طرح گول گھمانا شروع

کردیا۔ مجھے گالیاں دیتے ہوئے اس نے ایک زنانہ حرکت کی۔ اپنے سر کو جھکا کر اس نے بغل میں موجود میرے ہاتھ کی کلائی دانت جمادیے۔ تکلیف کی شدت ایک لہر بن کر میرے جسم میں تیر گئی۔ میں نے اس کم ظرف کو سینٹرل ٹیبل پر پنچ مارا۔

چھناکے کی ایک تیز آواز کے ساتھ گلاس ٹاپ ٹیبل ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ اس پر رکھے جام و مینا بھی کرچیوں میں بدل گئے۔ نجیب ٹیبل کے فریم میں کسی گھائل تصویر کے مانند لٹک گیا ہوگیا۔ شیشے کے تیز اور نکیلے ٹکڑے اس کے برہنہ وجود میں درجنوں کی تعداد میں پیوست ہوگئے۔ جسم کا زیریں حصہ بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ سب سے زیادہ قیامت اس کے چہرے پر گزری تھی۔ متعدد مقامات سے خون رسنا شروع ہوگیا۔

میں نے چند لمحے نجیب کے اٹھنے کا انتظار کیا لیکن میرا یہ انتظار بے سود ثابت ہوا' وہ زندہ تھا مگر ہمت اور حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔ کسی فائٹر اور جنگ جو کے پاس سب سے قیمتی سرمایہ اس کی ہمت اور حوصلہ ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ بھی ہار بیٹھے تو پھر جسمانی طاقت' اسلحہ اور فائٹنگ ٹیکنیک سب بے کار ثابت ہوتی ہیں۔

میں نے اکھڑی اکھڑی سانس لیتے ہوئے نجیب کو میز کے ٹکڑوں کے درمیان سے کھینچ کر باہر نکالا اور فرش کے قالین پر چاروں خانے چت ڈال کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ پھر میرا ہاتھ اپنی پنڈلی کی جانب رینگ گیا جہاں چرمی کیس میں آٹھ انچ طویل پھل والا ایک قاتل خنجر ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ یہ امتیاز کی نشانی تھی۔ اس کی ایک یاد تھی۔

میں نے خنجر کو برہنہ کرکے نجیب کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور غرا کر کہا "تمہاری زندگی اور موت کے درمیان حائل فاصلے کو اس خنجر کی دھار کے نیچے جگہ ملی ہے۔ اب تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا۔ سچ بول کر زندہ رہنا ہے یا جھوٹ بول کر زندگی کو الوداع کرنا ہے؟"

میرے لہجے میں دنیا جہان کی سفاکی سمٹ آئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کے رنگ میں ایک واضح تبدیلی آتے دیکھی۔ اس تبدیلی میں خوف اور سراسیمگی کی آمیزش تھی۔ اس کے بدن میں ہلکی سی جنبش ہوئی تاہم وہ زبان سے کچھ نہیں بولا۔

میں نے خنجر کی نوک کو اس کے نرخرے پر چبھوتے ہوئے کہا "تارا اور فیصل کہاں ہیں؟"

اب تک کی کارروائی سے مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ دونوں اس بنگلے میں موجود نہیں تھے۔ خرخراہٹ سے مشابہ اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میں کسی فیصل اور تارا کو نہیں جانتا۔"

"وہ تمہاری ماں کے خصم ہیں" میں دہاڑا "کیا تم اپنے دو عدد والد صاحبان کو جاننے سے انکاری ہو؟" اس کے ساتھ ہی میں نے خنجر کی نوک پر دباؤ بڑھادیا۔

وہ تلملا کر رہ گیا "تت... تم... اچھا نہیں کررہے ہو۔"

"انہوں نے بھی کچھ اچھا نہیں کیا" میں نے پھنکار کر کہا "میری دو ساتھیوں کو آج تین بجے اغوا کیا ہے انہوں نے۔"

"دو ساتھیوں کو؟" اس کی الجھی ہوئی آواز کے ساتھ ہی چہرے پر حیرت بھی نمودار ہوئی "مگر وہ تو ایک لڑکی..."

اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ متوحش نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کا یہ احساس اور احتیاط بعد از وقت والی بات تھی۔ میں اس کی غلطی پکڑ چکا تھا۔ کوئی چور جب رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو اس سے اقبالِ جرم کروانا آسان ہوجاتا ہے۔ وہ تو رنگی زبان میری گرفت میں آگیا تھا۔

میں نے خنجر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا "خاموش کیوں ہوگئے؟ یہی کہنا چاہ رہے تھے نا' وہ تو ایک لڑکی کو اغوا کرنے گئے تھے۔ وہی... مدھوری ڈکشٹ کی صورت والی؟"

میرے سوالات میں بہت فورس تھی اور آخری جملہ میں نے اپنے اندازے کی بنا پر ادا کیا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ تامل کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"تم کون ہو؟"

"پہلے میرے سوالات کے جواب دو" میں نے وحشت بھرے لہجے میں کہا۔

اسے یقین ہوگیا کہ آج گلوخلاصی ممکن نہیں۔ میں اپنے سوالات کے جواب لے کر رہوں گا۔ اگر وہ جواب نہیں دے گا تو اس کے بدلے اسے جان دینا ہوگی۔

"تم... میری گردن سے خنجر ہٹاؤ تو میں کچھ بولوں بھی" وہ جھنجلا کر بولا۔

میں نے سختی سے کہا "خنجر کی نوک تمہارے حلق میں پیوست نہیں۔ تم اسی حالت میں بولو گے ورنہ اس خنجر کی دھار وہ فاصلہ مٹادے گی جو تمہاری زندگی اور موت کے درمیان واقع ہے اور سینڈ واچ (SAND WATCH) کے چیمبر کی طرح رفتہ رفتہ کم ہورہا ہے... ہمیشہ کے لیے ختم ہوجانے کے لیے۔"

میری سفاکی' ثابت قدمی اور وحشت کو دیکھ کر وہ تعاون پر آمادہ ہوگیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ میں حسبِ منشا جواب نہ پاکر اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا' میں نے خنجر پر دباؤ قدرے کم کرتے ہوئے پوچھا۔

"تارا اور فیصل کہاں ہیں؟"

"وہ یہاں سے آج دوپہر کو چلے گئے تھے" اس نے رک رک کر بتایا "ابھی تک واپس نہیں آئے۔"

"کب واپس آئیں گے؟" میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

"وہ اب یہاں نہیں آئیں گے۔"

"کہاں جائیں گے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "کشمیر روڈ والے بنگلے پر جائیں گے۔"

"یہ بنگلا کشمیر روڈ پر کس جگہ واقع ہے؟" میں نے پوچھا "مجھے اسپورٹس کمپلیکس کے ریفرنس سے لوکیشن سمجھاؤ۔"

وہ بنگلے کا نمبر بتانے کے بعد اس کی لوکیشن کی وضاحت کرنے لگا۔

میں نے یہ ضروری معلومات اپنے ذہن میں نقش کیں اور نجیب سے پوچھا "تم کچھ بتا رہے تھے' وہ دونوں ایک لڑکی کو اغوا کرنے گئے تھے؟"

"ہاں' ان کا پروگرام تو یہی تھا" وہ اثبات میں سر کو ناکام جنبش دیتے ہوئے بولا "وہ اندرون سندھ سے آئی ہوئی ممتاز نامی ایک لڑکی کو اغوا کرنے گئے تھے جس کی شکل کسی انڈین اداکارہ سے خاصی حد تک ملتی جلتی ہے۔"

میرا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ تارا ساحل کی یہاں موجودگی سے اگر واقف تھا بھی تو وہ اس کے ٹھکانے سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ ممتاز کے تعاقب میں یہاں تک پہنچا تھا اور اسی کو اغوا کرنے کا پروگرام بھی بنایا تھا مگر بدقسمتی سے ساحل بھی اس لپیٹے میں آگئی۔

میں نے اپنے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس کی اور نجیب سے پوچھا "کشمیر روڈ والا یہ بنگلا جس کا تم نے ایڈریس مجھے سمجھایا ہے' کس کی ملکیت ہے؟"

"میاں زاہد حسین" اس نے جواب دیا "دراصل پہلے پروگرام کچھ اور تھا۔ میاں جی کے فون نے ساری گڑبڑ کردی۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا "ابتدائی پروگرام کے مطابق تارا نے اغوا کرکے ممتاز کو ڈیفنس کے ایک بنگلے بی تھرٹی ایٹ میں پہنچانا تھا لیکن آج صبح چار بجے میاں جی کا فون آگیا کہ مذکورہ بنگلے کے حالات دگرگوں ہیں لہٰذا لڑکی کو کشمیر روڈ والے بنگلے پر پہنچایا جائے۔ میاں جی خود بھی اسی بنگلے پر جارہے تھے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے' تارا اینڈ کمپنی کشمیر والے روڈ والے بنگلے پر ہی گئے ہوں گے؟"

"وہ میاں جی کے حکم سے انکار کیسے کرسکتے ہیں۔"

"اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں بھی انہی کا وفادار ہوں۔"

"اس وقت تم خوب وفاداری نبھا رہے ہو!" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

وہ خجل سا ہوکر بولا "مجبوری کی بات دوسری ہے۔ جان بچانے کے لیے حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجبوری کی بات دوسری ہوتی ہے۔ میں بھی اس وقت بہت مجبور ہوں اس لیے تم سے دوسری بات پوچھ رہا ہوں۔"

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا پھر بولا "تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"بہت سمجھ دار ہو" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "جب تارا نے میری دو ساتھیوں کو کشمیر روڈ والے بنگلے میں پہنچادیا ہے تو تم یہاں کیا کررہے ہو؟ تمہیں بھی تو کہیں نہ کہیں پہنچ جانا چاہیے نا؟" اس کی آنکھوں میں دہشت بھر گئی۔ میں نے ایک جنون کی سی کیفیت میں کہا "سب سے پُرسکون جگہ اگلا جہان ہے جہاں کسی قسم کا کوئی بکھیڑا نہیں ہوگا۔ نہ باس میاں جی کا حکم ماننا ہوگا اور نہ ہی وجدان سے لات جوتا کھانا پڑے گا۔"

"وج ... وجدان ... کیا تم وجدان ہو؟" وہ لکنت زدہ آواز میں بولا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ امتیاز کی نشانی نے میرے سفیر کا کردار ادا کیا۔ وہ برق کی طرح چمکا اور نجیب کی شہ رگ سے خون کا ایک فوارہ چھوٹ پڑا۔ میں نے بیک رول کرتے ہوئے اپنے لباس کو اس کے گندے خون سے آلودہ ہونے سے بچایا۔

میں نے زندگی میں انسانی جان لینے سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کی تھی مگر ساحل کے ساتھ پیش آنے والے واقعے نے مجھے ہوش وحواس سے بے گانہ کردیا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے خون رنگ چادر سی تن گئی تھی۔ میں اپنی

منزل تک پہنچنے کے لیے ہزاروں' لاکھوں انسانی جانوں سے کھیل سکتا تھا۔ اب تک میں اپنی زندگی جیتا آیا تھا' ساحل کا وجود اس طرح میرے معمول میں داخل ہوا تھا کہ وہ میری ذات کا حصہ بن گئی۔ کوئی اپنی ذات سے جدا نہیں رہ سکتا۔ میں بھی اپنی ذات کے ایک حصے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا مجھے اپنی زندگی کی تلاش تھی جو ساحل کی شکل میں اچانک مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔

○*○

سرمئی شام دھیرے دھیرے رات کے اندھیرے میں بدل گئی تھی۔

یہ رات کا آغاز تھا۔ روشنیوں کا شہر اپنی پوری آن بان کے ساتھ جگمگا رہا تھا لیکن میرے اندر ایک مستقل اندھیرے نے جگہ بنانا شروع کردی۔ ان روشنیوں کی آب و تاب میرے من کی بے کلی کو کم کرنے میں ناکام ہورہی تھی۔ مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے پڑتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ میں ڈرائیونگ کے دوران میں مسلسل ساحل اور ممتاز کے بارے میں سوچنے لگا۔

شبانہ کے بیان کے مطابق ان دونوں کو آج سہ پہر تین بجے بہادر آباد چورنگی سے اغوا کیا گیا تھا اور اب کم و بیش آٹھ بجنے والے تھے۔ پانچ گھنٹے ان مصیبت زدہ لڑکیوں نے کس طرح گزارے ہوں گے' یہ خیال مجھے بہت پریشان کررہا تھا۔ خاص طور پر ساحل کے حوالے سے میرا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ ساحل اب پہلے والی ساحل نہیں رہی تھی۔ اس نے میرے قرب میں بہت کچھ سیکھا تھا مگر مجھے رہ رہ کر نیلگری کی پیش گوئی یاد آرہی تھی اور میری اصل پریشانی کا سبب بھی یہی تھا۔ نیلگری نے بڑی سفاک اور دل چیر پیش گوئی کی تھی۔ نبی سر کی ایک بنگلا نما حویلی میں اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ مجھے یاد تھا۔ اس نے ساحل کے نام کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا "وجدان! ساحل کی مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساحل اور ساگر کا جنم جنم کا ساتھ ہے مگر ..." اس "مگر" کے بعد اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ میرے پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا تھا مگر سمجھ دار کے لیے اس ادھورے جملے میں بہت کچھ پنہاں تھا۔

پچھلے دنوں نیلگری کا میرے ساتھ جو رویہ رہا تھا' اس کے پیش نظر مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ مجھے یہی شک تھا کہ ساحل کو مجھ سے جدا کرنے میں نیلگری کوئی بہت بڑا رول پلے کرے گی۔ وہ میرے لیے اپنی چاہت کا کھل کر اظہار کرچکی تھی اور میرے نزدیک کسی اور عورت کو دیکھنا اسے گوارا نہیں تھا لیکن پھر وہ اچانک غائب ہوگئی۔ لگ بھگ گزشتہ دو ماہ سے اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں از خود اس سے رابطہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جب چاہتی تھی' چھم سے میری تنہائی میں چلی آتی تھی۔ اسے لانے بلانے پر مجھے اختیار نہیں تھا۔

نیلگری کے تصور نے میری نگاہ میں اس کے منفرد حسن کو اجاگر کردیا مگر دوسرے ہی لمحے ساحل کی یاد نے اس تصور کو آف کردیا۔ میری سوچ پلٹ کر ساحل پر مرکوز ہوگئی۔ جب دل پر بوجھ ہو تو کوئی شے اچھی نہیں لگتی۔ میرے اندر کا موسم بگڑ گیا تھا۔ ساحل موسمِ بہار کے مانند میرے اندر اتر چکی تھی۔ وہ میری نس نس میں لہو بن کر دوڑتی تھی۔ میری اس بہار کو خزاں کی نظر لگ گئی۔ نیلگری کی پیش گوئی بالآخر پوری ہوکر رہی' ساحل مجھ سے بچھڑ گئی۔ تارا نے ایک شیطانی چال چل کر مجھے ساحل سے جدا کردیا تھا۔

میری نیلی شیرڈ کسی بے لگام گھوڑی کے مانند عروس البلاد کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ میری منزل کشمیر روڈ کا ایک بنگلا تھی۔ وہ بنگلا' جہاں تارا' ممتاز اور ساحل کو لے گیا تھا۔ مجھے اپنی ساتھیوں کو اس خبیث کے چنگل سے نکالنا تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر نیلگری کی پیش گوئی کو پورا نہیں ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے ساحل تک پہنچنا تھا' اسے واپس لانا تھا۔ ہر قیمت پر' ہر طوفان سے گزر کر' چاہے اس مقصد کے لیے مجھے اپنی جان بھی قربان کرنا پڑتی یا دشمنوں کی جانیں نکالنا پڑتیں!

میں نے کشمیر روڈ پر پہنچ کر مذکورہ بنگلے کو تلاش کیا۔ اس تلاش میں مجھے تھوڑا بھٹکنا پڑا۔ راستہ آسان اور سادہ تھا لیکن میں اس وقت ذہنی طور پر بہت زیادہ منتشر تھا اس لیے ان دو چار گلیوں نے مجھے گھما کر رکھ دیا۔ میں نے اپنے ٹارگٹ بنگلے کے سامنے سے گاڑی گزارتے ہوئے سوچا' مجھے سب سے پہلے اپنے ذہن کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ دھیان ٹھکانے پر ہوگا تو میں اپنے دشمنوں سے نمٹ سکوں گا۔ مجھے خود پر حیرت بھی ہورہی تھی۔ میں اتنا جذباتی پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ پہلے میرا اس نوعیت کا کوئی عزیز مجھ سے بچھڑا بھی نہیں تھا۔

میں نے اپنی شیرڈ بغلی گلی میں تھوڑے فاصلے پر کھڑی کردی۔ یہ بنگلے کا پہلو تھا۔ دوسری جانب ایک الٹرا ساؤنڈ کلینک تھا۔ میں نے گاڑی اسی کلینک کے سامنے کھڑی کی تھی۔ وہ کوئی عام سا دکان نما کلینک نہیں تھا بلکہ وہ ایک وسیع و عریض بنگلے پر پھیلا ہوا خاصا معروف الٹرا ساؤنڈ کلینک تھا۔

بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بات

خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ اندر کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا' اس وقت اندر کوئی بھی موجود نہ ہو۔ یہ حیران کن بات تھی۔ نجیب نے زندگی کے آخری لمحات میں مجھے بتایا تھا کہ تارا نے اغوا کی واردات کے بعد اسی بنگلے پر آنا تھا اور یہ کہ میاں زاہد بھی یہیں موجود تھا۔ میں تو یہاں خاصی گہما گہمی کی توقع کر رہا تھا لیکن ایسی کوئی بات کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک لمحے کو میرے ذہن میں خیال آیا' کہیں نجیب نے مجھے مس گائیڈ تو نہیں کردیا۔ موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر انسان عموماً جھوٹ بولنے سے پرہیز کرتا ہے لیکن نجیب تو ایک شیطان تھا۔ ممکن ہے' اس نے مجھے غلط راہ پر ڈالنے کے لیے اس بنگلے کا تذکرہ کیا ہو۔ اس کا خیال ہو کہ اس طرح میں اس کی جان بخشی کردوں گا۔ بہرحال' میں نے اس کا خیال غلط ثابت کردیا تھا۔

میں یہاں تک آگیا تھا تو بنگلے کو ٹچ کیے بغیر واپس چلے جانا ممکن نہیں تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے بنگلے کے پہلو سے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ الٹرا ساؤنڈ کلینک کے سامنے میری گاڑی کے سوا اور کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہاں اچھا خاصا سناٹا تھا۔ جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' وہ کلینک مارننگ کی شفٹ میں چلتا ہوگا۔

میں نے گلی میں دونوں جانب دور تک نگاہ دوڑائی اور بنگلے کی سائڈ وال پھلانگ کر اندر پہنچ گیا۔ میرے پاؤں میں جو گرز تھے اس لیے ہلکی سی "دھپ" کی آواز کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ میں دبے قدموں بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔

میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا' میری حیرت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ بنگلے کا ہر دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں کی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے وارن کرنے لگی کہ اس بنگلے میں کوئی گڑبڑ ہے... اور گڑبڑ کہاں ہے' یہ معلوم کرنے کا تجسس' مجھے بے اختیار آگے بڑھا رہا تھا۔ میں نے ایک کے بعد ایک بنگلے کی زیریں منزل کے تمام کمرے دیکھ لیے مگر کسی ذی نفس کے آثار نہیں ملے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا' نجیب نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا!

میں محتاط قدموں سے بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک کمرے میں مجھے روشنی دکھائی دی۔ میں یک بہ یک رک گیا۔ باہر سے میں نے بنگلے کو ٹاپ ٹو باٹم دیکھا تھا اور اس کے کسی بھی ظاہرہ حصے میں مجھے روشنی نظر نہیں آئی تھی۔ بنگلا مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اب یہ روشنی! اور وہ بھی ایک ایسے کمرے میں جس کی کھڑکیوں کا رخ بنگلے کے فرنٹ کی جانب تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ لائٹ ابھی حال ہی جلائی گئی تھی۔ وہاں یقیناً کوئی موجود تھا۔

میں جو ٹھٹک کر رک گیا تھا' دوبارہ محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ میں ہر قسم کی صورتِ حالات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوچکا تھا۔ میں نے روشن کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر ذرا سا دباؤ ڈالا تو میری حیرت دوچند ہوگئی۔ وہ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔

میں نے دروازے کے پٹ کی آڑ لیتے ہوئے ہینڈل کو گھما کر آہستہ آہستہ دروازہ کھولنا شروع کردیا۔ اگلے ہی نصف دروازہ ہی کھول پایا تھا اور جھانک کر اندر دیکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میری سماعت سے ایک گمبھیر آواز ٹکرائی۔

"ڈرو نہیں وجدان! میں تمہارے استقبال کے لیے یہاں موجود ہوں۔"

سیکنڈ کے سو ویں حصے میں' میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ تارا کی آواز تھی۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا "اندر آجاؤ۔ آج سارے حساب بے باق ہوجائیں گے۔"

میں ایک دھکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ خاصا کشادہ ہال نما کمرا تھا جس کے فرش پر قیمتی قالین بچھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ پہلو بہ پہلو صوفہ سیٹ لگے تھے اور آخری سرے پر تارا بہ نفسِ انبیس ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ہلکی کلیپنگ کرتے ہوئے بولا۔

"ویل کم مسٹر وجدان' سن آف شیطان!"

میں نے دانت کچکچا کر اسے خوں خوار نظروں سے گھورا اور سلگتے ہوئے لہجے میں سوال کیا "ساحل اور ممتاز کہاں ہیں؟"

"میں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا" وہ اپنے مخصوص بے رحمانہ انداز میں بولا "لیکن اس سے پہلے میں کچھ باتوں کی وضاحت کردوں۔ تمہارا ذہن الجھ رہا ہوگا کہ یہاں تمہارا استقبال کس انداز میں ہو رہا ہے؟ مجھے تمہاری آمد کی خبر کیسے ہوئی؟" وہ ایک لمحے کو خاموش ہو کر میرے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تم نے گلشن والے بنگلے پر جو "کارنامہ" انجام دیا ہے' مجھے اس کی خبر ہوچکی ہے اور یہ خبر کچھ دیر پہلے مجھے مشتاق نے دی ہے' ٹیلی فون کے ذریعے۔"

"مشتاق!" میں چونک اٹھا "وہ تو بے ہوش ہوگیا تھا؟"

"سنتے جاؤ' بیچ میں مت بولو۔" وہ سخت لہجے میں گویا ہوا "مشتاق نائی اس گھریلو ملازم کو تمہارے وہاں سے رخصت ہونے سے قبل ہوش آگیا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب نجیب نہیں میرے اور اس بنگلے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مشتاق ہوش میں آنے کے باوجود بھی بے ہوشی کی اداکاری کرتا رہا۔ اسے اپنی جان عزیز تھی۔ اس نے تمہارے ہاتھوں نجیب جیسے گرگ ذیل اور فائٹر کا حشر دیکھ لیا تھا۔ وہ چوں چراں کرکے خود کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ تم نے نجیب کو قتل کرنے سے پہلے اپنا نام اس کے سامنے لیا تھا۔ مشتاق نے مجھے فون پر بتایا کہ وجدان نامی کسی شخص نے تارا اور نجیب کو قتل کردیا ہے۔ مشتاق تمہارے نام اور صورت سے آشنا نہیں البتہ نجیب نے تمہاری شہرت سن رکھی تھی مگر دیکھا پہلی مرتبہ تھا... یعنی آخری مرتبہ۔"

وہ آہستہ آہستہ دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا مگر میں اس کی آواز میں شامل غم و غصے کی چبھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ سیکورٹی گارڈ تارا کی موت میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ میں نے تو اسے دو گھنٹوں کے لیے اناً غفیل کیا تھا۔

میں نے تارا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "مگر یہ ساری تفصیل تم مجھے کیوں سنا رہے ہو۔ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

وہ پھنکارا "تمہارے سوال کا جواب اس تفصیل کے بعد ملے گا۔ میں چاہتا ہوں' مرنے سے پہلے تمہارے ذہن میں کوئی الجھن نہ رہے۔ آج ہمارے درمیان آخری معرکہ ہوگا۔ ہم میں سے کوئی ایک ہی اس بنگلے سے زندہ سلامت جاسکے گا۔ تم نے مجھ پر بہت قرض چڑھا دیا ہے' میں یہ قرض سود در سود تمہیں لوٹانے والا ہوں۔"

"میں بھی اپنے دل میں تمہارے لیے کچھ اسی قسم کے جذبات رکھتا ہوں" میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا "تمہاری بکواس اگر ختم ہوچکی ہو تو میرے سوال کا جواب دے دو!"

اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور بپھرے ہوئے لہجے میں بولا "جیسے ہی مجھے تمہارے بارے میں اطلاع ملی' میں نے سب کو یہاں سے ہٹا دیا۔ اس بنگلے میں اس وقت ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔"

"ساحل اور ممتاز کو تم نے کہاں شفٹ کیا ہے؟"

"فی الحال میں ان کے بارے میں نہیں جانتا' وہ اس وقت کہاں ہوں گی" وہ مکاری سے زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "وہ جہاں بھی ہیں' زندہ ہیں۔"

میں نے دہاڑ کر کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو' تمہیں سب معلوم ہے۔"

"تمہارے سر کی قسم' میں غلط نہیں کہہ رہا" وہ بدستور زہریلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا "تمہاری آمد سے آدھا گھنٹا پہلے میاں جی ان دونوں کو اپنے ساتھ کسی دوسرے ٹھکانے پر لے گئے ہیں۔ جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ آئے تو پورے بنگلے کی تلاشی لے لو۔ ویسے میں ایک بات جانتا ہوں' ساحل اور ممتاز کو بڑی مناسب جگہوں پر پہنچایا جانے والا ہے۔"

میں نے تڑپ کر پوچھا "کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"ویری سمپل!" وہ شیطانی انداز میں مسکرایا "ان کو ان کے طلب گاروں کے پاس پہنچایا جائے گا۔ تم جانتے ہو' ان کی طلب' کس کس کو ہے؟"

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا "تمہارے مذموم عزائم کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بہتر ہوگا کہ اپنی ناپاک زبان سے خود ہی بتادو۔"

تارا نے کہا "ابھی تھوڑی دیر بعد ممتاز کو عمر کوٹ روانہ کردیا جائے گا۔ اس کا طلب گار میرا یار وڈیرا اکبر سومرو ہے۔ ممتاز اور اس کے ماما ایس پی نے اکبر کو بہت نقصان پہنچایا ہے' وہ اپنا سارا نقصان اس نوجوان حسینہ سے پورا کرے گا۔ کس طرح' یہ صرف اکبر سومرو ہی جانتا ہے... اور کسی کو جاننے کا حق بھی نہیں۔"

وہ بہت ہی خطرناک عزائم کا اظہار کر رہا تھا تاہم یہ معلومات میرے لیے بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ میں نے اسے باتوں میں لگاتے ہوئے پوچھا "ساحل کو تم لوگوں نے کہاں چھپایا ہے اور اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟"

"اوہو!" وہ عجیب سے انداز میں ہنسا "تم اس بدیسی لڑکی کے لیے بڑے بے چین ہو رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے' وہ تمہاری محبوبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب کہیں جاکر تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔ مجھے تمہاری اس بے قراری سے بہت لطف محسوس ہو رہا ہے۔"

اس کی ہنسی مجھے زہر لگی۔ میں نے برہمی سے کہا "تم یونہی بک بک کرتے رہو گے یا ساحل کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ گے؟"

اس نے بتایا "تم نے ہمارے چوہدری صاحب کی محبوب ڈائری کا ایک قیمتی ورق چرا لیا ہے۔ ہم تمہاری محبوبہ ساحل کو چوہدری نوازش کی حویلی میں پہنچا دیں گے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں تلملا اٹھا "تم کس ڈائری کی بات کررہے ہو؟"

"وہی تمہارے باپ کی رقم کردہ ڈائری جس میں کثیرالمالیت سونے کا راز تحریر کیا گیا تھا" وہ بے پناہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا "تم جس ڈائری کا ذکر کررہے ہو' وہ چند ماہ پہلے میاں زاہد حسین نے میرے ہوٹل کے کمرے سے چوری کروالی تھی۔ وہ اب تک تمہارے چوہدری تک پہنچ چکی ہوگی۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے" وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا "ڈائری تو چوہدری صاحب تک پہنچ ہی گئی ہے مگر اس ڈائری کے دو صفحات یعنی ایک ورق اس کے اندر سے تم نے بڑی صفائی سے پار کرلیا ہے۔ اس ایک ورق کے بغیر بات نہیں بن سکتی۔ وہ ڈائری ادھوری اور بے معنی ہوکر رہ گئی ہے جس طرح تم ساحل کے بغیر ادھورے اور اجاڑ بن کر رہ گئے ہو' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تمہیں شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے اور تمہارے چوہدری کو بھی" میں نے اسے چکر دیتے ہوئے کہا "میں نے اس ڈائری میں سے ایک صفحہ بھی الگ نہیں کیا۔"

وہ میرے چکر میں نہ آیا۔ میرا جملہ ختم ہوتے ہی اس نے کہا "تم مجھے کوئی سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔ ڈائری کے بارے میں میرا اور چوہدری صاحب کا موقف اٹل ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وہ قیمتی صفحات میرے حوالے کردو۔ میں وعدہ کرتا ہوں' تمہاری محبوبہ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ بہ صورتِ دیگر' ہمارے درمیان آج خون ریز معرکہ ہوگا۔ اگر بدقسمتی سے تم مجھے زیر کرنے میں کامیاب ہوگئے تو بھی ساحل کو پانے کے لیے وہی شرط ہوگی۔ یہ چوہدری صاحب کا ناقابلِ تبدیل فیصلہ ہے۔ جب تک تم انہیں ڈائری کے وہ صفحات نہیں دوگے' ساحل چوہدری نوازش کی حویلی میں رہے گی اور زندہ رہے گی۔" وہ ایک لمحے کا توقف کرکے بڑے معنی خیز انداز میں بولا "مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ چوہدری صاحب کی مرضی ہے کہ وہ کب تک تمہیں چھوٹ دیتے ہیں۔"

وہ پتا نہیں' کب تک اسی قسم کی بکواس جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں جو جاننا چاہتا تھا' وہ مجھے معلوم ہوچکا تھا۔ آخری سوال کے طور پر میں نے پوچھا "کیا ساحل ابھی تک کراچی ہی میں ہے یا اسے لاہور کے لیے روانہ کردیا گیا ہے؟"

"تم سوال ہی کرتے رہوگے یا وہ صفحات میرے حوالے بھی کروگے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کرڈالا۔

میں سمجھ گیا' اب وہ مجھے مزید کچھ نہیں بتائے گا۔ میں نے کہا "میں تمہیں ان صفحات کے بارے میں پہلے ہی بتاچکا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے' گھی نکالنے کے لیے انگلی کو ٹیڑھا ہی کرنا پڑے گا۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگادی۔ یہ حملہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں نے بیک جمپ کی اور دو فٹ پیچھے چلا گیا۔ وہ منہ کے بل زمین کی طرف آیا مگر نیچے گرنے کے بجائے اس نے ہاتھوں کے پنجوں کا استعمال کرتے ہوئے فرش پر ایک قلابازی لگائی اور میرے پہلو میں پہنچ گیا۔ ہمارے درمیان صرف ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر پنچ مارا۔ اس نے گردن جھکا کر میرا وار خالی دیا۔ میں نے ایک اسٹیپ اندر آکر اس کی جھکی ہوئی گردن پر رائٹ ایلبو رسید کردی۔ اس کا سر ایک جھٹکے سے مزید جھک گیا۔ اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی کراہ برآمد ہوئی اور اسی لمحے اس نے ایک نیچ حرکت کی۔

وہ اچانک زمین پر بیٹھا اور بجلی کی سی سرعت سے اس نے میرے ٹانگوں کو قینچی سے جکڑ کر مجھے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا وار چل گیا اور میں پشت کے بل پیچھے جا گرا۔ تارا اپنی گردن کو سہلاتے ہوئے میری جانب بڑھا۔ میری ایلبو (ELBOW) نے اسے اذیت میں مبتلا کردیا تھا۔

وہ کسی ریچھ کے مانند مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں نے فرش پر لیٹے لیٹے اس کے گرتے ہوئے جسم کو اپنے پاؤں پر روکا اور ایک جرک کے ساتھ اپنے سر کے عقب میں اچھال دیا۔ وہ ایک صوفے کے پہلے پر جاکر گرا۔ میں نے فٹ اسپرنگ لگایا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

تارا اپنی کمر کو سہلاتے ہوئے میری جانب بڑھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ وہ اس وقت ایک زخمی کوبرے کے مشابہ نظر آرہا تھا۔ اتفاق سے اس نے بلیو جینز پر جو بلیک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی' اس پر بھی ایک کوبرے کی سفید رنگ میں تصویر بنی ہوئی تھی۔

میں ہر قسم کے حملے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ چار فٹ کی دوری پر پہنچ کر اس نے ہوا میں جمپ کی اور رائٹ سائڈ فلائنگ کک مارنے کی کوشش کی۔ کوشش ان معنوں میں کہ اس کی کک میرے وجود کو کچ نہ کرسکی' ہٹ کرنا تو دور کی بات ہے۔ میں نے تیزی سے اپر سائڈ بلاک کیا۔ تارا کے جسم نے ہوا میں ٹوسٹ کیا اور وہ تین فٹ دور اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔

میں نے اس کے زمین پر آتے ہی ایک سلانٹ کک ماری۔ وہ بلاک نہ کرسکا۔ میں نے آگے بڑھ کر فرنٹ فلائنگ کک ماری۔ میرا پاؤں تارا کی ناک پر پڑا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھامتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ یہ وہی ناک تھی جس کی میں نے عمرکوٹ کے ہوٹل میں اچھی خاصی "خاطرداری" کی تھی۔

جب تارا نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو ایک وحشت ناک منظر دیکھنے کو ملا۔ اس کی ناک سے خون جاری ہوگیا تھا جو اس کے ہونٹوں اور ٹھوڑی کو رنگین کرتا جارہا تھا۔ تارا بار بار ہاتھ کی پشت سے اپنے چہرے کو صاف کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس منظر نے میرے اندر ایک سنسنی سی دوڑادی۔ میں نے ایک عجیب سا سرور محسوس کیا۔ تارا کو کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر مجھے خوشی ہورہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ساحل کے غم نے مجھے جنونی بنادیا تھا اور یہ غم دینے والا تارا ہی تھا۔

میں نے اس کے سنبھلنے کا انتظار نہیں کیا اور آگے بڑھ کر اسے لات مکوں پر رکھ لیا۔ وہ اپنے چہرے کو کور کرتے ہوئے پیچھے ہٹتا رہا اور مار کھاتا رہا۔ بالآخر اس کی پشت دیوار سے جا لگی۔ اس دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا لیکن یہ وہ دروازہ نہیں تھا جس سے گزر کر میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔

ایک لمحے کو میں نے محسوس کیا جیسے وہ فرار کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس نے اچانک دروازے کو دیکھا تھا لیکن یہ اس کی چالاکی تھی۔ اس نے میری توجہ بٹانے کے لیے وہ حرکت کی تھی۔ میری لمحاتی غفلت کا نتیجہ فوراً ہی برآمد ہوگیا۔

تارا نے کسی ارنا بھینسے کی طرح میرے پیٹ میں ایک زوردار ٹکر ماری اور اپنے سر کے زور سے پانچ فٹ مجھے عقب میں دھکیلتا چلا گیا۔ اس کی ٹکر میں کسی سانڈ کی قوت تھی۔ مجھے اپنے پیٹ میں مروڑ سا اٹھتا محسوس ہوا۔ میں نے فوراً سانس روکی اور اس کے سر پر رائٹ ایلبو سے ہٹ کیا۔

تارا ایک دردناک آواز کے ساتھ منہ کے بل زمین پر گرا۔ میں نے اس کی پشت پر سوار ہوکر گردن کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں کسنا شروع کردیا۔ وہ اپنے سر کو آزاد کرانے کے لیے زور لگانے لگا تاہم یہ زور بے سمت اور خواہ مخواہ نہیں تھا۔ تارا ایک اچھا مارشل آرٹسٹ تھا۔ یہ بات اسے معلوم تھی کہ اپنی اس کوشش میں اگر اس نے ذرا سی بھی نان ٹیکنیکل حرکت کی تو اس کی گردن کا کڑا کا نکل جائے گا۔

ہمارے درمیان باقاعدہ ریسلنگ کی طرح زور آزمائی ہورہی تھی۔ اسی دوران میں اس کا داؤ چل گیا اور اس نے بیک پش (BACK PUSH) کا استعمال کرتے ہوئے مجھے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ اس جسارت کے نتیجے میں اس کی گردن کو ایک جھٹکا لگا تھا تاہم یہ زیادہ خطرناک اور ضرر رساں نہیں تھا۔

ہم ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اس مرتبہ حملے میں پہل میں نے کی۔ میں نے نی شاٹ کا جھانسا دے کر ایک فرنٹ ٹو سائڈ کک اس کی ٹھوڑی پر رسید کردی۔ وہ تکلیف کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے مجھ پر جھپٹا۔

اس نے ڈبل پنچ سے میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ میں نے گردن کو بیک جرک دی۔ اس کے ساتھ ہی میری کمر کسی کمان کی طرح پیچھے کو جھک گئی۔ تارا نے دونوں بازو کھول کر مجھے دبوچنا چاہا مگر میں اس کے بازوؤں کے حلقے میں آنے سے پہلے ہی فضا میں سائڈ ٹوئسٹ کرتے ہوئے دور جاچکا تھا۔ البتہ اس فضائی پرواز کے دوران میں میرے جوگرز پوش پاؤں تارا کے چہرے کو ایک شاندار "سلامی" پیش کرچکے تھے۔

وہ کسی پٹتے ہوئے کتے کی طرح حلق سے "چیاؤں چیاؤں" کی آواز نکالتے ہوئے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا' میں تیزی سے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ آج میرے اندر کوئی اور ہی وجدان سما گیا تھا۔

اس نے اٹھتے ہی مجھے غلیظ گالیوں سے نوازنا شروع کردیا۔ ایک مارشل آرٹسٹ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مغلظات پر اتر آئے۔ یہ ایک کمزوری اور بداخلاقی سمجھی جاتی ہے۔ تارا کو میں نے شروع ہی سے گرم مزاج اور غصیلا پایا تھا۔ یہ اس کے کمزور اعصاب کی دلیل تھی۔ اس کے بالعکس دوزخ مکانی دارا میں خاصا تحمل اور تدبر پایا جاتا تھا۔ دونوں بھائیوں میں مزاج کا بہت بڑا فرق تھا ورنہ اعمال دونوں کے متوازی تھے۔

وہ جھنجلاہٹ اور ناکامی کے ملے جلے انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کی جھنجلاہٹ سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کی رائٹ راؤنڈ ہاؤس کو میں نے بڑی صفائی سے بلاک کیا۔ اس کے ساتھ ہی اندر آکر میں نے اس کے سینے پر پنچ مارا۔

اس نے میرے مکے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کلائی

کے مقام پر جکڑ لیا اور نیچے کی جانب ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اگر میں کسی قسم کی مزاحمت کرتا تو میری کلائی چیخ سکتی تھی۔ اس کے جھٹکے کے ساتھ ہی میں بھی زمین کی طرف جھک گیا۔ میری اس حرکت پر تارا اگر میری کلائی کو چھوڑ دیتا تو اس کا فائدہ تھا مگر اس نے کلائی کو دبوچ رکھا اور نتیجے میں وہ خود بھی میرے اوپر کھنچتا چلا آیا۔ میں نے اچانک اٹھ کر اسے اپنے اوپر سے دور پھینک دیا۔ میرے اوپر گرتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے کلائی چھوٹ گئی تھی۔

اس نے پلٹ کر مجھ پر ایک کک چلائی مگر اس کک میں فورس برائے نام تھی۔ میں نے اس ڈھیلی ڈھالی کک پر کھڑے ہاتھ کا چوپ رسید کردیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی اور ایک لوئر سائڈ کک اس کی مضروب ٹانگ پر رسید کردی۔ ہڈی چٹخنے کی آواز ابھری اور تارا زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کی ایک ٹانگ بے کار ہوگئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ لنگڑاتے ہوئے اٹھا۔ اس حالت میں مجھے اس پر رحم آنا چاہیے تھا مگر آج تو میں رحم وکرم سے بہت دور نکل آیا تھا۔ میرے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا تھا جو انسانیت کے نام پر بدنما دھبا تھا۔ اس نے میری عزیز ترین ہستی کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ میں اس سے ہمدردی کس طرح کرسکتا تھا!

وہ اپنی دائیں ٹانگ کو ہوا میں اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ پاؤں زمین پر لگاتے ہوئے اسے شدید تکلیف سے گزرنا پڑتا اور میں اسے ہر قسم کی تکلیف سے گزارنا چاہتا تھا۔

میں نے بڑی سفاکی سے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور اس کی گھائل ٹانگ کو ایک مرتبہ پھر نشانہ بنایا۔ جواب میں اس کی چیخیں ابھریں اور میرے دل کو وافر مقدار میں سکون بخش گئیں۔

تارا خاصا سخت جان تھا۔ لوٹ پوٹ کر پھر کھڑا ہوگیا۔ میں اس کے نزدیک آیا تو اس نے مجھے پنچ مار دیا۔ یہ ایک رائٹ اسٹریٹ پنچ تھا۔ میں نے بلاکنگ کے بعد اس کی کلائی کو گرپ (GRIP) میں لے کر ٹوسٹ (TWIST) کیا۔ وہ جھکا تو میں نے اس کی کہنی پر اپنی بائیں کہنی کا وار کیا۔ تارا کے منہ سے ذبح ہوتے ہوئے جانور جیسی آواز پیدا ہوئی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

مجھے یاد آیا' اندرون سندھ کے ریگزار میں ایک معرکے کے دوران میں' میں نے تارا کی اس کہنی کا جنازہ نکالا تھا۔ چوٹ پر چوٹ کیا قیامت ڈھاتی ہے' اس کا احساس انہی لوگوں کو ہوسکتا ہے جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔

مجھے امید نہیں تھی کہ تارا اب مزید مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ اس کا دایاں پہلو بالکل ہی بے کار ہوکر رہ گیا تھا لیکن میں نے دیکھا' وہ ڈھیٹ ابن خبیث ایک مرتبہ پھر ڈگمگاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں اس پر نظر جمائے صرف چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

اس مرتبہ تارا نے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ بجائے مجھ پر حملہ کرنے کے وہ دیوار پر نصب سوئچ بورڈ کی جانب بڑھا اور بجلی کی سی تیزی سے اس نے ایک بٹن دبادیا۔ اس کی اس شاطرانہ حرکت سے میں یہ تو سمجھ گیا کہ اس نے کوئی نئی چال چلی تھی لیکن فوری طور پر میں اس کی چال کو سمجھ نہ سکا۔ پھر اس سے قبل کہ میں غور وفکر کرتا' مجھے اپنے عقب میں دھڑ سے ایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہی دروازہ تھا جہاں سے میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے چار گن بردار بھڑا مار کر کمرے کے اندر آئے اور آتے ہی انہوں نے بے دریغ فائرنگ شروع کردی۔

ان کا ٹارگٹ صرف اور صرف میں تھا۔ میں اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر رہ گیا تاہم میرے دماغ نے بروقت میری راہنمائی کی۔ میں اپنی جانب چار گنوں کی نالوں کو اٹھتے دیکھ کر ہوا میں اچھلا۔ شاؤلن ٹیمپل میں ٹریننگ کے دوران میں مجھے ہائی ورٹیکل جمپ کی خصوصی مشق کروائی گئی تھی اور میں یہ آسانی دس بارہ فٹ تک ہوا میں اچھل سکتا تھا۔

میری جمپ کے نتیجے میں کمرا تارا کی آخری چیخوں سے گونج اٹھا۔ میری جانب آنے والی درجنوں گولیوں میں سے کسی نے یا کئی نے اس کے وجود کو چھید ڈالا۔ حملہ آور افراد نے اپنی گنوں کا رخ چھت کی جانب کیا اور برسٹ فائر کیے لیکن میں وہاں ہوتا تو فائرنگ کی زد میں آتا۔ میرا حساس ذہن مجھے "آٹو" پر سیٹ کرچکا تھا۔ ورٹیکل جمپ کرتے ہی میں نے بلندی پر پہنچ کر اپنی باڈی کو سمرسالٹ (SAULT SOMER) کے انداز میں رول کیا اور ڈبل اسٹیپ کرتے ہوئے سوئچ بورڈ کے پاس پہنچ گیا۔

چار گنوں سے خارج ہونے والی مہلک گولیوں نے کمرے کی چھت کو ادھیڑ ڈالا۔ اسی وقت مجھے اپنے بائیں کندھے میں آگ سی اترتی محسوس ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ گن بردار میری جانب فائرنگ کرتے' میں ہاتھ مار کر کمرے کی لائٹ آف کرچکا تھا۔

میں تاریکی چھاتے ہی جس مقام پر گرا تھا' وہاں سے

تھوڑا آگے رینگ گیا۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا ورنہ وہ اندھیرے میں بھی اگر میری سمت فائرنگ کرتے تو مجھے شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔

حیرت انگیز طور پر مزید فائرنگ نہیں ہوئی اور وہ چاروں یکے بعد دیگرے کمرے سے نکل گئے۔ یقینی طور پر وہ اپنی گنوں" کو ری لوڈ (RELOAD) کرنے گئے تھے۔ برسٹ فائرنگ نے گنوں کے میگزین خالی کردیے تھے۔ میں ان کی واپسی تک وہاں رکنے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔ کوئی گولی ری باؤنڈ ہوکر میرے کندھے میں آدھمکی تھی جس سے میں شدید تکلیف محسوس کررہا تھا۔

میں نے زخمی کندھے کو ایک ہاتھ سے تھاما اور دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے کے نزدیک آگیا۔ مجھے اپنے ہاتھ پر خون کا رساؤ محسوس ہوا۔ کندھا ٹھیک ٹھاک زخمی ہوچکا تھا۔ چند لمحات تک جب باہر خاموشی رہی تو میں احتیاط سے باہر نکل آیا۔ وہاں کسی ذی نفس کے آثار نہیں تھے۔

میں نے ایک لمحے کو سوچا اور گولی کی رفتار سے بالائی منزل کی بالکونی کے پاس پہنچ گیا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ چاروں میری طرف آرہے تھے۔ انہوں نے اپنی گنیں ری لوڈ کرلی ہوں گی۔ پیچھے مڑکر دیکھنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں اس وقت ہائی رسک پر تھا اور اس قسم کی صورتِ حالات میں بھاگم بھاگ اور فوری فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے سانس روکی' بالکونی کی ریلنگ پر چڑھا اور ڈائیونگ بورڈ سے جمپ لگانے کی طرح خود کو فضا کے حوالے کردیا۔

میرے پاؤں میں جوگرز تھے۔ اتنی بلندی سے نیچے آنا کوئی آسان کام نہیں لیکن جو لوگ "فری فال" کی تھیوری اور ٹیکنیک سے آگاہ ہیں' انہیں یہ ناممکن نظر نہیں آتا۔ مشاق لوگوں کے لیے یہ ایک کھیل ہے۔

زمین پر میرے پاؤں اور ہاتھ ایک ساتھ عمل میں آئے اور میں فرنٹ رول کرتے ہوئے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ میرے زخمی کندھے کی تکلیف اس حرکت سے کئی گنا بڑھ گئی مگر میں بازو کو تھام کر "ہائے ہائے" نہیں کرسکتا تھا۔ میرے عقب میں چار خطرناک گنوں کی سفاک نالیں اٹھی ہوئی تھیں جیسے چار توپیں دہانے کھولنے کو بے قرار ہوں۔

رولنگ ختم ہوتے ہی میں اٹھ کر اپنی گاڑی کی جانب لپکا۔ اسی وقت بنگلے کی بالائی منزل سے گولیوں کی ایک بوچھار میری جانب آئی مگر خوش قسمتی سے ایک بھی گولی میرے وجود کو چھو نہ سکی۔

وہ بڑے قیامت خیز لمحات تھے۔ میرے پاس سوچنے' رکنے یا پلٹ کر پیچھے اپنے دشمنوں کو دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی ہی تھی کہ عقبی نشست سے کوئی سفید شے پرواز کرتے ہوئے آئی اور "دھپ" سے میری گود میں گری۔ ہڑبڑاہٹ میں اسٹیئرنگ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اسی لمحے میری سماعت سے ایک مانوس آواز ٹکرائی۔

"میاؤں...!"

سگریٹ نوشی چھوڑ دیجیے
جینا شروع کیجیے
قیمت
25 روپے
ذاکہ خرچ
23 روپے
تمباکو نوشی اور دیگر بری عادات سے چھٹکارا حاصل کیجیے۔
خطرکتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
kitabiat1970@yahoo.com
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (انٹر کانٹی نینٹل بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

وہ نرم و ملائم سفید شے ایک بلی تھی۔ ''میاؤں'' کی آواز نکالتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر اچھلی اور پسنجرز سیٹ پر پہنچ گئی۔ میری گردن بے ساختہ اس کی جانب مڑ گئی۔ ہماری نگاہیں ملیں تو وہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مخصوص ادا سے سر کو جھٹکا اور اس کے حلق سے بڑی کراری آواز برآمد ہوئی..... ''میاؤں!''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے وہاں سے جلد از جلد نکلنے کا مشورہ دے رہی ہو۔ وہاں تو میں خود بھی ایک لمحے کو نہیں رکنا چاہتا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے آگے بڑھا دیا۔ دو تین گلیاں گھومنے کے بعد میں مین کشمیر روڈ پر آ گیا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ یہ رش کا وقت تھا۔ کشمیر روڈ سے میں جیسے ہی شاہراہِ قائدین پر پہنچا، اس رش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ میں مسلسل بیک ویو پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، ایک موٹر سائیکل میرے تعاقب میں تھی۔ اس موٹر سائیکل پر دو افراد سوار تھے۔ ایک ڈرائیو کر رہا تھا، دوسرا اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ اس تعاقب کے سلسلے میں، میں کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں، میں نے نورانی چورنگی پر پہنچ کر گاڑی کو شاہراہِ قائدین پر رکھنے کے بجائے بائیں جانب موڑ لیا۔ اب میری گاڑی خالد بن ولید روڈ پر دوڑ رہی تھی اور یہ دیکھ کر کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ موٹر سائیکل میرے ہی تعاقب میں آ رہی تھی اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہمارا درمیانی فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ایک تشویش ناک صورتِ حالات تھی۔

میں اس وقت بہت نازک اور سنگین حالات سے گزر رہا تھا۔ اپنے روٹ کو میں نورانی چورنگی پر چھوڑ چکا تھا۔ مجھے اصولی طور پر شاہراہ قائدین پر رہتے ہوئے نرسری تک پہنچنا تھا پھر شاہراہِ فیصل پر سفر کرتے ہوئے گورا قبرستان اور وہاں سے نیشنل ہائی وے کے ذریعے ڈیفنس میں ''ساؤتھ'' تک جانا تھا۔ روٹ کی تبدیلی سے میری مشکلات میں اضافہ ہو گیا، خاص طور پر اس صورت میں کہ میرا بایاں کندھا بھی زخمی تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا، گولی نے مجھے کس قدر نقصان پہنچایا تھا، البتہ میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ خون کے رساؤ میں تیزی آتی جا رہی تھی۔

خالد بن ولید روڈ پر زیادہ رش ویگنز وغیرہ کا تھا۔ متعاقب موٹر سائیکل کسی دُم کے مانند میری شیرڈ کے ساتھ بندھی چلی آ رہی تھی۔ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس طرح اس کے دونوں ہاتھ اور بالائی دھڑ نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں ڈرائیونگ کے دوران میں گاہے بہ گاہے بیک ویو میں موٹر سائیکل سواروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ پر نگاہ جمائے آگے بڑھ رہے تھے۔ رش کی وجہ سے انہیں اوورٹیک کرنے یا میرے برابر میں آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

ہم آگے چلتے ہوئے سگنل کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں پر علامہ اقبال روڈ، خالد بن ولید روڈ کو کراس کرتی ہے۔ جیسے ہی ہم سگنل کے قریب پہنچے، سگنل کی سرخ لائٹ روشن ہو گئی۔ میں جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا ان کا تقاضا یہی تھا کہ فوری طور پر تعاقب کرنے والوں سے جان چھڑا لی جائے۔ میں انہیں اپنے پیچھے لگا کر آگے بڑھنے کا موقع فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دونوں انہی چار افراد میں سے تھے جنہوں نے بنگلے میں مجھ پر بے دریغ فائرنگ کی تھی۔

میں نے سرخ لائٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی شیرڈ کو آگے بڑھا دیا۔ میں سگنل توڑ کر قانون شکنی کا مرتکب ہو رہا تھا لیکن اس لمحے یہ سب سوچنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ جو بھی کرنا تھا، ہنگامی اور جنگی بنیادوں پر کرنا تھا۔ میں نے محبت اور جنگ کے اصول پر عمل کر ڈالا۔

میرے پیچھے کئی گاڑیوں کے ٹائروں کی چرچراہٹ گونجی۔ یقینی طور پر یہ وہ گاڑیاں تھیں جو علامہ اقبال روڈ کا سگنل کھلنے پر آگے بڑھی تھیں، میں نے بیک ویو پر نگاہ ڈالی تو اس گونج کا سبب نظر آ گیا۔ میں تو زن سے سگنل توڑ کر آگے بڑھ آیا تھا، موٹر سائیکل والوں نے بھی میری تقلید میں وہی قانون شکنی کی تھی اور اس موٹر سائیکل کو بچانے کے لیے ہی متعدد گاڑیوں نے بریک لگائے تھے۔ یہ ان کا ایک فطری ردِعمل تھا۔

اس لمحاتی واقعے نے میرے تعاقب پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ میں نے ریڈ الرٹ ہوتے ہوئے ایکسلی ریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا لیکن عقبی سگنل بند ہونے کے باعث روڈ کی یہ سائیڈ بالکل خالی پڑی تھی چنانچہ شیرڈ کی بڑھتی ہوئی اسپیڈ کوئی کام نہ دکھا سکی اور آن واحد میں موٹر سائیکل گاڑی کے پہلو میں آ گئی..... اور اسی لمحے میری آنکھوں نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا۔

موٹر سائیکل ڈرائیونگ سائیڈ سے شیرڈ کے برابر آئی تھی اور اس وقت موٹر سائیکل کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا شخص بالکل میرے متوازی محوِ سفر تھا۔ اب چادر کے اندر سے اس کے ہاتھ باہر نکل آئے تھے اور نظر آنے والے ان ہاتھوں میں ایک مختصر الوجود کلاشن دکھائی دے رہی تھی جس کا بیرل ایک سوا انچ

کے زاویے پر میرے سر کی جانب اٹھا ہوا تھا۔ کوئی لمحہ تھا کہ وہ مہلک بیرل میری طرف موت اچھالنے والا تھا۔

موت کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق مجھے کئی مرتبہ ہوا تھا ''قربت'' کا یہ والہانہ پن میں نے ازیں قبل ملاحظہ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا..... یہ خدا نہیں جانتا کہ وہ وہ فیصلہ میں ب اور کیسے کیا؟ سوچ کر عمل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے یاد نہیں، وہ کیا تھا اور کیا نہیں تھا!

اچانک میرے قدموں میں سرسراہٹ ہوئی اور میں نے قوت سے بریک پیڈل دبا دیا۔ ٹائروں کی چرچراہٹ فضا گونج اٹھی پھر اس گونج میں کلاشن کے برسٹ کی وں تڑتڑاہٹ بھی شامل ہو گئی۔ میں نے ساکن شیرڈ کی اسکرین کے پار موٹر سائیکل کو سڑک پر لہراتے ہوئے ا۔ وہ خط نما میں سفر کرتے ہوئے سڑک سے اتری اور یوں کے ایک شوروم کے آہنی گیٹ سے جا ٹکرائی۔

اس ٹکراؤ کے نتیجے میں دونوں موٹر سائیکل سوار دھڑام ے نیچے جا گرے۔ اسی لمحے میں نے اپنے پاؤں میں کوئی نرم ز چیز جنبش حرکت محسوس کی اور میرے کانوں تک یہ مخصوص از رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ''میاؤں.....''

وہ آفت کی پرکالہ اس نازک مرحلے پر کسی وقت پسنجرز ٹ سے نقل مکانی کر کے میرے قدموں میں پہنچ گئی تھی۔ ری پوری توجہ کلاشن کے بیرل پر مرکوز تھی لہٰذا میں اس کی اس رکت کو دیکھ نہیں سکا تھا۔

اسی وقت فضا میں ایک مخصوص سائرن کی آواز گونجنے لی۔ میں نے میکانکی انداز میں بیک ویو پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ ر میرے اعصاب تن گئے کہ عقبی سگنل کھل چکا تھا اور میری انب بڑھنے والے ٹریفک کے ریلے میں سب سے آگے یک پولیس موبائل تھی۔ یہ مخصوص سائرن کی آواز اسی موبائل ے خارج ہو کر فضا میں منتشر ہو رہی تھی۔ ہمارے درمیان اتنا ملہ تھا کہ میں اپنے بچاؤ کی مناسب کوشش کر سکتا تھا۔ ایک ے کی تاخیر کیے بغیر میں نے نیلی شیرڈ کو آگے بڑھا دیا۔ اگلے لمحے وہ نئی نویلی گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

میرے عقب میں آنے والی گاڑیاں پولیس موبائل کو گے بڑھنے کا پورا پورا موقع دینے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ وبائل میرے قریب ہونے لگی۔ اس وقت میرے ذہن میں رف ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ فی الفور پولیس موبائل سے ٹکارا حاصل کرنا ہے۔ میں شیرڈ کو مختلف سڑکوں پر موڑتے ئے شہید ملت روڈ پر لے آیا۔ اتفاق اور خوش قسمتی سے اس ت اس روڈ پر زیادہ رش نہیں تھا۔ میں ایکسلی ریٹر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے اپنے اور پولیس موبائل کے درمیانی فاصلے کو بہ تدریج طول دینے لگا۔ اس کوشش میں مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

سفید بلی دھیرے سے کھسکتے ہوئے میرے قدموں سے نکلی اور اُچک کر دوبارہ پسنجرز سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ یہ ہو بہو وہی بلی تھی جو پہلی مرتبہ اوپن ائیر ریسٹورنٹ میں دکھائی دی تھی، دوسری بار بوٹ بیسن پر، تیسری دفعہ فلیٹ کے بیڈ روم میں اور اب ان حالات میں وہ بلا مبالغہ میری دست گیری کر رہی تھی۔ اگرچہ تمام بلیاں کم و بیش ملتی جلتی صورت و شکل کی ہوتی ہیں لیکن میرا دل کہہ رہا تھا..... یہ ایک ہی بلی ہے جو مختلف ناز و اطوار سے میری زندگی میں آ رہی ہے۔ یہ ایک بے اختیار خیال تھا جس کی طاقت کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

میں نے شیرڈ کی اسپیڈ میں مزید اضافہ کرتے ہوئے اپنے ''پڑوس'' میں فروکش اس عجوبۂ روزگار بلی کو دیکھا۔ وہ اس اعصاب شکن ماحول سے بے نیاز، اپنے پاؤں کے پنجے سے گردن کو کھجا رہی تھی۔ مجھے اس کی بے نیازی پر رشک محسوس ہونے لگا۔ اللہ ایسی بے فکری سب کو دے! اس حالت میں دیکھ کر بلی کی معصومیت پر ایمان لانے کو جی چاہتا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ قائم رکھتے ہوئے بیک ویو میں پولیس جیپ کو دیکھا۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ پیدا ہو چکا تھا کہ پہلی نظر میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا، وہ موبائل میری شیرڈ کے تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی ہے مگر بلوچ کالونی والے پل سے ایک سگنل پہلے مجھے اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو خطرناک حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ جب سگنل کراس کر کے میں نے دوبارہ رفتار بڑھائی تو پولیس موبائل ایک مرتبہ پھر میرے بہت قریب پہنچ گئی۔ میں نے شیرڈ کو برج پر چڑھانے کے بجائے سروس روڈ پر ڈالا اور تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے شاہراہِ فیصل پر آ گیا۔ اس وقت میرا رخ ائیرپورٹ کی جانب تھا۔ میں نے کشادہ سڑک پر آتے ہی بیک ویو پر نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی کہ پولیس موبائل مجھ سے بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

میں نے پولیس موبائل کو ڈاج دینے کے لیے اپنی شیرڈ کو ایک مرتبہ پھر سروس روڈ پر ڈال دیا۔ شاہراہِ فیصل جیسی مصروف، سیدھی اور کشادہ روڈ پر میں زیادہ دیر تک پولیس والوں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا رہائشی علاقے کی گلیوں میں گھما پھرا کر اس موبائل سے نجات حاصل کی جا سکتی

تھی۔ اسی حکمتِ عملی پر قدم بڑھاتے ہوئے میں نے اپنی گاڑی کو ''لال قلعہ'' کے پہلو سے بائیں جانب اندر لے لیا۔

اب میں میراں محمد شاہ روڈ پر سفر کر رہا تھا۔ پولیس موبائل جس طرح میرے تعاقب میں چلی آ رہی تھی اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا، وہ مجھے کوئی ڈاکو یا قاتل قسم کی چیز سمجھ رہے ہیں، علامہ اقبال روڈ والا سگنل توڑ کر ہم نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا پھر موٹر سائیکل سے جو میری جانب برسٹ فائر کیا گیا تھا۔ اس نے ہمیں مزید مشکوک کر دیا۔ پتا نہیں، ان دونوں موٹر سائیکل سوار افراد کا کیا ہوا ہوگا۔ میں اس لمحے کے بارے میں سوچ کر لرز اٹھا جب جدید ترین کلاشن کا بیرل میری جانب اٹھا ہوا تھا اور اب تب میں مجھ پر فائرنگ ہونے والی تھی۔ اگر میں بریک لگانے میں سیکنڈ کے دس ویں حصے کے برابر بھی تاخیر کر دیتا تو آج اپنی داستان بیان کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔ اتنے نزدیک سے کلاشن کوف کا برسٹ میرے بھیجے کو گاڑی کے اندر چاروں طرف اڑا دیتا۔ حملہ آور کلاشنکوف بردار کی ٹائمنگ میں کوئی فرق تھا اور نہ ہی اس کا نشانہ کچا تھا۔ اگر میں ذرا سی بھی کوتاہی کر دیتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اچانک شیرڈ رک جانے سے موٹر سائیکل کئی فٹ آگے نکل گئی اور اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ اسی ''خطا'' کے نتیجے میں ان کی موٹر سائیکل لہرا کر ایک شوروم کے گیٹ سے جا ٹکرائی تھی۔

میں نے بے ساختہ پسنجرز سیٹ پر بیٹھی ہوئی سفید بلی کو ممنونیت آمیز نظر سے دیکھا۔ اس نے میرے قدموں میں سرسراہٹ پیدا کر کے غیر ارادی طور پر مجھ سے بریک لگوا دیے تھے۔ گویا میری جان بچانے کا سہرا اسی کے سر بندھتا تھا۔

میراں محمد شاہ روڈ کے دو تین کٹ گزرنے کے بعد میں نے بیک ویو میں دور تک دیکھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، لال قلعہ والے کارنر سے پولیس موبائل مڑ کر میری جانب سیدھی ہو چکی تھی۔ رہائشی علاقے کی سڑک پر آ کر میری اسپیڈ کم ہو گئی تھی جس کا فائدہ پولیس والوں نے اٹھایا البتہ ان کی ایک ''مہربانی'' میرے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ اب موبائل کا سائرن خاموش تھا۔ پتا نہیں، اس میں ان کی کیا مصلحت تھی!

موبائل کو ایک مرتبہ پھر اپنے تعاقب میں دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ رہائشی علاقے میں موبائل سے جان چھڑانے کے لیے چور سپاہی والا کھیل ضروری ہو گیا۔ میں نے ایک ذیلی اسٹریٹ میں شیرڈ کو موڑتے ہوئے اچانک اسپیڈ بڑھا دی۔ اس اسٹریٹ کے اختتام تک پہنچتے ہوئے میں موبائل سے اچھے خاصے فاصلے پر آ گیا۔ وہ جیسے ہی مذکورہ اسٹریٹ میں داخل ہوئی۔ میں ایک اور اسٹریٹ پر مڑ چکا تھا۔ میں اس وقت نہایت مہارت کے ساتھ ''کے ڈی اے ایکسٹینشن نمبر ون'' کی کشادہ اسٹریٹس پر پولیس والوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں انہیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ گزشتہ دو تین ٹرننگ کے وقت مجھے اپنے عقب میں پولیس موبائل دکھائی نہیں دی تھی۔ پہلے میرا ارادہ تھا، گھما پھرا کر اپنی گاڑی کو کارساز والی سڑک پر لے جاؤں گا لیکن پھر ایک صاف ستھری گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنا ارادہ فوراً ترک کر دیا۔

اس فوری اور حتمی تبدیلی کا سبب وہ گیٹ تھا جس کے اندر مین نے ایک چمچماتی بلیک ہونڈا سوک کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوبصورت عورت موجود تھی جو بہ آہستگی گاڑی کو بنگلے کے اندر لے گئی۔

مجھے یقین تھا، اس عورت نے میری شیرڈ کو نہیں دیکھا ہو گا۔ بہ فرضِ محال اگر دیکھا بھی تھا تو اس نے میری جانب دھیان نہیں دیا ہوگا۔ اس اسٹریٹ میں آغاز سے اختتام تک خاموشی اور سناٹا تھا۔ میں نے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اپنی شیرڈ کو اس کھلے ہوئے گیٹ سے بنگلے کے اندر داخل کر دیا۔

بلیک ہونڈا سوک ایک مخصوص راستے پر سفر کرتے ہوئے اپنے پورچ میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے گیٹ کے اندر پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ طے کر کے شیرڈ کو بائیں جانب موڑ کر روک دیا۔ بنگلے کے سامنے والے حصے میں ایک خوبصورت سرسبز لان بنا ہوا تھا۔ میں نے لان کا حصہ گزرنے کے بعد ہی گاڑی کو بائیں جانب پختہ فرش پر روکا تھا۔

غالب امکان یہی تھا کہ میری اس ''جسارت'' پر وہ ہونڈا سوک والی، بہت واویلا مچائے گی۔ میں اس کی اجازت حاصل کیے بغیر بڑی بے جگری سے اس کے بنگلے میں گھس آیا تھا مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ عورت بڑے اطمینان سے اپنی گاڑی سے نکلی اور مجھ پر، یعنی میری گاڑی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

اس کا یہ رویہ میری سمجھ سے بالاتر اور غیر فطری تھا۔ یہ سوچنا بے وقوفی کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ اس نے میری شیرڈ کو دیکھا نہیں ہوگا اور وہ میری وہاں موجودگی سے بے خبر ہوگی۔ میں نے اپنے زخمی کندھے کو مضبوطی سے تھاما اور بیک ویو میں بنگلے کے گیٹ کا جائزہ لینے لگا۔ جس جگہ میں نے شیرڈ کو روکا تھا

وہاں سے وہ گیٹ بالکل عقب میں پڑتا تھا۔ اس عورت نے دروازے سلیقے اور تحمل کے ساتھ گیٹ کو بند کر کے اندر سے بولٹ کیا اور پنے قدموں سے میری جانب بڑھنے لگی۔

عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں، میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہاں اگرچہ زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن میں اس کے سراپا کو بڑی وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا قد کسی بھی طور پانچ فٹ آٹھ انچ سے کم نہیں تھا وہ متناسب جسم کی مالک ایک خوش شکل عورت تھی جس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس کے قریب قریب لگایا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا، رنگت سانولی تھی جس کی وجہ سے اس کی کشش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک جاذبِ نظر اور خوبصورت عورت تھی جس کے حسن کی دلکشی میں کسی کلام کی گنجائش نہیں تھی۔

''کیا ساری رات اسی گاڑی میں گزار دو گے؟''

اس سوال نے مجھے چونکا دیا۔ میں اس کے سراپا میں اس قدر محو ہو گیا تھا کہ مجھے پتا ہی نہیں چل سکا، وہ کب میرے قریب پہنچ گئی تھی۔ میں نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں اور دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آ گیا۔

''اوہ! تم تو زخمی ہو۔'' اس نے میرے خون آلود کندھے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ بولی ''اندر آ جاؤ۔ یہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا مناسب نہیں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ مڑ کر بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا یہ رویہ میری حیرت میں مزید اضافہ کر گیا۔ میں جس قسم کی صورتِ حال میں اس کے بنگلے میں وارد ہوا تھا، اس کے پیشِ نظر اسے کسی اور نوعیت کے ردِعمل کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ میں اس سمجھ میں نہ آنے والی مہربان عورت کی راہنمائی میں بنگلے کے اندر پہنچ گیا۔ مختلف راہداریوں سے گھما کر وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئی جو اپنی ٹرننگ سے بیڈ روم نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک جہازی سائز بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سریلی آواز میں کہا۔

''تم یہاں آرام کرو۔ میں تمہارے زخمی کندھے کا کوئی بندوبست کرتی ہوں۔''

''تم کون ہو؟'' بے ساختہ میری زبان سے پھسل گیا۔

وہ زیرِ لب مسکرائی ''یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے تھا۔ اگر نہیں پوچھا تو اس کا یہی مطلب ہے، میں تمہاری دشمن نہیں بلکہ دوست ہوں۔ ویسے میرا نام لیلیٰ ہے۔''

''لیلیٰ!'' میں نے دھیمی آواز میں دہرایا ''اگر تم میری دوست ہو تو پھر میں تمہیں یہ ضرور بتاؤں گا کہ اس وقت پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ تم مجھے پناہ دینے کے جرم میں کسی مصیبت میں بھی مبتلا ہو سکتی ہو۔''

وہ پُراعتماد لہجے میں بولی ''پناہ میں نے نہیں دی بلکہ تم از خود میرے بنگلے میں آئے ہو، بہرحال اٹ ڈزنٹ میٹر'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور کہا ''اس بنگلے میں تم بالکل محفوظ ہو۔ پولیس کا باپ بھی یہاں تاک نہیں کر سکتا۔ شاید تم نے بنگلے کے باہر نصب نیم پلیٹ کو نہیں دیکھا؟''

اس کے اعتماد سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی توپ قسم کی شے ہے۔ میں نے واقعی نیم پلیٹ کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ میں نے لیلیٰ کے سوال کے جواب میں نفی میں گردن ہلائی اور پوچھا ''نیم پلیٹ پر کیا لکھا ہوا ہے؟''

''بتا دوں گی۔'' وہ بے اعتنائی سے بولی ''پہلے تمہارے کندھے کے علاج معالجے کے سلسلے میں کچھ کوشش کر لوں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ تم آرام سے بستر پر لیٹ جاؤ۔''

میں نے لیلیٰ سے زیادہ جرح نہ کی اور اس کے مشورے کے مطابق بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ بیڈ سائیڈ پر ایک خوبصورت جدید قسم کا ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا میں تمہارا فون استعمال کر سکتا ہوں؟''

''میں تمہاری دوست ہوں۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی ''تم اس بنگلے کی ہر چیز کو بے دریغ استعمال کر سکتے ہو۔''

اس کی مسکراہٹ بڑی دل آویز اور دل نشین تھی۔ اس نے پیازی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو اس کی سانولی رنگت کی دلکشی کو مہمیز کرتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نمک کی کان نے لباس پہن کر لیلیٰ کی شکل اختیار کر لی ہو۔ مجنوں کی لیلیٰ تو سیاہ رات کے مانند کالی تھی لیکن میرے سامنے جو لیلیٰ کھڑی تھی وہ اپنی رنگت اور سنگت سے کسی بھی ذی ہوش کو مجنوں بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

میں اس وقت لیلیٰ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ان آنکھوں میں بے پناہ لپک تھی۔ یوں لگتا تھا وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ آنکھوں کے مقام پر دو طاقت ور مقناطیس فٹ کر دیے گئے ہوں۔ وہ کسی ساحرہ کی آنکھیں تھیں جو اپنے سامنے موجود ہر شے کو مسخر کرنے پر قدرت رکھتی تھیں۔ میں نے ایسی آنکھوں والی عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

میں شاید اس کی آنکھوں میں دیکھتا چلا جاتا کہ وہ اچانک مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔ میں بیڈ روم میں اکیلا رہ گیا۔ اس اکیلے پن نے مجھے احساس دلایا کہ تھوڑی دیر پہلے میں

جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا، کسی ان دیکھی، ان جانی قوت کے زیرِ اثر عمل کر رہا تھا۔ لیلیٰ کا رد عمل حیرت انگیز اور پراسرار تھا۔ کسی غیر شخص کو اس طرح اپنے بنگلے میں گھستے دیکھ کر اسے جو فطری ردِ عمل ظاہر کرنا چاہیے تھا، اس نے اس کے بالکل برعکس کیا تھا اور میں..... میں بھی اس کے مشورے کو بلا چون و چرا مان کر بیڈ روم تک چلا آیا تھا۔

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے پچاسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے پھر میں پیش آمدہ صورتِ حال میں لوٹ آیا۔ ساحل سے جدائی کے تصور نے لیلیٰ کا سراپا اور اس کا طرزِ عمل دھندلا دیا اور میں نے کندھے کی تکلیف کو فراموش کر کے ٹیلی فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ سب سے پہلے میں نے ''نبی سر'' میں قاضی سلطان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسری گھنٹی پر ادھر سے ریسیور اٹھایا گیا۔ میرے ''ہیلو'' کہنے کے جواب میں ایک نسوانی آواز ائر پیس میں ابھری۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''میں وجدان بات کر رہا ہوں کراچی سے۔ قاضی صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ ابھی ابھی حویلی سے نکلے ہیں۔'' دوسری جانب سے جواب ملا ''میں ممتاز کی اماں رخسانہ بیگم بول رہی ہوں۔'' لہجہ سندھی انداز کا تھا تاہم وہ بات اردو میں کر رہی تھی ''کراچی سے منہاس باقر کا فون آیا تھا۔ انہوں نے فوری طور پر قاضی سلطان کو بلایا ہے۔''

اس کی بات سے ظاہر ہو رہا تھا، منہاس باقر نے انہیں ممتاز کے اغوا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا یا اگر کچھ بتایا بھی تھا تو وہ قاضی نے خود تک محدود رکھا تھا، اپنی بیگم کو اس سانحاتی اطلاع کی ہوا بھی لگنے نہیں دی تھی۔

میں نے سوال کیا ''منہاس باقر نے قاضی صاحب کو کس سلسلے میں کراچی بلایا ہے؟''

''سلسلہ تو مجھے پتا نہیں۔'' وہ فکرمندی سے بولی ''کسی ضروری کام ہی سے بلایا ہوگا۔''

میں نے پوچھا ''قاضی صاحب کو حویلی سے نکلے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟''

''زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ! پھر تو ممکن ہے، وہ ابھی وہاں سے روانہ ہوئے ہوں۔''

''اگر تم کہو تو میں ملازم کو بھیج کر پتا کرواتی ہوں۔'' رخسانہ بیگم نے کہا ''خیریت تو ہے نا؟''

میں نے پہلے رخسانہ بیگم کو دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آواز سنی تھی۔ یہ ہمارے درمیان پہلا صوتی رابطہ تھا۔ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''فوراً کسی کو دوڑائیں۔ یہ بے حد ضروری ہے..... اشد ضروری!''

''کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ وہاں خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے۔'' میں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

وہ تڑپ کر بولی ''میری ممتاز تو ٹھیک ہے نا؟''

''آپ وقت ضائع کر رہی ہیں خاتون۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''اچھا، اچھا۔'' وہ بے تابی سے بولی ''تم ہولڈ کرو۔ میں بھیجتی ہوں کسی ملازم کو۔''

دو منٹ بعد قاضی سلطان لائن پر موجود تھا۔

''ہیلو'' کے بعد اس کی گھبرائی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ''وجدان! یہ کیسے ہوگیا۔ ممتاز کے تعاقب میں وہ سوکر ختم کراچی کیسے پہنچ گئے۔ میں نے تو اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھنکوا دیا تھا۔''

میں نے کہا ''ان معاملات کی تفصیل میں جانے کا وقت ہے اور نہ ہی موقع۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب آپ کو میری ہدایت پر فوراً عمل کرنا ہے..... اگر ممتاز کی بہ خیریت واپسی چاہتے ہیں تو!''

''ہاں، ہاں۔'' وہ جلدی سے بولا ''میری ممتاز کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ منہاس نے تو مجھے فوری طور پر کراچی آنے کو کہا ہے۔''

''خدا کا شکر ہے، آپ حویلی سے روانہ نہیں ہوئے تھے ورنہ آپ سے رابطہ نہ ہو پاتا۔'' میں نے کہا ''آپ ہرگز ہرگز کراچی نہیں آئیں۔ ممتاز یہاں سے روانہ ہو چکی ہے۔''

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا ''کہاں کے لیے روانہ ہو چکی ہے؟''

''عمر کوٹ کے لیے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا واقعی!'' اس کی آواز میں بے پناہ حیرت تھی ''تمہاری فراہم کردہ اس اطلاع کی صحت میں کسی شک و شبے کی گنجائش تو نہیں؟''

''ناٹ ایٹ آل!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اس نے پوچھا ''وہ کراچی سے کب روانہ ہوئی ہے؟''

تارا نے کشمیر روڈ والے بنگلے پر مجھے بتایا تھا کہ تھوڑی دیر بعد ممتاز کو عمر کوٹ روانہ کر دیا جائے گا۔ جب وہ مجھے یہ اطلاع

دے رہا تھا اس وقت لگ بھگ رات کے آٹھ بجے تھے۔ اس کا یہی مطلب تھا، وہ آٹھ اور نو بجے کے درمیان وہاں سے عمر کوٹ بھیجی جانے والی تھی۔ قاضی سلطان کے سوال و جواب میں، میں نے کہا۔

''میری معلومات کے مطابق ممتاز کو ساڑھے آٹھ بجے اس سے عمر کوٹ کے لیے روانہ کیا گیا ہے۔ اسے سیدھا میرا اکبر سومرو کے بنگلے پر پہنچایا جائے گا؟''

''تو وہ خبیث بھی آزاد ہوگیا!'' قاضی نے نفرت آمیز آواز میں کہا۔

میں نے کہا ''قاضی صاحب لگتا ہے، آج کل آپ حالاتِ حاضرہ سے زیادہ باخبر نہیں ہیں، یہ دونوں شیطان کچھ عرصہ پہلے جوڑ توڑ اور مک مکا کر کے قانون کے شکنجے سے نکل گئے تھے۔ تارا نے اسی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے ممتاز کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ بدقسمتی سے میری دوست ساحل اس لپیٹے میں آگئی۔''

''مجھے منہاس باقر نے سب کچھ بتا دیا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''مجھے ساحل کے اغوا کا دکھ ہے وجدان۔ بولو، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

میں نے سنجیدگی سے کہا ''فی الحال آپ ساحل کو بھول جائیں۔ اس کی تلاش اور واپسی کا بیڑا میں نے اٹھا لیا ہے۔ اب آپ اپنی بیٹی ممتاز کی صحیح سالم واپسی کے لیے فوراً حرکت میں آجائیں۔ اس سلسلے میں آپ اپنے ایس پی سالے سے مدد لیں۔ وہ عمر کوٹ میں خاصا اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ وڈیرے کی حویلی اور بنگلے کی جانب جانے والے ہر راستے کی سنجیدہ ناکہ بندی کی جائے تو مغوی ممتاز کو بہ آسانی بازیاب کیا جا سکتا ہے۔ عمر کوٹ تک پہنچنے میں انہیں ابھی کافی وقت لگے گا، گویا آپ کے پاس ہاتھ پاؤں، اور ذہن کو کام میں لانے کے لیے کافی وقت ہے۔ آپ چاہیں تو یہ بازی آپ کے حق میں پلٹ سکتی ہے۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کرتے ہوئے اضافہ کیا ''ویسے آپ کے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔ میں نے دوزخ مکانی تارا کو اپنی آنکھوں کے سامنے جہنم واصل ہوتے دیکھا ہے۔ اس کی آخری چیخوں نے میرے آبلہ جگر کو بہت سکون پہنچایا تھا۔''

''تم فکر نہ کرو وجدان۔'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا ''میں بھی عن قریب تمہیں ایک عظیم خوش خبری سناؤں گا..... جب اکبر سومرو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کی بھیک مانگے گا اور زندگی کے نام پر اسے کچھ نہیں ملے گا..... اور اگر اسے کچھ ملے گا بھی تو وہ ہوگی موت، ایک دردناک موت..... ایک عبرت انگیز اور نفرت آمیز موت!''

''انشاء اللہ!'' میں نے تیقن سے کہا۔

قاضی سلطان بولا ''میں ابھی منہاس باقر کو فون کر کے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں۔'' پھر کسی فوری خیال کے تحت اس نے پوچھا ''تم نے منہاس کو تو اس سلسلے میں سب کچھ بتا دیا ہے نا؟''

میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا ''آپ نے فون کرنا ہی ہے تو اپنے سالے سے رابطہ کریں اور ممتاز کو بہ حفاظت دشمنوں کے چنگل سے نکالنے کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیں۔ منہاس باقر کو میں خود ہی سب سمجھا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' وہ جلدی سے بولا پھر پوچھا ''تم نے ممتاز کی اماں کو تو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا نا؟''

''میں نے کہا ''واضح طور پر کچھ نہیں۔''

''اب اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری ہوگیا ہے۔'' اس نے کہا ''ابھی تک میں نے ممتاز کے اغوا کے سلسلے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اس وقت بھی دوسرے کمرے میں ہے۔''

پھر ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ ختم ہوگیا۔

میں نے دوسرا فون منہاس باقر کے بنگلے پر کیا۔ جلد ہی وہ فون پر آگیا۔ رسمی کلمات کے بعد میں نے اسے حالاتِ حاضرہ کے بارے میں بتایا اور تھوڑی دیر پہلے قاضی سلطان سے ہونے والی گفتگو سے بھی آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

''وجدان! میں تمہاری حاضر دماغی اور معاملہ فہمی کو مان گیا ہوں۔ تم نے قاضی سلطان کو وہاں روک کر بہت سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے۔ اس طرح ممتاز کی بازیابی زیادہ آسان ہو جائے گی۔''

''یہ وقت کا تقاضا تھا منہاس صاحب!'' میں نے کہا۔

وہ بولا ''تم یہ نہ سمجھنا مجھے تمہاری دوست ساحل کے اغوا کا افسوس نہیں۔ یقین جانو، وہ بھی میرے لیے ایسے ہی ہے جیسے ممتاز یا جیسے شبانہ۔''

''میں آپ کے جذبات اور احساسات کو بہ خوبی سمجھ رہا ہوں۔''

''تم مجھے بتاؤ، میں تمہاری دوست کے حصول کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''میں آپ کی پیش کش کی قدر کرتا ہوں۔'' میں نے کہا ''مجھے جب بھی آپ کی مدد یا تعاون کی ضرورت ہوئی، میں آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔ فی الحال موجودہ حالات جو رخ

اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر مجھے خود ہی اپنے دشمنوں سے نمٹنا ہے۔ میں آپ کو یہ بتا ہی چکا ہوں، اغوا کنندگان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

میں نے منہاس باقر کو نہایت ہی محفوظ اور چیدہ چیدہ باتیں بتائی تھیں۔ یہ حالات کا تقاضا اور میری مجبوری بھی تھی۔ میں نہ تو کھل کر اس کے سامنے آسکتا تھا اور نہ ہی مکمل پردہ پوشی ممکن تھی۔ وہ بہت سمجھ دار اور بردبار شخص تھا۔ جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ۔ اس سے بات کرتے ہوئے مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔

میری بات سننے کے بعد اس نے کہا ''میری دعا ہے، اللہ تمہیں جلد از جلد کامیاب کرے۔ تم اس مشن سے سرخ رو ہو جاؤ تو پھر میں بھی تمہیں ایک نہایت ہی ہم ذمے داری سونپنا چاہتا ہوں۔''

''کیسی ذمے داری؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ بولا ''ابھی میں خود اس سلسلے میں بہت الجھا ہوا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، ایک بہت ہی منظم گروہ کراچی میں کام کر رہا ہے۔ مقامی افراد کے اس گروہ کے پیچھے درحقیقت یہودی لابی اپنا کام کر رہی ہے۔ میں اسی گروہ سے متعلق تحقیقاتی کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے، تم وہ کام کر گزرو گے جو دوسروں کے لیے ناممکن ہے۔''

میں نے پوچھا ''آپ جس گروہ پر کام کر رہے ہیں اس کی سرگرمیاں کس نوعیت کی ہیں؟''

''بہت ہی پراسرار نوعیت کی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''ان کے کام اور کردار کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ یہودیوں کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ اس گروہ کے تمام اراکین ہم میں سے ہیں، ہمارے ہی بھائی بند ہیں اس لیے عام لوگ ان کے درپردہ عزائم تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہ ان کے ظاہرہ مثبت اور تعمیری کاموں پر نظر رکھتے ہیں مگر میں کسی بہت بڑے طوفان کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں، میں نے کچھ شواہد بھی جمع کیے ہیں لیکن ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اگر تم میرے ساتھ مل کر کام کرو تو ہم بہت جلد کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہودی لابی بہت ہی مکاری اور عیاری دکھا رہی ہے۔''

''آپ نے جو شواہد جمع کیے ہیں اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ شہر میں دہشت گردی اور بدنظمی کی جو وارداتیں آئے دن سننے اور دیکھنے میں آرہی ہیں، اس کے پیچھے اسی گروہ کا ہاتھ ہے۔ وہ یہودیوں کے کسی نہایت ہی خاص مقصد کے لیے، ملک اور حکومت کو بدنام کرنے کے لیے اس قسم کی سنگین وارداتیں کرتے پھر رہے ہیں۔ انشاءاللہ بہت جلد میں اس گروہ کو بے نقاب کر کے ان کا کچا چٹھا کھول دوں گا۔ یہودیوں کے ناپاک عزائم بھی پورے نہیں ہو سکیں گے۔''

''ٹھیک ہے، اس موضوع پر فرصت سے بات کریں گے۔'' میں نے یہ کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔

اس کے بعد میں نے ساؤتھ کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر میں نے ائرپیس میں کبیر شاہ کی آواز سنی۔ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا ''تم کہاں رہ گئے بھئی؟''

اس کے سوال کے جواب میں، میں نے اب تک کی کارروائی کی مختصر کہانی سنائی جہاں اسے میرے کارناموں پر خوشی ہوئی، وہیں ساحل کے اغوا والے واقعے نے اسے شدید رنج بھی پہنچایا۔ اس نے مناسب الفاظ میں مجھے دلاسا دیا اور دشمنوں کے دانت کھٹے کرنے بلکہ دانت توڑنے کے عزائم کا اظہار کیا۔ میں نے اس کے اظہارِ خیال کے اختتام پر پوچھا ''شعیب صاحب آگئے ہیں نا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا ''میری ان سے بات کراؤ۔''

''شعیب صاحب اس وقت ساؤتھ میں نہیں ہیں۔''

''پھر کہاں ہیں؟''

''انہیں ایک ضروری کام کے سلسلے میں سینٹرل جانا پڑ گیا۔'' کبیر شاہ نے بتایا ''ایک گھنٹا پہلے وہ یہاں سے گئے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''سینٹرل میں ان سے رابطہ ہو سکتا ہے؟''

''آں..... ہاں.....'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا ''ہو تو سکتا ہے لیکن..... میں پہلے ان سے پوچھ لوں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ.....''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے، فی الحال رہنے دو شاہ جی۔ صبح دیکھیں گے۔'' میں نے گویا اس کی مشکل آسان کر دی۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' کبیر شاہ نے پوچھا۔

''سمجھ لو، ایک دوست کے پاس ہوں۔'' میں نے کہا ''اور محفوظ ہوں۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا ''رات میں اگر باس کا فون آ گیا تو میں انہیں تمہارے بارے میں تفصیلاً بتا دوں گا۔ تم صبح سیدھے ساؤتھ چلے آؤ۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر ریسیور کو کریڈل کر دیا۔

میرے مرحوم دوست امتیاز کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ کراچی کے پانچ اضلاع میں شعیب غوری نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے جو انہی اضلاع کے نام سے منسوب تھے۔ ''ساؤتھ'' اور ''ایسٹ'' میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایسٹ والا ٹھکانا ہل پارک کے نزدیک تھا اور ''ساؤتھ'' ڈیفنس میں پارک والی مسجد کے قریب۔ ''سینٹرل'' نارتھ ناظم آباد میں تھا۔ ''ویسٹ'' اور ''ملیر'' کے بارے میں میری معلومات صفر کے برابر تھیں۔ یعنی ان ٹھکانوں کے بارے میں!

کبیر شاہ عرف شاہ جی ساؤتھ کا قائم مقام تھا اور اس کی تنظیمی مجبوریوں کو میں بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ اسی بنا پر میں نے اس سے زیادہ جرح، کرید یا اصرار نہیں کیا۔ میں کیے بعد دیگرے اسی ٹیلی فونک گفتگو سے فارغ ہوا ہی تھا کہ لیلیٰ بیڈروم میں داخل ہوئی۔ وہ ابھی تک اسی پیازی رنگ کے لباس میں تھی۔

اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس دیکھ کر میں سمجھ گیا، وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میرے نزدیک آ کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ فرسٹ ایڈ باکس کو اس نے سائیڈ میں رکھ دیا۔ میں بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں ایک والہانہ نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ میں کوئی بجلی بھری تھی۔ مجھے اپنے تن بدن میں ایک سنسنی سی اترتی محسوس ہوئی۔ وہ میری کیفیت کو تاڑتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی اور تبسم ریز انداز میں متفسر ہوئی۔

''اگر تم ٹیلی فون سے فارغ ہو چکے ہو تو میں اپنا کام شروع کروں؟''

میں نے کہا ''ٹیلی فونک معاملات سے تو میں نمٹ چکا ہوں مگر تم کون سا کام شروع کرنے والی ہو؟''

جواب دینے کے بجائے اس نے فرسٹ ایڈ باکس کو تھپتھپایا اور مخصوص انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں کلیوں کے چٹخنے کا تاثر پایا جاتا تھا۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ میں نے پوچھا ''کیا تم ڈاکٹر ہو؟''

''ڈاکٹر تو نہیں ہوں مگر تمہاری مشکل کو بہ آسانی حل کر سکتی ہوں۔'' اس نے فرسٹ ایڈ باکس کو کھولتے ہوئے کہا ''ویسے کسی زمانے میں، میں نے نرسنگ کا کورس بھی کیا تھا۔''

میں نے اپنا گھائل بازو اس کے سامنے رکھ دیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے پوچھا ''میرا ذہن تمہارے بارے میں سیکڑوں سوالات تیار کر چکا ہے۔ تمہاری ان مہربانیوں کو میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ تمہاری ہر ہر ادا، ہر ہر ردعمل سیکڑوں ہزاروں سوالات کو جنم دیتا ہے۔''

''فی الحال تم اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔ تمہارے ہر سوال کا منطقی جواب تمہیں مل جائے گا۔'' وہ میرے زخمی کندھے کا معائنہ کرتے ہوئے بولی ''تم اطمینان سے ایک مہربان، قدر دان دوست کی مہربانیوں سے استفادہ کرو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

اس کے بعد میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ تھوڑی دیر کے معائنے کے بعد اس نے بتایا ''شکر کرو، گولی تمہارے کندھے کا گوشت پھاڑتے ہوئے گزر گئی۔ اگر وہ کندھے کے اندر گھس کر بیٹھ جاتی تو پھر آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس صورت میں ہڈی کو بھی شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ بہرحال'' اس نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بولی ''تم اپنی شرٹ اتار دو، تاکہ میں بہ آسانی تمہاری مرہم پٹی کر سکوں۔''

میں ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ گولی میرے کندھے کے اندر دھنسی ہوئی ہے۔ دراصل پچھلے دو گھنٹے میں، میں جن جان لیوا اور سنسنی خیز حالات سے گزرا تھا ان میں، میں صحیح طور پر اپنے گھائل کندھے کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ مجھے اتنا موقع اور فرصت میسر نہیں آئی تھی کہ میں کندھے کا معائنہ کر سکوں۔ کشمیر روڈ والے بنگلے پر جب میں نے اپنے بائیں کندھے میں آگ سی اترتی محسوس کی تھی تو یہی سمجھا کہ چھت سے ری باؤنڈ ہو کر کوئی گولی میرے کندھے میں گھس گئی ہے۔ لیلیٰ کی اطلاع میرے لیے خاصی حوصلہ افزا تھی۔ گولی میرے کندھے سے ''بغل گیر'' ہو کر رخصت ہو گئی تو اس میں میرا ہی فائدہ تھا ورنہ اگر وہ وہاں ''سکونت'' اختیار کر لیتی تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔ پہلے ہی کچھ کم مصیبتیں کھڑی تھیں جو ایک کا مزید اضافہ ہو جاتا!

میں نے لیلیٰ کی ہدایت پر اپنی خون آلود شرٹ اتار دی۔ وہ بڑے انہماک سے میرے کندھے کی ''خاطر داری'' میں مصروف ہو گئی۔ اس کی کارروائی کے دوران میں، میں اپنے کندھے میں خاصا درد محسوس کر رہا تھا۔ بعض اوقات تو میں ناقابلِ برداشت حد کو چھونے لگتی مگر میں اپنے دانتوں پر دانت جمائے وہ تکلیف سہتا رہا۔ آدھے گھنٹے کی ڈاکٹری کے بعد لیلیٰ نے اپنے کام سے فارغ ہو کر فرسٹ ایڈ باکس بند کر دیا پھر کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہاری خون آلود شرٹ تو میں نے اتروا دی لیکن میں

...ہو رہی ہوں، تمہاری پتلون کی حالت بھی خاصی ناگفتہ بہ ...'' پھر اس نے بیڈروم کے اٹیچڈ واش روم کی جانب ...ارہ کیا اور بولی ''وہاں ایک نیو برانڈ سلیپنگ سوٹ ٹنگا ہے۔ ...فریش ہو کر وہ لباس پہن لو۔ میں تمہارے لیے پین کلر دوا ...لے کر آتی ہوں۔''

پھر اس سے پہلے کہ میں بیڈ سے اٹھ کر کھڑا ہوتا، وہ ...سٹ ایڈ باکس اٹھا کر بیڈروم سے نکل گئی۔ میں اس مہربان ...ی دوست کے بارے میں سوچتے ہوئے واش روم میں ...س گیا۔ وہ ایک معما ثابت ہو رہی تھی۔ سوچنے سے مزید ...ہ جاتی تھی۔

واش روم میں ایک نیا نکور سلیپنگ سوٹ موجود تھا۔ وہ ...ٹ مردانہ تھا جس سے ظاہر ہوا، اس بنگلے میں لیلیٰ کے علاوہ ...ئی مرد بھی رہتا تھا لیکن میں جب سے اس بنگلے میں آیا تھا ...لیٰ کے سوا کسی کو دیکھا تھا اور نہ ہی سنا تھا۔ اس سلیپنگ سوٹ یا ...ر کے بارے میں لیلیٰ ہی کوئی وضاحت کر سکتی تھی۔

دس منٹ کے بعد میں تر و تازہ ہو کر واش روم سے نکل ...یا۔ لیلیٰ بیڈروم میں موجود تھی اور بیڈ شیٹ کو درست کر رہی ...ی۔ ایک ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے بستر کی ...ر کو بدل دیا تھا۔ میرے زخمی کندھے نے پہلے والی چادر کو جا ...داغ دار کر دیا تھا۔

کمرے میں میری موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے لیلیٰ ...نے کہا ''دراصل وہ شیٹ خاصی خراب ہو گئی تھی۔ میں نے نئی ...ٹ بچھا دی ہے۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں ابھی آتی ...ں۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ میری بات سنے بغیر ایک مرتبہ ...ر کمرے سے نکل گئی۔ میں بستر کی اجلی مخملیں چادر پر نیم دراز ...کر خود کو پیش آنے والے حالات و واقعات کے بارے میں ...چنے لگا۔ میرے لیے یہ لمحات موت اور زندگی کے کھیل میں ...رے تھے اور خالد بن ولید روڈ پر تو موت مجھ سے چند انچ ...دوری پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ اگر وہ محسن سفید بلی میرے ...موں میں نہ کسمساتی تو میں بے اختیار بریک لگانے پر مجبور ...ہوتا۔ میرا وہ عمل غیر ارادی اور اچانک تھا جس نے مجھے ...ت کے منہ میں جانے سے بچا لیا تھا..... اور اس عمل کا محرک ...بب وہ سفید بلی تھی۔ گویا اس مرحلے پر سفید بلی نے مجھے ...ت کے جبڑوں سے کھینچ کر نکالا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ ...ر بیٹھ گیا۔

میرا ذہن تیزی سے اس دست گیر بلی کے بارے میں ...چنے لگا۔ میں کافی دیر سے اس بلی کو بھولا بیٹھا تھا۔ کیوں؟ یہ خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک اس بلی کی یاد نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ جب میں لال قلعہ کے پہلو میں میراں محمد شاہ روڈ پر مڑا تھا تو وہ بلی میری شیرڈ کی پسنجرز سیٹ پر بے نیازی سے بیٹھی اپنا سر کھجا رہی تھی۔ اس کے بعد پولیس والوں سے آنکھ مچولی کے دوران میں میرا دھیان اس طرف سے ہٹ گیا تھا اور اب..... وہ اچانک ہی میری سوچ کا مرکز بن گئی تھی۔ میں اس بلی کے بارے میں پریشان ہو گیا۔

میں نے سوچا، لیلیٰ سے اس سفید بلی کے بارے میں پوچھوں گا۔ شیرڈ سے نکل کر میں لیلیٰ کے ساتھ ہی اس بیڈروم تک پہنچا تھا۔ اس بلی سے متعلق وہی مجھے کوئی تسلی بخش بات بتا سکتی تھی۔ میں بے چینی سے لیلیٰ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

میرا یہ انتظار جلد ہی ختم ہو گیا۔ لیلیٰ ایک بدلے ہوئے روپ کے ساتھ بیڈروم میں داخل ہوئی۔ اس نے گلابی رنگ کی نائٹی پہن رکھی تھی جس کا کپڑا بہت نفیس اور مہین تھا۔ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں والی صورت حال تھی۔ اس حریری لباس میں وہ کسی قیامت سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ ملکوتی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بڑی سبک خرامی سے میری جانب بڑھ رہی تھی۔ ہاتھ میں اس نے ایک قیمتی طشتری اٹھا رکھی تھی جس پر ایک بلوری گلاس دکھائی دے رہا تھا۔ اس گلاس میں مشروب ٹائپ کوئی شے نظر آ رہی تھی جس کا رنگ کندنی تھا۔

میرے پاس آ کر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی طشتری آگے بڑھائی پھر بڑے دل آویز انداز میں بولی ''یہ پی لو۔ اس سے تمہارے زخم کی تکلیف جاتی رہے گی اور انفیکشن کا بھی کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔''

''مگر تم تو کوئی پین کلر میڈیسن لینے گئی تھیں۔!'' میں نے اس کے سراپا سے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔ اس پر نظر ٹکائے رکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

وہ دل بریں لہجے میں بولی ''اس مشروب کو تم پین کلر ہی سمجھو۔ یہ تمہاری تمام تکالیف دور کرنے کے ساتھ ساتھ تمہارے دل و دماغ اور جسم کو تقویت بھی دے گا۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ بلوری گلاس اٹھایا اور اس میں موجود کندنی مشروب کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔ وہ مشروب انتہائی شیریں، خوش ذائقہ اور خوشبودار تھا۔ مجھے اپنے جسم و جان میں ایک سکون بخش ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہوئی۔ اس ٹھنڈک میں ایک ناقابل فہم سی آنچ بھی شامل تھی۔ شاید میں اس کیفیت کو صحیح طور پر بیان نہیں کر پا رہا۔ وہ مشروب اتنا پُر اثر تھا کہ میری قوتِ بیان کو بھی متاثر کر رہا تھا۔

میں اس کی کیف آوری کو بہ خوبی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے مزید دو گھونٹ لینے کے بعد پوچھا ''کیا یہ مشروب بازار میں عام فروخت ہوتا ہے؟'' میری آواز میں سرور کی آمیزش تھی۔

جواب دینے سے پہلے وہ مخصوص انداز میں مسکرائی پھر نفی میں گردن کو جنبش دیتے ہوئے بولی ''یہ مشروب تمہیں پوری مارکیٹ میں نہیں ملے گا کیوں کہ اسے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔ دنیا کا کوئی مشروب اس سے زیادہ فرحت بخش نہیں ہوسکتا۔''

''وہ تو میں محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور گلاس میں بچے ہوئے مشروب کو ایک ہی بڑے گھونٹ سے اپنے اندر اتار لیا۔ اس کے بعد میں نے خالی گلاس کو واپس طشتری میں رکھتے ہوئے پوچھا ''اس ہوم میڈ مشروب کا تم نے کوئی نام تو رکھا ہوگا؟''

وہ ہاں میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''اس کا نام جامِ اُمید رکھا ہے لیکن یہ نام صرف مجھ تک محدود ہے یا پھر میں تمہیں بتا رہی ہوں۔''

''اچھا ہے..... بہت اچھا ہے۔'' میں نے گلابی نائٹی کے اندر جھلملاتی ہوئی لیلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''بے مثال..... لاجواب ہے..... باکمال ہے۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ''تم اس مشروب کے نام کی تعریف کر رہے ہو یا میری؟''

اس کا یہ پُرمعنی سوال برمحل تھا۔ میں اس وقت بے ساختہ اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا ''دونوں کی۔''

وہ میرے بیڈ کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھی تھی، کرسی کو بیڈ کے مزید قریب کرنے کے بعد اس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے ایک نرم سی گرماہٹ اپنے سر میں اترتی محسوس ہوئی۔ اس گرماہٹ میں لذتِ حیات شامل تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔ میری آواز میں خمار شامل تھا۔

''نرسنگ۔'' اس نے یک لفظی جواب دیا۔

''نرسنگ!'' میں نے حیرت سے دہرایا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''آپریشن کے بعد آپریٹیڈ باڈی کو ریکوری روم میں رکھا جاتا ہے۔ جب متعلقہ شخص ہوش میں آجاتا ہے تو اسے روم یا وارڈ میں شفٹ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد نرسنگ شروع ہوجاتی ہے۔'' اس نے تھوڑا توقف کر کے میری آنکھوں میں جھانکا پھر سلسلۂ کلام کو اپنی مخصوص مسکراہٹ کی آمیزش سے جاری رکھتے ہوئے بولی ''تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہارے کندھے کی ہلکی پھلکی سرجری کی ہے۔ چوں کہ اس عمل کے دوران میں تمہیں بے ہوش نہیں کیا گیا۔ اس لیے ریکوری روم میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت تم براہِ راست اپنے بیڈ پر ''منتقل'' کیے جاچکے ہو لہٰذا نرسنگ کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔''

بات ختم کرتے ہی وہ کرسی سے اٹھی اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر ہولے ہولے میرا سر دبانے لگی۔ اس کی سانولی ہتھیلی کی حرارت بخش گداز میرے تن میں اترنے لگا۔ میں بھول گیا کہ اس سے سفید بلی کے بارے میں استفسار کرنا تھا۔ اس وقت میں پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا۔ وہ ''نرسنگ'' کے دوران میں مجھے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کے بیان میں اتنی کشش تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی میرا دھیان اسے چھوڑ کر کہیں ادھر ادھر بھٹکنے کے لیے نہ جاسکا۔ وہ دلنشین آواز میں کہہ رہی تھی۔ میں ہمہ تن گوش سن رہا تھا۔

''میں ایک ممتاز سیاست داں کی بیوہ ہوں۔ ایک سال پہلے میرے شوہر سعید خان کا انتقال ہوگیا تھا۔ سعید خان میرے لیے اتنا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوا کہ مجھے معاش کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بنگلا، گاڑی اور بینک بیلنس، سب کچھ ہے میرے پاس۔ میں نے مختلف جگہوں پر بہت بھاری اور محفوظ انوسٹمنٹ کر رکھی ہے جس سے مجھے لگ بھگ تین لاکھ روپے ماہانہ پرافٹ مل جاتا ہے۔ یہ رقم میرے پورے مہینے کے اخراجات کے لیے بہت کافی ہوتی ہے۔''

میں نے پرافٹ کی رقم پر حیرت کا اظہار کیا اور کہا ''تمہارا شوہر تو جاتے جاتے تمہیں ہر معاشی اور مالی غم سے آزاد کر گیا لیکن تم جو کچھ کر رہی ہو کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟ اس وقت تمہارے مرحوم شوہر کی روح کو کس قدر اذیت پہنچ رہی ہوگی!''

میں نے الفاظ ''جو کچھ'' پر زور دیا تھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی ''تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ سب کچھ پہلی اور آخری مرتبہ ہے۔''

''پہلی مرتبہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔'' میں نے کہا ''آخری مرتبہ کیوں کر؟''

وہ قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولی ''اب ضروری نہیں کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔ کچھ ان کہی اور ان سنی بھی رہنے دو۔''

بات ختم کرتے ہی وہ مجھ سے صفرانچ کے فاصلے پر آگئی۔ نا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کوشش میں ی کامیابی ہوئی۔ میں آنکھیں نیم وا کر کے رہ گیا۔ اس م امید نامی مشروب کے اثرات اب کھل کر سامنے آگئے ے۔ یقیناً اس میں درد کش اجزا کے ساتھ ساتھ کچھ مسکن اشیا ں شامل کی گئی تھیں۔ مجھے خمار کی سی کیفیت محسوس ہوئی لیکن دوران میں لیلیٰ اپنا رنگ دکھا چکی تھی۔

سیاہ رات، دن کے اجالے کو نگل جاتی ہے۔ لیلیٰ کے ولے پن میں سرے ایسی جاذبیت تھی۔ میں سرے کی اس ان میں بھٹک کر رہ گیا۔ وہ کسی سیاہ ریشمی تھان کی طرح مجھ لتی اور مجھے کھولتی چلی گئی۔ احتیاط اور تکلف کے سارے بند ہوئے تو میں بے خودی اور خود فراموشی کی منزل پر کھڑا تھا۔

☆☆☆

علی الصباح میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ایک طویل ڑائی لیتے ہوئے بدن کو کھینچا اور گہری سانس لیتے ہوئے ری ں ہوگیا۔ میرا جسم پھول کی طرح ہلکا محسوس ہو رہا تھا زشتہ ساری کلفت، الفت میں بدل گئی تھی لیکن اب وہ یفیت جاتی رہی تھی۔ میں ٹرانس اور بے خودی کی حالت سے ا آیا تھا۔ جب میرے حواس بہ جا ہوئے تو میں نے خود کو یقت کی اذیت ناک دنیا میں پایا۔ مجھے درپیش حالات رہ کرستانے لگے۔ ساحل کی یاد ایک کسک بن کر میرے دل ا جاگزیں ہوچکی تھی۔ اس کی جدائی نے میرے جگر میں جو لاؤ ڈالا تھا۔ وہ زمانے کی کسی بھی شے سے بھر نہیں سکتا تھا۔ ا کی، اس کجی اور اس خلا کو صرف اور صرف ساحل کی ذات ر کرسکتی تھی۔

گزشتہ رات کے ''واقعات'' کے بارے میں سوچتے ے مجھے خود پر حیرت ہونے لگی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ا ن منازل سے گزر گیا! پھر میری یہ حیرت افسوس میں لنے لگی۔ وہ سب کچھ غیر ارادی طور پر محسوس ہوگیا تھا۔ پتا ں، لیلیٰ نے مجھے کیسا طلسمی مشروب پلایا تھا کہ میں بے چون ا اس کے اشاروں پر عمل کرتا گیا، اس کے کنایوں کو سمجھتا ا اور اس کی اداؤں کو محسوس کرتا گیا۔

پھر مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ تھوڑی دیر قبل تو حیرت ں میں بدلی تھی۔ اب یہی افسوس، پشیمانی کی شکل اختیار کر ا۔ مجھے اپنے عمل پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ اس شرمندگی ثلت پکڑی تو میں لیلیٰ کے بارے میں سوچنے لگا جس کے یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔ اگرچہ میں بھی برابر کا حصے دار تھا، ر کی ذمے دار وہی تھی۔

لیلیٰ کے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے اپنے پہلو میں دیکھا۔ وہ آسودگی کی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا بے ترتیب بدن کسی زیرِ مرمت گاڑی کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہلکے سبز رنگ کی بیڈ شیٹ پر پنک نائٹی میں وہ اینٹی منی مائن (ANTI MONY MINE) کسی کھلتے ہوئے گلاب کا منظر تخلیق کر رہی تھی۔

میں اس کی آسودگی میں مخل ہوئے بغیر بہ آہستگی کنارِ شوق سے اُٹھ آیا۔ واش روم میں ایک حیرت میری منتظر تھی۔ اپنے خون آلود لباس پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا اور چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اب وہ لباس بے داغ، صاف اور استری شدہ دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں نے گزشتہ رات سلیپنگ سوٹ پہنتے ہوئے اپنی پتلون اور شرٹ کھونٹی پر لٹکائی تھی اور ان کی حالت خراب ہو رہی تھی مگر یہی پتلون اور شرٹ اب ہینگر پر سجی تھیں اور لگتا تھا، جیسے ابھی ابھی کسی نفیس لانڈری سے دھل کر آئی ہوں۔

فریش ہو کر لباس پہننے کے دوران میں، میں مسلسل لیلیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ ہمارے دونوں کے سوا اس بنگلے میں اور کوئی نہیں تھا۔ اگر میں نے اپنے آلودہ لباس کو صاف نہیں کیا تھا تو پھر یہ کارنامہ لیلیٰ ہی کا ہوسکتا تھا۔ آج کل جدید قسم کی واشنگ مشینز آگئی ہیں۔ جن میں دھونے، سکھانے اور استری کرنے کی سہولت موجود ہوتی ہے۔ اس کا مطلب تھا، میری نیند کے دوران میں لیلیٰ نے میرے لباس کو بھی ''فریش اپ'' کر دیا تھا۔ وہ بڑی حیرت انگیز اور پراسرار ہستی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اپنے عمل سے میری یادداشت میں نقش ہوتی چلی جا رہی تھی۔

میں تازہ دم ہو کر واش روم سے نکلا تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ لیلیٰ بستر پر موجود نہیں تھی۔ اس کی جگہ ہلکی سبز بیڈ شیٹ پر ایک ننھا سا موبے کا پھول نظر آرہا تھا۔ مجھے اپنے وجود میں سنسناہٹ سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی کیوں کہ اس لمحے موبے کے پھول میں حرکت پیدا ہوئی تھی پھر وہ ''پھول'' میری جانب دیکھ کر مسکرایا، اس نے اپنے حلق سے مخصوص آواز خارج کی اور اچھل کر بیڈ سے نیچے اتر آیا۔

''میاؤں'' کی تیز آواز نے میرے جسم و جان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ موبے کا پھول نظر آنے والی وہ سفید بلی پلک جھپکتے میں بیڈ روم سے نکل گئی۔

اب میں اس آفت کی پرکالہ، شیر کی خالہ کا صورت آشنا ہو چکا تھا۔ ویسے تو تمام بلیوں کی شکلیں آپس میں ملتی جلتی ہوتی ہیں لیکن مجھے یقین ہے، میں اس سفید بلی کو ہزاروں لاکھوں

بلیوں میں بھی الگ شناخت کر سکتا ہوں۔ اس نے مجھ پر جو احسانات کیے تھے انہیں فراموش کرنا ممکن نہیں تھا..... لیکن یہ گزشتہ رات کہاں غائب ہوگئی تھی؟

میں رات لیلیٰ سے اس بلی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر لیلیٰ اور کچھ جام اُمید کی اثر پذیری نے اس کا موقع نہیں دیا۔ ابھی بلی کو دیکھ کر یہ تو تسلی ہوگئی کہ وہ بنگلے ہی میں موجود ہے..... مگر لیلیٰ کہاں چلی گئی! تھوڑی دیر پہلے تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

لیلیٰ کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے، وہ کسی دوسرے واش روم میں ہو۔ میں نے ڈریسنگ کے سامنے پہنچ کر اپنے بال سنوارے پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر میں نے اپنے جوگرز پہنے اور لیلیٰ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

جب اس انتظار نے طول پکڑا تو مجھے وحشت ہونے لگی۔ اب تک لیلیٰ کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ باہر اب اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ ایک گھنٹا گزرنے کے بعد بھی جب مجھے لیلیٰ کی صورت دکھائی نہ دی تو میں بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ اس تلاش کے دوران میں، میں مسلسل لیلیٰ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں نے آئندہ پندرہ منٹ میں اس بنگلے کا ایک ایک کمرا، ایک ایک واش روم اور ایک ایک کونا جھانک لیا لیکن لیلیٰ کہیں نظر آئی اور نہ ہی اس کا کوئی آثار دکھائی دیا۔ لگتا تھا، وہ جیسے یہاں آئی ہی نہ ہو، یہاں رہی ہی نہ ہو۔ یہاں اس کی موجودگی کا کوئی نشان ڈھونڈنے میں، میں ناکام رہا۔

میں واپس اسی بیڈروم میں آیا جہاں شب بسری کا مجھے موقع ملا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر اس اسرار اور طلسم کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں جوں جوں سوچتا جا رہا تھا، میرا تجسس اور الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ لیلیٰ کا سابق سلوک اور موجودہ رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ ایک بھارت کی طرح میری زندگی میں داخل ہوئی، ایک یادگار لحاظی رفاقت کا تحفہ دے کر کسی پہیلی کے مانند غیر حل شدہ ہوگئی تھی۔ میں سرِ دست اسے حل کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اسم بامسمّیٰ ثابت ہو رہی تھی۔ لیلیٰ..... سیاہ رات کی پہلی کرن کے ساتھ ہی رخصت ہوگئی۔

یہی سب سوچتے اور الجھتے ہوئے بے اختیار میرا ہاتھ اپنے زخمی کندھے پر چلا گیا اور میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ گھائل کندھے پر پٹی موجود تھی، یہ تو میں تازہ دم ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا مگر اب پٹی پر ہاتھ پڑتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میرا وہ کندھا دوسرے کندھے کی طرح انتہائی صحت مند ہو۔ درد اور تکلیف سے بے نیاز!

میں نے بے یقینی کی سی کیفیت میں گھائل کندھے کو ٹٹولا اور بار بار دبا کر دیکھا لیکن حقیقت بدل نہ سکی۔ مجھے وہاں ٹیسیں برابر تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ ناممکن تھا..... انتہائی ناممکن! میرا وہ کندھا گولی لگنے سے بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ مانا، لیلیٰ بہت اچھی نرس رہی ہوگی، اس نے نہایت مہارت سے میرا زخم صاف کر کے مرہم پٹی کی تھی مگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا، ایک ہی ڈریسنگ سے زخم بھر جائے۔ نہ صرف زخم بھر جائے بلکہ اس میں تکلیف کا احساس تک نہ رہے!

میرا ذہن تیز رفتاری سے ان واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے فوراً ڈریسنگ کے سامنے جا کر اپنی شرٹ اتار دی پھر کندھے پر بندھی پٹی کو کھولنے لگا۔ اس دوران میں، میں ''جامِ اُمید'' نامی اس حیرت انگیز اور سرور بخش مشروب کے بارے میں بھی سوچتا جا رہا تھا۔ لیلیٰ نے کندن رنگت والے اس مشروب کی بہت تعریف کی تھی۔ ممکن ہے، اس مشروب کے گہرے اثرات نے میرے کندھے کی تکلیف کو اُڑن چھو کر دیا ہو..... لیکن یہ کیا؟ کندھا پٹی کی بندش سے آزاد ہوا تو میں چونک اٹھا۔

ڈریسنگ کا آئینہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ آئینہ کہیں کا بھی ہو، وہ جھوٹ سے نا آشنا ہوتا ہے۔ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ میں جس آئینے کے سامنے کھڑا تھا اس کی راست گوئی نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ میں چند فٹ کے فاصلے پر آئینے میں اپنے بائیں کندھے کو دیکھ رہا تھا۔ پٹی کھل چکی تھی اور میرے اس کندھے پر زخم تو کیا، ایک خراش تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیا کوئی نرس یا کوئی ڈاکٹر اتنا صاحبِ کمال ہو سکتا ہے کہ ایک ہی پٹی سے زخم کا نام و نشان مٹا ڈالے؟ نہیں، ایسا صاحبِ کمال اور ہنر مند ڈاکٹر ممکن نہیں اور نہ ہی ایسا ہونا ممکن ہے کہ کوئی مرہم یا دوا اتنی زود اثر ہو کہ زخم کو چند گھنٹوں میں بھر کر اس کے آثار تک ناپید کر دے..... تو پھر یہ سب کیا تھا؟ میں کھلی آنکھوں سے جس حقیقت کو دیکھ رہا تھا اس سے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ اس بجلی کی چمک نے میرے خیالات میں ایک انتہائی خطرناک اور روانگٹے کھڑے کر دینے والے سوال کو اجاگر کر دیا۔ میں نے سوچا، کہیں یہ سب نیلگری کا کیا دھرا تو نہیں؟

اس سوال نے میرے پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ نیلگری بہت ہی پراسرار اور مہا شکتیوں کی مالک تھی۔ وہ بہت کچھ کرنے پر قادر تھی۔ گزشتہ رات جو کچھ ہوا، وہ تو اس کے لیے بائیں ہاتھ کا چٹکارا تھا۔ اس سے بڑے بڑے

کہ نیلگری ہی نے اسے اپنی کسی شکتی کے زیرِ اثر ''دخل در معقولات'' سے باز رکھا ہوگا۔ نیلگری ہزار ہا نادیدہ قوتوں کی مالک تھی اور جانور، خصوصاً بلی نادیدہ قوتوں اور ہوائی مخلوق کو بہت جلد دیکھ لیتی ہے۔

میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں گزشتہ رات میں نے اپنی شیر ڈکھڑی کی تھی۔ یہاں مجھے استعجاب کے ایک اور جھٹکے سے گزرنا پڑا۔ نیلی شیر ڈ وہاں سے غائب تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ کار پورچ میں بلیک ہونڈا سوک بھی موجود نہیں تھی۔ میں پریشانی کے عالم میں کھڑا شیر ڈ اور لیلیٰ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بنگلے کے گیٹ کے اوپر وہی سفید بلی نمودار ہوئی اور گیٹ کے ستون پر سے ہوتے ہوئے وہ باہر کود گئی۔ اس چھلانگ سے قبل اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے ایک خاص ادا سے ''میاؤں'' بھی کیا تھا۔

مجھے یوں لگا، وہ اس ''میاؤں'' کے ذریعے مجھے کوئی پیغام دے گئی ہو۔ رات اس گیٹ کو لیلیٰ نے بند کر کے بولٹ چڑھا دیا تھا۔ میں تیزی سے چلتے ہوئے گیٹ کے پاس آیا۔ گیٹ کی اندرونی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے دھکیل کر گیٹ کو کھولنا چاہا تو معلوم ہوا، وہ باہر سے بند ہے۔ اس کوشش کے دوران میں میری نگاہ بھٹک کر گیٹ کے درز سے باہر چلی گئی اور میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ گیٹ کے سامنے، باہر سڑک پر میری نیلی شیر ڈ کھڑی تھی۔

سفید بلی کا اشارہ میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ بند گیٹ کے باہر پہنچنے کا طریقہ مجھے بتا گئی تھی، گویا مجھے بھی دیوار پھاند کر یا اُچک کر گیٹ کے اس پار جانا تھا۔ میں نے اس محسن بلی کی خفیہ ہدایت پر عمل کیا اور اپنی شیر ڈ تک پہنچ گیا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے گیٹ کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہاں گیٹ کی کنڈی میں مجھے ایک بڑا سا تالا جھولتا نظر آیا۔ میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور میں نے ایک جھٹکے سے شیر ڈ آگے بڑھا دی۔

حیران ہونے کے لیے اتنا کچھ تھا کہ میں نے حیرت کا اظہار کرنا ہی چھوڑ دیا۔ گزشتہ رات اس بنگلے کا گیٹ کھلا دیکھ کر میرا وہاں داخل ہونا، لیلیٰ کی معیت میں بے چون و چرا اس کے بیڈروم میں پہنچنا، پھر وہاں پیش آنے والے واقعات..... میرے لباس کا صاف ستھرا ہو جانا، میرے کندھے کا زخم سرے سے غائب ہو جانا، سفید بلی کی حرکات و سکنات کا ساکت و جامد ہو جانا، لیلیٰ کا غیاب اور اب میری گاڑی کا بنگلے سے باہر پہنچ جانا، گیٹ کا باہر سے لاک ہونا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام ایسے

واقعات تھے جن کی کوئی عقلی توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ ماورائی اور روحانی ذیل میں یہ تمام ڈانڈے نیلگری سے جا ملتے تھے..... آہ نیلگری!

واپسی کے سفر کے دوران میں، میں نے شکایتی نظر سے سفید بلی کو دیکھا۔ وہ حسبِ معمول پسنجر سیٹ پر برا جمان مجھے ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میری نگاہ میں موجود شکایت کو اس نے محسوس کر لیا اور گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔

میں نے اس سے پوچھا ''ڈھائی ماہ پہلے اوپن ائر ریسٹورنٹ میں تم ہی میری میز کے نیچے سرسرا رہی تھیں نا؟''

''میاؤں'' اس نے یک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

''اور اسی رات بوٹ بیسن کے مقام پر ہمارے دشمن گن بردار پر بھی تمہی نے جست لگائی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

اس نے اپنے جواب کو دہرایا ''میاؤں۔''

میں نے سوال کیا ''گن بردار پر چھلانگ لگاتے وقت تمہاری جسامت میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ تم کسی صحت مند کتے کے جثے کو پہنچ گئی تھیں؟''

ایک مرتبہ پھر مجھے ''میاؤں'' سننے کو ملی۔

میں نے فلیٹ کے بیڈروم میں بیڈ کے اوپر اس کی موجودگی کا حوالہ دے کر سوال کیا اور اس نے ایک بار پھر ''میاؤں'' کی آواز نکالی۔

میں نے ایک منٹ تک خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا ''تم اس بات سے انکار تو نہیں کرو گی نا کہ جب ساحل اور ممتاز سی سائیڈ والے فلیٹ میں تنہا تھیں تو تم نے ایک سفید چیتے کا روپ دھار کر انہیں ڈرانے کی کوشش کی تھی؟''

یہ سوال بہت اہم تھا لیکن حسبِ سابق اس سفید بلی نے اس کا جواب بھی اپنی مخصوص ''میاؤں'' میں دیا تو میں جھلا کر رہ گیا۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ اس کی کون سی ''میاؤں'' کا مطلب ''ہاں'' ہے اور کس ''میاؤں'' کا مطلب ''نہ''۔ مجھے تو وہ تمام میاؤں ایک ہی جیسے لگ رہے تھے۔ کچھ بھی ہو، یہ بلی کوئی عام بلی نہیں تھی۔ اس نے اب تک دوستانہ رویے کا مظاہرہ کیا تھا، سوائے چیتے والے واقعے کے۔

ایک فوری خیال کے تحت میں چونک اٹھا۔ یہ خیال نیلگری کے بارے میں تھا۔ گزشتہ رات اس کی پُراسرار شکتیوں کے سبب سفید بلی بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ سفید چیتے والے واقعے میں بھی نیلگری ہی کا ہاتھ ہو؟ اگر ایسا تھا تو پھر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی کہ نیلگری نے ساحل اور ممتاز کے اغوا کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ نیلگری مجھے اپنی پراپرٹی بنا کر رکھنا چاہتی تھی اور میرے نزدیک آنے والی ہر عورت سے ایک مخصوص قسم کی دشمنی رکھتی تھی..... ساحل تو اس حوالے سے سرِفہرست تھی!

ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اپنے دل و دماغ پر بہت بوجھ محسوس ہوا۔ تارا کی باتوں سے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ساحل کی زندگی کو فی الفور کوئی خطرہ لاحق نہیں اور میں اس ''فی الفور'' کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اس تک پہنچنا اور اسے بحفاظت واپس لانا چاہتا تھا۔ سفید بلی کے بارے میں، میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک اس کا اسرار میری سمجھ میں نہیں آ جاتا، میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ خاص طور پر اس کی جسامت میں کمی بیشی والی مسٹری کو جاننا بہت ضروری تھا۔ وہ میرے قریب رہتی تو میں زیادہ بہتر طور پر اس کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔

میں نے ڈیفنس سوسائٹی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد سفید بلی کی جانب دیکھا اور سوال کیا ''کیا تم ہمیشہ میرے پاس رہ سکتی ہو؟''

ناقابلِ فہم اور رٹا رٹایا جواب موصول ہوا ''میاؤں۔''

میں نے ایک نیا تجربہ کیا ''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا، تم مستقل طور پر میرے ساتھ رہنے کے لیے آمادگی ظاہر کر رہی ہو چنانچہ اب ضروری ہو گیا ہے، میں تمہارے لیے کسی موزوں سے نام کا انتخاب بھی کر لوں۔ میں تمہاری طرح ''میاؤں'' کرنے سے تو رہا!''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے ''میاؤں'' نہیں کیا بلکہ منتظر نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میرے منہ سے اپنا مجوزہ نام سننے کا انتظار کر رہی ہو۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

''آج سے تمہارا نام ڈارلنگ ہے۔''

وہ مُسرت انداز میں دہانہ کھول کر بولی ''میاؤں!''

میں نے کہا ''ڈارلنگ! صرف ''میاؤں'' سے کام نہیں چلے گا۔ اگر تمہیں یہ نام پسند آیا ہے اور تم میری بات سمجھتی ہو تو تمہیں اس کا ثبوت دینا ہو گا۔''

وہ سنجیدہ ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔ وہ کسی سمجھ دار اور بردبار شخص کی طرح ہمہ تن گوش ہو گئی تھی جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ میری باتوں کو پوری طرح سمجھ رہی ہے۔

میں نے کہا ''ڈارلنگ! ثبوت کے طور پر تمہیں ابھی اور اسی وقت میری گود میں آنا ہو گا!''

میرا جملہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک منی سے

لگا کر میری آغوش میں پہنچ گئی پھر بڑے رومانٹک انداز میں منہ کے حلق سے آواز نکالی ''میاؤں!؟''

میں متعجب نگاہ سے اس عجوبۂ روزگار کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

''ساؤتھ'' میں کبیر شاہ سمیت سبھی نے مجھ سے افسوس کا اظہار کیا پھر کبیر شاہ اپنے ساتھ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا یہ وہی بیڈروم تھا جہاں کل کا بیشتر دن میں نے آرام کرتے ہوئے گزارا تھا۔ کبیر شاہ نے پہلے میرے لیے ناشتے کا بندوبست کیا۔ میں نے رسماً ہلکا پھلکا ناشتا کیا۔ دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے زہر مار کرتا رہا۔

ناشتے کے دوران میں کبیر شاہ نے کہا ''وجدان! تمہاری غیر موجودگی سے گزشتہ رات مجھے باس کی ڈانٹ سننا پڑی۔ اچھا ہوتا، اگر تم ہیڈ آفس میں تمہارا ان سے رابطہ کروا دیتا۔''

''ایسا کیا ہو گیا شاہ جی؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ بولا ''آدھی رات کے وقت باس کا فون آیا تھا۔ میں نے انہیں تمہارے اور تمہیں پیش آنے والے حالیہ واقعات کے بارے میں بتا دیا۔ وہ اس پر خاصے برہم ہوئے کہ میں نے ان سے تمہاری بات کیوں نہیں کروائی۔ خاص طور پر ساحل والے سانحے نے انہیں بہت دکھ پہنچایا ہے۔ وہ دس بجے تک یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اچھا ہوا، تم ان سے پہلے ہی آ گئے۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا ''تم نے بتایا تھا کہ اپنے کسی دوست کے پاس ہو مگر وہاں کا پتا اور ایڈریس نہیں بتایا تھا ورنہ میں رات ہی تم سے رابطہ کر لیتا۔'' اس کے لہجے میں معذرت شامل تھی۔

میں نے فراخ دلی سے کہا ''چلو، کوئی بات نہیں۔ میں شعیب سے تفصیلی ملاقات کر لوں گا۔'' پھر میں نے دیوارِ چاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اس وقت نو بجنے والے ہیں۔ شعیب کے آنے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ جب تک میں ضروری فون کر لوں۔''

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مجھے آرام کرنے کا کہہ کر بیڈروم سے نکل گیا۔

گزشتہ رات جب میں نے کبیر شاہ کو فون کر کے اپنے بارے میں آگاہ کیا تھا تو اس بات کا خیال رکھا تھا کہ واقعات یا تفصیل میں نہ جاؤں۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ چوہدری انڈسٹریل اینڈ کمپنی نے میری دوست ساحل کو اغوا کر لیا ہے اور میں ساحل کی تلاش میں پہلے گلشن اقبال والے بنگلے اور پھر کشمیر روڈ والے بنگلے پر زبردست مارا ماری کر کے اپنے دوست کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ میں نے اسے تارا کی موت کے بارے میں بھی بتا دیا تھا تاہم وہ اس حقیقت سے واقف نہیں تھا کہ ساحل کے ساتھ ممتاز نامی ایک لڑکی بھی اغوا ہوئی تھی اور یہ کہ کشمیر روڈ والے بنگلے پر میرے بائیں بازو میں کوئی گولی بھی لگی تھی۔

یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا اور میں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا ورنہ اگر کبیر شاہ میرا زخمی کندھا دیکھنے کی فرمائش کر بیٹھتا تو میرے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ میں جن ظلماتی اور ماورائی حالات سے گزرا تھا ان کی وضاحت یا توجیہ بہت مشکل تھی۔ میرے بیان کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا..... اور یہ کچھ غلط بھی نہ ہوتا!

گزشتہ رات لگ بھگ ساڑھے نو بجے میں نے ''نبی سر'' میں قاضی سلطان سے بات کی تھی۔ اس بات کو تقریباً بارہ گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ اتنے وقت میں کراچی سے عمر کوٹ جا کر واپس بھی آیا جا سکتا تھا، اس کا مطلب یہی تھا، ممتاز کو وہاں پہنچایا جا چکا ہو گا۔ اس سلسلے میں قاضی سلطان نے بیٹی کے حصول کے لیے کیا ''بندوبست'' کیا تھا یہ اسی سے معلوم کیا جا سکتا تھا۔

میں نے نبی سر میں قاضی سلطان سے حویلی میں رابطہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں قاضی سے ہمکلام تھا۔ اس نے رسمی علیک سلیک کے بعد بڑے پُرجوش انداز میں میرا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اس نے اپنے ایس پی سالے اور پولیس کی بھاری جمعیت کے تعاون سے ممتاز کو اغوا کنندگان کے قبضے سے آزاد کرا لیا ہے۔ کراچی سے عمر کوٹ کی طرف جانے والے راستے کی ناکا بندی کر کے پولیس نے بہت خطرناک آپریشن کیا تھا جس کا نتیجہ کامیابی کی صورت میں برآمد ہوا۔ ممتاز واپس اپنے والدین کے پاس پہنچ چکی تھی۔

قاضی سلطان مجھے اس کارروائی کی تفصیل سنانا چاہتا تھا جو یقیناً بہت ہی سنسنی خیز ہوتی لیکن فی الحال میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ ممتاز بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔ میں نے قاضی سے کہا۔

''انشاءاللہ بہت جلد ہماری ملاقات ہو گی پھر میں آپ سے یہ تفصیل سنوں گا۔ فی الحال آپ ممتاز کا خیال رکھیں۔ وہ بڑے اذیت ناک لمحات سے گزر کر آپ کے پاس پہنچی ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' قاضی نے تائید کی ''وہ بہت سہمی ہوئی ہے۔ تمہارا ایک مرتبہ پھر تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ دوسری مرتبہ ہے، جب تم نے ممتاز کو بچایا

ہے۔'' پھر اسے کچھ یاد آ گیا، پوچھنے لگا ''ساحل کا کچھ سراغ وغیرہ ملا؟''

میں نے کہا ''ساحل میرے جانے پہچانے دشمنوں کے پاس ہے۔ تارا نے اپنی موت سے قبل اسے زاہد حسین نامی ایک شخص کے حوالے کر دیا تھا۔ میاں زاہد حسین، چوہدری نوازش علی کا خاص آدمی ہے جو کراچی میں اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کرتا ہے۔ میں بہت جلد میاں زاہد کے سر پر عتاب بن کر نازل ہونے والا ہوں..... بہت جلد!''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں سنگین اور سفاکی در آئی۔ قاضی سلطان نے کہا۔ ''میں نے گزشتہ رات ہی منہاس باقر کو یہ خوش خبری سنا دی تھی۔ تمہارا کوئی رابطہ نمبر میرے پاس نہیں تھا اس لیے تمہیں فون نہ کر سکا بعد میں منہاس باقر سے تمہارے فلیٹ کا جو فون نمبر مجھے مل سکا، میں نے اس پر فون کیا لیکن وہاں سے کسی ردِعمل کا اظہار نہ ہوا۔ بہرحال، میں ایک مرتبہ پھر تمہارے اس تعاون کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

''آپ مجھے بار بار شرمندہ نہ کریں۔'' میں نے کہا ''ملاقات ہونے پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔''

پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔ ممتاز کی بازیابی سے مجھے دلی سکون حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساحل کا تصور بھی ابھر آیا۔ ممتاز کی واپسی نے ساحل کی یاد دلا دی تھی۔ وہ دونوں کل سہ پہر بہاد آباد چورنگی سے اغوا ہوئی تھیں۔ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے ایک کو برآمد کر لیا گیا مگر دوسری ابھی تک مفقود الخبر تھی۔ اس خیال نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ میں دکھی دل سے ساحل اور اس کی سلامت واپسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

تارا نے اپنی موت سے قبل مجھ سے جو مکالمہ بازی کی تھی اس میں تو چوہدری نوازش علی کی طرف سے یہی مطالبہ دہرایا گیا تھا، اگر میں ڈائری کے وہ دو قیمتی صفحات ان کے حوالے کر دوں تو وہ میری ساحل کو میرے سپرد کر دیں گے۔ تارا نے باقاعدہ مجھ سے وہ صفحات مانگے تھے۔ اس کا تقاضا ظاہر کرتا تھا، وہ لوگ مجھ سے ہر صورت میں وہ صفحات نکلوانا چاہتے ہیں۔ تارا اب باقی نہیں رہا تھا چنانچہ لامحالہ یہ کام اب میاں زاہد حسین کو کرنا تھا اور اس لیے یقیناً وہ مجھ سے رابطہ کرتا۔ رابطے کے بغیر بات نہیں بن سکتی تھی۔ چوہدری نوازش علی پچیس کروڑ روپے مالیت کے سونے کو ہر طور حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس حصول کے لیے وہ قیمتی صفحات ازحد ضروری تھے..... گویا میاں زاہد حسین نے ہر صورت مجھ سے رابطہ کرنا تھا اور اس سے پہلے اسے میرا سراغ لگانا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت ساحل کے بارے میں اگر کوئی شخص مجھے درست معلومات فراہم کر سکتا تھا تو وہ میاں زاہد حسین کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میاں زاہد کراچی کے نیٹ ورک کو آپریٹ کر رہا تھا۔ تارا نے اغوا کے بعد دونوں لڑکیوں کو میاں زاہد کی تحویل میں دیا تھا۔ اسی نے ممتاز کو وڈیرا اکبر سومرو کی حویلی میں پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔ ساحل کے بارے میں بھی اسی کو قدم اٹھانا تھا۔ تارا مجھے یہ بتا چکا تھا کہ ساحل کو بالآخر چوہدری نوازش کی حویلی واقع موضع رکھاں والی میں پہنچا دیا جائے گا لیکن اس کے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ مجھ سے ڈائری کے صفحات حاصل کرنے کی مہم کے دوران میں وہ لوگ ساحل کو کراچی کی حدود سے باہر نہیں لے جائیں گے۔ مجھے جو بھی تگ و دو کرنا تھی، فوراً سے پیشتر کرنا تھی..... اور اس سلسلے میں، میں نے پہلی فرصت میں ایک ہنگامی فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا، میاں زاہد حسین کا بے دریغ تعاقب کرنے کے بجائے میں اسے اپنے قریب آنے کا موقع دوں گا۔ کس طرح؟ اس بارے میں، میں مسلسل سوچ بچار کرنے لگا۔

ٹھیک دس بجے مجھے اطلاع ملی کہ شعیب غوری ساؤتھ میں داخل ہو چکا ہے۔ آئندہ پندرہ منٹ بعد میں شعیب کے ساتھ ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں بند ہو گیا۔ ہمارے درمیان واجبی سی ''ہیلو ہائے'' ہوئی۔ اس نے ساحل والے واقعے پر گہرے رنج کا اظہار کیا اور مجھے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد ساحل کو ڈھونڈ نکالے گا بلکہ اس نے بتایا کہ رات ہی اس نے اس سلسلے میں کچھ پیش رفت بھی کر ڈالی ہے جس کے نتیجے میں وہ میاں زاہد کے ایک ایسے ٹھکانے کا پتا چلانے میں کامیاب ہو گیا ہے جس کے بارے میں اس کی تنظیم کے بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اس سے پہلے میں نے ممتاز اور ساحل کے اغوا سے لے کر تارا کی موت تک کے تمام واقعات تفصیل سے شعیب کو سنا دیے تھے۔ کے ڈی اے اسکیم نمبر دو کے بنگلے اور لیلیٰ کا قصہ میں نے دانستہ گول کر دیا۔ مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا ورنہ مجھے بہت سی باتوں کی وضاحت کرنا پڑتی اور قصہ بہت دور تک جا پہنچتا۔

شعیب نے کہا ''وجدان! میرے غیاب میں تم جن المناک حالات سے گزرے ہو ان کا مجھے پوری طرح احساس ہے اور انشاءاللہ میں اس سلسلے میں تمہاری بھرپور مدد بھی کروں گا۔ تمہارے بیان سے میں نے اندازہ لگایا ہے، تمہارے دشمن چند روز تک ساحل کو کراچی ہی میں رکھیں گے۔ میاں زاہد حسین ڈائری کے دو قیمتی صفحات حاصل کرنے کے لیے

تمہیں ضرور رنج کرے گا۔ وہ صفحات جو تم میرے حوالے کر چکے ہو۔''

میں توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا، چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا ''میں سب سے پہلے میاں زاہد کے اس خفیہ ٹھکانے کو چیک کرواتا ہوں جس کا میں تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا ہے۔ مجھے امید ہے، وہاں ساحل کا سراغ ہمیں مل جائے گا۔ بس اس کے لیے بڑی احتیاط اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔''

''یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے کہا ''لیکن ساحل تک پہنچنے کے لیے میں بہت بے چین ہوں۔''

''میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''دنیا داری اور دلداری ایک ساتھ جاری رہنا چاہیے۔ ساحل کی تلاش اور میاں زاہد کی کھنچائی کے ساتھ ساتھ تمہیں سونے والے معاملے کو بھی دیکھتے رہنا ہے۔'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''سونے والے معاملے کو کیا ہوا ہے؟'' میں نے چونک کر اس سے پوچھا۔

ساحل کے تذکرے میں سونے والے معاملے کی ''آمد'' نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، شعیب غوری کوئی انسان نہ ہو، مشین ہو۔ احساسات اور جذبات سے عاری۔ وہ انتہائی نازک حالات میں بھی اپنے کاروباری منصوبوں سے غافل نہیں رہتا تھا۔ شاید اس کی کامیابی کی وجہ یہی تھی۔ جذبات سے مغلوب لوگ دنیاوی اور اخروی ترقی میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ شعیب ایک فعال تنظیم کا روحِ رواں تھا۔ دل کے بجائے دماغ سے سوچنا اور جذبات کو ایک طرف رکھ کر فیصلے کرنا اس کی مجبوری تھی..... اور مجبوری ایک عادت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا ''سونے والے معاملے کو یہ ہوا ہے کہ مسٹر نیل آرمر اپنے طے شدہ پروگرام سے قبل ہی یہاں آ رہا ہے۔ رات فون پر میری اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ کل کراچی پہنچ جائے گا۔ وہ جلد از جلد اس مدفون خزانے تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''پھر؟'' میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔

''پھر یہ کہ اس سلسلے میں وہ تم سے ایک بھرپور میٹنگ کرنا چاہتا ہے۔'' شعیب نے بتایا ''تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔''

ساحل کی جدائی نے میرے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے بے دلی سے کہا ''شعیب! نیل آرمر سے ہر قسم کے معاملات تم خود ہی طے کر لو۔ میں نے یہ پروجیکٹ جب

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات صدیوں سے زندہ ایک پُراسرار شخص کی آپ بیتی، ھَوا جس کی دوست تھی، سمندر جس کے لیے آغوشِ مادر تھا، آگ اس کے بدن کو بوسے دیتی تھی۔

وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے کے ریکارڈ توڑ دیے

صدیوں کا بیٹا

پانچ حصّوں میں مکمّل

قیمت فی حصہ -/60 روپے * ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے

مکمل سیٹ منگانے پر رعایتی قیمت -/300 روپے ڈاک خرچ معاف -/300 روپے کا منی آرڈر پیشگی روانہ فرمائیں۔ یہ رعایت صرف منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی مل سکے گی۔

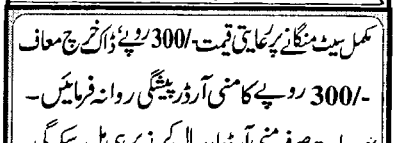

تمہارے سپرد کر دیا ہے تو پھر تم مجھے بار بار اس میں نہ گھسیٹو۔ میں اپنی تمام تر توجہ ساحل پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔''

''میں تمہارے احساسات کو بخوبی سمجھ رہا ہوں۔'' وہ خیر خواہانہ انداز میں بولا ''ساحل سے بچھڑنے کے واقعے نے تمہیں بری طرح توڑ کر رکھ دیا ہے لیکن اول آخر تم سونے والے اس معاملے سے الگ نہیں ہو۔ تم سے کوئی مشورہ صلاح کے بغیر آگے کیسے بڑھا جا سکتا ہے!''

میں نے چند لمحے سوچا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا ''شعیب! ہمارے درمیان، سونے والے معاملے پر جب پہلی مرتبہ بات ہوئی تھی تو ہم نے ایک پارٹنر شپ بزنس کا فیصلہ کیا تھا۔ تم نے مجھے ففٹی ون اور خود کو فورٹی نائن کا حصے دار قرار دیا تھا جب کہ سونے کی بازیابی تمہارے ہی ذمے تھی چاہے تم اس کے حصول کے لیے کوئی بھی راہ اختیار کرو۔''

''میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔'' اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے واضح الفاظ میں اسے بتایا ''اس وقت میں اور اب میں تھوڑی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ اس مہم میں تمہارے علاوہ مسٹر نیل آرمر، رام داس وغیرہ بھی شامل ہو چکے ہیں۔ اس شمولیت کا مطلب ہے، انہیں بھی حصہ دینا ہوگا۔'' میں چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس دوران میں شعیب بڑی توجہ سے میری جانب دیکھتا رہا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا ''ان حالات کے پیشِ نظر ہمیں اپنے معاہدے کو 'ری نیو' کر لینا چاہیے۔''

اس نے پُرمعنی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا ''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

میں نے کہا ''اگر واقعتاً سونے کی وہی مقدار برآمد ہوتی ہے جس کا ہم اندازہ لگائے بیٹھے ہیں تو اس وقت مذکورہ سونے کی مارکیٹ ویلیو لگ بھگ چوتھائی ارب روپے ہے یعنی پچیس کروڑ روپے۔ ففٹی ون کی پارٹنر شپ کے حساب سے میرے حصے میں کم و بیش تیرہ کروڑ روپے آئیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔''

''تمہارا رف اندازہ تقریباً درست ہے۔'' اس نے تائید کی۔

میں نے کہا ''میں چاہتا ہوں، سونے کی بازیابی کے تمام بکھیڑے تم خود ہی اپنے طور طریقے سے نمٹاؤ۔ مجھے اس کھٹ راگ سے الگ ہی رکھو۔ میں اپنی تمام تر توجہ ساحل پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میرے حصے کے حوالے سے ایک لم سم رقم طے کر لیتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''تمہارے خیال سے اتفاق کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''تم بتاؤ مجھے، تمہیں کتنی رقم درکار ہے؟''

میں نے کہا ''دس کروڑ روپے۔''

اس نے چند لمحے سوچا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا ''مجھے منظور ہے لیکن ایک شرط کے ساتھ!''

''کیسی شرط؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا ''اگر اس متروک کنویں سے اتنا ہی سونا برآمد ہوا جتنا ہم سوچ رہے ہیں!''

''بالکل، یہ تو بنیادی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''بس تو پھر تم اس معاملے کو ڈن سمجھو۔'' وہ بولا ''میں نیل آرمر اور دیگر متعلقہ افراد سے خود ہی نمٹ لوں گا۔ سونے کی بازیابی کے سلسلے میں یہ ہماری آخری میٹنگ ہے۔''

''او کے۔'' میں نے مطمئن انداز میں کہا ''سونے کی برآمد، اس کی ترسیل اور فروخت وغیرہ سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اس مشن کے اختتام پر مجھے دس کروڑ روپے مل جانا چاہئیں۔''

''مل جائیں گے۔'' وہ پُریقین لہجے میں بولا ''کل مسٹر نیل آرمر یہاں آتے ہیں تو میں آئندہ کے لیے لائحۂ عمل تیار کر لوں گا۔ وہ گولڈ اکاؤنٹ بینک کے مالک ہیں۔ سونے کی فروخت کے سلسلے میں ہمیں آنا جانا نہیں ہوگا۔ برآمد شدہ سونے کے بسکٹ ڈائریکٹ نیل آرمر کے بینک میں چلے جائیں گے۔'' ایک ذرا توقف کے بعد اس نے کہا ''تم بے فکر ہو جاؤ وجدان۔ میں اس سلسلے میں اب تمہیں بچ نہیں کروں گا۔''

مزید چند ضروری باتوں کے بعد ہماری میٹنگ ختم ہو گئی۔

شعیب غوری ''ساؤتھ'' سے رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا ''تم نے میاں زاہد حسین کے جس خفیہ ٹھکانے کا ذکر کیا ہے، میں وہاں دھاوا بولنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں تم نے کچھ سوچ رکھا ہے یا.....!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ انداز سوالیہ تھا چنانچہ اس نے کہا ''میں نے تو سوچ تو بہت کچھ رکھا ہے لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا، کم از کم ایک دن کا وقت دے دو مجھے۔ میں پہلے یہ معلوم کر لوں کہ ساحل کو کہاں رکھا گیا ہے۔ اسی خفیہ ٹھکانے پر یا کہیں اور.....''

''ٹھیک ہے، تم اپنے طور طریقوں سے معلوم کرو۔ میں اپنی نئی حکمتِ عملی آزماتا ہوں۔'' میں نے کہا ''میں اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ تم میری بات کو سمجھ رہے ہو؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''اس سلسلے میں تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، کبیر شاہ سے کہہ دینا۔ وہ ہر وقت تمہاری مدد کے لیے یہاں ساؤتھ میں موجود رہے گا۔ میں اسے خصوصی ہدایات بھی دے دوں گا۔''

میں نے کہا ''تمہارے اس تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ میں ساحل کی تلاش کے سلسلے میں اکیلا ہی نکلنا چاہتا ہوں۔ ہاں، البتہ اگر کسی مرحلے پر مجھے کبیر شاہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں فوراً اس سے رابطہ کروں گا۔''

''تمہاری باتوں سے لگتا ہے، تم ساؤتھ میں بھی مستقل نہیں ٹھہرنا چاہتے؟''

''ہاں، میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔''

''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

''فی الحال تو ساحل سمندر والے فلیٹ پر جاؤں گا۔'' میں نے کہا ''لیکن کسی نہ کسی طور ساؤتھ سے بھی ٹچ میں رہوں گا۔ میں تھوڑا وقت تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

شعیب نے کہا ''تم اس کے لیے آزاد ہو مگر کوئی انتہائی اقدام اٹھانے سے پہلے کبیر شاہ کو کم از کم مطلع ضرور کر دینا۔ اس کی مدد کی ضرورت کسی وقت بھی پڑ سکتی ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

دوپہر کا کھانا میں نے ساؤتھ ہی میں کھایا اور نیلی شیرڈ میں اپنے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب میں ایک دو ذیلی سڑکوں سے گھوم کر نیشنل ہائی وے (مین کورنگی روڈ) پر آیا تو سگنل بند تھا۔ میں نے شیرڈ کو روک لیا۔ اسی وقت میری نگاہ ایک شناسا چہرے پر پڑی۔

وہ صدف تھی جو ہائٹ سٹی میں نیشنل ہائی وے کو چھوڑ کر اندر کی جانب آ رہی تھی۔ مجھ سے نظر ملی تو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ میں نے بادلِ ناخواستہ خوش دلی سے اس کی مسکراہٹ اور ہلتے ہوئے ہاتھ کا جواب دیا۔ اتنی دیر میں سگنل کھل گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

صدف ایک روز پہلے پارک میں مجھ سے ملی تھی۔ وہ میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھی اور مستقبل قریب میں ڈاکٹر بننے والی تھی۔ گزشتہ روز ہمارے درمیان مختصر مکالمت ہوئی تھی۔ اس نے مجھ پر جس شک کا اظہار کیا، وہ جینوئن تھا لیکن میں نے بڑی شدت سے اس کی تردید کر دی۔ میں نہیں چاہتا تھا، کسی انجانی لڑکی پر میرا ماضی اس طرح کھل جائے کہ میرے لیے مسائل کھڑے ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ یہ ''مسائل'' مثبت اور منفی، کسی بھی نوعیت کے ہو سکتے تھے۔

میں اپنے فلیٹ کی جانب سفر جاری رکھے ہوئے صدف کے بارے میں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اپنی سوچ کو ختم کرنا پڑا کیوں کہ میرے ''پڑوس'' میں براجمان اس سفید حسینہ نے اپنی مخصوص آواز میں ''میاؤں'' کیا تھا۔ اس کے اسٹائل سے ظاہر ہوتا تھا، اسے میرا کسی اور کے بارے میں

سب رنگ ڈائجسٹ کے مشہور سلسلے کتابی شکل میں دستیاب ہیں
غلام اردن
قیمت: -/30
ڈاک خرچ -/23 روپے
دو حصے مکمل
قیمت -/40 روپے فی حصہ
ڈاک خرچ -/23 روپے
دو حصے مکمل قیمت -/50 روپے فی حصہ
ڈاک خرچ -/23 روپے
کتابات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۱۲۳۰، کراچی

آتش فشاں 248 حصہ 8

سوچنا پسند نہیں آیا۔ اگر وہ واقعی میرے خیالات تک رسائی رکھتی تھی تو اس کا یہ انداز محبوبانہ اور ہیجانہ تھا۔ وہ میرے نزدیک تو کیا، ذہن میں بھی کسی دوسری کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ میں نے اس کا نام ڈارلنگ رکھا تھا جو اس پر بڑا فٹ بیٹھتا تھا۔

جب میں ساؤتھ پہنچا تو وہ گاڑی میں میرے ساتھ تھی لیکن وہ بنگلے میں میرے ساتھ ساتھ نہیں لگی رہی بلکہ مجھے تو اس نے محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کب مجھ سے جدا ہوئی اور کیسے دوبارہ گاڑی میں آموجود ہوئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں ساؤتھ سے نکلا تو وہ شیرڈ میں مجھے دکھائی نہیں دی تھی لیکن جس وقت میں مسجد والے پارک کے پاس سے گزر رہا تھا، وہ چھپاک سے کودی اور عقبی نشست سے پسنجرز سیٹ پر پہنچ گئی۔ میں اس کے اتنے چمتکار دیکھ چکا تھا کہ اب اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ ایک پُراسرار بلی تھی۔ وہ حالات اور موقع کی مناسبت سے ''حاضر غائب'' کے اصول پر عمل پیرا تھی۔ جب چاہتی، میرے قریب چلی آتی اور جب محسوس کرتی کہ مجھے دوسرے لوگوں سے ملنا ہے تو طرح دے جاتی۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی، وہ جب میری تنہائی میں ظاہر ہوتی تھی تو اس کا انداز دلبرانہ ہو جاتا۔ یہ ایک خطرناک اور جواب طلب صورتِ حال تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی خاص مشن پر ہو!

جب کوئی زندگی آپ کے ساتھ ساتھ ہو اور آپ اس کے مقاصد سے ناواقف ہوں تو ایک عجیب سی بے چینی گھیرے رکھتی ہے۔ میں بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت سے دوچار تھا چنانچہ میں نے ڈارلنگ کو اپنے قریب رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اس کے اسرار کا پردہ چاک کر سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد، میں اس کی حقیقت کو پہنچ جاؤں گا۔ جب میں فلیٹ کے اندر داخل ہوا تو ساحل کی یاد نے میرے دل و دماغ کو تڑپا کر رکھ دیا۔ اس فلیٹ کے در و دیوار اور ہر ہر شے سے ہم دونوں کی مختصر اور مشترک یادیں وابستہ تھیں۔ میں نے اندر قدم رکھا تو ایک معطر جھونکے نے میرا اندرون مہکا دیا۔ مجھے اپنی نس نس میں ساحل کی خوشبو دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ظاہر ہے، یہ سب میرا احساس تھا۔ ساحل کا طاقت ور تصور اس کی موجودگی کو محسوس کروا رہا تھا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔ جدائی کے کرب کی سنگینی کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو کبھی اس کیفیت سے گزرے ہوں۔

شام چھ بجے انسپکٹر چیانگ شو (Chyang Chow) کا فون آ گیا۔ سنگاپور میں اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ انسپکٹر نے بتایا کہ وہ کل صبح ایک کثیر رقم مجھے ہنڈی کر دے گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔

''انکل! آپ نے مجھ سے کیا ہوا وعدہ تو پورا کر دیا ہے نا!''

''یس مائی سن۔'' وہ سنجیدگی سے بولا ''تم میرے مرحوم دوست کے بیٹے ہو۔ میں تمہاری خوشی کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں۔ تمہاری خواہش کے مطابق میں نے کل رقم میں سے ایک لاکھ یو۔ ایس منہا کر لیے ہیں۔ اب چونتیس لاکھ ڈالرز میں تمہیں بھجوا رہا ہوں۔ جو پاکستانی کرنسی کی صورت میں تمہیں کل مل جائیں گے۔ یہ رقم لگ بھگ ساڑھے پندرہ کروڑ ہو گی۔ میں رقم کی وصولی کی تصدیق بعد میں تم سے کر لوں گا۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا شکریہ ادا کیا پھر ایک فوری خیال کے تحت اس سے پوچھا ''انکل! آپ دارا کو تو نہیں بھولے ہوں گے؟''

''نو مائی سن! میں اس شیطان کو کیسے بھول سکتا ہوں۔'' چیانگ شو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اس وقت دارا تمہیں کیوں یاد آ گیا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھوں ختم ہو چکا ہے۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا ''دارا کے حوالے سے دراصل میں جمال اور بھولا ناتھ کا ذکر چاہتا ہوں۔ یہ دونوں افراد دارا کے سینڈیکیٹ سے وابستہ تھے اور آپ نے انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجا تھا۔ بھولا ناتھ سے آپ نے دس کلو گرام ہیروئن بھی برآمد کی تھی جو وہ سنگاپور سے یورپ کی طرف اسمگل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔''

''ہاں، یہ واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔'' چیانگ شو نے کہا پھر بتایا ''جمال اور بھولا ناتھ کو چند روز قبل رہائی ملی ہے۔ وہ اپنی سزا کاٹ کر آزاد ہو چکے ہیں۔''

میں نے کہا ''انکل! اب وہ واقعی ہمیشہ کے لیے آزاد ہو چکے ہیں۔ انہیں ہم نے زندگی کی قید سے رہائی دلوا دی ہے۔''

''مائی سن! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ حیرت سے بولا۔

میں نے اس کی حیرت کو رفع کرنے کے لیے ''بلی۔ تھری ایٹ'' پر پیش آنے والے واقعات تفصیل سے سنا ڈالے۔ دارا کا فرسٹ کزن جمال، کبیر شاہ کی فائرنگ سے ہلاک ہوا تھا جب کہ بھولا ناتھ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔ اسے میرے سامنے مارشل آرٹس دکھانے کا شوق چرایا تھا، اسی شوق نے بھولا ناتھ کو آنجہانی بنا دیا۔

پوری بات سننے کے بعد چیانگ شو نے کہا ''یہ دونوں خبیث پاکستان کیا لینے گئے تھے؟''

میں نے بتایا ''میرے دشمنوں سے گٹھ جوڑ کرنے۔'' پھر میں نے انسپکٹر کو دارا کے برادر خورد تارا کے ''کارناموں'' اور عبرت ناک موت کی تفصیل سنائی۔

اس نے زہریلے لہجے میں کہا ''خس کم، جہاں پاک!''

چیانگ شو کے اس مختصر سے تبصرے کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ ختم ہو گیا۔

میں نے ریسیور کو کریڈل کیا اور ڈارلنگ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس دوران میں وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ اس کا انداز خالصتاً ہیجانہ تھا۔ نہایت ہی تیز و طرار بلیاں جس طرح اپنے شوہروں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتی ہیں، بالکل ویسے ہی وہ مجھے بھی واچ کر رہی تھی۔ میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ڈارلنگ! میرے پاس آؤ۔''

وہ سبک قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاؤں کے نزدیک آ گئی۔

میں نے اسے بلانے کے لیے صرف ہونٹوں اور زبان کو حرکت دی تھی، باقاعدہ کوئی اشارہ وغیرہ نہیں کیا تھا۔ اس نے ذرا میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ اس سے یہی بات ظاہر ہوتی تھی، وہ میری بات کو سمجھتی ہے۔ میں نے اس کی جانب بازو دراز کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ، میری آغوش میں بیٹھ جاؤ۔''

وہ ''میاؤں'' کی آواز نکالتے ہوئے اُچک کر میری گود میں آ گئی۔ میں نہایت ہی شفقت سے اس کے ریشم ایسے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو بلی کیٹس ظاہر کرنے لگی۔ میری انگلیاں دھیرے دھیرے اس کے بدن کو ٹٹولتی رہیں۔ ان انگلیوں کے لمس میں ایک جذبہ تھا، ایک محبت تھی اور ایک انسیت تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے، جانور محبت کی زبان سے بخوبی آشنا ہوتے ہیں۔ میری انگلیاں اس وقت محبت کی زبان بول رہی تھیں۔ ڈارلنگ آنکھیں بند کیے بڑی مطمئن اور آسودہ نظر آ رہی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے محسوس ہوا، وہ میری گود میں سو چکی ہے۔ میں نے آزمانے کے لیے اسے پیار بھری ایک چپت رسید کر دی۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے اس عمل کو دہرایا۔ وہ بدستور آسودہ اور بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اس کا جسم صرف زندگی کا احساس دلا رہا تھا۔ سانس کی آمد و شد سے پتا چلتا تھا، وہ زندہ ہے۔ وہ گہری نیند میں چلی گئی تھی!

میں بہ آہستگی صوفے سے اٹھا۔ ڈارلنگ میری گود میں گر گئی۔ میں نے لاؤنج کے ایک کونے میں اسے قالین پر رکھ دیا۔ اس کے نزدیک ہی اسٹینڈ پر ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ میرا خیال تھا، میں جیسے ہی ڈارلنگ کو نیچے رکھوں گا، وہ بیدار ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ آسودگی کی نیند سو رہی تھی۔

میں ٹیلی فون کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گیا اور دلچسپی سے پُراسرار ڈارلنگ کو تکنے لگا۔ چند لمحات کے بعد آپوں آپ میرا خیال ڈارلنگ سے پرواز کرتے ہوئے لیلیٰ کی جانب چلا گیا پھر مجھے اس کی ''کارروائی'' یاد آنے لگی۔ گویا میں نیلگری کے بارے میں سوچنے لگا۔

نیلگری نے مجھے ایسی چوٹ دی تھی جو کسی بھی طرح ایک شکست سے کم نہیں تھی۔ میرے ذہن نے نیلگری کے بارے میں جو اندازے قائم کیے تھے، وہ ان پر پوری اتری تھی۔ وہ اپنی ضد کو پورا کرنے کے لیے مجھے الجھنوں کے جال میں باندھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک میں اسی ادھیڑ بُن میں رہا پھر لیلیٰ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ لیلیٰ سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیے۔ نیلگری نے اسے واسطہ بنایا تھا۔ اس کا مطلب تھا، لیلیٰ اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے بات کر کے بہت سے سوالات کے جواب مل سکتے تھے۔

میں نے لیلیٰ کے بیڈروم سے گزشتہ رات تین فون کیے

الیاس سیتاپوری
انسانوں کی سچ مچ کہانیاں
انسان جو کبھی نہیں بدلے گا اور کبھی پرانا نہیں ہوگا، اسی طرح یہ کہانیاں بھی کبھی پرانی نہیں ہوں گی کیونکہ یہ کہانیاں انسانوں کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں وہ سب کچھ ہے جو انسان میں ہے۔
جلد اول کتاب 40 روپے
جلد دوم کتاب 23 روپے
10 کتابوں کے سیٹ کی رعایتی قیمت 350 روپے پوسٹ آفس خرچ مفت
تمام پبلشرز کے ہاں دستیاب ہے
طلسماتی دنیا کی
فون: 5895313-5802552 فیکس: 5802551
Email: kitabistan19@yahoo.com
پوسٹ بکس 23
کراچی 74200

تھے۔ پہلا قاضی سلطان کو، دوسرا منہاس باقر کو اور تیسرا کبیر شاہ کو۔ ان تینوں فونز کا دورانیہ دس منٹ سے زیادہ تھا اور اس دوران میں میری نگاہ ٹیلی فون سیٹ پر جمی رہی تھی۔ سیٹ کی پیشانی پر موجود چھوٹی سی ٹرانسپیرنٹ پاکٹ میں فون نمبر درج تھا۔ یہ نمبر میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اب تک اس فون نمبر کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟

بے اختیار میرا ہاتھ ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے لیلیٰ کے بنگلے کا فون نمبر ڈائل کیا۔ چوتھی گھنٹی پر دوسری جانب کال ریسیو کر لی گئی۔ ایک مانوس نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''ہیلو!''

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، دوسری طرف لیلیٰ تھی پھر بھی میں نے بے ساختہ پوچھ لیا ''کیا تم لیلیٰ بات کر رہی ہو؟''

اس نے تصدیق کی اور پوچھا ''تم کون ہو؟''

''اتنی جلدی بھول گئیں!'' بے اختیار میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''میں واقعی تمہیں نہیں جانتی۔''

''میں وجدان بات کر رہا ہوں۔ کچھ یاد آیا؟''

اس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا ''میں کسی وجدان کو نہیں جانتی۔ سوری..... رانگ نمبر.....''

پھر اس سے پہلے کہ وہ ریسیور کو کریڈل کر دیتی۔ میں نے جلدی سے کہا ''پلیز فون بند نہ کرنا، میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''جب میں تمہیں جانتی ہی نہیں تو پھر باتوں کا کیا سوال ہے؟''

''سوال ہے۔'' میں نے قطعیت سے کہا ''اور یہ سوال اس لیے ہے کہ میں کل رات تم سے ایک بھرپور ملاقات کر چکا ہوں۔''

''وہاٹ نان سینس!'' وہ برہمی سے بولی ''لگتا ہے، تم کوئی پاگل ہو۔ کل رات تو میں اپنے بنگلے پر اکیلی تھی۔''

اس کی باتیں میرے شک بلکہ یقین کی تائید کر رہی تھیں۔ میں نے کہا ''اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو میں تمہیں یاد دلانے کے لیے چند حوالے دیتا ہوں۔''

''جو بھی کہنا ہے، جلدی کہہ ڈالو۔'' وہ بیزاری سے بولی ''فضول باتیں سننے کا میرے پاس وقت نہیں۔''

میں نے کہا ''ابھی جن باتوں کو فضول کہہ رہی ہو بعد میں انہیں تسلیم کرتے ہی بنے گی۔''

''اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔'' وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی ''تم جو بھی انکشاف کرنا چاہتے ہو، اس میں تاخیر نہ کرو۔''

میں نے استفسار کیا ''کیا کل رات تم لگ بھگ ساڑھے نو بجے اپنے بنگلے پر پہنچی تھیں؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا ''تمہارے پاس بلیک ہونڈا سوک ہے؟''

''ہاں ہے..... پھر؟''

''جب تم نے پورچ میں اپنی گاڑی کھڑی کی تو لان کے قریب ہی ایک نیلی شیرڈ بھی آ کر رکی تھی؟''

''بالکل غلط۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''نیلی شیرڈ میں، میں زخمی حالت میں تھا۔ تم مجھے اپنے ساتھ بنگلے کے اندر لے گئی تھیں۔'' میں نے کہا ''اور بیڈروم میں جا کر تم نے میری مرہم پٹی بھی کی تھی؟''

''اب مجھے یقین ہو چلا ہے، تم کوئی دماغی مریض ہو۔'' لیلیٰ نے چڑ کر کہا۔

میں نے پوچھا ''کسی زمانے میں تم نے نرسنگ کورس کیا تھا؟''

''یہ بات درست ہے۔''

''تمہارے شوہر سعید خان کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعید ایک ممتاز سیاست داں تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''اس نے اپنے پیچھے اور تمہارے آگے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ تم نے جو رقم انویسٹ کر رکھی ہے اس سے تمہیں ماہانہ تین لاکھ کے قریب پرافٹ مل جاتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔ یہ باتیں بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ تمہیں بھی کہیں سے معلوم ہو گئی ہوں گی لیکن تمہاری اس جانکاری سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے، کل رات ہماری ملاقات ہو چکی ہے اور میں نے تمہاری مرہم پٹی کی تھی؟''

میں نے مصلحتاً گزشتہ رات کے ''اہم واقعات'' کو گول کر دیا اور لیلیٰ سے پوچھا ''کیا تمہیں یقین ہے کہ کل رات تم اپنے بنگلے پر اکیلی ہی تھیں؟''

''میں تمہارے اس قسم کے سوالات کے جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔'' وہ جھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی ''اس سے پہلے کہ میں فون بند کر دوں، تمہارا منہ بند کرنے کے لیے تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں، گزشتہ رات ہی نہیں بلکہ میں ہر رات اپنے بنگلے پر اکیلی ہی رہتی ہوں اور میں نے کل رات کسی وجدان سے ملاقات کی ہے اور نہ ہی میں اس نام کے کسی شخص سے واقف ہوں۔ تم کوئی پاگل ہو یا تم نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ لیا ہے۔ بس یا اور کچھ؟''

''بس ایک بات اور۔'' میں نے جلدی سے کہا ''کیا آج سارا دن پھر تم اپنے بنگلے پر ہی رہی ہو؟''

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''تم نے اپنے اس سوال کو آخری بات کہا ہے تو سنو، میں آج کا دن کراچی سے باہر گزار کر آئی ہوں۔ علی الصباح ایک ضروری کام سے مجھے حیدرآباد جانا پڑ گیا۔ میں لگ بھگ چھ بجے بنگلے سے نکل گئی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میری واپسی ہوئی ہے۔'' اس نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات ختم کرنے والے انداز میں بولی ''اگر اب تم نے دوبارہ فون کر کے مجھے پریشان کرنے کی کوشش کی تو میں سمجھ لوں گی، تم کوئی نفسیاتی مریض ہو چنانچہ تمہیں پولیس کے حوالے کرنا میرا فرض بن جائے گا..... اور تم جانتے ہو، میں ایک ممتاز سیاست داں کی بیوی ہوں۔ تم یہ بھی بخوبی جانتے ہو گے اس ملک میں سیاست داں اور اس کے اہلِ خانہ کس طاقت اور قدرت کے مالک ہوتے ہیں!''

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی ٹیلی فون بند ہو گیا۔ دوسری جانب سے لیلیٰ نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ وہ خاصی پُراعتماد اور نڈر عورت معلوم ہوتی تھی ورنہ وہ اتنی دیر مجھ سے گفتگو نہ کرتی۔ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، اس کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔ میں نے پہلے بھی نیلگری کی افسوں گری کے کئی واقعات اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیے تھے۔ وہ بڑی کرنی والی تھی۔ گزشتہ رات کم و بیش ساڑھے نو بجے میں لیلیٰ کے بنگلے پر پہنچا تھا۔ اسی وقت وہ کہیں باہر سے آئی تھی۔ نیلگری نے اپنی شکتی سے، رات ساڑھے نو بجے سے صبح چھ بجے تک کے واقعات لیلیٰ کی زندگی سے خارج کر دیے تھے کیوں کہ ان اوقات کے درمیان وہ خود اس کی زندگی میں دخیل رہی تھی۔ گویا اس نے لیلیٰ کی زندگی کی وہ رات چرا لی تھی۔ وہ بے چاری یہی سمجھ رہی تھی کہ، اس کی وہ رات سو کر گزاری ہو گی!

لیلیٰ سے ہونے والی اس گفتگو نے نیلگری کی ''کارکردگی'' پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اس حسین ساحرہ نے تمدنی مشروب ''جامِ اُمید'' کا سہارا لے کر لیلیٰ کی بے بسی اور مجبوری سے کسی حد تک اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ میں ایک لمبی آہ بھر کر رہ گیا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھلے ہوئے سلائیڈنگ ڈور سے کمرے کے اندر پہنچ رہے تھے۔ میں قالین پر یوگا کی مختلف مشقیں کر رہا تھا۔ سورج طلوع ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ سپیدۂ سحر ظاہر ہونے لگا تھا۔ وہ بہت خوشگوار اور سہانا سماں تھا۔ چاروں جانب پھیلی خاموشی اور سناٹے نے مشق کا لطف دوبالا کر دیا۔

یوگا کی مشقوں کو ایک ترتیب سے کیا جاتا ہے۔ ایک سے زیادہ شعبوں کو آزمانا ہو تو ان میں بھی ترتیب کا خیال رکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے ہتھ یوگ (باڈی یوگا) پر راج یوگ (برین یوگا) اور آخر میں منتر یوگ (روحانی یوگ) کی مشقیں کی جائیں تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ ویسے تو کوئی بھی مشق، کسی بھی طور کر لی جائے اس کا فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔

میں نے اپنے دماغ اور روح کو ''وارم اپ'' کرنے کے لیے ہتھ یوگ کے چند آسن لگائے جن میں اونٹ آسن (Camel Posture) مین آمن (Fish Posture) اور ہل آسن (Plough Posture) شامل تھے۔ اس کے بعد میں کنول آسن میں بیٹھ کر سانس کی ایک مخصوص مشق کرنے لگا۔ کنول آسن یعنی لوٹس پوسچر (Lotus Posture) کو یوگا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس آسن یا انداز کو پدم آسن، سکھ آسن اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنا بھی کہتے ہیں۔ منتر یوگ کی اکثر مشقیں اسی آسن میں کی جاتی ہیں۔

میں شمالی رخ بیٹھ کر سانس کی مشق کرنے لگا۔ سانس کھینچنے، روکنے اور چھوڑنے کی مشقتوں کو مجموعی طور پر پرانایام (Pranayam) کہا جاتا ہے۔ عموماً سانس کو روکنے کے تین طریقے رائج ہیں۔ دو جسم کے اندر اور ایک بدن سے باہر۔ جسم کے اندر یا تو سانس پھیپھڑوں میں روکی جاتی ہے یا پھر پیٹ میں جب کہ بدن سے باہر سانس روکنے کے لیے اپنے پیٹ اور پھیپھڑوں کو خالی کرنا پڑتا ہے یعنی اتنا گہرا (Exhale) کرنا ہوتا ہے کہ جسم کے اندر خصوصاً پیٹ اور پھیپھڑوں میں سانس باقی نہ رہے۔ سانس روکنے کا یہ طریقہ خاصا مشکل اور صبر آزما ہے اگر اس میں مہارت حاصل ہو جائے تو انسان اپنے دل کی دھڑکن کو روک کر خود کو مردہ ظاہر کر سکتا ہے۔ جو شعبدہ باز یوگی گھنٹوں سانس روکنے کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ اسی طریقے کو اپناتے ہیں۔ نہ صرف سانس بلکہ ایک مخصوص عمل سے معدے کو ہر قسم کی نمی اور خوراک سے خالی کر لیا جاتا ہے۔

شاذون ٹیمپل میں قیام اور تربیت کے دوران میں میرے

دادا استاد ماسٹر ہینگ پائی (Hang Pai) نے مختلف مشقوں سے میرے اندر ''چی'' کی قوت کو بیدار کیا تھا اور اس قوت کے مزید حصول کے لیے مجھے ایڈوانس ایکسر سائز بھی بتائی تھیں۔ اب تک مجھے ان مشقوں کے لیے مناسب وقت نہیں ملا تھا لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ میں ان کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ خاص طور پر گزشتہ رات نیلگری کے حوالے سے جو واقعہ پیش آیا تھا۔ اس میں مجھے اپنی بے بسی کا گہرا احساس ہوا تھا۔ میں ''چی'' کی ایڈوانس ایکسر سائز سے اپنی باطنی قوت کو بڑھانا چاہتا تھا تاکہ نیلگری جیسی نادیدہ اور پُراسرار شکتیاں مجھے اپنا آلۂ کار نہ بنا سکیں۔ کوئی انسان چاہے کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، آلۂ کار بننا پسند نہیں کرتا۔ انسان کی خودی ہر حال میں اسے طاقت اور اختیار حاصل کرنے کے لیے اُکساتی رہتی ہے۔

میں نے آنکھیں بند کیں، چند گہری سانسیں لے کر اپنے ذہن کو ٹیون کیا پھر سانس کی ایک مخصوص مشق (Stroke) Breathing کرنے لگا اس مشق کے دوران میں مختلف وقفوں سے سانس کو کھینچا اور چھوڑا جاتا ہے۔ سانس اندر کھینچتے (Inhale) کرتے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رک کر سانس کی ڈور پر گرہ لگائی جاتی ہیں۔ اسی طرح جب سانس کو چھوڑا جاتا ہے یعنی (Exhale) کرتے وقت بھی انہی مقامات پر رک کر ان گرہ کو کھولتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی سادہ اور آسان عمل ہے لیکن اس میں ردھم اور تناسب پیدا کرنے کے لیے خاصی مشق اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے کہ (Inhale) کرتے وقت ہم نے جہاں جہاں گرہ لگائی تھیں، (Exhale) کرتے ہوئے وہیں سے گرہ کھولی جائیں مگر ترتیب الٹ جائے یعنی آخری گرہ کو پہلے کھولا جائے گا اور پہلی گرہ کو سب سے آخر میں۔ گرہ کھولنے اور لگانے کا عمل تصوراتی ہے۔ اس تصور کو خیال کی قوت سے روشن اور واضح کیا جاتا ہے۔ اس مشق کے دوران میں ارتکاز بہت ضروری ہے۔ سانس کھینچتے اور چھوڑتے وقت یعنی گرہ لگاتے اور کھولتے وقت تمام تر توجہ ناف کے مقام پر مرتکز رکھنا ضروری ہے۔

میں دس منٹ تک یہ مشق دہراتا رہا پھر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد آرام کی غرض سے سکھ آسن کو ختم کر کے قالین پر چت لیٹ گیا۔

آئندہ دو روز تک کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ میرے لیے قابلِ ذکر واقعہ وہ ہوتا جس میں کسی نہ کسی حوالے سے ساحل موجود ہوتی۔ اس کی وجودگی کے بغیر میں خالی ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے میں اپنے جسم کا ایک حصہ ہی سمجھنے لگا تھا۔ وہ کیا مبدا ہوئی تھی، گویا میں کہیں کھو گیا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے، میں ساحل کو تلاش کر رہا ہوں لیکن میں ''تیری تلاش میں نکلے اور خود کھو گئے'' والی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

تیسرے روز میں نے شعیب غوری سے واضح الفاظ میں کہہ دیا ''میں لاہور جا رہا ہوں۔''

شعیب نے میاں زاہد کے جس خفیہ اڈے کا سراغ لگایا تھا، وہاں ساحل کی موجودگی ثابت نہ ہو سکی۔ ان حالات میں میرا ذہن بار بار اس طرف جا رہا تھا کہ اسے ان بدبختوں نے لاہور بھیج دیا ہوگا۔ عین ممکن تھا، ساحل اس وقت چوہدری نوازش علی کی حویلی میں ہو..... اس کی قید میں۔ میں نے لاہور جانے کا ارادہ ظاہر کرنے سے پہلے شعیب کو اپنے اندازے کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا ''میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔ خیر، میں کل کی کسی فلائٹ سے تمہارے لاہور جانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کبیر شاہ کو تمہاری ضرورت کے بارے میں بریف کر دوں گا۔''

میں نے کہا ''شعیب! کل صبح میں ساؤتھ جا کر کبیر شاہ سے مل لوں گا۔ تم اسے بتا دینا، میرے ساتھ ایک بلی بھی جائے گی۔ اس کے سفر کے انتظامات بھی کرنا ہوں گے۔''

''بلی!'' شعیب کی حیرت بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس وقت ہم ٹیلی فون کے ذریعے گفتگو کر رہے تھے۔

میں نے زور دے کر کہا ''ہاں بلی۔ اس کا نام ڈارلنگ ہے۔ لائیو اسٹاک کی بکنگ کے لیے اس کے نام کی ضرورت پڑے گی۔ وہ سفید رنگ کی ایک خوبصورت بلی ہے۔''

''یہ بلی تمہارے پاس کہاں سے آ گئی؟'' اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی پائی جاتی تھی۔

میں نے بتایا ''بس نئی نئی دوستی ہوئی ہے۔''

وہ میرے اس گول مول جواب سے سمجھ گیا، میں بلی کے سلسلے میں کسی وضاحت میں نہیں جانا چاہتا لہٰذا اس نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور جلدی سے بولا۔

''او کے، او کے۔ بلی کی بکنگ بھی ہو جائے گی۔'' پھر اس نے پوچھا ''لاہور میں کس ہوٹل میں قیام کرنا پسند کرو گے؟ میں تمہارے ٹھہرنے کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا ''میں اپنی شعوری زندگی میں پہلی مرتبہ لاہور جا رہا ہوں۔ اس لیے وہاں کے ہوٹلز کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم جو مناسب اور موزوں جانو، اسی ہوٹل میں کمرا

بک کروا دو۔ میں ہوٹل کی بکنگ اور ہوائی سفر کے اخراجات کی کل رقم کل کبیر شاہ کو دے دوں گا۔''

''خواہ مخواہ مجھے شرمندہ نہ کرو دوست۔'' شعیب نے کہا ''میں بھلا یہ چھوٹی سی رقم تم سے وصول کرتا اچھا لگوں گا؟''

''بات اچھا یا برا لگنے کی نہیں شعیب۔'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا ''ہم صرف دوست ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے بزنس پارٹنر بھی ہیں۔ پہلے کی بات اور تھی۔ میرے پاس رقم تھی اور نہ ہی کوئی محفوظ ٹھکانا۔ تم نے مجھے متذکرہ سہولیات فراہم کر دیں لیکن اب صورتِ حال خاصی حوصلہ افزا اور صحت مند ہے۔ اس وقت میرے مختلف اکاؤنٹس میں لگ بھگ ساڑھے پندرہ کروڑ روپے موجود ہیں لہٰذا لین دین کی عادت مجھے بھی ڈالنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

پھر ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

دو روز قبل سنگاپور سے آنے والی ہنڈی کی رقم میں نے وصول کر لی تھی اور اسی روز شعیب غوری کی راہ نمائی اور تعاون سے میں نے تین مختلف بینکوں میں اکاؤنٹس بھی کھول لیے تھے۔ ان میں ایک غیر ملکی اور دو ملکی بینک تھے۔ غیر ملکی میں شعیب کے مشورے کے مطابق میں نے ''ڈالر اکاؤنٹ'' کھولا تھا جب کہ دو مختلف ملکی بینکوں میں ''روپی اکاؤنٹس'' کھولے گئے۔ ان دونوں ملکی بینکوں میں ''آن لائن بینکنگ'' کی سہولت موجود تھی۔ مجھ ایسے نگڑے اکاؤنٹ ہولڈر کو پا کر تینوں بینکوں کے منیجرز خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔

ایک گھنٹے بعد کبیر شاہ کا فون آ گیا۔ اس نے پُرمسرت لہجے میں بتایا ''وجدان! میں نے کوشش کر کے کل صبح تمہاری روانگی کا بندوبست کر دیا ہے۔ آٹھ بجے والی فلائٹ میں تمہاری اور ڈارلنگ کی بکنگ ہو گئی ہے۔ تم سات بجے سے تھوڑا پہلے ائیر پورٹ پہنچ جانا بلکہ ایسا کرو۔'' وہ ایک لمحے کا توقف کر کے بولا ''تم رات کو ساؤتھ ہی کیوں نہیں چلے آتے۔ میں صبح خود تمہیں ائیر پورٹ چھوڑ آؤں گا۔''

''نہیں شاہ جی! اتنے تکلفات میں نہ پڑو۔'' میں نے کسی اندرونی جذبے کے تحت کہا ''تم ہمارے ٹکٹ وغیرہ یہاں بھیج دو۔ میں کل ٹھیک وقت پر ائیر پورٹ پہنچ جاؤں گا۔''

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا ''چلو ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر تمہارا ٹکٹ بھجوا رہا ہوں۔ تمہاری ڈارلنگ کے سلسلے میں، میں نے ائیر پورٹ کے متعلقہ ڈنر سے فون پر بات کر لی ہے۔ وہ ڈارلنگ کے لیے اسپیس چھوڑ دیں گے۔ تم ائیر پورٹ پہنچ کر ''لائیو اسٹاک'' کاؤنٹر سے رابطہ کرنا۔ وہ تمہیں بلی کے لیے ایک چھوٹا سا کیج (Cage) مہیا کریں گے۔''

''ہاں، میں اس پراسس سے واقف ہوں۔'' میں نے کہا پھر پوچھا ''ڈارلنگ کے لائسنس کی ضرورت تو پیش نہیں آئے گی؟ بیرونِ ممالک میں تو پالتو جانوروں کے باقاعدہ لائسنس جاری کیے جاتے ہیں۔ بغیر لائسنس آپ نہ تو اپنے پاس کوئی پالتو جانور رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اسے اپنے ساتھ سفر پر کہیں لے جا سکتے ہیں۔''

کبیر شاہ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا ''یہاں اس قسم کی ''پریشانیوں'' نے ابھی رواج نہیں پایا۔ کراچی سے لاہور تک بائی ائیر سفر کرنے کے لیے تمہاری بلی کا نام ہی کافی ہے۔''

''پھر تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

وہ کریدنے والے انداز میں بولا ''یار وجدان! یہ بلی کا کیا چکر ہے۔ جب تم ساؤتھ سے گئے تھے تو ایسی کوئی بلی تمہارے ساتھ نہیں تھی، نہ ہی پہلے میں نے اسے تمہارے آس

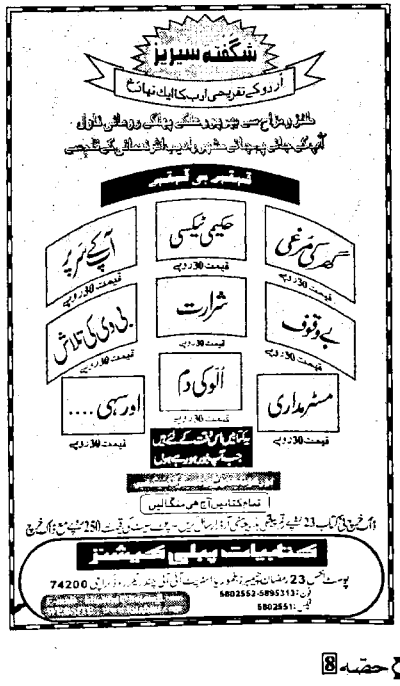

پاس دیکھا ہے۔ کیا حال ہی میں یہ تمہارے ہتھے چڑھی ہے؟''

اس فلیٹ میں پیش آنے والے سفید چیتے کے واقعے سے کبیر شاہ واقف تھا۔ ازاں بعد جسے میں نے ساحل کے خواب سے تعبیر کر کے بات بتالی تھی۔ بلی کو واقعی اس نے میرے پاس نہیں دیکھا تھا۔ جب میں ڈارلنگ کے ساتھ لیلیٰ کے بنگلے سے ساؤتھ آیا تھا تو اس شیطان کی خالہ نے بڑی مہارت سے خود کو روپوش کر لیا تھا۔ کبیر شاہ کے سوال کے جواب میں، میں نے مختصراً کہا۔

''ہاں، شاہ جی! ڈارلنگ سے نئی نئی دوستی ہوئی ہے۔''

''آخر یہ ہے کون؟''

''ڈارلنگ کے معنی نہیں جانتے ہو؟''

''محبوبہ!'' اس نے کہا۔

''بالکل درست۔'' میں نے دو ٹوک انداز میں کہا ''ڈارلنگ نامی یہ سفید بلی میری محبوبہ ہے۔''

''میاؤں!'' میرا جملہ ختم ہوتے ہی لاؤنج میں ایک مخصوص آواز ابھری۔

کبیر شاہ نے حیرت آمیز لہجے میں کہا ''اوہو! تو موصوفہ تمہارے آس پاس ہی ہے؟''

''ڈارلنگ اس وقت میری گود میں بیٹھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''محبوبہ کو ہر وقت، چاہنے والے کی آغوش ہی میں رہنا چاہیے۔'' وہ چہک کر بولا پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔

کبیر شاہ نے یہ جملہ روا روی میں ادا کیا تھا مگر اس کا یہ سرسری انداز مجھے جھنجوڑنے کے لیے کافی تھا۔ یک بہ یک میرا خیال ساحل کی جانب پرواز کر گیا۔ میں پچھلے کچھ عرصے سے ساحل کو چاہنے لگا تھا، یہ کہ کبھی وہ مجھے اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش میں رہتی تھی اور میں دانستہ اسے نظر انداز کرتا چلا آیا تھا۔ مجھے بہت بعد میں یہ احساس ہوا کہ میں اسے چپکے چپکے چاہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری چاہت اس پر کھلتی، ساحل کے رویے میں اچانک ایک ناخوشگوار تبدیلی واقع ہو گئی۔ وہ بڑی خوبصورتی سے گریز کی راہ پر چلنے لگی۔ ہم دونوں ریل کی پٹریوں کی طرح پہلو بہ پہلو محوِ سفر تھے اور ہمارے درمیان حائل چند فٹ کا فاصلہ برقرار تھا۔ یہ فاصلہ ایک بے رحم زنجیر کے مانند تھا۔ ایک ایسی نادیدہ زنجیر جو بڑے کروفر سے تنی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی لچک تھی اور نہ ہی کوئی پیچک۔ یہ سفاک اور سخت گیر زنجیر بڑی سختی گرفتی۔ ہمیں ملنے دیتی تھی اور نہ ہی بچھڑنے دیتی تھی۔ اس نے ہمیں پاس پاس رکھ کر دور دور کر دیا تھا۔

زندگی کا یہ سفر چلتے چلتے جاری تھا کہ اچانک یہ ظالم زنجیر ٹوٹ گئی، گویا پٹریوں کا ناتا ٹوٹ گیا۔ پہلے ہم ایک فاصلے پر رہتے ہوئے بھی ایک ہی سمت میں سفر کر رہے تھے لیکن وقت کے ظالم تازیانے نے ہمیں جدا کر دیا۔ اپنے مدار سے ہٹنے والے اجسام کی طرح ہمارے رخ بدل گئے تھے۔ ساحل تو پھر بھی ایک ''طے شدہ'' سمت میں آگے بڑھ رہی تھی مگر میں بے سمت ہو کر رہ گیا تھا۔

ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے میں ہیجانی کیفیت سے گزرنے لگا۔ اس وقت میری دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، دانتوں پر دانت جمے ہوئے تھے اور بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا، اگر میں کچھ دیر مزید اسی حالت میں بیٹھا رہا تو اپنے ہوش و حواس گم کر بیٹھوں گا۔ پتا نہیں..... معلوم نہیں..... میں نہیں جانتا، وہ کس طرح میرے اندر سما گئی تھی کہ میں اس کے لیے بے اختیار ہو جاتا تھا۔ میری سوچ اور جذبے کنٹرول میں نہیں رہتے تھے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ''سیلف کنٹرول'' پر عبور رکھتا ہوں لیکن ساحل کے معاملے میں، میں بے بسی کا شکار ہو جاتا تھا۔ یہ بے بسی، بے چارگی اور بے اختیاری مجھے مار ڈالے گی، اگر میں نے جلد از جلد ساحل تک پہنچنے کی کوشش نہ کی تو!

یہ آخری جملہ ایک سوال بن کر میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ یہ ایک خوفناک وارننگ تھی، ایک کھلا چیلنج تھا اور میں ہمیشہ سے چیلنج قبول کرتا آیا ہوں۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے لاؤنج میں ٹہلنے لگا۔ ساحل کے بارے میں جذباتی انداز سے سوچتے ہوئے میں نے اپنے اندر کسی اور وجود کو بیدار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ وجدان انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا جو بہت ہی سرکش اور ضدی تھا۔ وہ ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر سوچتا تھا اور مقصد کے حصول کے لیے ہر معاملے میں بے خطر کود پڑتا تھا۔ میں نے اس وجدان کے معرکہ آرا کارنامے بھی دیکھے تھے اور بعد میں خود بھی حیران ہوا تھا کہ کیا واقعی یہ سب کچھ میں نے کیا ہے؟

اس وقت میرے ذہن میں سرکش اور انتقامی خیالات کا میلا لگا ہوا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں فیصلہ کیا، کوئی ضروری نہیں کہ میں قدم قدم پر شعیب غوری اور ''سی ایف کے'' کی انگلی پکڑ کر چلوں۔ دوستوں سے مشورہ اور مدد لینا اچھی بات ہے لیکن میں ساحل کی تلاش کو صرف اور صرف خود تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا، اس سلسلے میں ہر اقدام میں

[illegible] تنہا کروں گا۔ ان نتیجہ خیز اور ولولہ انگیز خیالات کی روشنی [illegible]، میں نے اپنے ذہن میں ایک فوری اور اٹل ارادہ باندھ [illegible] یا۔ یہ کہ..... کراچی چھوڑنے سے قبل میں میاں زاہد حسین کو [illegible] برت ناک انجام سے دوچار کروں گا۔ اس کے انگشت بہ [illegible] دان حشر کو دیکھ کر کراچی سرکٹ میں کھلبلی مچ جائے گی اور [illegible] ہنگامہ ہو گا جس کی گونج کراچی سے ''رکھاں والی'' تک [illegible] ائی دے گی۔ یہ ایک طرح کا ٹیلی گرام ہو گا جو میں رکھاں [illegible] ں میں اپنی آمد کی اطلاع کے طور پر چوہدری نوازش علی کو [illegible] وانہ کروں گا۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا اور میاں زاہد کو تلاش کرنا [illegible] ت مشکل! مگر ان لمحات میں میرے دماغ کی ڈکشنری بدل [illegible] ئی تھی۔ نئی ڈکشنری میں ''مشکل'' اور ''ناممکن'' کے الفاظ [illegible] ج نہیں تھے۔ میں نے اس ڈکشنری کے اوراق الٹتے ہوئے [illegible] تھی کا میابی یعنی ''فتح'' کو سرکل کیا اور ڈکشنری بند کر دی۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک [illegible] ت کی مہلت تھی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے لیے [illegible] ہا مضبوط اور مربوط پلاننگ کرنے لگا۔ سب سے پہلا مرحلہ [illegible] یاں زاہد کی تلاش کا تھا۔ میرے ذہن نے فوراً اس مسئلے کا حل [illegible] ش کر دیا، گویا میرا ذہن پوری طرح فعال ہو چکا تھا۔ اپنی [illegible] پلاننگ کے مطابق مجھے کچھ ابتدائی انتظامات کرنا تھے جن کے [illegible] لیے دو ڈھائی گھنٹے کافی تھے۔ حسبِ وعدہ کبیر شاہ نے ٹکٹ اور [illegible] ضروری کاغذات مجھے بھجوا دیے تو میں انتظامات میں جُت [illegible] گیا۔

[illegible] میں نے شیرڈ نکالی اور ڈارلنگ کی ہمراہی میں مارکیٹ کا [illegible] ایک چکر لگایا۔ ضروری خریداری کے بعد میں نے ایک ہیئر [illegible] سیلر سے کٹنگ کروائی۔ میری ہدایت پر اس نے مجھے سولجر بنا [illegible] دیا۔ اس کے ہاتھوں کی جنبش، انگلیوں کی حرکات و سکنات اور [illegible] شینے میں ابھرنے والے اپنے عکس کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا [illegible] وہ ہیئر ڈریسر ''سولجر کٹ'' میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد میں اپنے فلیٹ پر موجود تھا۔ میں نے [illegible] بلے اپنا سفری بیگ تیار کیا۔ تمام ضروری سامان اور کاغذات [illegible] ا میں رکھے۔ آن لائن بینکنگ سے استفادہ کرنے کی [illegible] چابی'' بھی میرے پاس موجود تھی۔ اس کے علاوہ کیش کی [illegible] صورت میں بھی اچھی خاصی رقم میرے پاس تھی۔ اس کے بعد [illegible] نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ آئینے کے سامنے جا کر میں نے اپنا [illegible] زہ لیا تو حیران رہ گیا۔ حلیے کے اعتبار سے اب میں چند گھنٹے پہلے والا وجدان نہیں رہا تھا، ویسے مزاج اور ارادوں کے حوالے سے بھی میں بہت بدل چکا تھا۔ یہ سب آثار تھے کسی بہت بڑے طوفان کے۔

میں نے بلیو جینز پر سرخ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بھاری بھرکم آرمی شوز تھے۔ گزشتہ چند ماہ میں میری مونچھیں اچھی خاصی بڑی ہو گئی تھیں۔ سولجر کٹ کی وجہ سے بھی

محی الدین نواب کی دل میں اتر جانے والی شاہکار کہانیوں کا مجموعہ
ایمان کا سفر
نیا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے
مضبوط جلد — کمپیوٹرائزڈ کتابت
قیمت -/150 روپے ● ڈاک خرچ -/25 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23
کراچی 74200
5802551 فون: 5802552-5895313
Email: kitabiat1970@yahoo.com

مقبول ترین مصنف محی الدین نواب
جن کی کہانیاں آنکھوں سے نہیں دلوں سے پڑھی جاتی ہیں
⑧ بہترین کہانیوں کا مجموعہ
کچرا گھر
کا نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے
کمپیوٹرائزڈ کتابت — قیمت 100 روپے ڈاک خرچ 25 روپے — خوبصورت ٹائٹل
محی الدین نواب کی کہانیوں کا یہ مجموعہ "ایمان کا سفر" بھی دستیاب ہے
کتابیات پبلی کیشنز
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
Email: kitabiat1970@yahoo.com

میرے حلیے میں اچھی خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ آنکھوں پر میں نے سیاہ شیشوں والا ایک اسمارٹ سا چشمہ لگا لیا تھا اور گلے میں طلائی چین بھی ڈال لی تھی۔ یہ ایک بدلا ہوا جدان تھا..... جو بہت کچھ بدلنے جا رہا تھا۔

آئندہ دس منٹ بعد میں اپنے فلیٹ میں نہیں تھا۔ نیلی شیرڈ کے ذریعے میں صدر کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے گاڑی کو عبداللہ ہارون روڈ کے ایک مناسب مقام پر چار جڈ پارکنگ میں کھڑا کیا اور اپنا بیگ اٹھا کر اس ہوٹل کی جانب بڑھ گیا جہاں چند ماہ قبل میں، ساحل اور میر بخش کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ میاں زاہد حسین اس ہوٹل کے حصے داروں میں سے ایک تھا۔

میں نے ہوٹل کے ریسیپشن پر پہنچ کر اپنا تعارف کروایا۔ ''میرا نام موہن ہے۔ میں میاں زاہد حسین سے ملنا چاہتا ہوں۔''

استقبالیہ کلرک نے پوچھا ''تم کس سلسلے میں میاں جی سے ملنا چاہتے ہو؟''

میں نے گفتگو کا آغاز چوں کہ انگلش میں کیا تھا اس لیے جواباً وہ بھی اسی زبان میں بول رہا تھا۔ اس کی انگلش خاصی ''صحت مند'' تھی..... یعنی کہ موٹی تھی!

میں نے کہا ''مجھے میاں جی سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ پلیز، تم اس سے میری بات کروادو۔''

''دیکھو مسٹر موہن!'' استقبالیہ کلرک نے کہا ''میاں جی ہوٹل میں نہیں ہوتے۔ اس لیے ان سے ملاقات ممکن نہیں۔''

میں نے برہمی سے کہا ''یہ بات میں بھی جانتا ہوں، میاں زاہد چوبیس گھنٹے اس ہوٹل میں بیٹھا نہیں رہتا ہوگا۔ وہ ہوٹل کا حصے دار ہے، کبھی کبھار ہی یہاں کا چکر لگاتا ہوگا۔ تم فون پر اس سے میری بات کروادو۔''

''مجھے معلوم نہیں، میاں جی سے اس وقت کہاں فون پر بات ہوسکتی ہے۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ میرے جارحانہ رویے نے اسے خاصا نرم کر دیا تھا۔

میں نے چاروں جانب دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا ''تم مجھے کسی ذمے دار شخص سے تو ملوا سکتے ہو نا۔ مثلاً ہوٹل منیجر.....؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''یس سر! آپ اس طرف چلے جائیں۔'' پھر اس نے ایک جانب اشارہ کیا ''منیجر صاحب اس کمرے میں بیٹھتے ہیں۔''

میں فوراً ہوٹل منیجر چوہدری جمل کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ میں دراصل بھولا ناتھ کا دوست ہوں۔ چند روز قبل سنگاپور سے آیا ہوں یہاں میں اپنے ایک دوست امرناتھ کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں جو گارڈن ویسٹ میں رہتا ہے۔ بھولا ناتھ نے مجھے میاں زاہد سے ملنے کو کہا تھا مگر باوجود کوشش کے ابھی تک میری میاں زاہد سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ کل صبح کی فلائٹ سے میں واپس سنگاپور جا رہا ہوں۔ میرے پاس صرف آج رات کا وقت ہے، اگر میاں زاہد سے چند منٹ کی ملاقات ہو جائے تو اس میں ہم دونوں کا ہی بھلا ہے۔ بصورتِ دیگر دونوں شدید نقصان اٹھائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

پوری بات سننے کے بعد منیجر نے کہا ''تم کس سلسلے میں میاں جی سے ملاقات کرنا چاہتے ہو؟''

''یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔'' میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا ''معاملہ بہت ہی سنگین اور رازداری کا ہے۔ پلیز، آپ اصرار نہ کریں اور فوراً میاں جی سے میرا رابطہ کروا دیں۔''

ہوٹل منیجر ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''مسٹر موہن! تم نے بتایا ہے کہ کوشش کے باوجود بھی ابھی تک میاں جی سے تمہاری ملاقات نہیں ہوسکی۔ تم نے انہیں کہاں تلاش کیا تھا؟ کیا تم اس سلسلے میں پہلے بھی ہوٹل آ چکے ہو؟''

''اس ہوٹل میں، میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔'' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا ''بھولا ناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے ''بی۔ تھری ایٹ'' میں قیام کرے گا اور یہاں پہنچتے ہی وہ مجھ سے رابطہ کرے گا۔ واضح رہے کہ میں بھولا ناتھ سے تین روز پہلے یہاں آیا تھا۔ جب بھولا ناتھ نے مجھ سے کوئی کانٹیکٹ نہیں کیا تو میں مذکورہ بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ آ کر کہیں جا چکا ہے۔ مجھے یہ جواب سن کر حیرت بھی ہوئی۔ بھولا ناتھ نے تو مجھے میاں جی سے ملوانا تھا۔ وہ کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی سنگاپور سے یہاں آیا تھا جس کا نام جمال تھا۔'' میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''میرا واپس جانا بھی ضروری ہے اور اگر میں میاں زاہد سے ملے بغیر واپس چلا گیا تو شدید نوعیت کا نقصان ہوسکتا ہے۔ مجھے بھولا ناتھ کی زبانی پتا چلا تھا کہ یہ ہوٹل میاں زاہد کی ملکیت ہے۔ امید کی آخری کرن کے سہارے یہاں آیا ہوں۔ اب تو آپ میری مجبوری اور ضرورت کو سمجھ گئے ہوں گے؟''

میں بات ختم کر کے سوالیہ نظروں سے ہوٹل منیجر چوہدری جمل کو دیکھنے لگا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ وہ ایک

جہاندیدہ شخص دکھائی دیتا تھا لیکن میں نے بھی اتنی بھرپور کہانی سنائی تھی کہ وہ میرے لیے کچھ کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے مجھے ہوٹل کی لابی میں انتظار کرنے کو کہا اور خود ٹیلی فون کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

یہ ''مصروفیت'' وہ میری موجودگی میں بھی جاری رکھ سکتا تھا۔ اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میاں جی کو ٹریس کرنے کی کارروائی کو وہ مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دانستہ اسے ایسی مبہم اور چکر دار کہانی سنائی تھی کہ وہ میری حیثیت کا اندازہ نہ لگا سکے مگر میاں زاہد سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی دکھائی دے رہی تھی۔ جب میں نے چوہدری جمل کے سامنے ''بی۔ تھری ایٹ'' اور جمال کا ذکر کیا تو اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی تھی تاہم زبان سے اس نے کوئی اظہار یا استفسار نہیں کیا۔ میں اسے اپنی اہمیت کا احساس دلانے میں کامیاب رہا تھا۔

دس منٹ کے بعد ہوٹل منیجر نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میں وہاں پہنچا تو اس نے کہا ''ایسا ہے کہ میاں جی سے تمہاری بات ہوگئی ہے۔ وہ تمہیں صرف آدھا گھنٹا دینے کو تیار ہیں۔''

''کیا وہ یہاں آ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' منیجر جمل نے نفی میں گردن ہلائی ''انہوں نے تمہیں ڈیفنس کلینک پر بلایا ہے۔'' پھر اس نے مذکورہ کلینک کا ایڈریس بتانے کے بعد کہا ''ٹھیک نو بجے تم وہاں پہنچ جاؤ۔ ساڑھے نو بجے میاں جی کا ڈینٹسٹ سے اپائنٹمنٹ ہے۔ وہ نو بجے ساڑھے نو بجے کے درمیانی آدھے گھنٹے میں تم سے ملاقات کرلیں گے لیکن وقت کا خیال رکھنا۔ وہ بہت ہی پنکچوئل ہیں۔''

''میں خود بھی ایسا ہی ہوں۔'' میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''اس وقت آٹھ بجے ہیں۔ نو بجنے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ میں بہ آسانی اس کلینک پر بروقت پہنچ سکتا ہوں۔''

چوہدری جمل نے پوچھا ''وہاں جانے کے لیے تمہارے پاس سواری کا بندوبست ہے یا میں ٹیکسی منگوا دوں؟''

میں نے دانستہ جھوٹ بولا ''میرے پاس سواری وغیرہ ہے۔ میں ٹیکسی میں وہاں جاؤں گا لیکن اس سلسلے میں آپ زحمت نہ کریں۔ میں خود چلا جاؤں گا۔ ابھی میں صدر میں بھی کچھ خریداری بھی کروں گا۔''

''ایز یو لائیک'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا پھر پوچھا ''تم نے بتایا ہے کہ میاں جی سے یہ تمہاری فرسٹ میٹنگ ہوگی۔ تم کلینک میں انہیں کیسے پہچانو گے؟''

میں نے اسے یقین دلانے کے لیے اپنے چہرے پر پریشانی کے آثار تخلیق کیے تاکہ وہ مجھے میاں زاہد کا صورت ناآشنا ہی سمجھتا رہے ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ میں میاں زاہد کے نقش و نگار اور حلیے کو اپنے ذہن میں ''لاک'' کر چکا تھا۔ شعیب غوری نے پہلی ملاقات میں مجھے اس کی تصویر بھی دکھائی تھی۔ اگرچہ میں نے اس سے پہلے میاں زاہد کو نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ میں اسے پہلی ہی نظر میں بخوبی پہچان لوں گا۔ میں نے کہا ''ہاں، یہ پرابلم تو ہوگی!''

میری الجھن کے پیش نظر چوہدری جمل نے کہا ''ویسے تو میں نے میاں جی کے حکم پر انہیں تمہارا حلیہ تفصیلاً نوٹ کروا دیا ہے۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیں گے لیکن انہوں نے جو مشورہ دیا ہے تمہیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔''

''کیا مشورہ دیا ہے میاں زاہد نے؟'' میں نے پوچھا۔

جمل نے بتایا ''ڈینٹل کلینک کی ریسیپشنسٹ کا نام حنا ہے۔ وہ دبلی پتلی لڑکی میاں جی کو اچھی طرح جانتی ہے۔ تم اس سے ان کے بارے میں پوچھ لینا۔ میاں جی ٹھیک نو بجے کلینک کے ویٹنگ روم میں موجود ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں میاں زاہد کے مشورے پر عمل کروں گا۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا اور منیجر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ جب میں ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ چکا تو ڈارلنگ اچانک ایک طرف سے نمودار ہو کر میرے پاس آ گئی۔ وہ گاڑی سے ہوٹل تک بھی میرے ساتھ آئی تھی مگر ہوٹل کے اندر داخل ہونا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

میں دو چار گلیوں میں گھومنے کے بعد اپنی شیرڈ کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ ہوٹل سے نکلنے کے بعد کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ میں نے ڈارلنگ کو پسنجر سیٹ پر سوار کرایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں عبداللہ ہارون روڈ سے نکل کر کلفٹن کی جانب جا رہا تھا۔ مذکورہ ڈینٹل کلینک کلفٹن ایسے پوش اور باروق علاقے میں واقع تھا۔

اس وقت میں بڑے تسلسل کے ساتھ میاں زاہد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بڑی چالاکی کے ساتھ چوہدری جمل سے میرا حلیہ معلوم کر لیا تھا لیکن مجھے اس کے حلیے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، میاں زاہد اچھی طرح دیکھ بھال کر مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر اسے میرے بارے میں کسی قسم کا شبہ ہو جاتا تو وہ پردے میں

رہ کر کوئی بھی خطرناک چال چل سکتا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں نے فیصلہ کیا کہ میں قبل از وقت اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاؤں گا اور نو بجنے سے پہلے میں وہاں کا تنقیدی جائزہ بھی لے لوں گا۔ کلینک میں داخل ہونے اور ریسپشنسٹ سے میاں زاہد کے بارے میں استفسار کرنے کے بارے میں حالاتِ موجودہ کے مطابق ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ بہت ہی نازک سچویشن تھی اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

صدر سے اس ڈینٹل کلینک تک بہ سہولت پچیس منٹ کی ڈرائیو تھی۔ میں نے تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے یہ فاصلہ پندرہ منٹ میں طے کرلیا۔ جب میں مطلوبہ کلینک پہنچا تو میری رسٹ واچ آٹھ بیس کا وقت بتا رہی تھی گویا میاں زاہد کی آمد میں ابھی چالیس منٹ باقی تھے۔ اگر وہ دس منٹ پہلے بھی آجاتا تو پھر بھی آدھا گھنٹا پڑا تھا۔

میں نے کلینک کے سامنے گاڑی روکی نہیں بلکہ دھیمی رفتار سے آگے بڑھا لے گیا۔ اس دوران میں، میں گردونواح کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ کلینک کے سامنے، سڑک کی دوسری جانب ایک بہت بڑا ڈپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ وہ اسٹور مجھے آئیڈیل جگہ لگی۔ اس کے اندر رہتے ہوئے میں بہ آسانی کلینک میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ اس وقت کلینک کے آگے تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں جو ظاہر ہے وہاں آنے والے مریضوں ہی کی ہوسکتی تھیں۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے شیرڈ کو واپس موڑ لیا اور ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے سے گزر کر دوبارہ کلینک والی سمت میں آگیا۔ میں نے سوچا، ابھی کافی وقت ہے لہٰذا ایک نظر اندر جھانک کر دیکھ لینا چاہیے کہ وہاں کا لے آؤٹ کیا ہے..... اور وہاں موجود افراد میں کہیں میاں زاہد حسین تو شامل نہیں! کلینک کی نگرانی سے قبل یہ جاننا بہت ضروری تھا۔

میں نے شیرڈ کو کلینک کے آگے کھڑی گاڑیوں کے ساتھ پارک کردیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہنگامی صورتِ حال میں مجھے وہاں سے فوراً نکلنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ ہو۔

چند سیکنڈ میں، میں کلینک کے اندر سے راؤنڈ لگا کر باہر آچکا تھا۔ کلینک کے ویٹنگ روم میں میاں زاہد موجود تھا اور نہ ہی مجھے کوئی مشتبہ چہرہ نظر آیا۔ ڈارلنگ شیرڈ کے اندر بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی پشت کو پیار سے سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''ڈارلنگ! تم اس مشن میں میرے ساتھ رہوگی یا گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کروگی؟''

اس نے بڑے سُریلے انداز میں آواز نکالی ''میاؤں''۔

میں اس آواز کو ''ہاں یا ''نہ'' میں سے کسی بھی خانے میں فٹ نہ کرسکا۔ اس سے درست جواب کے لیے تھوڑی سی ذہنی جمناسٹک کرنا پڑتی تھی۔ میں نے بدستور اس کے نرم وملائم اور گداز بدن کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''ڈارلنگ! تمہاری ''میاؤں'' خاصی معنی خیز ہوتی ہے۔ میری بات دھیان سے سنو۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''میں گاڑی کو یہاں چھوڑ کر سامنے والے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں جارہا ہوں۔ اگر تم گاڑی کے اندر ہی میرا انتظار کرنا چاہتی ہو تو آرام سے سیٹ پر بیٹھی رہنا..... اور اگر میرے ساتھ جانا چاہتی ہو تو گاڑی سے باہر آجاؤ۔''

بات ختم کرتے ہی میں دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ ڈارلنگ نے اپنی مخصوص آواز میں ''میاؤں'' کیا اور چھلانگ لگا کر میرے قدموں کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے اپنا فیصلہ سنادیا تھا۔ میں سڑک پار کرکے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے نزدیک آگیا۔ ڈارلنگ کو اس طرف پہنچانے کے لیے مجھے کوئی کوشش نہیں کرنا پڑی۔ وہ ایسے مواقع پر مجھے کسی قسم کی زحمت نہیں دیتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ایک جانب چل گئی۔

میں اس کی اداؤں کو اب خاصا سمجھنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر میرے قریب رہتی تھی جیسے کوئی سراغ رساں نگرانی پر مامور ہو۔ وہ ''حاضر غائب'' کی فلاسفی سے بھی بخوبی واقف تھی۔ جب مناسب سمجھتی، میرے نزدیک آجاتی اور جب نامناسب خیال کرتی، میری نظر سے اوجھل ہوجاتی۔ ایسی سمجھدار بلی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ڈپارٹمنٹل اسٹور خاصا کشادہ تھا لہٰذا وہاں اچھا وقت گزارا جاسکتا تھا۔ میں نے وہاں رکھی اشیائے بے بہا کا اس طرح جائزہ لینا شروع کیا کہ شیشے کے پار کلینک کا منظر مجھے واضح نظر آتا رہے۔ مجھے وہاں ''مصروف'' دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کلینک کی نگرانی کررہا ہوں۔

پونے نو بجے میری مراد بر آئی۔ میں نے چونک کر اس سیاہ لینڈ کروزر کو دیکھا جو میری شیرڈ کے برابر آکر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نئے ماڈل کی ایک ہیوی گاڑی تھی جس کے شیشے بھی سیاہ ہی تھے۔ میں تن کر پوری توجہ سے جیپ کو دیکھنے لگا۔

لینڈ کروزر کے دروازے کھلے اور تین افراد آگے پیچھے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک باس ٹائپ شخص تھا لیکن وہ میاں زاہد حسین ہرگز ہرگز نہیں تھا۔ میاں زاہد پستہ قامت اور سیاہ رنگ تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی، مکاری سے بھری ہوئی اور جسم مائل بہ فربہی تھا مگر میں نے جس باس ٹائپ شخص کا ذکر کیا ہے، وہ دراز قامت، گندمی رنگت اور موٹی آنکھوں کا مالک تھا۔ اس کا جسم بھی بالکل فٹ تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا پرنس سوٹ پہن رکھا تھا جس پر گولڈن کڑھائی واضح نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ باقی دو افراد تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی جب کہ دوسرا نہتا دکھائی دیتا تھا۔ کلاشنکوف بردار محافظ لینڈ کروزر کے نزدیک ہی رک گیا جبکہ پرنس سوٹ والا دوسرے شخص کے ساتھ کلینک کے اندر داخل ہوگیا۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ میرے ہی استقبال کے لیے وہاں پہنچے تھے۔

میں اپنی جگہ موجود رہا اور گہری نظر سے لینڈ کروزر کو دیکھتا رہا۔ کلاشنکوف بردار کی حیثیت گارڈ کی سی تھی اور وہ اس وقت جیپ کے ڈرائیور سے باتیں کررہا تھا۔ مزید پندرہ منٹ بھی گزر گئے مگر زاہد حسین کی صورت مجھے نظر نہ آئی۔ نو پانچ پر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ نہیں آئے گا۔ اس نے مجھے چکما دینے اور میری حقیقت جاننے کے لیے آدمی بھیج دیے تھے۔

میں ڈپارٹمنٹل اسٹور سے نکل آیا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر کلینک کے سامنے پہنچ گیا۔ چوہے بلی کے اس کھیل میں، میں پوری طرح اِن ہوگیا۔ میں نے اپنے ذہن کو ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار کیا اور پُراعتماد قدم اٹھاتے ہوئے ڈینٹل کلینک میں داخل ہوگیا۔

تھوڑی دیر پہلے میں جھانک کر جا چکا تھا۔ اس وقت ریسپشنسٹ اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔ میں سیدھا حنا نامی اس نیلی پتلی لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ذرا گھبرا چونکی، اس کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ کچھ شک گزرا کہ اسے میرے حلیے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ یہ ناممکن نہیں تھا۔

میں نے حنا سے کہا ''میں موہن ہوں اور میاں زاہد حسین سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے دانستہ اپنی آواز بہت دھیمی رکھی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے، وہ ٹھیک نو بجے یہاں موجود ہوں گے۔ کیا میں ان سے ملاقات کرسکتا ہوں؟''

''وہ آپ کا انتظار کررہے ہیں۔'' حنا نے جواب دیا پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی ''میاں جی وہاں تشریف رکھتے ہیں۔''

میں نے اس کے اشارے کا نگاہی تعاقب کیا اور میری نظر پرنس سوٹ والے دراز قامت شخص پر جا کر رک گئی۔ مجھے اپنا جانب متوجہ پا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھی نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں اس دوران میں ان کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ میں نے باری باری ان سے مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام موہن ہے۔ میں سنگاپور سے آیا ہوں۔''

پرنس سوٹ والے نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا ''جب تم کلینک میں داخل ہوئے تو میں سمجھ گیا تھا، تم ہی موہن ہو۔ جمل نے مجھے تمہارا حلیہ بڑی تفصیل سے بتادیا تھا۔'' ایک لمحے کا توقف کرکے اس نے اضافہ کیا ''میں میاں زاہد حسین ہوں۔''

وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ ایک فیصد بھی میاں زاہد حسین نہیں تھا، گویا میاں زاہد نے مجھے اُلو بنانے کے لیے اپنا کوئی نمائندہ بھیج دیا تھا۔ ایک دوسرے کو بنانے کے اس کھیل میں بازی اسی کے ہاتھ آتی جو زیادہ کامیاب اداکاری کا مظاہرہ کرتا۔ میاں زاہد کی معلومات کے مطابق میں اس کا صورت آشنا نہیں تھا لہٰذا یہ کھیل بہت مزے دار ثابت ہوتا۔

میں نے پرنس سوٹ والے سے کہا ''مجھے یہاں پہنچنے میں تھوڑی دیر ہوگئی۔ خیر کوئی بات نہیں، میں نے اپنا وقت ہی کم کیا ہے۔ میرا خیال ہے، ہمیں اصل موضوع کی طرف آجانا چاہیے۔''

''اصل موضوع یہاں ڈسکس نہیں ہوسکتا مسٹر موہن۔'' اس نے کہا ''میرا خیال ہے، کسی پُرسکون جگہ پر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

میں نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا ''لیکن ساڑھے نو بجے کا تو تمہارا ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے!''

''وہ معاملہ میں نے نمٹا دیا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''میں نے ڈاکٹر سے بات کرکے اپنا نمبر آگے لگوالیا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے سے نو بجے تک دراصل مریض آتا نہیں تھا اس لیے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں اس کلینک میں لگ بھگ سوا آٹھ بجے پہنچ گیا تھا۔

وہ مکمل کھلا جھوٹ بول رہا تھا۔ سیاہ لینڈ کروزر انہیں لے کر پونے نو بجے کلینک پہنچی تھی۔ میں نے اس جھوٹ کو اس کے گھر تک پہنچانے کی خاطر کہا۔

''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ اب سکون سے بات ہوسکے گی۔ جانا کہاں ہے؟''

وہ بولا ''میرا خیال ہے، بنگلے پر چلتے ہیں۔ تم میرے مہمان ہو۔ آج رات کا کھانا میری طرف سے ہوگا۔ وہیں چل کر بات بھی کرلیں گے۔''

میں نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے جو سنا تھا، تم اس کے بالعکس ثابت ہو رہے ہو میاں زاہد! جبل نے مجھے بتایا تھا کہ تم بہت مصروف آدمی ہو، وقت مقررہ سے ایک سیکنڈ زیادہ مجھے نہیں دے سکو گے۔''

''تم نے میرے بارے میں بالکل درست سنا ہے۔ میں ایسا ہی بندہ ہوں۔'' وہ کلینک سے باہر نکلتے ہوئے بولا ''لیکن تم اتنی دور سے آئے ہو اور تمہارے ذہن میں میرے فائدے کا کوئی آئیڈیا بھی ہے لہٰذا تمہارے لیے تو میں وقت نکال سکتا ہوں۔ ویسے بھی تم کل واپس جا رہے ہو، آج کا ڈنر تو میرے ساتھ ہوگا۔'' ذرا سا توقف کر کے اس نے کہا ''مجھے حیرت ہے، بھولا ناتھ نے تمہارا ذکر کیوں نہیں کیا؟''

''اس سلسلے میں، میں بھی الجھا ہوا ہوں۔'' میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی پریشانی طاری کرتے ہوئے کہا ''بی۔ تھری ایٹ سے مجھے پتا چلا ہے، وہ لوگ واپس سنگاپور چلے گئے ہیں۔''

اس نے کہا ''ہاں، بھولا ناتھ اور جمال دو دن بعد واپس چلے گئے تھے۔''

وہ ان لوگوں کی واپسی کا ذکر کر رہا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ وہ سنگاپور نہیں بلکہ عدم پور روانہ ہو چکے تھے لیکن اس موقع پر مجھے اپنی معلومات کا دریا نہیں بہانا تھا لہٰذا خاموش رہا۔ ہم سب چلتے ہوئے سیاہ لینڈ کروزر کے قریب آ گئے۔ گن بردار ڈرائیور فوراً مستعد ہو گئے۔ میری نیلی شیرڈ، لینڈ کروزر کے قریب برابر میں کھڑی تھی۔ میں نے اس کو نظر کی زبان میں ''اللہ حافظ'' کہا اور نقلی میاں زاہد کے ساتھ لینڈ کروزر کے اندر بیٹھ گیا۔

گن بردار نے پسنجر زسیٹ سنبھال لی۔ میں اور نقلی میاں زاہد درمیانی سیٹ پر تھے جب کہ ان کا تیسرا ساتھی عقبی نشست پر خاموش بیٹھا تھا۔ جیپ میں ہم پانچوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ لینڈ کروزر نے بڑے دھواں دھار انداز میں اپنے سفر کا آغاز کیا اور صاف ستھری سڑکوں پر پھسلتی ہوئی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئی۔

اس سفر کا اختتام ڈیفنس سوسائٹی کے ایک ایسے فیز میں ہوا جو ابھی پوری طرح آباد نہیں تھا۔ یہ فیز سمندر سے بہت قریب تھا۔ اسے ''سی سائیڈ'' کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اس علاقے میں زیادہ تر بنگلے زیر تعمیر تھے اور ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر واقع تھے۔ تمام تر تعمیری مراحل سے گزرنے والے بنگلوں کی تعداد بہت کم تھی۔ سیاہ لینڈ کروزر جس بنگلے کے سامنے جا کر رکی، وہ پوری طرح تیار تھا۔ اس کے آس پاس کافی دور تک کوئی بنگلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس سیٹنگ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ کسی سخت قسم کے ''انٹرویو'' کے لیے مجھے یہاں لائے ہیں اور عین ممکن تھا، میاں زاہد حسین بھی اسی بنگلے کے کسی کونے کھدرے میں چھپا بیٹھا ہو۔ پتا نہیں کیوں، میرا دل کہتا تھا کہ یہاں میاں زاہد سے ضرور سامنا ہو گا۔ یہ میری چھٹی حس کا پیغام تھا یا پھر ''جی'' کی کارفرمائی، یہ فیصلہ کرنے سے میں قاصر تھا۔ جب ڈینٹل کلینک پر لینڈ کروزر آ کر رکی تھی تو بھی میرے اندر سے یہ آواز آئی تھی کہ اس جیپ میں میاں زاہد کے آدمی آئے ہیں حالانکہ ایسا کوئی ثبوت سامنے موجود نہیں تھا۔ میرے ذہن نے بڑی درست اطلاع دی تھی۔

میں ان دنوں ''جی'' کی ایڈوانس مشق بڑی باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ ممکن ہے، اس مشق کی وجہ سے میرے کسی باطنی حواس میں تحریک پیدا ہو گئی ہو! بہرحال، یہ جو کچھ بھی تھا، میرے لیے سودمند ثابت ہو رہا تھا۔ اگر میری اس صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا تو ساحل تک پہنچنا میرے لیے بہت آسان ہو جاتا۔

ساحل کے تصور نے میرے دل کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، اگر مزید کچھ لمحے مجھ پر یہی کیفیت طاری رہی تو میں ڈھے جاؤں گا..... اور مجھے اس نازک مرحلے پر پوری طرح ہوش و حواس میں رہنا تھا۔ میاں زاہد نے ساحل کو مجھ سے جدا کیا تھا۔ میں اس وقت میاں زاہد کے بہت قریب پہنچ چکا تھا..... اور یہ ''قربت'' مجھے ساحل تک پہنچا سکتی تھی۔

نقلی میاں زاہد نے مجھے ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ میں نے ایک دبیز و آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر اپنا سفری بیگ کارنر ٹیبل پر رکھ دیا۔ نقلی میاں زاہد ایک منٹ کے لیے باہر گیا پھر واپس آ کر میرے سامنے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ ہمارے درمیان سینٹرل ٹیبل موجود تھی جس پر ایک نفیس قسم کی کرسٹل ایش ٹرے رکھی تھی۔ ہمارے ساتھ آنے والے دیگر افراد بنگلے کے اندرونی حصے میں کہیں غائب ہو گئے۔ ڈرائنگ روم میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

نقلی میاں زاہد حسین نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''کھانا آدھے گھنٹے کے بعد لگا دیا جائے گا۔ میں نے اس کے لیے خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ اس وقفے میں ہم کچھ بات چیت کر لیتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے مسٹر موہن؟''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے ڈرائنگ روم کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہا ''پہلے اہم باتیں، پھر کھانا چلے گا۔''

میرے دائیں ہاتھ پر ڈرائنگ روم کی دیوار میں ایک

کھڑکی موجود تھی جس پر قیمتی دبیز پردہ لٹک رہا تھا۔ بائیں ہاتھ کی دیوار میں وہ دروازہ تھا جس سے گزر کر میں اندر آیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں آمد و شد کے لیے وہی واحد دروازہ تھا۔ سامنے والی دیوار میں واش روم کا دروازہ تھا۔ واش روم کمرے کے ایک کونے میں واقع تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے وقت وہ بائیں ہاتھ پر پڑتا تھا۔

نقلی میاں زاہد نے مجھ سے پوچھا ''مسٹر موہن! اب بتاؤ، تم مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے؟''

میں نے فوری طور پر سوچی ہوئی ایک فرضی اور پُر اثر کہانی اسے مختصر الفاظ میں سنا ڈالی جس کے مطابق، میں اس کے لیے سنگاپور میں ایک زبردست سینڈیکیٹ کے قیام کا منصوبہ لے کر آیا تھا۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہاں کا نظم و نسق میں بہت اچھے طریقے سے سنبھالوں گا۔ ایک اسمگلر اور جرائم پیشہ کو کسی مجرمانہ کام کی پیشکش کر کے ہی شیشے میں اتارا جا سکتا تھا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور بولا ''تمہارا آئیڈیا تو اچھا ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف کر کے اس نے اچانک پوچھا ''تم سنگاپور میں کس جگہ رہتے ہو مسٹر موہن؟''

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا ''لٹل انڈیا۔''

''اوہ!'' اس نے ایک طویل سانس خارج کی ''میں نے اس علاقے کے بارے میں سنا ہے۔ وہاں ہندوستانیوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔''

''جبھی تو اسے چھوٹا ہندوستان (لٹل انڈیا) کہا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس دوران میں، میں چاق و چوبند بیٹھا تھا اور پوری توجہ سے نقلی میاں زاہد اور ڈرائنگ روم کی ایک ایک شے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس شخص نے مجھ سے پوچھا۔

''مسٹر موہن! تم کتنے عرصے سے سنگاپور میں رہ رہے ہو؟''

جواب دینے سے قبل میں تھوڑا سا چونکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، کھڑکی پر لٹکے ہوئے پردے میں جیسے ہلکی سی حرکت ہوئی ہو۔ میں نے اس چونکنے کو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور کہا۔

''ایک طویل عرصے سے۔ بلکہ میں تو پیدا ہی سنگاپور میں ہوا ہوں۔ میرے ماتا پتا بہت پہلے ہندوستان سے کوچ کر کے سنگاپور چلے گئے تھے۔''

''اس کا مطلب ہے، تم وہاں کے نیشنل ہو!''

''ایگزیکٹلی'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ چند لمحے گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر سنجیدگی سے بولا ''مسٹر موہن! تم سنگاپور سے یہاں آئے اور کل واپس بھی جانے والے ہو۔ تمہارے بیگ میں اس وقت تمہارا پاسپورٹ تو ہو گا؟''

اس کا سوال بڑا قیامت خیز تھا لیکن میں ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ میں نے برجستہ کہا ''پاسپورٹ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ وہ گھر میں رکھا ہے۔ میں اپنے ایک دوست امرناتھ کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں جو گارڈن ویسٹ کے علاقے میں رہتا ہے۔''

''تمہارے اس بیگ میں کیا ہے؟'' اس نے کارنر ٹیبل پر رکھے سفری بیگ کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے کہا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے صدر کے علاقے میں، میں نے کچھ شاپنگ کی ہے اس بیگ میں وہی سامان بھرا ہوا ہے۔''

''کیا میں تمہارے بیگ کی تلاشی لے سکتا ہوں؟'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس سوال پر میں نے اپنے چہرے کو برہمی کے تاثرات سے سجا لیا اور الجھن زدہ انداز میں کہا ''میں سمجھا نہیں مسٹر زاہد حسین!''

''ویری سمپل'' وہ بولا ''میں اس بیگ کے اندر جھانکنا چاہتا ہوں۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے احتجاجی انداز میں کہا۔

اسی لمحے کھڑکی کے پردے میں دوبارہ حرکت پیدا ہوئی۔ میں فوراً سے پیشتر سمجھ گیا، کھڑکی کے پیچھے کوئی موجود ہے۔ وہ پردے کی اوٹ سے مجھے دیکھ رہا تھا اور ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو بھی سن رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں، میرا خیال میاں زاہد حسین کی سمت پرواز کر گیا..... اور ایسا سوچتے ہوئے میں نے اپنے وجود میں ایک تناؤ سا محسوس کیا۔ میں اپنے شکار کے انتہائی نزدیک پہنچ چکا تھا۔ لپکنے اور جھپٹنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

نقلی میاں زاہد نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں تلاشی دینے پر اعتراض کیا ہے؟''

''یہ میری انسلٹ ہے مسٹر زاہد۔'' میں نے کہا۔

''اس میں بے عزتی والی کوئی بات نہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''تمہارے لیے نہیں ہو گی۔'' میں بھی ہتھے سے اکھڑ گیا

''لیکن میں تمہارے اس مطالبے سے بہت سبکی محسوس کر رہا ہوں۔'' پھر میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا ''میرا خیال ہے، مجھے چلنا چاہیے۔''

''تم ایسے نہیں جا سکتے مسٹر موہن۔'' وہ غرایا ''یا تم جو کوئی بھی ہو! بیگ کی تلاشی تو تمہیں دینا پڑے گی۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔ اگلے ہی لمحے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور گن بردار شخص اندر آ گیا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی کلاشنکوف کی نال کا رخ میرے سینے کی جانب کر دیا۔

''کیا ارادہ ہے مسٹر! شرافت سے بیگ میری طرف پھینکتے ہو یا میں اسلم کو زحمت دوں؟'' اس کا اشارہ کلاشنکوف بردار کی طرف تھا۔

میں نے کھڑے ہوتے ہی کارنر ٹیبل سے اپنا سفری بیگ اٹھا لیا جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے نقلی میاں زاہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔

''کسی کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے رضا کارانہ طور پر ہینڈز اپ ہوتے ہوئے کہا ''مجھے نہیں معلوم تھا، یہاں اس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ پڑے گا۔ میں تم سے مل کر مایوس ہوا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے بیگ کو اس کی طرف پھینکنے کا جھانسا دیتے ہوئے کہا ''تم خود دیکھ لو، اس بیگ کے اندر میں نے کون کون سے سانپ بند کر رکھے ہیں؟''

وہ میرے جھانسے میں آ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ بیگ کو کیچ کرنے کے ارادے سے بے اختیار آگے بڑھے لیکن اس دوران میں، میں بیگ کو گن بردار کی سمت پوری قوت سے اچھال ... چکا تھا۔

گن بردار اس غیر متوقع حرکت سے بوکھلا گیا۔ میرا سفری بیگ سیدھا اس کے ہاتھوں پر جا کر لگا تھا۔ اسی اثنا میں، میں فرنٹ رول کر کے سینٹرل ٹیبل کے اوپر سے نقلی میاں زاہد کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس کے دراز بازوؤں کے درمیان نمودار ہو کر میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار پنچ رسید کر دیا۔

وہ میری جانب سے ایسے حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ بیگ کے بجائے ایک کرنٹ دار پنچ کا تحفہ اسے ملا تو وہ چکرا کر رہ گیا۔ میں اس دوران میں گن بردار کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

بیگ کا اسٹریپ جانے کس طرح گن کی نال سے الجھ گیا تھا کہ گن بردار کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے ایک بھرپور سائیڈ کک اس کی تشریف پر جڑ دی۔ وہ بیگ اور گن سمیت سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اسے شدید قسم کی چوٹ پہنچی اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ یعنی بیگ بھی اس سے خاصے فاصلے پر پہنچ گیا۔ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوتی۔

میں نے بیگ اور گن کی جانب قدم بڑھایا تو نقلی میاں زاہد حسین میرے راستے میں آ گیا۔ وہ میرے پنچ سے سنبھل چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں کے کلاوے میں کسنے کی کوشش کی۔ میں اس کے ہاتھوں کے ملاپ سے پہلے ہی اس کی بانہوں کے گھیرے سے نکل گیا اور جواب آں غزل کے طور پر ایک جھٹکے دار بیک کک اس کے سینے پر ماری۔ وہ الٹے قدموں گن بردار پر سے جا ٹکرایا۔

میں نے لپک کر بیگ اٹھایا، اس کے اسٹریپ میں سے ایک بازو اور گردن کو گزار کر اسے اپنے جسم پر سوار کر لیا۔ اگلے ہی لمحے کلاشنکوف میرے ہاتھوں میں آ چکی تھی۔ میں نے میکانکی انداز میں گن کا رخ ان دونوں کی طرف کیا اور دہاڑ کر نقلی میاں سے کہا۔

''جس طرح شیر کی کھال پہن لینے سے گیدڑ شیر نہیں بن جاتا بالکل اسی طرح ہاس کی اداکاری کرنے سے کوئی چمچہ ہاس نہیں بن سکتا۔ بتاؤ، اصلی میاں جی کہاں ہے؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''اس کا مطلب ہے، تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں؟'' میں نے سفاکی سے گن کی نال کو ہلکی سی جنبش دی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔

''تم کون ہو؟'' وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے زہریلے لہجے میں کہا ''تمہارا باپ ہوں میں اور تمہارے سیکنڈ فادر بلکہ گاڈ فادر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ میاں زاہد حسین کے بارے میں بتاؤ، ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!''

میرے لہجے میں موت کی سی سنگینی سمٹ آئی تھی۔ اس شخص نے بے اختیار چونکی ہوئی نگاہ سے پردہ پوش کھڑکی کی جانب دیکھا۔ وہ کھڑکی میری پشت پر تھی۔ میں نے بے ساختہ اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ اس لیے بھی کہ تھوڑی دیر پہلے میں کھڑکی کے پردے میں مشکوک قسم کی حرکت نوٹ کر چکا تھا۔

کھڑکی خاموش اور اس پر پڑا ہوا پردہ ساکن تھا۔ جتنی دیر میں میری نظر کھڑکی سے پلٹ کر واپس نقلی میاں زاہد تک

پہنچتی، اسے مہم جوئی کا موقع مل گیا۔ اس نے مجھ سے گن چھیننے کے لیے چھلانگ لگا دی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو لپیٹے ہوئے قالین پوش فرش پر دور تک لڑھک گئے۔ وہ میرے ہاتھوں سے گن نکالنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ مجھے ماننا پڑا کہ اس شخص کے جسم میں کسی گینڈے جیسی طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ بڑے بھرپور جھٹکے مار رہا تھا مگر میں بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اسی چھینا جھپٹی میں ایک مرحلے پر وہ میرے نیچے آ گیا۔ میں نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اچانک کلاشنکوف پر اپنی گرفت ختم کر دی۔

گن میرے ہاتھوں سے کسی طوفان کے مانند نکلی اور اس کا دھاتی جسم، میرے نیچے دبے ہوئے شخص کے چہرے سے ٹکرایا۔ ایک کرب ناک چیخ ڈرائنگ روم کی فضا میں گونجی اور وہ کسی ذبح شدہ جانور کی طرح ہاتھ پاؤں پھینکنے لگا۔ گن ایک مرتبہ پھر دور جا گری۔

میں نے اس کے سینے سے اٹھنے سے قبل دو چار ''شافی'' پنچ اس کے مضروب چہرے پر ثبت کیے۔ وہ تکلیف کی شدت سے چلانے لگا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

میں نے بجلی کی سرعت سے پلٹ کر دیکھا۔ زخمی ''گن مین'' سنبھل چکا تھا اور کلاشنکوف کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے اس نے اس طرف چھلانگ لگائی تھی جہاں گن پڑی تھی پھر اس سے پہلے کہ کلاشنکوف اس کے ہاتھ آتی، میں نقلی زاہد حسین کے سینے پر کسی طاقت ور اسپرنگ کے مانند اچھلا اور اسلم نامی اس شخص کے سر پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں وہ گن کو اٹھا کر میری جانب سیدھا کر چکا تھا۔ میں نے ہوا میں رہتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر ایک بھرپور ضرب لگائی اور بیک سمرسالٹ (Back Somer Sault) لگاتے ہوئے کمرے کے کونے میں پہنچ گیا۔

اسی وقت فائرنگ کی مخصوص آواز گونجی۔ میرے پاؤں کی ٹھوکر کے سبب گن کا ٹریگر دب گیا تھا لیکن اس ظالم ضرب نے گن کی نال کا زاویہ بگاڑ دیا۔ اس کا رخ فرش کی جانب ہو گیا تھا چنانچہ فائرنگ کی آواز میں انسانی چیخوں کا اضافہ ہو گیا۔ کلاشنکوف کے اس برسٹ نے نقلی میاں زاہد کو چھلنی کر دیا۔ میرے وہاں نہ ہونے کے سبب وہ براہِ راست فائرنگ کی زد میں آ گیا تھا۔

یہ ایک بے ارادہ عمل تھا۔ اسلم نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی اور نشانہ کوئی دوسرا بن گیا۔ اسلم گن تھامے وحشت زدہ نظر سے اپنے ''باس'' کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اسلم کی وحشت ٹوٹنے سے قبل ہی میں نے اس پر وار کر دیا۔

میں نے ایک لانگ اسٹیپ (Long Step) سائیڈ کک اس کی کمر پر رسید کی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے چند قدم دور چلا گیا تاہم اس نے گن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ میں آگے بڑھ کر اس پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ وہ خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش کے دوران میں اسے فائرنگ کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں اسے گن سیدھی کرنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

اسی اثنا میں دروازے کے باہر دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ کوئی بھاگتے ہوئے اس طرف آ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور وہ مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اسلم کو لمبا لٹانے کے لیے اس پر دو چار خطرناک ہاتھ آزمائے۔ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں سے کلاشنکوف نکالی اور ایک لمبی جست بھر کر کھلے دروازے کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ اگر مجھے اس عمل میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو آج میں یہ داستان سنانے کے لیے زندہ نہ ہوتا لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کے مصداق میرا بال بھی بانکا نہ ہوا۔

میں نے جن دوڑتے قدموں کی آواز سنی تھی، ان قدموں کا مالک کھلے ہوئے دروازے میں نمودار ہوا اور اس نے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ہاتھ میں تھمی کلاشنکوف نے ایک مہلک قہقہہ لگایا۔ اس کا نشانہ میں تھا مگر میں نشانے پر نہیں تھا۔ لہٰذا اس فائرنگ نے اسلم کے زمین بوس وجود کو چھید ڈالا۔

نووارد حملہ آور حیرت زدہ نظر سے چاروں جانب دیکھنے لگا۔ اس کی متلاشی نگاہ کو میری تلاش تھی۔ میں نے اس کی حیرت اور تلاش کو ختم کرنے کے لیے دروازے کی اوٹ سے نکل کر بڑی پھرتی سے کلاشنکوف کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی پھر بے رحم لہجے میں غرایا۔

''گن کو پھینک دو!''

مجھے خود اپنی آواز انجان سی لگی۔ اس وقت سفاکی اور وحشت نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ یہ گن بردار وہی شخص تھا جو ڈینٹل کلینک میں نقلی زاہد حسین کے ساتھ داخل ہوا تھا اور زیادہ تر اس نے گونگا کردار کیا تھا۔

میرے حکم کی تعمیل میں اس نے پس و پیش سے کام لینا چاہا تو میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی کھوپڑی پر کلاشنکوف کا

بٹ رسید کر دیا۔ وہ ڈگمگایا اور تیورا کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ غصیلے انداز میں اپنے ہیوی فوجی بوٹ سے اس کے چہرے پر دو تین بھرپور ٹھوکریں بھی لگا دیں۔ کھوپڑی پر پڑنے والی ضرب نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ کلاشنکوف بدستور اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی لیکن اس ''غافل'' شخص کے ہاتھوں میں وہ گن اب ایک لاٹھی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے اندھا دھند فائرنگ کر کے اس کا میگزین خالی کر دیا تھا۔ میں نے اسے گن پھینکنے کا حکم محض اس احتیاط کی بنا پر دیا تھا کہ وہ کوئی چالاکی دکھا کر گن کوری لوڈ نہ کر لے۔

اسی وقت کھڑکی کے پردے میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ اس کی دوسری طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ وہاں کھڑکی کے پیچھے جو کوئی بھی موجود تھا، فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا..... اور وہ میاں زاہد بھی ہو سکتا تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، فرار ہونے والے کم از کم دو افراد تھے۔ میں لپک کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ جب میں نقلی میاں زاہد سے گفتگو کر رہا تھا تو اس وقت میں نے کھڑکی کے پردے میں پُراسرار حرکت کو نوٹس کیا تھا۔ پردے کی حالیہ سرسراہٹ نے یہ بات ثابت کر دی کہ اس پردے کی اوٹ سے کوئی مسلسل اندر جھانک رہا تھا۔

میں تیزی سے دوڑتے ہوئے اس جانب پہنچا جدھر وہ کھڑکی کھلتی تھی۔ وہ ایک برآمدہ نما جگہ تھی۔ جس کے سامنے سرسبز لان اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ میری عقابی نگاہ برآمدے کے آخری سرے تک جا پہنچی اور میں نے وہاں کسی کو مڑتے ہوئے دیکھا۔ مجھے اس شخص کی صرف پشت نظر آئی تھی اور میں نے اس کے لباس سے پہچان لیا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جو لینڈ کروزر کو چلا کر ڈیتھل کلینک سے یہاں تک لایا تھا۔

میں چیتے کی رفتار سے اس کے عقب میں لپکا۔ چند سیکنڈ میں، میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی جست بھر کر اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ میرا آہنی ہاتھ اس کی گردن پر پڑا اور میں نے کالر دبوچ کر اسے ایک جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا۔

وہ زوردار آواز کے ساتھ راہ داری کے پختہ فرش سے ٹکرایا پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا، میں نے کلاشنکوف کی خوفناک نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ میں نے خونخوار لہجے میں دریافت کیا۔

''تمہارے ساتھ اور کون تھا اور وہ کہاں ہے؟''

میرے ہاتھ میں تھمی کلاشنکوف کی ساری گولیاں فائر ہو چکی تھیں۔ اسلم نے ایک طویل برسٹ مار کر گن کو خالی کر دیا تھا مگر زمین پر پڑا ہوا وہ ڈرائیور اس ''راز'' سے واقف نہیں تھا لہٰذا اس کی خوفزدگی اور سراسیمگی جینوئن تھی۔ اس نے دہشت آمیز انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا، وہ گن کی نال کو منہ سے نکالنے کے لیے التجا کر رہا تھا تاکہ میرے سوالوں کا جواب دے سکے۔

میں نے خوفناک انداز میں کہا ''جواب دینے کے لیے تمہاری زبان کا آزاد ہونا ضروری نہیں ہے تم اشاروں میں بھی بتا سکتے ہو۔'' پھر میں نے اس کے حلق میں گھسی ہوئی کلاشنکوف کی نال پر تھوڑا سا دباؤ بڑھایا اور پوچھا۔

''کیا وہ میاں زاہد حسین ہے؟''

اس کی گردن میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔

میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ میں نے کہا ''وہ کس طرف گیا ہے؟''

اس نے ہاتھ سے ایک کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کر دیا۔ اس کے اس جنبشی جواب کے بعد مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ اس شخص سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی مگر میں اسے آزاد بھی چھوڑنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا لہٰذا میں نے اسے دنیائے غفلت میں پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ نال کو اس کے منہ سے باہر نکال کر میں نے اپنے ہاتھوں کی مشاق انگلیوں کو اس کی گردن پر ''آزمایا'' اور اسے دو تین گھٹنے کے لیے اتنا غفیل کر دیا۔ یہ کام میں نے چند سیکنڈ میں انجام دے لیا تھا۔ خالی گن کو بھی میں نے وہیں پھینک دیا۔

پھر میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسی دروازے کی جانب رینگ گیا جدھر ڈرائیور نے اشارہ کیا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہینڈل کو گھما کر چند جھٹکے دیے مگر دروازہ کھل نہ سکا۔ مجھے ''بی۔ تھری ایٹ'' کے وہ لمحات یاد آئے جب میں نے میاں زاہد کے کمرے کے دروازے کو کھولنے کے لیے ''چی'' کی قوت کو آزمایا تھا۔ میں ان لمحات کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا جب وہ شیطان صفت انسان مجھے چکما دے کر بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

آج میں اسے ایسا کوئی موقع دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بنگلے میں اس وقت ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ اب قصۂ پارینہ اور صدائے ماضی قریب میں بدل چکی تھی۔ میں نے کمرے کا

دروازہ کھولنے کے بجائے اس سے بھی زیادہ ضروری کام پہلے کرنا مناسب سمجھا اور ڈرائیور کے بے حس و حرکت جسم کے اوپر سے پھلانگ کر مین گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔

گیٹ اندر سے بند تھا مگر اس میں تالا نہیں لگا تھا۔ گیٹ کا تالا کنڈی کے بک سے لٹک رہا تھا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے وہ تالا بند کر دیا۔ اب چابی کے بغیر اس تالے کو کھولا نہیں جا سکتا تھا..... اور تالا کھلنے سے پہلے وہ گیٹ وا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ساری کارروائی چند سیکنڈ میں ہو گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں گیراج کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں دو گاڑیاں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ ان میں ایک تو وہی سیاہ لینڈ کروزر تھی جس میں سوار ہو کر میں اس بنگلے تک پہنچا تھا اور دوسری ایک وہائٹ ہونڈا اکارڈ تھی۔ مجھے یاد آیا کہ بنگلا نمبر ''بی۔ تھری ایٹ'' سے فرار ہونے کے لیے میاں زاہد نے ایک سفید ہونڈا اکارڈ ہی کا سہارا لیا تھا، گویا اس بنگلے میں اس مردود کی موجودگی مسلم ہو گئی تھی۔

میں نے چند سیکنڈ میں دونوں گاڑیوں کے انجنوں سے معمولی چھیڑ چھاڑ کر کے انہیں ایسا بنا دیا کہ وہ مکمل چیک اپ کے بغیر اسٹارٹ ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو گئیں۔ کوئی بھی شخص افراتفری کے عالم میں انہیں استعمال کر کے بنگلے سے ''رخصت'' نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا میں نے میاں زاہد کے فرار کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔ میں مطمئن ہو کر بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ میری متلاشی نظر کسی معقول گوشے کو ڈھونڈ رہی تھی۔

اس مرحلے پر میں نے کسی کمرے میں داخل ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں ایک ستون کی آڑ میں ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے بنگلے کا مین گیٹ، گیراج اور ان دونوں مقامات کا درمیانی راستہ واضح طور پر نظر آتا تھا۔ جلد یا بدیر میاں زاہد کو اس بنگلے سے نکلنا تھا اور وہ میری نگاہ میں آئے بغیر کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بنگلے کے کمروں میں اندھا دھند چکرانے سے بہتر تھا کہ اسے گھات لگا کر شکار کیا جائے۔

اس وقت رات کے لگ بھگ گیارہ بجے تھے۔ ڈیفنس کا یہ فیز ابھی زیادہ تر غیر آباد پڑا تھا اس لیے وہاں سناٹے کا راج تھا۔ مجھے اس گوشے میں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پندرہ منٹ بعد مجھے کسی کے دبے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے اپنی حسیات کو سماعت میں بدلا اور اس آہٹ پر توجہ مرکوز کر دی۔ لمحہ بہ لمحہ قدموں کی دھیمی چاپ نزدیک آتی چلی گئی۔ میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت میں نے ایک انسانی جسم کو بنگلے کی عمارت سے نکل کر گیراج کی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ شخص اندھیرے کی آڑ لے کر محتاط قدموں سے، دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پسٹل بھی موجود تھا۔

اندھیرا ہونے کے باوجود بھی میرے دل نے گواہی دی، وہ میاں زاہد حسین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اندھیرے کے باعث میں اس کے چہرے کی.. یا ہی اور آنکھوں کی مکاری کو تو نہیں دیکھ سکا تاہم اس کے بھاری جسم اور پستہ قامتی نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ وہ اس وقت ایک سوٹ میں ملبوس تھا۔

میں نے شکاری چیتے کے مانند اپنے اور میاں زاہد کے درمیانی فاصلے کو نگاہ میں ناپا اور اس حساب کو ضرب تقسیم کر کے اپنے قدموں کے سپرد کر دیا۔ آئندہ دو سیکنڈ کے اندر میں کسی بلٹ ٹرین کی طرح سفر کرتے ہوئے میاں زاہد کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔

اس موقع پر اس کی مکاری کھل کر سامنے آ گئی۔ اس نے اپنے عقب میں میری موجودگی کو محسوس کر لیا۔ نہ صرف محسوس کر لیا بلکہ اس کا فوری ردِعمل بھی سامنے آ گیا۔ اس نے اچانک پلٹ کر مجھ پر فائر کر دیا تھا۔

اگر میں میکانکی انداز میں بروقت نیچے نہ بیٹھ جاتا تو گولی میری کھوپڑی کے پار ہو جاتی۔ میں نے نیچے بیٹھتے ہی وہاں رکے رہنا خطرناک جانا اور فرنٹ رول کر کے اس کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔

میری یہ پھرتی آمیز احتیاط بہت سود مند ثابت ہوئی کیوں کہ میاں زاہد نے دوسرا فائر اسی جانب کیا تھا جہاں پر بیٹھ کر میں نے پہلی گولی کو خالی دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے تیسرے فائر کا اسے موقع نہ دیا اور اس کے پسٹل والے ہاتھ پر ایک راؤنڈ ہاؤس (Round House) کک ماری۔

پسٹل اس کے ہاتھ ہی میں رہا لیکن وہ تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے دو قدم پیچھے چلا گیا پھر اس سے قبل کہ وہ دوبارہ پسٹل کا رخ میری طرف کرتا، میں نے ایک بھرپور سائیڈ کک اس کی کمر پر رسید کر دی۔

اس کک کا وہ نتیجہ برآمد نہ ہوا جس کی میں توقع کر رہا تھا جس سے ظاہر ہو گیا کہ میاں زاہد بے پناہ قوتِ برداشت کا مالک تھا۔ میرے پاؤں کی ٹھوکر کھا کر وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا اور اس کے منہ سے میرے لیے ایک گالی نکل گئی۔ اس ناقابلِ اشاعت گالی کے اختتام پر اس نے کہا۔

''وجدان! ابنِ شیطان! آج تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاؤ گے۔ تمہاری جانب بہت سا حساب نکلتا ہے، مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے مجھ پر گولی چلانا چاہی مگر میں اس کی اس جسارت کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ اس کا پسٹل والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی میں نے ہوا میں جمپ کی اور فرنٹ سمر سالٹ لگاتے ہوئے اس کے اوپر سے گزر گیا۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں موجود پسٹل نے گولی اگلی لیکن جہاں کا نشانہ لیا گیا تھا، میں اب وہاں موجود نہیں تھا۔

میں نے جیسے ہی زمین پر پنجے ٹکائے، وہ میری طرف گھوما لیکن میں اس دوران میں بجلیوں سے فرش کو پش (Push) کر کے دوبارہ ہوا میں اچھل چکا تھا جیسے ہی میاں زاہد کا چہرہ میری سمت ہوا، میں نے ایک دھانسو قسم کی (Wheel Flying Kick) اس کے تھوبڑے پر رسید کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھامے ہوئے کراہا اور الٹے قدموں پیچھے چلا گیا۔ بیک گیئر میں دو قدم کا فاصلہ طے کر کے رکا پھر وہ اندھا دھند مجھ پر فائرنگ کرنے لگا۔

اس کی اس ''اندھا دھندی'' سے میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بہ یک وقت ٹرپل بیک فلیک (Back Flick) کرتے ہوئے گیراج میں پہنچ گیا۔ اپنے پسٹل کی تین گولیاں وہ پہلے ہی فائر کر چکا تھا۔ اس مسلسل فائرنگ نے پسٹل کا کلپ خالی کر دیا۔ میں نے فائرنگ کے اختتام پر ''کھٹ کھٹ'' کی آواز سنی تھی۔

میاں زاہد نے جھنجلا کر خالی پسٹل کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیا کلپ لوڈ کرتا، میں گیراج کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ میری یہ ''آمد'' بڑی دھواں دھار تھی۔ میں نے دو قدم کی مختصر دوڑ لگانے کے بعد ایک سائیڈ فلائنگ کک اس کے سینے پر رسید کر دی پھر جیسے ہی میرے قدم زمین پر آئے، میں نے لیفٹ راؤنڈ ہاؤس گھما دی۔

میاں زاہد نے میری کک کو بلاک کرنے کے لیے پسٹل والا ہاتھ بے ساختہ آگے کر دیا۔ میری کک نے وہ خالی پسٹل اس کے ہاتھ سے چھڑا کر کہیں دور اندھیرے میں پہنچا دیا۔ میں نے ایک اسٹیپ اندر آ کر اس کے چہرے پر فرنٹ پنچ مارا۔ اس نے جھکائی دے کر اپنے چہرے کو بچا لیا۔ میں نے ڈبل ہینڈ پش اس کے سینے پر رسید کر دیا۔ عقب میں جھکائی دینے کے سبب اس کا سینہ ایک بہترین ٹارگٹ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

وہ اس دھکے کو سہہ نہ سکا اور پشت کے بل زمین پر جا رہا۔ میں نے اس کے قریب آ کر نہایت ہی کٹیلے لہجے میں کہا۔

''میاں جی! میری جانب تمہارا جو حساب نکلتا ہے، وہ میں گاہے بہ گاہے اتارتا رہا ہوں مگر تم بری طرح میرے مقروض ہو چکے ہو۔ آج میں تم سے ایک ایک پائی وصول کر کے رہوں گا۔ بتاؤ، میری ساحل کوتم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟''

''ساحل تک پہنچنے کے لیے تمہیں ہماری بات ماننا ہو گی۔'' وہ لباس جھاڑتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ''ڈائری کے دو صفحات ہمارے حوالے کر دو۔ تمہاری محبوبہ تمہیں دے دی جائے گی۔''

''دو صفحات کیا، پوری ڈائری تم پہلے ہی حاصل کر کے اپنے والد محترم ملک نوازش علی کو پہنچا چکے ہو۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

والدِ محترم کے الفاظ نے اس کا چہرہ متغیر کر دیا تاہم وہ مغلظات کا سہارا لینے کے بجائے نہایت ہی ترش الفاظ میں بولا ''ان دو صفحات کے بغیر وہ ڈائری ایسے ہی ہے جیسے گولی کے بغیر گن یا زہر کے بغیر سانپ۔ اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آئے تو تمہاری محبوبہ کا وہ حشر کیا جائے گا جسے دیکھ کر تم خودکشی پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

''میں تمہاری ناپاک زبان کو گدی سے کھینچ کر باہر نکال لوں گا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ''خودکشی کرے گا تمہارا باپ نوازش علی۔ اگر میری ساحل کا ایک بال بھی بانکا ہوا تو میں تم سب کو زندہ گاڑ دوں گا۔''

وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا ''تم شدید قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ تمہیں ہماری طاقت کا اندازہ نہیں۔''

''تو ساحل کے بارے میں تم زبان نہیں کھولو گے؟'' میں پوری سفاکی سے بولا۔

وہ نفرت آمیز انداز میں گویا ہوا ''تمہارا تو باپ بھی میری زبان نہیں کھلوا سکتا۔ تم میاں زاہد کو کیا سمجھتے ہو؟''

میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا ''میں تمہیں بھگوڑا، بزدل، ذلیل، کمینہ اور دنیا کا گھٹیا ترین انسان سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں تم یہی ثابت ہوتے رہے.....''

میری پوری بات ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے ایک زوردار مکا میری ٹھوڑی پر مارنے کی کوشش کی۔ آج میں اپنے دشمن کی کسی کوشش کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اس کے پنچ کو رائٹ آؤٹ (Right Out) بلاک کیا۔ اس نے پھرتی سے لیفٹ پنچ مجھ پر آزمایا۔ میں نے نیک جرک (Neck Jerk) سے اپنے چہرے کو بچا لیا۔ اس کے دونوں بازو اس حملوں کے نتیجے میں ایک دوسرے کے اوپر کراس ہو چکے تھے۔ میں نے اچانک مڑ کر اس کے چہرے پر ایک پنچ رسید کر دیا۔

اس کی ناک سے خون رسنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے ناک کو صاف کرتے ہوئے غصیلے انداز میں میری جانب بڑھا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب تھی تاہم وہ جسمانی طور پر انتہائی فٹ تھا۔ اب تک میں نے میاں زاہد سے جتنی فائٹ کی تھی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ باقاعدہ مارشل آرٹسٹ تو نہیں تھا تاہم لڑائی بھڑائی کے معاملات میں اسے خاصی مہارت حاصل تھی..... اور کیوں نہ ہوتی؟ آخر کو وہ ایک سینڈیکیٹ کا پروگرام کنٹرولر تھا۔ اسے جرائم کے دنیا کا ایک بہترین ڈائریکٹر مانا جاتا تھا۔ اسی کی ڈائریکشن پر پرنس سوٹ والے نے اس کا کردار نبھانے کی کوشش کی تھی اور بہ زعم خود مجھے گھیر کر اس بنگلے تک لے آیا تھا۔ وہ لوگ میری اصلیت جاننا چاہتے تھے اور اس جاننے کے چکر میں ایک بہت بڑی مصیبت کو گلے لگا بیٹھے تھے۔

میاں زاہد نے بڑے جارحانہ انداز میں میرے پیٹ پر لات مارنا چاہی، میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس کی اٹھی ہوئی ٹانگ پر پوری قوت سے پریشر کک رسید کر دی۔ میرا دایاں پاؤں کسی ڈائی مشین کے ہیمر کی طرح اس کے گھٹنے پر پڑا۔ وہ ردِعمل کے طور پر نیچے جھکتا چلا گیا میں نے اسی وقت لیفٹ فرنٹ جرک کک اس کے منہ پر ماردی۔ زمین پر بیٹھتے بیٹھتے وہ پیچھے کی جانب الٹا اور کافی دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

میں تیز قدموں سے چل کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے سنبھلتے ہی میں نے اس پر تابڑ توڑ لات کے برسانا شروع کر دیے۔ وہ پٹتا رہا اور قدم قدم پیچھے سرکتا رہا۔ ہم فائٹ کرتے ہوئے ایک برآمدہ نما راہداری میں آ گئے۔ یہاں تھوڑے فاصلے پر ڈرائیور بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اسلم نامی گن بردار سے چھینی ہوئی خالی کلاشنکوف ڈرائیور کے نزدیک ہی پھینک دی تھی۔ زاہد حسین نے چالاکی دکھاتے ہوئے وہ گن اٹھالی اور اس کی نال کا رخ ... میری جانب اٹھاتے ہوئے غرایا۔

''کھیل ختم، پیسا ہضم۔ لاؤ، یہ بیگ مجھے دے دو۔''

اس کا اشارہ اس بیگ کی طرف تھا جو میں نے اپنی گردن میں ڈال رکھا تھا۔ میاں زاہد کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ خالی گن کے بل پر مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کو یوں ظاہر کیا جیسے اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے چنگھاڑتے ہوئے ایک طوفانی سائیڈ کک اس کے پیٹ میں جڑ دی۔

وہ مجھ سے اس قسم کے ردِعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا لہٰذا میری اس کک نے اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ وہ توپ میں سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند ہوا میں اچھلا اور بیک گیئر میں نیچی پرواز کرتے ہوئے پشت کے رخ پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس دیوار کے قریب ہی دھاتی فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ وہ دیوار کو زوردار سلامی دینے کے بعد آہنی کرسیوں پر گرا۔ رہی سہی کسر اس نئے ٹکراؤ نے نکال دی۔ میں اس کی کمپری پر اَش اَش کر اٹھا۔

میاں زاہد کا وجود ان کرسیوں میں پھنس کر رہ گیا تھا اور وہ خود کو آزاد کرانے کے لیے ہاتھ پاؤں کو بڑے احمقانہ انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر ذرا ترس یا رحم نہ آیا اور میں نے اپنے وزنی فوجی بوٹ سے ایک کرسی کے پائے کو خوف ناک ٹھوکر ماردی۔

دونوں کرسیوں کا فاصلہ مزید کم ہو گیا جس کے نتیجے میں میاں زاہد کا آفت زدہ وجود بھنچ کر رہ گیا۔ میری ساعت تک، اس کے حلق سے خارج ہونے والی ایک کرب ناک چیخ نے رسائی حاصل کی تو مجھے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔ میں نے ترنگ میں آ کر ایک کرسی کی پشت کو بڑی حقارت سے ٹھڈا مارا۔ اس ٹھڈے کے نتیجے میں دونوں کرسیاں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے الٹ گئیں۔ کرسیوں کے ''الٹاؤ'' سے میاں زاہد کی جو حالت ہوئی ہوگی، بیان سے زیادہ اس کے تصور میں مزہ ہے۔

چند لمحات بعد وہ ہانپتا، لنگڑاتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے قریب آ کر پنچ مارنے کا ڈاج دیا۔ وہ دھڑام سے فرش پر جا گرا۔ اس کے اس عمل نے مجھے بتا دیا کہ ہمت کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔

میں نے چند لمحے اس کے اٹھنے کا انتظار کیا لیکن جب باوجود کوشش کے بھی وہ اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو میں اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی بے بسی سمٹ آئی تھی۔ وہ اس وقت انڈر ورلڈ کا باس نہیں بلکہ ایک حقیر کیچوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے اشارۂ ابرو پر انسانی جان کو اس جہاں سے اس جہاں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ساری سفاکی اور درندگی پتا نہیں، کس کس راستے اس کے جسم سے خارج ہو چکی تھی۔

کسی بے بس اور لاچار انسان کو دیکھ کر خوش ہونا اچھی بات نہیں لیکن میں اس وقت بہت مسرور تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میاں زاہد حسین کوئی انسان نہیں بلکہ شیطان صفت

انسان نما جانور تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی رورعایت کا حق دار نہیں تھا۔ اگر میں اس پر رحم کھا کر اسے آزاد کر دیتا تو اس کی بے بسی اور لاچاری پلک جھپکتے میں غائب ہو جاتی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ انسان دشمن اور شیطان دوست ثابت ہوتا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں استفسار کیا ''ساحل کہاں ہے؟''

وہ خاموش رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سراسیمگی کو کروٹ لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کی ڈھٹائی نما خاموشی نے میرے جنون میں اضافہ کر دیا۔ میں نے اس کے منحوس چہرے کو مکوں کی برسات سے لہولہان کر دیا پھر اسے گریبان سے جھنجوڑتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

''میری ساحل کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟''

وہ بدستور خاموش رہا جیسے اس نے زبان نہ کھولنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ اس کے عمل نے میری جھنجلاہٹ میں اضافہ کر دیا۔ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

''میں یہ سوال تم سے آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں میاں زاہد۔ اگر مجھے جواب نہ ملا تو میرے کیے کا بھی کوئی جواب نہیں ہوگا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

اس کے ہونٹوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی مگر آواز پیدا نہ ہو سکی۔

میں نے دوٹوک لہجے میں پوچھا ''ساحل اس وقت کہاں ہے؟''

''آج صبح..... میں نے اسے..... لاہور بھیج دیا..... ہے۔'' وہ ہکلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے استفسار کیا ''لاہور..... یار کھاں والی؟''

''رکھاں والی۔''

''اگر میری ساحل ''رکھاں والی'' روانہ ہو چکی ہے تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے کہا ''تمہیں تو اس وقت لکھاں والی میں ہونا چاہیے۔''

اس کی آنکھوں میں وحشت ابھر آئی۔ میں نے پوچھا ''وہ کس ذریعے سے لاہور بھیجی گئی ہے اور کب تک رکھاں والی پہنچ جائے گی؟''

''بائی روڈ..... پرائیویٹ جیپ میں.....'' اس نے رک رک کر نحیف آواز میں بتایا ''وہ کل صبح لاہور پہنچے گی اور دوپہر میں رکھاں والی۔''

میں نے اپنا ہاتھ بے ساختہ اپنی پنڈلی کی جانب بڑھا لیا۔ اس پنڈلی پر امتیاز علی کی یادگار، میرا ساتھی، میرا یار مستقل سکونت رکھتا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس قاتل خنجر کو چرمی کیس سے جدا کیا۔ مہلک خنجر کا پیاسا پھل میاں زاہد کی نگاہ میں چمکا تو اس کے رہے سہے حواس پر بجلی سی گر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں جاگزیں وحشت میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر موت کو منڈلاتے دیکھا۔ وہ مردہ آواز میں گھگھیایا۔

''مم..... مجھے..... معاف کر دو..... وجدان.....!''

معافی کا وقت گزر چکا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کو کون واپس لا سکا ہے؟..... کوئی نہیں، کبھی نہیں! میں نے اپنے خنجر کے تشنہ لبوں کو میاں زاہد کی شہ رگ کے گھاٹ پر رکھ کر سیرابی کا موقع فراہم کر دیا۔

اسی وقت میں نے بنگلے کے باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، وہ ایک نہیں بلکہ دو گاڑیاں تھیں جو بڑی تیزی سے بنگلے کی جانب آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر کسی محفوظ مقام تک پہنچ جاتا، دونوں گاڑیاں بنگلے کے گیٹ کے سامنے آ کر رک گئیں۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر اس برآمدہ نما راہداری میں دوڑ گیا۔ اپنے عقب میں، میں نے گاڑیوں کے بھاری دروازے کھلنے اور بہت سے لوگوں کے، ان گاڑیوں سے اترنے کی آوازیں سنیں۔ وہ جو کوئی بھی تھے، میاں زاہد کے دوست نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر وہ دوست ہوتے تو ان کی گاڑیاں بنگلے کے اندر آتیں اور انہیں احترام و کشادہ دلی سے ویلکم کہا جاتا۔ ان کا انداز تو ایسا تھا جیسے پولیس نے ریڈ کیا ہو!

اگلے ہی لمحے میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ میری ساعت سے میگافون کی آواز ٹکرائی۔ وہاں سے بنگلے کے مکین کو کھلی دھمکی دی جا رہی تھی۔

''ملک رؤف! ہم نے تمہارے بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اس وقت تم مکمل طور پر پولیس کے نرغے میں ہو لہٰذا کسی قسم کی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اپنے ساتھیوں سمیت خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ تمہیں صرف پانچ منٹ کی مہلت دی جاتی ہے۔ فرار کی کسی بھی صورت کا نتیجہ موت ہے..... بھیانک موت!''

میرا ذہن میاں زاہد حسین اور ملک رؤف کے درمیان سوالیہ نشان پر اٹک کر رہ گیا۔

میں دوڑتے ہوئے برآمدہ نما راہداری کے آخری سرے پر پہنچا تو میری سماعت سے میگافون کی آواز ٹکرائی۔ پولیس والے اپنی دھمکی کو دہرا رہے تھے۔ اس بنگلے کے مالک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جارہا تھا۔

''ملک رؤف! ہم نے تمہیں جو مہلت دی تھی اس کا ایک منٹ گزر چکا ہے۔ اب تمہارے پاس صرف چار منٹ بچے ہیں۔ یہ آخری وارننگ ہے، اس کے اختتام پر سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے ہاتھ میں تین منٹ کا وقت ہوگا۔ اس وقفے میں ہماری ہدایت کے مطابق اگر تمہاری جانب سے مثبت ردِعمل دیکھنے میں نہ آیا تو ہم بنگلے کے اندر داخل ہو جائیں گے۔ ایک بات کان کھول کر سن لو، فرار کی ہر کوشش خودکشی کے مترادف ہوگی۔ تمہارے بنگلے کو پولیس کے مسلح جوانوں نے پوری طرح گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اگر کسی شخص نے بنگلے سے باہر قدم رکھا تو اسے بے دریغ گولیوں سے بھون دیا جائے گا!''

میگافون اس اعلان کے بعد خاموش ہوگیا۔ اس خاموشی کی مدت تین منٹ مقرر کر دی گئی تھی۔ ٹھیک تین منٹ بعد پولیس اندھا دھند بنگلے میں گھس آئی۔ میں نے اندر سے گیٹ کو تالا لگا دیا تھا مگر ایسے مواقع پر پولیس ناک کرنے یا گیٹ کھلوانے کے تکلف میں نہیں پڑتی۔ ریڈ کا مطلب ہے..... ریڈ! وہ بہ آسانی دیوار پھاند کر بنگلے کے اندر پہنچ سکتے تھے۔ وہ بہت نازک لمحات تھے اور..... اس دوران میں مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا تھا۔ بنگلے سے باہر نکلنا انتہائی خطرناک ثابت ہوتا۔ پولیس والے یہی سمجھتے کہ میں ملک رؤف کا کوئی ساتھی ہوں۔ وہ کوئی سوال کیے بغیر مجھے شوٹ کر دیتے۔ فی الحال مناسب یہی تھا کہ میں خود کو بنگلے ہی میں کہیں روپوش کرلوں اور جیسے ہی موقع ملے، یہاں سے نکل جاؤں۔

ایک بات طے تھی۔ بنگلے کے اندر پولیس کی مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پرنس سوٹ میں ملبوس نقلی میاں زاہد، گن بردار اسلم اور بالکل اصلی میاں زاہد حسین اپنی طبعی عمر پوری کر کے کسی اور جہان میں سکونت اختیار کر چکے تھے جبکہ نقلی میاں زاہد کا خاموش ساتھی اور ڈرائیور دونوں شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکے تھے۔ میرے وزنی بوٹ کی ضربوں نے خاموش ساتھی کا چہرہ مسخ کر دیا تھا اور ڈرائیور بھی تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں پولیس باہر کا گھیرا توڑ دیتی اور مجھے وہاں سے نکلنے میں آسانی ہو جاتی۔

میں محتاط قدموں سے چلتے ہوئے اس دروازے کے پاس پہنچا جس کے پیچھے کچھ دیر پہلے میاں زاہد روپوش ہوا تھا۔ ڈرائیور نے اشارے سے مجھے بتایا تھا کہ میاں زاہد نے وہاں پناہ لی تھی۔ اس وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں کھلے ہوئے دروازے سے کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ اندر پہنچ کر میں نے دروازے کو بند کرنے کی غلطی نہیں کی اور اپنے چھپنے کے لیے کوئی موزوں مقام تلاش کرنے لگا۔ وہ کمرا ایک شاندار بیڈ روم تھا۔ تمام لائٹس آن تھیں۔ پانچ سیکنڈ میں، میں نے ایک دبیز پردے کا انتخاب کرلیا۔ پردے کے اختتام پر کمرے کے کونے میں ایک طویل و عریض چوبی الماری رکھی تھی۔ میں نے الماری کے قریب سے پردہ ہٹایا اور بڑی مہارت سے اس کے عقب میں چھپ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اپنے سامنے پردہ اس طرح برابر کرلیا تھا کہ الماری اور پردے کے درمیان بننے والی ایک سلوٹی جھری سے میں بیڈ روم کے بیشتر حصے کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

اس وقت میرا ذہن ملک رؤف اور میاں زاہد حسین کے درمیان جمنا سٹک کے کرتب دکھا رہا تھا۔ پولیس کی دھمکی کے مطابق وہ بنگلا کسی ملک رؤف نامی شخص کی ملکیت تھا جسے چھاپے کے لیے وہ جماعت وہاں پہنچے تھے۔ میرا دھیان آجا کر اسی پرنس سوٹ والے دراز قامت شخص پر ٹک جاتا تھا جس نے مجھے گھیرنے کے لیے نقلی میاں زاہد کا رول کیا تھا۔ اپنے رعب داب اور حرکات و سکنات سے وہ بنگلے کا مالک نظر آتا تھا۔ میرے خیال میں وہی ملک رؤف ہو سکتا تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی تھی کہ پولیس والے میاں زاہد حسین کی وہاں موجودگی سے آگاہ نہیں تھے۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ صبح آٹھ بجے میری فلائٹ تھی۔ مجھے ساڑھے چھے بجے ائرپورٹ پہنچنا تھا اور اس وقت میری رسٹ واچ میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ جب میں آج شام میاں زاہد کی تلاش میں نکلا تھا تو مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی، اس تلاش کے دوران میں، میں کن کن کٹھنائیوں سے گزروں گا۔ اسی لیے میں مکمل تیاری سے نکلا تھا۔ میرے بیگ میں ہر وہ شے موجود تھی جس کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اگر مجھے براہِ راست ائرپورٹ بھی جانا پڑا تو پروا نہیں تھی۔

پولیس کی دی ہوئی مہلت گزر گئی۔ بنگلے کے اندر بدستور خاموشی اور سناٹے نے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ میں بنگلے کے مکینوں پر گزرنے والے حالات کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے بنگلے کے احاطے میں ''نقل و حمل'' محسوس ہوئی پھر راہداری میں بھاری بھرکم بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا

واضح مطلب یہی تھا کہ پولیس نے اپنی دھمکی کے مطابق ''آپریشن ارلی نائٹ'' شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ بیرونی گیٹ کو بند پا کر اندر کود آئے تھے۔ ان کا یہ عمل بہت ہی نپا تلا اور پرفیکٹ تھا۔ اس بیڈ روم کا دروازہ کھلا رکھنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ باہر کی حرکات و سکنات کی صوتی اثرات بہ آسانی مجھ تک پہنچ رہے تھے۔ میں نے کم از کم چار افراد کو باہر چکراتے ہوئے سنا۔ چند لمحات کے بعد ان میں سے دو افراد ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئے۔ دو اس راہداری کے آخری سرے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ راہداری کی اس سمت پہلے انہیں بے ہوش ڈرائیور کا وجود ملتا اور اس کے بعد میاں زاہد حسین کی خون آلود لاش۔ میں نے بڑی بے دردی اور پوری سفاکی سے اس ننگِ انسانیت کو ذبح کر ڈالا تھا۔

میرے اندازے کے عین مطابق پولیس نے متذکرہ بالا دونوں افراد کو ''دستیاب'' کرلیا۔ اسی وقت ڈرائنگ روم کی طرف جانے والے بھی واپس لوٹ آئے۔ ڈرائنگ روم میں دو لاشیں اور ایک فرد بے ہوش پڑا تھا۔ وہاں سے لوٹنے والے پولیس مین بڑی سنسنی خیز خبریں لائے ہوں گے۔ میں نے ان چاروں کو تیز آواز میں باتیں کرتے ہوئے سنا وہ بنگلے میں موجود صورتِ حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ان میں سے جو سینئر تھا اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''پورے بنگلے کی تلاشی لو۔ ممکن ہے، ملک رؤف کا کوئی آدمی کہیں چھپا بیٹھا ہو!''

ان احکام سے ظاہر ہوگیا کہ وہ ملک رؤف کا سراغ لگا چکے ہیں۔ زندہ، بے ہوش اور مردہ پائے جانے والوں میں سے کوئی ایک ملک رؤف تھا اور وہ یقیناً میاں زاہد نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا، پرنس سوٹ والا ہی ملک رؤف تھا۔ اگر اس نے نقلی میاں زاہد کا کردار ادا کیا تھا تو اس کا مطلب تھا، اصلی میاں زاہد حسین کا بہت ہی خاص آدمی تھا۔ اب وہ میاں جی اور اس کا خاص آدمی دونوں بہت عام ہو چکے تھے۔

تھوڑی دیر تک باہر خاموشی رہی پھر دو افراد اس بیڈ روم میں داخل ہوئے جہاں میں ایک دبیز پردے کے پیچھے دبکا کھڑا تھا۔ انہوں نے پہلے حیرانی نظروں سے بیڈ روم کا جائزہ لیا پھر ڈریسنگ کے نزدیک رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے یہ بیڈ روم کی وہ دیوار تھی جو میری نظر کے عین سامنے تھی۔ میں بڑی وضاحت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک کی توند خاصی صحت مند تھی اور عہدے کے لحاظ سے وہ انسپکٹر تھا۔ دوسرا اے ایس آئی تھا جو خاصا چاق و چوبند اور اسمارٹ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بڑی مستعدی سے کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں ریوالور نظر آرہا تھا۔

بیڈ روم میں انسپکٹر کی گمبھیر آواز ابھری ''سرفراز!'' اس کا مخاطب اے ایس آئی تھا ''صورتِ حال کو بڑی خوبصورتی سے نکیل کرنے کی ضرورت ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

سرفراز نامی اے ایس آئی نے پُرزور انداز میں گردن ہلائی اور کہا ''یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے وہ ملک رؤف کے کسی دشمن کا کارنامہ ہے۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ کام دکھا کر چلا گیا لیکن سر۔'' اس نے بڑے شیطانی انداز میں اپنے آفیسر کو دیکھا اور بولا ''یہ کارنامہ اب ہمارے کھاتے میں لکھا جائے گا۔''

''تم بہت ترقی کرو گے سرفراز!'' انسپکٹر نے دھیمی آواز میں کہا ''موقع شناس ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کو موقع پرست بھی ہونا چاہیے۔ دنیا داری کا یہی اصول ہے۔ اس اصول کو نظر انداز کر کے کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا!''

اے ایس آئی نے ایک آنکھ دبائی اور معنی خیز لہجے میں بولا ''اب کہانی کچھ اس طرح بنے گی کہ ہم نے منشیات کے اسمگلر ملک رؤف کے اڈے پر چھاپا مارا۔ ملک رؤف اور اس کے ساتھیوں نے گرفتاری دینے کے بجائے ڈٹ کر پولیس کا مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں ملک رؤف اور اس کے دو ساتھی ہلاک ہوگئے۔ دو ساتھی شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہوگئے۔ سر! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟'' بات ختم کر کے اس نے سوالیہ نظر سے اپنے آفیسر کو دیکھا۔

''تم بالکل ٹھیک سمت میں جا رہے ہو۔'' انسپکٹر نے تائیدی انداز میں کہا ''لیکن اس کہانی میں رنگ بھرنے کے لیے بہت سے پہلوؤں کو جاندار بنانا ضروری ہے۔ ہمیں اس بنگلے کے مختلف مقامات پر ''ضروری'' فائرنگ کرنا ہوگی تاکہ پولیس مقابلے کا صحیح نقشہ نکل کر سامنے آئے۔ اس فائرنگ سے باہر موجود درجن بھر کانسٹیبلز کی تسلی بھی ہو جائے گی۔ ہمارے ساتھ بنگلے کے اندر جو دو کانسٹیبلز آئے ہیں، انہیں ''سمجھانے'' کی ضرورت ہے پھر اس بنگلے سے کچھ منشیات وغیرہ بھی برآمد کرنا ہے..... اور سب سے اہم بات۔'' انسپکٹر چند لمحے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''باہر راہداری میں جو گردن کٹی لاش پڑی ہے، شاید تم نے اسے غور سے نہیں دیکھا سرفراز!''

''سر، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اے ایس آئی بولا ''میں واقعی افراتفری میں اس پر زیادہ دھیان نہیں دے

سکا۔''

انسپکٹر نے سنسنی خیز انداز میں انکشاف کیا ''وہ اس شہر کی ایک مشہور سیاسی اور سماجی شخصیت میاں زاہد حسین کی لاش ہے۔ میں نے اس پر نگاہ پڑتے ہی پہچان لیا تھا۔ میاں جی کو بھی اس کہانی میں بڑی خوبصورتی اور کاری گری سے فٹ کرنا ہوگا۔''

''سر! آپ بہت منجھے ہوئے ''کہانی کار'' ہیں۔'' اے ایس آئی نے مسکا لگایا ''آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ یہ تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے جسے آپ چٹکیوں میں انجام دے لیں گے۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے چٹکی بجانے کا عملی مظاہرہ بھی کر ڈالا۔

''کچھ کرتے ہیں!'' چوبیلی تو ندوالا انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا ''آؤ میرے ساتھ۔''

پھر وہ دونوں تیزی سے بیڈروم سے نکل گئے۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور تازہ ترین صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ یہاں تو ایک نیا اور سنسنی خیز کھیل شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے ملک کی پولیس کے ''کارناموں'' کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ جس پر یقین کرنے کی جی نہیں چاہتا تھا لیکن جب اس قسم کے واقعات سامنے آتے تو شرم سے میری گردن جھک جاتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پولیس کا پورا ڈیپارٹمنٹ ہی کرپٹ ہے۔ یقیناً اس محکمے میں بھی ایماندار، فرض شناس اور قانون پرور لوگ موجود ہیں مگر بحیثیتِ مجموعی عوام میں اس محکمے کے حوالے سے تاثر کچھ اچھا نہیں پایا جاتا۔ اچھے پولیس والوں کی محدود تعداد میں اچھائیاں، برے پولیس والوں کی لامحدود برائیوں میں کہیں خلط ملط ہو کر خلط سلط ہو جاتی ہیں جو کہ افسوس ناک بات ہے!

انسپکٹر کی باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ وہ میاں زاہد حسین کو ایک سماجی اور سیاسی شخصیت کے طور پر جانتا تھا مگر اس مردود کی اصل حیثیت سے ناواقف تھا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔ پولیس والے تو ان چیزوں سے بھی واقف ہوتے ہیں جو سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوتیں! انسپکٹر ایک فعال سنڈیکیٹ کے روحِ رواں سے ناآشنا تھا، یہ بات ناقابلِ یقین اور سمجھ میں نہ آنے والی تھی؟

اسی وقت بیڈروم سے باہر بنگلے کے احاطے میں کلاشنکوفز کے موت بردار قہقہے گونجنے لگے۔ میں سمجھ گیا، اب وہاں کون سا ڈراما کھیلا جانے والا تھا۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ میرے حق میں جاتا تھا۔ مجھے کسی کارنامے کا کریڈٹ نہیں لینا تھا۔ اگر یہ سب کچھ انسپکٹر اور اے ایس آئی کے کھاتے میں درج ہونے والا تھا تو میری بلا سے! میرے لیے خوش آئند بات تو یہ تھی کہ اب فوری طور پر اس بنگلے کا محاصرہ ختم ہونے والا تھا لہٰذا میرے وہاں سے نکلنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔

کلاشنکوفز کے مزید دو تین برسٹ سنائی دیے پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد بنگلے کے اندر درجن بھر افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ محاصرہ توڑ دیا گیا تھا۔ میں نے پردے کے پیچھے رہتے ہوئے چند لمحے انتظار کیا۔ میری جانب خاموشی کا راج تھا۔ پولیس والوں کی آوازیں ڈرائنگ روم کی طرف آ رہی تھیں۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اب وہاں کون کون سا ڈراما رچایا جانے والا تھا۔ میں پہلی فرصت میں اس بنگلے سے نکلنا چاہتا تھا لہٰذا بے قدموں چپکے سے پردے سے باہر آ گیا۔

اگلے پندرہ منٹ میں نہایت احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں عقبی دیوار پھاند کر بنگلے سے نکل چکا تھا۔ بنگلے کے عقبی حصے میں اور بنگلے سے باہر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ لہٰذا مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ٹارشہید پارک تک میں نے پیدل سفر کیا پھر ڈیفنس کلفٹن کے نزدیک سے مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس ٹیکسی کے ذریعے میں ڈینٹل کلینک پہنچا جہاں میری نیلی شیورلیٹ کھڑی تھی۔ اس وقت رات کے سوا بارہ بجے تھے۔ مذکورہ کلینک کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے گاڑی میں سوار ہونے کے لیے دروازے کے لاک میں چابی لگائی تو اپنے قدموں کی انتہائی قریب کسی نرم و ملائم شے کی موجودگی نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ بے ساختہ میں نے اپنے پاؤں کو جھٹکا۔

اسی وقت ایک مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''میاؤں!''

اگلے ہی لمحے ڈارلنگ میرے سامنے موجود تھی۔ میں بے اختیار مسکرایا۔ وہ جانے کب سے وہاں میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وفا شعار اور فرماں بردار اطاعت گزار بیویاں اسی طرح اپنے شوہروں کی راہ دیکھتی ہیں۔ اس وقت مجھے ڈارلنگ پر بہت پیار آیا۔ میں ایک مشن سے کامیاب لوٹا تھا۔ شاید اسی خوشی کا اثر تھا کہ میں نے فرطِ جذبات میں جھک کر ڈارلنگ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

وہ ''میاؤں میاؤں'' کرتے ہوئے بڑے معشوقانہ انداز میں میرے بازوؤں میں اپنا منہ رگڑنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا، کسی کارنامے پر ڈارلنگ مبارک باد پیش کر رہی ہے!

☆☆☆

میں نے فلیٹ میں قدم رکھا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

دروازے کو اندر سے لاک کرنے کے بعد میں نے سفری بیگ کو صوفے پر پھینکا اور آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا ''ہیلو'' کے جواب میں مجھے دوسری جانب شعیب غوری کی آواز سنائی دی۔ اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''وجدان! تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں آدھے گھنٹے سے نہیں ٹرائی کر رہا ہوں۔''

''کیوں، خیریت تو ہے؟''

''سب خیریت ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا ''وجدان! تمہارے لیے میرے پاس ایک بہت بڑی خوش خبری ہے..... بلکہ یہ خوش خبری ہمارے لیے مشترکہ اہمیت کی حامل ہے۔'' اس کے لہجے میں خاصی سنسنی پائی جاتی تھی۔

میں نے کہا ''میرے پاس بھی تمہارے لیے ایک اعلیٰ کوالٹی کی نیوز موجود ہے۔ یہ دیری پیپی اینڈ گڈ نیوز بھی ہم دونوں کے لیے بہت امپارٹنٹ ہے۔''

وہ اضطراری انداز میں بولا ''بتاؤ، کیا خوش خبری ہے؟''

''پہلے تم بتاؤ گے۔'' میں نے کہا ''خوش خبری کا ذکر تم نے پہلے کیا تھا۔''

''اوکے..... اوکے۔'' وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا پھر اس نے بتایا ''وجدان! مسٹر نیل آرمر نے متروک کنویں کا خفیہ برآمد کر لیا ہے!''

''کیا واقعی؟'' میں بے ساختہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''بالکل، ایسا ہو چکا ہے۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''تفصیل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بتانے لگا ''جیسا کہ تم جانتے ہو، دو روز قبل مسٹر نیل آرمر مجھ سے ایک نہایت ہی اہم میٹنگ کر کے رام پور (امرتسر) روانہ ہو گیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ موضع رام پور کے چوہدری رام داس سے تمام معاملات طے کر آیا تھا۔ آج شام میں نیل آرمر نے مجھے اطلاع دی ہے، وہ لوگ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے۔ پاک بھارت سرحد پر رام داس کی زمین سے متروک کنویں کا فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں تھا پھر مسٹر نیل آرمر اپنے ساتھ بہترین ٹیم لے کر گیا تھا جس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت کثیر المالیت سونے کی بازیابی ہے۔''

''یہ تو واقعی بہت بڑی خبر ہے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا ''کیا اتنا ہی سونا برآمد ہوا ہے جتنی ہم توقع کر رہے تھے؟''

''مسٹر نیل آرمر کے مطابق بازیاب ہونے والے سونے کی قیمت ہماری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔'' شعیب غوری نے بتایا ''اور یہ بات تو تم اچھی طرح جانتے ہو، گولڈ کے معاملے میں نیل آرمر کی رائے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک معروف گولڈ اکاؤنٹ بینک کا مالک ہے!''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' میں نے کہا ''میں تو سمجھ رہا تھا، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد پتا نہیں، اس دفینے کی کیا حالت ہو گی۔ بیس سال کوئی کم مدت نہیں ہوتی۔''

شعیب نے کہا ''خدا کا شکر ہے، وہ سونا اپنی اصلی حالت میں ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ ویسے کینوس کے ان دو تھیلوں کی نیل آرمر نے بہت تعریف کی ہے جن میں سونے کے بسکٹ بھرے گئے تھے۔ وہ دہری نہیں بلکہ تہری تہہ والے تھیلے ہیں جس کی وجہ سے امتدادِ زمانہ نے خزانے کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وہ جس طرح متروک کنوئیں میں پھینکا گیا تھا بالکل اسی محفوظ حالت میں ہم نے حاصل کر لیا ہے۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤ وجدان! متروک کنوئیں کے مقام پر اس وقت سرسبز کھیت لہلہا رہے ہیں۔ وہ تمہارے دشمنِ دیرینہ چوہدری نوازش علی کی زمین ہے جس میں فصل سر اٹھا رہی ہے۔''

چوہدری نوازش علی کے ذکر پر میں نے چونک کر پوچھا ''شعیب! اس دفینے تک رسائی کے لیے نیل آرمر نے اپنی ٹیم سے جو زیرِ زمین کھدائی کروائی ہے وہ نوازش علی کی نظر سے تو اوجھل ہے نا؟''

''ایک دم اوجھل۔'' وہ قطعیت سے بولا ''وہ ہماری اس کامیابی سے یکسر بے خبر ہے۔''

میں نے خیال افروز لہجے میں کہا ''تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ اگر ملک نوازش علی کو تمہارے مشن کی بھنک بھی مل جاتی تو وہ ہر قسم کی بڑی سے بڑی رکاوٹ کھڑی کر سکتا تھا۔ سونے کی تلاش نے اسے نیم دیوانہ بنا رکھا ہے۔ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ازاں بعد جب بھی اسے معلوم ہو گا کہ اس کی بے خبری میں وہ سونا اس کی زمین کے نیچے سے پراسرار انداز میں کہیں اور منتقل ہو چکا ہے تو ممکن ہے، اس پر دل کا دورہ پڑ جائے۔''

''میں کسی بھی صورت اس ''واردات'' کی خبر اس تک نہیں پہنچنے دوں گا۔'' شعیب نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''ابھی تو تم نے ملک نوازش سے دو دو ہاتھ کرنا ہیں۔ میں چاہوں گا، وہ دل کے دورے سے نہیں بلکہ تمہارے ہاتھوں اپنے انجام کو

پہنچے۔"

چوہدری نوازش علی کے تذکرے نے میرے ذہن میں ساحل کا سراپا روشن کر دیا۔ جنہم مکانی میاں زاہد حسین کے آخری بیان کے مطابق آج صبح ساحل کو ہائی روڈ لاہور روانہ کر دیا گیا تھا۔ وہ کل صبح لاہور پہنچ جاتی۔ اس کے بعد دوپہر تک وہ موضع رکھاں والی میں ہوتی۔ ہم تقریباً ساتھ ساتھ لاہور پہنچنے والے تھے۔ میری فلائٹ آٹھ بجے کی تھی جو زیادہ سے زیادہ ساڑھے نو بجے لاہور پہنچ جاتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس پرائیویٹ جیپ میں یہاں سے روانہ کی گئی تھی اور اس کی نگرانی کے لیے میاں زاہد حسین نے کتنے بندوں کو ساتھ بھیجا تھا۔ جب میں میاں زاہد حسین سے آخری مکالمت کر رہا تھا، مجھے جوشِ جذبات میں یہ اہم باتیں جاننے کا خیال نہیں رہا تھا۔ ویسے ایک بات تو طے تھی، دیگر افراد کے ساتھ نوازش علی کا بیٹا فیصل ضرور اس جیپ میں موجود ہوگا۔ پچھلے دنوں کراچی میں اس کے بڑے واضح آثار ملے تھے پھر اچانک وہ خبروں میں نہ رہا۔ میں امید کر رہا تھا، گلشنِ اقبال والے بنگلے میں اس سے ملاقات ہو جائے گی مگر وہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی تارا کے ساتھ نکل گیا۔ نتیجے میں، میں نے پہلے نجیب اور بعد میں تارا کو ان کے جائز "انجام" سے ہمکنار کر دیا۔

ہمارے درمیان مزید کچھ دیر تک سونے کے بسکٹس کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر میں نے پوچھا "مسٹر نیل آرمر کب تک واپس آ رہا ہے؟"

"ابھی میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" شعیب نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا "نیل آرمر نے مجھے آئندہ کا پروگرام کہیں بتایا۔ وہ اس کثیر المالیت سونے کو کس طرح ٹھکانے لگائے گا، میں نہیں جانتا۔ ویسے میں نیل آرمر کی جانب سے مطمئن ہوں۔ وہ میرا برسوں کا آزمایا ہوا ہے۔"

"اگر تم مطمئن ہو تو پھر مجھے بھی کوئی فکر نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ بولا "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم مجھ پر اس قدر اعتبار کرتے ہو۔ یقین کرو دجدان!" اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی در آئی "اگر کسی مرحلے پر خدانخواستہ کسی قسم کی کوئی گڑبڑ ہو گئی تو میں تم سے کیا ہوا وعدہ اپنی جیب سے پورا کر دوں گا۔ تم سے جو طے ہو گیا ہے، وہ بہرصورت کیش کی صورت میں تمہیں ضرور ملے گا۔"

"مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے شعیب۔" میں نے پوری سچائی کے ساتھ کہا "انشاء اللہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ بالفرض کوئی اپ سیٹ ہو بھی جاتا ہے تو میرے نزدیک یہ اتنا بڑا ایشو نہیں ہوگا کہ ہماری دوستی کو کسی امتحان سے گزرنا پڑے۔ دوستی، ہر فائدے نقصان پر فوقیت رکھتی ہے۔"

"یار، تم دل موہ لینے والی باتیں کرتے ہو۔" وہ ایک نیچا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "سود و زیاں کے اس قصے کو ایک طرف رکھو اور جلدی سے بتاؤ، تمہارے پاس کون سی خوش خبری ہے؟ باتوں میں لگا کر تم نے اس طرف سے میرا دھیان ہٹا دیا ہے۔"

میں نے ایک طویل سانس خارج کی پھر شعیب خوری کے سوال کے جواب میں آج شام سے لے کر تھوڑی دیر پہلے تک پیش آنے والے واقعات کی تفصیل اسے سنا دی۔ میری بات کے اختتام پر وہ چلا اٹھا۔

"بریو..... یو آر گریٹ۔ دجدان! تمہارے اس کارنامے نے میرے کلیجے میں ٹھنڈک اتار دی ہے..... ویری نائس..... خس کم، جہاں پاک!"

پھر میں نے شعیب کو پولیس والوں کے اس "کارنامے" سے بھی آگاہ کیا جس میں تو ندمار کا انسپکٹر، اپنے اے ایس آئی کو اعتماد میں لے کر، ان واقعات کو پولیس مقابلہ کا رنگ دے کر اپنے کریڈٹ پر درج کروانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد شعیب نے کہا۔

"ہوتا ہے..... ایسا بھی ہوتا ہے یہاں چلتا ہے..... چلنے دو، وجدان میاں! کس کس کی اصلاح کرتے پھرو گے۔ ہم بحیثیت مجموعی ایک کرپٹ معاشرے کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ دوا سے علاج ممکن نہیں، اب سرجری کے بغیر چارہ نہیں۔ اگر زبان کلامی اور اصلاحی باتوں سے سدھار ممکن ہوتا تو پھر "سی ایف کے" کے قیام کی کیا ضرورت تھی؟ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا دجدان!"

یہ اس کا اسٹائل نہیں تھا۔ آج شعیب بڑے مختلف انداز میں بات کر رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہ رہا تھا، میں بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک حقیقت بیان کر رہا تھا جسے سمجھنے کے لیے بہت زیادہ عقل و دانش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "شعیب! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا "دجدان! اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔ کل صبح تمہیں بہت جلدی اٹھنا ہوگا اس لیے اب کچھ نیند بھی لے لو۔ پچھلے چند گھنٹوں میں تم نے بہت مارا ماری کی ہے۔ تم آرام کی ضرورت محسوس کر رہے ہو گے!"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" میں نے کہا "میں فریش ہونے کے بعد سو جاؤں گا۔"

"تمہارا ٹکٹ اور دیگر کاغذات تو تم تک پہنچ گئے ہیں نا؟"

"ہاں، کبیر شاہ نے اس سلسلے میں بہت مستعدی دکھائی ہے۔"

"اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو؟" وہ دوستانہ انداز میں مستفسر ہوا۔

میں نے کہا "سب ٹھیک ہے۔ تم مطمئن رہو۔"

شعیب غوری نے کسی فوری خیال کے تحت پوچھا "دجدان! تم نے جس خنجر کے توسط سے میاں زاہد کو جہنم رسید کیا ہے وہ ہر وقت تمہارے پاس رہتا ہے نا!"

میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے بتایا "یہ خنجر میرے مرحوم دوست امتیاز علی کی نشانی ہے۔ یہ نشانی ایک یادگار..... ایک مددگار کی حیثیت سے میری پنڈلی پر بندھے چرمی کیس میں موجود رہتا ہے۔"

"تم اتنے سمجھدار ہو کہ ایک چھوٹی سی بات کی طرف توجہ دلاتا میں اچھا نہیں لگتا لیکن پھر بھی یہ بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی اس لیے ضرور کہوں گا۔" اس نے اتنا کہہ کر ذرا توقف کیا پھر بولا "ائرپورٹ پر تمہاری اور تمہارے سامان کی چیکنگ ہو گی۔ تم اس ہتھیار کو اپنے ساتھ نہ لے جاؤ تو اچھا ہے۔ عام استعمال کی چھری چاقو کی بات دوسری ہے مگر یہ ظالم تو اپنی شکل ہی سے انتہائی خطرناک اور سفاک نظر آتا ہے۔ تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ اس خنجر کے سلسلے میں تمہاری ہدایت کو یاد رکھوں گا۔"

"دش یو گڈ لک اینڈ اللہ حافظ!" شعیب نے الوداعی انداز میں کہا۔

میں نے "خدا حافظ" کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی پورے طمطراق سے دوبارہ بج اٹھی۔ اس کا مطلب یہی تھا، کوئی پہلے سے میرے نمبر کو ٹرائی کر رہا تھا اور جیسے ہی میں نے ریسیور رکھا، اس کی بن آئی۔

تیسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں "ہیلو" کہا۔

"یار دجدان! تم خیریت سے تو ہو نا؟" منہاس باقر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مگر آپ کی آواز سے گھبراہٹ جھلکتی ہے۔ خدانخواستہ کوئی اور گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟"

وہ قدرے سنبھل کر بولا "ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں شام سے لے کر اب تک بیس پچیس مرتبہ تمہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ تم سے رابطے کے لیے میرے پاس یہی ایک فون نمبر ہے۔ پہلے تو بیل جا رہی تھی، کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا اور اب کافی دیر سے تمہارا فون انگیج مل رہا تھا۔ کیا تم گھر میں نہیں تھے؟"

میں نے مصلحت کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے ہلکا سا جھوٹ بولا "منہاس صاحب! میں آج شام پکچر دیکھنے نکل گیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے واپس آیا ہوں۔ فلیٹ میں قدم رکھتے ہی ایک دوست کا فون آ گیا جس سے فارغ ہوا تو آپ کا فون لگ گیا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "آپ کس قسم کی گڑبڑ کا ذکر کر رہے ہیں؟ آپ کی بیٹی شبانہ تو خیریت سے ہے نا؟ اب تو اس کی شادی میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا ہے!"

"شبانہ اور گھر کے دیگر افراد بخیریت ہیں۔" وہ جلدی سے بولا پھر اصل موضوع کی جانب مڑتے ہوئے اس نے کہا "دجدان! میں نے چند روز قبل تم سے ایک جرائم پیشہ گروہ کا تذکرہ کیا تھا جو یہودی لابی کے زیرِ اثر اس شہر میں سرگرمِ عمل ہے۔ وہ لوگ دہشت گردی اور بدامنی کے واقعات میں اس طرح ملوث ہیں کہ کسی کو ان پر شک نہیں ہو سکتا۔ مقامی افراد پر مشتمل یہ گروہ بظاہر بہت سے سماجی اور فلاحی کام کرتا ہے۔ عوام ان کے چہروں کے پیچھے پوشیدہ یہودی عزائم کو نہیں پڑھ پا رہے ہیں اس لیے وہ کامیابی سے اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہیں۔"

منہاس باقر سانس لینے کو رکا تو میں نے کہا "ہاں، آپ نے ایسے کسی گروہ کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ آپ ان لوگوں کے خلاف کسی خفیہ قسم کی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں جس میں کسی مرحلے پر آپ کو میری مدد کی بھی ضرورت ہو گی۔"

"وہ مرحلہ آ گیا ہے دجدان!" وہ پرجوش انداز میں بولا "میں اس وقت بڑی شدت سے تمہاری ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

"اس وقت؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"میں جانتا ہوں، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔" ایرپیس میں منہاس باقر کی آواز ابھری۔ "یہ کسی شریف آدمی کے آرام اور نیند کا وقت ہے لیکن میں تمہیں ضرور زحمت دوں گا..... اس زحمت کے لیے پیشگی معذرت قبول کر لو۔"

میں نے جلدی سے کہا "منہاس صاحب! اس قسم کی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ میرے بزرگوار! اسے

ہیں۔ حکم کریں، میں آپ کے کون سے کام آ سکتا ہوں۔ ویسے آپ کی اضطراری حالت کو دیکھ کر لگتا ہے، آپ نے اس یہودیت نواز جرم پیشہ گروہ کے بارے میں کوئی نہایت ہی اہم راز پالیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''یو آر ایبسولیوٹلی کرکٹ!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا ''میں نے اس خبیث گروہ کے دو افراد کو کوٹر لیس کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں میرے اخبار کے کرائم رپورٹر نے بہت تعاون کیا ہے۔ شہزاد علی صرف کرائم رپورٹر ہی نہیں بلکہ میرے اعتماد کا آدمی ہے۔ تم اسے میرے ان تعلق داروں میں شمار کرسکتے ہو جو بیک وقت دوست بھی ہوتے ہیں اور ملازم بھی۔ ان کی ملازمت، معاونت سے کہیں آگے کی چیز ہوتی ہے۔''

میں ریسیور کان سے لگائے خاموشی سے منہاس باقر کی بات سن رہا تھا۔ وہ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ''وجدان! اگر چہ شہزاد علی لڑائی بھڑائی کے کاموں کا ماہر ہے۔ کرائم رپورٹر ہونے کے ناتے وہ کافی چابک دست اور سمجھ بوجھ کا مالک بھی ہے مگر اس مرحلے پر میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ رہو..... بلکہ وہ تمہارے انڈر کام کرے۔ میں تمہاری معاملہ فہمی اور دوری اندیشی کا قائل ہو چکا ہوں۔ تم نے جس بہادری، سمجھ داری اور جرأت مندی سے میرے دوست سلطان کی اکلوتی بیٹی ممتاز کو ڈاکوؤں کے چنگل سے نہ صرف چھڑایا تھا بلکہ اس کے اغوا کے ذمے داروں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کیا تھا، یہ قصہ تو میں نے ممتاز اور قاضی سلطان کی زبانی سنا تھا مگر تم نے جس حکمتِ عملی سے کام لے کر دوسری مرتبہ ممتاز کو بچایا ہے وہ سب تو میرے سامنے کے واقعات ہیں۔ مجھے تم جیسے کسی جوان ہی کی ضرورت تھی۔ مجھے یقین ہے، اب میرا مشن پایۂ تکمیل کو ضرور پہنچے گا۔''

منہاس باقر بہت ہی جوش و جذبے کے ساتھ لگاتار بول رہا تھا۔ اسے سن کر مجھے حیرت ہونے لگی۔ میں نے اب تک اسے انتہائی کم گو اور غیر جذباتی پایا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ کسی بھی موضوع پر طویل گفتگو نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ دو اور دو چار کی طرح ٹو دی پوائنٹ بات کر کے معاملہ نمٹا دیتا تھا۔ ایسے شخص کا روانی کے ساتھ نان اسٹاپ بولنا خلاف معمول تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی تھی کہ موجودہ معاملے سے اس کی گہری جذباتی دلچسپی تھی۔ میں نے منہاس کو ایک سچا اور محبِ وطن پاکستانی پایا تھا جو ملک دشمن عناصر سے شدید نفرت کرتا تھا۔

جذباتی وابستگی سخت سے سخت انسان کو بھی اس کے خول سے باہر آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ شاید، منہاس باقر کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا معاملہ تھا۔

میں نے اس کی پوری بات توجہ سے سننے کے بعد کہا ''منہاس صاحب! اس سلسلے میں آپ مجھ سے کیا تعاون چاہتے ہیں؟''

وہ بولا ''میں نے جن دو افراد کا ذکر کیا ہے وہ گلستان جوہر کے ایک فلیٹ میں مقیم ہیں۔ یہ اپارٹمنٹس بلڈنگ گلستان جوہر کے آخری سرے پر واقع ہے جس کے زیادہ تر فلیٹس ابھی غیر آباد ہیں۔ میں چاہتا ہوں، تم شہزاد علی کے ساتھ وہاں پہنچو اور ان لوگوں سے اس گروہ کے بارے میں مزید ''اگلوانے'' کی کوشش کرو۔ زبان کھلوانے کے سلسلے میں تم پولیس والوں سے چار ہاتھ آگے ہو۔ میں جلد از جلد اپنے شہر سے بیرونی لابی کے قدم اکھاڑنا چاہتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے بتایا ''ان دو افراد کے نام جہانگیر اور فواد معلوم ہوئے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''کیا یہ آپریشن آج ہی رات ہونا ضروری ہے؟''

''بے حد ضروری!'' وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔

''ہوں!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ جلدی سے بولا ''ان جرائم پیشہ لوگوں کے مزاج اور پروگرام کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ پل پل اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ آج جہانگیر اور فواد گلستان جوہر کے اس فلیٹ میں ہیں، ممکن ہے کل کسی ایمرجنسی میں وہ کہیں اور شفٹ ہوجائیں۔ میں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اگر یہ سراغ ہاتھ سے نکل گیا تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔''

''یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں منہاس صاحب!'' میں نے متذبذب انداز میں کہا تو وہ میرے لہجے میں چھپی الجھن کو فوراً محسوس کرتے ہوئے بولے۔

''تم کس سوچ میں ڈوب گئے وجدان؟''

''آں..... کچھ نہیں۔''

''کوئی پرابلم ہے اس وقت آنے میں؟''

''آنے میں کوئی دشواری نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا پھر پوچھا ''مجھے کہاں پہنچنا ہوگا اور کتنے بجے تک پہنچنا ہوگا میں چاہتا ہوں، ایک دو گھنٹے میں سب نمٹ جائے۔''

وہ جہاں دیدہ آدمی تھے۔ میرے لہجے میں شامل گریزنما تذبذب نے اسے بتا دیا کہ میں اس وقت کسی نہایت ہی پیچیدہ معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔ وہ نہایت ہی مشفقانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''مجھ سے کھل کر بات کرو وجدان! میں نے محسوس کیا ہے، تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو!''

میں نے خود کو پیش آمدہ صورتِ حالات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''منہاس صاحب! تازہ ترین معلومات کے مطابق میری ساتھی ساحل کو آج صبح کراچی سے لاہور روانہ کر دیا گیا ہے جہاں سے وہ میرے دیرینہ دشمن ملک نوازش علی کی حویلی میں پہنچا دی جائے گی۔ میں کل صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے لاہور جا رہا ہوں۔ یہ پروگرام فل اینڈ فائنل ہے۔''

''اوہ!'' منہاس باقر گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''آپ مایوس نہ ہوں منہاس صاحب۔'' میں نے جلدی سے کہا ''آپ کا مشن ادھورا نہیں رہے گا۔ مجھے امید ہے، ہم دو گھنٹے میں فارغ ہوجائیں گے۔''

اب اس کے انداز میں مجھے تذبذب محسوس ہوا۔ میرے حالات جاننے کے بعد وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں نے اس کی الجھن کو سلجھن میں بدلتے ہوئے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں منہاس صاحب! میں نے آج دن میں تین چار گھنٹے کی نیند لے لی تھی۔ اس وقت میں بالکل فریش اور چاق و چوبند ہوں۔ آپ بتائیں، میں کہاں پہنچوں؟''

تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے کہا ''تم میرے اخبار کے دفتر ہی آ جاؤ۔ میں اس وقت دفتر میں موجود ہوں۔ تمہیں اس گروہ کے حوالے سے کچھ بریف بھی کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

میرے فلیٹ سے منہاس باقر کے دفتر کا فاصلہ صرف تیس منٹ کا تھا۔ نصب شب کے بعد روڈ خالی ملتیں اور میں بہ آسانی بیس منٹ میں وہاں پہنچ جاتا۔ ایک گھنٹے کا وقت میں نے اس لیے لیا تھا کہ میں تھوڑا فریش ہونا چاہتا تھا۔ گزشتہ چار گھنٹے میں نے افراتفری اور مارا ماری میں گزارے تھے۔ میں ایک بھرپور شاور کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ میں بیگ سے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔

دورانِ غسل میں مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ میں نے آج دوپہر کے بعد سے ابھی تک باقاعدہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ شام میں، صدر کے علاقے میں، میں نے لائٹ ریفریشمنٹ ضرور لیا تھا مگر اسے کھانے میں شمار نہیں کیا جا سکتا پھر ملک روف کے بنگلے پر جن حالات سے نبرد آزما رہا، انہوں نے میری بھوک کو چمکا دیا تھا۔ میں نے سوچا، منہاس باقر کی طرف جاتے ہوئے، راستے میں بوٹ بیسن سے کچھ کھا لوں گا۔ اس علاقے میں رات گئے ریسٹورنٹ کھلے رہتے تھے۔ وہ علاقہ ایک طرح سے فوڈ مارکیٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں نہا دھو کر تیار ہوا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ میں فلیٹ سے باہر نکلتا، گھنٹی بج اٹھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت دروازے پر کون ہوسکتا ہے۔ اس علاقے میں تو ویسے بھی پرائی دیسی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا اور پھر آدھی رات کے بعد بیل کا بجنا خالی از علت نہیں ہوسکتا تھا۔

ڈور بیل ایک طرح کا سوال ہوتا ہے جس کے جواب میں شرفا دروازے کھولتے ہیں۔ میں تو ویسے بھی دروازہ کھولنے ہی والا تھا لہٰذا یہ جواب اور بھی آسان ہوگیا۔

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے آٹھ سو دو والی پڑوسن کھڑی تھی۔ میں اسے اس وقت وہاں دیکھ کر چونکا۔ اس نے ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں دو تین برتن ڈھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی پڑوسن انیلا کو دیکھا۔ وہ جلدی سے بولی ''آج کل آپ کی مسز دکھائی نہیں دے رہی!''

اس کا اشارہ ساحل کی جانب تھا۔ ہم اس فلیٹ میں دنیا والوں کی نظروں میں، میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ اس رشتے کی آڑ میں سماجی زندگی بڑی سہل اور پُرسکون ہوجاتی ہے۔ ورنہ جس کی بھی نگاہ اٹھتی ہے، شک سے لبریز ہوتی ہے۔

میں نے اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''وہ چند روز سے اپنے میکے، لاہور گئی ہوئی ہے۔ میں کل صبح اسے لینے جا رہا ہوں۔''

''دراصل آج میں نے اپنے گھر میں میلاد کروایا تھا۔'' انیلا نے مجھے بھرپور نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا ''اچھا ہوا، میں اسی وقت لے کر آ گئی۔'' اس نے ٹرے میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا ''ورنہ صبح تو آپ پھر غائب ہوجاتے۔ یہ آپ کے حصے کا کھانا ہے۔''

میں جس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں ٹھہرا ہوا تھا اس کے ہر فلور پر صرف دو فلیٹ آمنے سامنے بنے ہوئے تھے۔ میں آٹھ سو ایک میں تھا اور انیلا آٹھ سو دو میں۔ اس کے شوہر کا نام طفیل تھا جو کسی بینک میں معزز عہدے پر فائز تھا۔ فیصل اور اسد نامی دو بچوں کے ساتھ وہ ایک خوش باش اور مطمئن فیملی کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ انیلا سے ایک دو مرتبہ لفٹ میں آتے جاتے

میری ''ہیلو ہائے'' ہوئی تھی اور وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ اس کی تعریف میں صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ وہ ایک بھرپور عورت تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور پوچھا ''کیا طفیل صاحب اس وقت گھر میں نہیں ہیں؟''

یہ سوال میں نے اس غرض سے پوچھا تھا کہ اتنی رات کو اسے خود کھانا دینے آنا پڑا تھا۔

وہ بولی ''طفیل سر گودھا گئے ہوئے ہیں اور دونوں بچے سو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کی فلیٹ میں لائٹ دیکھی تو اس لیے خود ہی چلی آئی۔ آج کا کھانا کل دیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔''

''آپ کو برتن ابھی واپس کردوں یا.....''

''برتن بعد میں آجائیں گے۔'' وہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور کھانے کی ٹرے لے کر اندر آگیا۔

اس وقت مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ یہ کھانا بروقت پہنچا تھا۔ میں نے ٹرے میں موجود مختلف برتنوں کے ڈھکن اٹھا کر دیکھے۔ ایک ڈش میں گرما گرم چکن بریانی تھی جس سے دھیمی دھیمی بھاپ بھی اٹھ رہی تھی۔ لگتا تھا، ابھی ابھی دیگ کے اندر سے نکالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قورمہ تھا، تافتان تھے اور دیگر لوازمات کے ساتھ سوئٹ ڈش بھی تھی جس کے عناصرِ ترکیبی میں خوبانی کو اولیت اور مرکزیت حاصل تھی۔ یہ ایسا وقت اور موقع نہیں تھا کہ میں پیٹ بھر کر کھانا کھاتا۔ میں جس مشن پر روانہ ہو رہا تھا اس کا تقاضا تھا کہ ہلکا پھلکا کھاؤں چنانچہ دس منٹ میں، میں نے آتشِ شکم کو سرد کیا اور فلیٹ سے باہر آگیا۔

جب میں منہاس باقر کے دفتر پہنچا تو رات کے ٹھیک دو بج رہے تھے۔

منہاس نے فوراً مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا ''آپ تو علی الصباح دفتر آیا کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کو یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے!''

''مجھے ایک ایمرجنسی میں آدھی رات کو دفتر آنا پڑا ہے۔'' اس نے اضطراری لہجے میں بتایا ''یہاں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی تم سے فون پر رابطہ ہو پایا تھا، خیر۔'' وہ جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے بولا ''تم سناؤ، کیا حال چال ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا پھر پوچھا ''آپ کس ایمرجنسی کا ذکر کر رہے ہیں؟''

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا ''ابھی دو گھنٹے پہلے پولیس نے ڈیفنس میں ایک کامیاب آپریشن کیا ہے۔ مجھے باخبر ذرائع سے جیسے ہی اس آپریشن کی اطلاع ملی، میں دفتر چلا آیا۔ میرے اخبار کی ایک ماہر ٹیم جائے وقوعہ پر پہنچ چکی ہے۔ صبح تک سنسنی خیز خبروں کی توقع ہے۔''

پولیس آپریشن کے ذکر پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ آج رات ساڑھے دس سے ساڑھے گیارہ بجے تک میں ملک رؤف کے بنگلے پر بہت ''مصروف'' رہا تھا۔ ازاں بعد وہاں پولیس کی ''مصروفیت'' شروع ہو گئی تھی۔ منہاس باقر نے پولیس آپریشن کا تذکرہ کیا تو لامحالہ میرا ذہن اس طرف چلا گیا۔

''پولیس نے کس قسم کا آپریشن کیا ہے منہاس صاحب؟'' میں نے استفسار کیا۔

تھوڑے تامل کے بعد اس نے بتایا ''ڈیفنس کے ایک بہ نسبت کم آباد فیز میں ملک رؤف نامی منشیات کا ایک اسمگلر رہتا تھا۔ پولیس نے اس کے بنگلے پر کامیاب چھاپا مارا ہے۔ وہاں پولیس کو شدید نوعیت کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مار ماری میں ملک رؤف کے علاوہ دو مزید افراد کی ہلاکت واقع ہوئی ہے۔ دو ملازم شدید زخمی ہوئے ہیں۔ ہلاک ہونے والے تین افراد میں ملک رؤف، اس کا مسلح باڈی گارڈ اسلم اور ایک معروف سماجی و سیاسی شخصیت میاں زاہد حسین بھی شامل ہے۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ میاں زاہد ایک اسمگلر کے بنگلے میں کیا کر رہا تھا؟ پولیس نے بھاری جمعیت کے ساتھ کارروائی کر کے نہ صرف اسمگلرز کو کچل ڈالا بلکہ اس بنگلے سے منشیات کی بھاری مقدار برآمد کر لی ہے۔'' وہ ایک لمحے سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''یہ آپریشن انسپکٹر قادر بخش کی نگرانی میں ہوا ہے۔''

اس کی بات ختم ہوئی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ایک اخبار کا پبلشر اینڈ ایڈیٹر بالکل اسی انداز میں سوچ رہا تھا جیسا پولیس چاہتی تھی۔ گویا موٹی تو ندوالا انسپکٹر قادر بخش اپنی ''اسکیم'' میں کامران رہا تھا۔ اس پورے آپریشن کا سب سے اہم کردار میں تھا۔ اس واقعے کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا تھا، مگر میں منہاس باقر کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا..... کچھ بھی نہیں!

''ویسے ایک بات طے ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''میاں زاہد حسین کسی چکر میں وہاں پھنس گیا ہوگا اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ پولیس مقابلے میں نہیں مارا گیا بلکہ

پولیس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اسے موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔ اس کی گردن کٹی لاش ایک برآمدے میں پڑی ملی ہے جب کہ پولیس نے اس آپریشن میں گن فائرنگ سے کام لیا ہے۔ بہرحال، صبح تک صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔''

میاں زاہد حسین اس شہر کے معزز افراد میں شمار ہوتا تھا۔ عوام کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ ایک فعال سنڈیکیٹ کا باس تھا بلکہ خواص کی اکثریت بھی اس راز سے بے خبر تھی جن میں منہاس باقر بھی شامل تھا۔ میں نے آج تک میاں زاہد کے حوالے سے اپنے معاملات کے بارے میں منہاس باقر کو کبھی کچھ نہیں بتایا تھا..... اور اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر منہاس باقر نے کہا ''کس سوچ میں ڈوب گئے ہو جدان؟''

''کچھ نہیں..... کچھ نہیں۔'' میں نے چونکنے کی اداکاری کی ''بس ذرا ساحل کی طرف دھیان چلا گیا تھا۔''

وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا پھر مجھے جہانگیر اور فواد کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے اب تک یہودی تنظیم کے آلۂ کار گروہ کے بارے میں جو تحقیق کی تھی اس سے مجھے آگاہ کیا، چند ہدایات دیں اور گمبھیر لہجے میں کہا۔

''یہ راز ہمارے درمیان رہنا چاہیے وجدان۔''

''یعنی میرے اور آپ کے درمیان؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا ''اور وہ آپ کا کرائم رپورٹر شہزاد علی؟''

''وہ میرے بھروسے کا آدمی ہے۔'' منہاس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''گویا یہ راز ہم تینوں کے بیچ ہوا نا؟''

''ہاں، بالکل۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا ''اور اگر کسی مرحلے پر ہمیں پولیس کی مدد کی ضرورت پیش آئی تو اس کا بندوبست بھی موجود ہے۔ ایک دو با اختیار پولیس آفیسر میرے گہرے دوستوں میں ہیں۔ میں انہیں اعتماد میں لے کر بڑے سے بڑا کام نکلوا سکتا ہوں۔'' وہ چند لمحات کا توقف کرنے کے بعد گویا ہوا ''ویسے تمہاری موجودگی میں مجھے یقین ہے، کسی اور سے کسی قسم کی مدد نہیں لینا پڑے گی۔ تم اکیلے ہی تمام معاملات سے نمٹ لو گے۔''

''یہ تو آپ کی محبت ہے جو مجھ پر اتنا اعتبار کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا ''تم کسی حد تک ٹھیک کہتے ہو۔ اس اعتماد میں ایک حد تک میری محبت اور شفقت بھی شامل ہے مگر غالب عنصر تمہاری کارکردگی ہے۔ اب تک کے تمہارے تمام کارنامے میرے سامنے ہیں۔''

میں نے موضوع کا زاویہ بدلتے ہوئے کہا ''وہ آپ کا کرائم رپورٹر شہزاد نظر نہیں آرہا؟''

''وہ اس وقت دفتر ہی میں ہے۔'' منہاس باقر نے بتایا ''میں ابھی اسے اپنے کمرے میں بلا کر تم سے متعارف کرواتا ہوں۔'' پھر ذرا توقف کے بعد اس نے کہا ''میں نے اپنے اخبار کے لیے ایک فل ٹائم الگ کرائم رپورٹر بھی رکھا ہوا ہے جو اس وقت اخباری ٹیم کے ساتھ ڈیفنس گیا ہوا ہے۔ شہزاد علی کو میں خاص الخاص معاملات میں استعمال کرتا ہوں۔ اخبار کے حوالے سے اس پر کوئی لوڈ نہیں ہے۔''

پھر وہ مختصر الفاظ میں شہزاد کے بارے میں بتانے لگا جس کے مطابق دس سال پہلے وہ جہلم سے کراچی آیا تھا۔ اس نے انٹرنس تک تعلیم کر رکھی تھی۔ ہنر کے نام پر اسے ڈرائیونگ آتی تھی۔ ابتدا میں اسی ہنر کو ذریعۂ معاش بنایا۔ منہاس نے دیکھا کہ بندہ پڑھا لکھا اور چابک دست ہے تو اس نے شہزاد کو رپورٹنگ سائیڈ میں آزمایا اس شعبے میں وہ خاصا نمایاں رہا اور آگے چل کر اخبار کے لیے کرائم رپورٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتا رہا۔ آج کل وہ مکمل طور پر منہاس باقر کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ منہاس باقر اسے بھڑے والے معاملات میں استعمال کرتا تھا کیوں کہ شہزاد دنگا فساد میں مہارت رکھتا تھا۔

آئندہ چند لمحات میں، میں شہزاد علی سے بالمشافہ متعارف ہو چکا تھا۔ وہ ایک دراز قامت اور دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کا قد چھے فٹ کے قریب اور عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ اس سے مصافحہ کرنے میں مجھے بہت مزہ آیا۔ اس کی ہتھیلی خاصی کشادہ، انگلیاں آہنی سلاخوں کی مانند اور گرفت مضبوط تھی۔ اس نے جس گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا، اس سے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ یاروں کا یار اور لڑنے مرنے کو تیار رہنے والا بندہ ہے۔ ایسے افراد اپنے مقصد اور دوستوں کے لیے جان کی بازی لگانے میں کسی سوچ بچار سے کام نہیں لیتے۔

یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ شہزاد علی سے مل کر میں نے دلی مسرت محسوس کی تھی۔ ٹھیک ڈھائی بجے ہم منہاس باقر کے دفتر کی ہائی روف میں اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

گلستانِ جوہر کا یہ حصہ اس وقت رات کی تاریکی میں ڈوبا

ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ ہمیں اپنے مطلوبہ فلیٹ تک آنے کے لیے خاصا لمبا سفر کرنا پڑا۔ دن کے وقت یہ فاصلہ پونے گھنٹے سے پہلے طے نہیں ہوسکتا تھا مگر رات کے آخری پہر سڑکیں سنسان پڑی تھیں پھر شہزاد نے اچھی خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ بھی کیا چنانچہ ہم صرف بیس منٹ میں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ بلاشبہ، شہزاد ایک مشاق ڈرائیور ثابت ہوا تھا۔

شہزاد نے جس اپارٹمنٹس بلڈنگ کے پچھواڑے گرین ہائی روف کھڑی کی وہ گلستانِ جوہر کے بالکل آخری سرے پر واقع تھی۔ اس بلڈنگ کے بہت کم فلیٹس ابھی آباد ہوئے تھے۔ یہ بلڈنگ چار بلاکس اے، بی، سی اور ڈی پر مشتمل تھی۔ ہر بلاک کے چار فلور تھے..... یعنی کل پانچ منزلیں۔ فلیٹس سسٹم میں پہلی منزل کو ''گراؤنڈ'' کا نام دے کر گنتی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ کوئی بھی پانچ منزلہ عمارت، فور فلور بلڈنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

میرے مطلوبہ دونوں افراد بلاک ڈی کے فلیٹ نمبر تین سو آٹھ میں تھے۔ وہ ایک کارنر فلیٹ تھا۔ جو تیسرے فلور پر واقع تھا۔ اس بلڈنگ کے ہر فلور پر آٹھ فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کتنا بڑا رہائشی پروجیکٹ ہوگا! ویسے گلستانِ جوہر کے اکثر پروجیکٹس دیو ہیکل اور ہیبت ناک ہیں۔ اس رہائشی منصوبے کی عمارتوں کو منڈی کہا جاسکتا ہے۔

ہم گاڑی سے باہر آئے اور محتاط قدموں سے چلتے ہوئے بلڈنگ کی پاؤنڈری وال تک پہنچ گئے۔ میرے پاس اپنا مخلص اور آزمودہ خنجر تھا جب کہ دورانِ سفر میں شہزاد علی مجھے بتا چکا تھا، وہ اپنے ساتھ ایک پسٹل لایا تھا۔ ہم نے چوکیدار کی نظر بچا کر پاؤنڈری وال کراس کی اور عمارت کے اندر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ہمیں اپنے ٹارگٹ فلیٹ تک رسائی حاصل کرنے میں صرف تین منٹ لگے تھے۔

کارنر فلیٹ ہونے کے باعث داخلے کے لیے دو دروازے مل گئے تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں اور دوسرا لاؤنج میں کھلتا تھا۔ میں تھوڑا ہٹ کر زینے کے پاس کھڑا ہو گیا اور شہزاد علی کو میں نے اشارہ کیا کہ وہ دروازے پر دستک دے۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجانے سے اسے خاص طور پر منع کر دیا تھا۔

اس نے ہولے سے دستک دی۔ اندر نیچی آواز میں ٹی وی چل رہا تھا۔ دستک کے بعد ٹی وی کی آواز معدوم ہوگئی۔ اس کا یہی مطلب تھا، دستک کو اندر والوں نے سن لیا تھا۔ ویسے ٹی وی کی آواز ہمیں بتا چکی تھی کہ وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک ضرور جاگ رہا تھا۔ ہم دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے تھے کہ مجھے اپنے دائیں جانب کوئی شے حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس طرف کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو یقینی طور پر فلیٹ کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی تھی۔

میں نے بے اختیار اس کھڑکی کی سمت دیکھا اور یہ اندازہ لگانے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ کھڑکی کے پیچھے موجود پردے میں حرکت ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس پردے کے پیچھے سے کسی نے چھپ کر ہمیں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں زینے کی چھت پر روشن ٹیوب لائٹ کی روشنی بڑی وافر مقدار میں پہنچ رہی تھی، گویا مجھے دیکھ لیا گیا تھا۔ ویسے آج شام سے میں نے اپنے حلیے میں بڑی تسلی بخش تبدیلی کر لی تھی۔

میں نے بروقت اپنی جگہ سے حرکت کی اور ڈرائنگ روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ میرا یہ عمل بے آواز تھا۔ اس دوران میں میرے اشارے پر شہزاد علی دوبارہ دستک دے چکا تھا۔ یہ دستک پہلے کی بہ نسبت تیز اور زیادہ شدت لیے ہوئے تھی۔

تھوڑی دیر بعد، اندر سے کسی نے بھاری بھرکم آواز میں پوچھا ''کون ہے؟''

''ہم اس بلڈنگ میں نئے آئے ہیں۔'' میں نے اپنی آواز میں پریشانی بھرتے ہوئے کہا ''سیکنڈ فلور پر..... فلیٹ نمبر دو سو چار میں۔''

شہزاد علی کی معلومات کے مطابق دو سو چار میں چند روز پہلے ایک فیملی آ کر آباد ہوئی تھی۔ منہاس بافر کے دفتر سے یہاں تک پہنچنے کے دوران میں، میں نے شہزاد سے اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں اور اب ان کو استعمال کر رہا تھا۔

اندر سے اسی بھاری آواز والے نے سوال کیا ''اس بلڈنگ میں نئے آئے ہو تو ہم کیا کریں؟''

''میرے بھائی!'' میں نے اپنے لہجے میں مصنوعی لجاجت شامل کرتے ہوئے کہا ''بات دراصل یہ ہے کہ میری بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ وہ پورے دنوں سے ہے۔ اسے فوری طور پر اسپتال لے جانا ہوگا۔ میرے پاس کنوینس کا بندوبست نہیں اور رات کے آخری پہر ٹیکسی بھی آسانی سے نہیں ملے گی۔ آپ لوگوں کے پاس ایک سوئفٹ گاڑی موجود ہے۔ اگر آپ مصیبت کے وقت میں میری تھوڑی مدد کر دیں تو اللہ آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔ میری بیوی کی حالت ایسی ہے کہ اگر اسے بروقت اسپتال.....''

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ''میں نے پہلے تمہیں دیکھا نہیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے، نیچے کوئی نئی فیملی آئی ہے۔''

میں اس سے پوچھ سکتا تھا، پہلے مجھے نہیں دیکھا تو اس وقت کیسے دیکھ لیا۔ اگر اس وقت نہیں دیکھا تو پھر تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو؟ میں جانتا تھا، اس شخص نے کھڑکی کے پردے میں درز پیدا کر کے مجھے زینے کے پاس کھڑے دیکھ لیا تھا اور یہ حلیہ اس کے تئیں یقیناً اجنبی تھا۔ میں اس سے سوال و جواب کر کے وقت ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میری پہلی ترجیح دروازہ کھلوانا تھی۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ وہ شہزاد کی وہاں موجودگی کو محسوس نہیں کر سکا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا، دستک بھی میں نے ہی دی ہوگی۔

میں نے شہزاد علی کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے، دروازے کے پیچھے موجود شخص سے کہا ''بھائی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے مجھے پہلے اس بلڈنگ میں نہیں دیکھا ہوگا۔ میں آج رات ہی آیا ہوں۔ میرا کام کچھ اس نوعیت کا ہے کہ زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتا ہوں۔ شفٹنگ میرے چھوٹے بھائی نے کروائی تھی اور اسی کی زبانی مجھے پتا چلا کہ آپ کے پاس سوئفٹ (SWIFT) گاڑی ہے۔''

میں نے دروازہ کھلوانے کے لیے بڑے مضبوط دلائل دیے تھے لیکن اندر موجود شخص بھی بہت چھٹا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے کے بجائے اس نے کہا ''تم تھوڑا انتظار کرو۔ میں اپنے ساتھی سے مشورہ کرتا ہوں۔''

ہمارے اندازے کے مطابق اس فلیٹ میں جہانگیر اور فواد نامی دو افراد مقیم تھے جن کا تعلق ایک ایسی تنظیم سے تھا جو یہودی لابی کے اشاروں پر کٹھ پتلی کے مانند ناچتی تھی۔

ہمیں صرف ایک منٹ انتظار کرنا پڑا۔ دروازے کی دوسری جانب قدموں کی آواز سنائی دی، پھر میں نے دروازے کا ہینڈل گھومنے اور اندر کی کنڈی گرائے جانے کی آواز سنی۔ وہ بہت نازک لمحات تھے۔ گزشتہ ایک منٹ میں، اشاروں کی زبان میں، میں نے شہزاد کو آئندہ کی حرکات و سکنات کے بارے میں سمجھا دیا تھا اور اس نے اثبات میں گردن ہلا کر مجھے مطمئن کر دیا تھا، گویا اس کے دماغ نے میرے سگنلز کو پوری طرح ریسیو کر لیا تھا۔

میں فوری حملے کے لیے اسٹانس (STANCE) بنائے، سانس روکے کھڑا تھا۔ جیسے ہی اندر موجود شخص نے دروازے کے سنگل پٹ کو چوکھٹ سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی، میں نے پوری قوت سے ڈبل ہینڈ پُش دروازے کے پٹ پر رسید کر دیا۔ نتیجے میں دروازہ پوری طرح کھل گیا اور اس کے پیچھے موجود شخص دیوار اور پٹ کے درمیان دب کر رہ گیا۔ بے اختیار اس کے حلق سے ایک کراہ برآمد ہوئی۔

میں نے فلیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میرے اس عمل سے پہلے ہی شہزاد بھی بھرمار کر اندر داخل ہو چکا تھا۔ میں نے چشمِ زدن میں دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس دوران میں شہزاد نے اس شخص کو اپنے پسٹل کے نشانے پر رکھ لیا۔

''کک..... کون ہو..... تم لوگ؟'' اس شخص نے وحشت زدہ نظر سے، شہزاد کے ہاتھ میں موجود پسٹل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے شہزاد سے کہا ''تم دوسرے کو دیکھو۔ اسے میں بتاتا ہوں، ہم لوگ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس ارادے سے یہاں پہنچے ہیں۔''

شہزاد پستول بدست ایک کمرے میں گھس گیا۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ڈرا سہما ہوا وہ شخص اچانک شیر ہو گیا۔ وہ پگلا یہ نہیں جانتا تھا، میں نہتا کسی مسلح سے کتنا زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہوں۔

اس نے بڑی سرعت سے میرے پیٹ میں ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش جزوی طور پر کامیاب ہوئی۔ اس کا مینڈھے کی طرح جھکا ہوا سر میرے پیٹ کی جلد سے ٹکرایا مگر میرے اندرونی اعضا پر کاری ضرب نہیں لگا سکا۔ میں نے اس عمل پر فوراً ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے اپنے پیٹ کو کمر سے لگا لیا تھا۔ سانس کی مشقوں نے مجھے اس فن میں خاصی مہارت بخشی تھی۔

میں نے خود کو بچانے کے ساتھ ہی اس شخص پر جوابی حملہ کر دیا۔ اس کی پشت میرے سامنے ایک میز کی صورت موجود تھی۔ میں نے پوری طاقت سے اپنی دونوں کہنیاں اس کی کمر پر رسید کر دی۔ وہ ایک خوفناک آواز خارج کرتے ہوئے دھڑام سے منہ کے بل زمین پر گرا۔ میں اچھل کر اس کے اوپر سے آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے فلیٹ کے کسی حصے سے یہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''فواد! یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم نے تو بتایا تھا، کسی کی بیوی.....!''

بولنے والے کی زبان کو بریک لگ گئے۔ میں سمجھ گیا، اس کی آنکھوں نے اپنے سامنے ایک پستول بردار شخص کو دیکھ لیا تھا۔ اس دوران میں فواد نامی وہ شخص اٹھ کر دوبارہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہو چکا تھا۔

ہماری معلومات کے مطابق اس فلیٹ میں فواد اور جہانگیر نامی دو افراد ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھ سے پٹنے والے فواد نامی شخص کو مخاطب کرنے والا جہانگیر ہی ہو سکتا تھا۔ فواد نے جہانگیر کے ادھورے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ پر حملہ کر دیا۔

اس نے بڑی تیز رفتاری سے رائٹ پنچ میرے چہرے پر آزمانے کی کوشش کی۔ میں نے دائیں ہاتھ کی گرفت میں اس کا مکا دبوچ کر بڑی سرعت سے ایک مروڑ دیا۔ ردِعمل میں اس کی کمر ٹوسٹ (TWIST) ہوئی اور چہرہ آگے کی جانب جھک گیا۔ میں نے اس کے خمیدہ کمر پر بائیں گھٹنے سے ٹھوکر لگائی۔ وہ منہ کے بل دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس تصادم میں اس کے حلق نے ایک کربناک آواز خارج کی۔

فواد کی طویل، دردناک چیخ کے دوران میں، میں نے شہزاد علی کو سنا۔ وہ غالباً جہانگیر کو پستول کے بل پر دھکار رہا تھا۔ اسی لمحے ایک نسوانی چیخ بھی اس دھمکی میں شامل ہو گئی۔ گویا ان دونوں کے علاوہ کوئی سریلی چیخ خارج کرنے والی بھی موجود تھی۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے میں مجھے ذہن کو زیادہ تکلیف دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

نسوانی چیخ کی آواز نے مجھے ایک لمحے کے لیے فواد کی جانب سے غافل کر دیا تھا۔ اس نے سنبھل کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کا حملہ بڑا دیسی قسم کا تھا۔ میں یہ اندازہ تو کر چکا تھا، فواد باقاعدہ مارشل آرٹس سے نابلد تھا۔ وہ مقامی انداز کا فائٹر تھا۔

فواد نے مجھے دھکا دے کر گرانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی یہ کوشش جزوی طور پر پوری ہوئی۔ میں اس کا پش (PUSH) لے کر تھوڑا سا لڑکھڑایا لیکن اسی لڑکھڑاہٹ کے دوران میں میری وہیل کک (WHEEL KICK) چل گئی جو فواد کی کنپٹی پر لگی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔ میں نے اس کے سنبھلنے سے قبل ایک زبردست سائیڈ کک اس کے سینے پر رسید کر دی۔

اس کے حلق سے ''غوں'' کی آواز برآمد ہوئی اور وہ ہوا میں بیک فلائی کرتے ہوئے عقبی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کا جسم ''دھپ'' سے فرش پر آ گرا۔

اسی لمحے میں نے اندر کمرے میں دھینگا مشتی کی سی آوازیں سنیں۔ ظاہر ہوتا تھا، جہانگیر، شہزاد سے بھڑ گیا تھا۔ میں نے فواد کے ساتھ لاؤنج میں معرکہ آرائی کی تھی جب کہ شہزاد فلیٹ کے ایک کمرے میں گھسا ہوا تھا۔

میں نے فواد کو تجزیاتی نگاہ سے دیکھا۔ وہ فوری طور پر اٹھنے کے قابل نظر نہیں آتا تھا۔ دیوار سے ٹکراؤ میں، شاید اس کی کھوپڑی پر کوئی شدید نوعیت کی چوٹ آ گئی تھی۔ وہ لاؤنج کے فرش سے پڑا دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ میں اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اندر پہنچ کر ایک دلچسپ اور حیرت ناک منظر نے میرا استقبال کیا۔ شہزاد اور جہانگیر آپس میں گتھا گتھم تھے۔ ایک ماہ جبیں بیڈ شیٹ کو ہنگامی انداز میں لپیٹے بیڈ پر بیٹھی کپکپا رہی تھی۔ اس کی کپکپی کسی ٹھنڈک کی مرہونِ منت نہیں تھی بلکہ اس کی آنکھوں میں جمی وحشت اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ اچانک پیش آمدہ حالات سے بری طرح خوف زدہ ہو چکی ہے۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بڑی سہمی ہوئی نظروں سے دو انسانوں کو جانوروں کے مانند کشتم کشتا ہوتے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس ڈری سہمی حسینہ کی نشست سے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل اس فلیٹ میں ''کیا کچھ'' ہو رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے شہزاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہزاد نے جہانگیر کو نیچے گرا رکھا تھا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر زور آزمائی کر رہا تھا۔ شہزاد کچھ اس طرح جہانگیر پر چھایا ہوا تھا کہ جہانگیر کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہانگیر کے بدن پر اس وقت صرف ایک پاجامہ تھا اور اس نے شہزاد سے پستول والے ہاتھ کو بڑی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ شہزاد کی زور آزمائی کا سبب فوراً میری سمجھ میں آ گیا پھر اس سے قبل کہ میں شہزاد کی کوئی مدد کرتا، ایک فوری واقعہ پیش آ گیا۔

شہزاد کے نیچے دبے ہوئے، شخص نے اپنے جسم کو ایک مخصوص انداز میں زوردار جھٹکا دیا۔ شہزاد اس کے اوپر سے اچھل کر دور جا گرا، پستل جہانگیر کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اس نے بیک پش (BACK PUSH) لگایا اور سر کو جھٹکتے ہوئے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ پڑی تو میں اچھل پڑا۔ میں نے پلک جھپکتے میں اسے پہچان لیا۔ میری سانس گویا ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی۔ میں نے اپنے تن بدن میں ایک خوشگوار سنسنی کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ حالات کی اس کروٹ نے مجھے میرے شکار تک پہنچا دیا تھا۔

میری نگاہ اس وقت کوئی دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ وہ جہانگیر نامی اس شخص کے لہو کی پیاسی تھی۔ سانولا رنگ، ہلکی مونچھیں، کرخت چہرہ، جسم مائل بہ فربہی اور قد پانچ فٹ دس انچ..... اس بدبخت نے میرے تین پیاروں کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا تھا۔ وہ میر بخش، امتیاز علی اور روبی کا قاتل تھا..... گرے پجارو سے برآمد ہونے والا گن بردار..... وہ گرے پجارو جس کا نمبر ''تھری، ون، فائیو، ون'' تھا۔ اس کے شیشے سیاہ تھے اور اسی سیاہ شیشوں والی گاڑی میں سے سیاہ بخت جہانگیر نے گولیاں برسا کر گورا قبرستان کے نزدیک میرے تین اہم ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا!

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ میرے من میں روشن خوفناک آگ کے انتقامی شعلوں میں اچانک بلا کی بھڑک پیدا ہو گئی۔ جہانگیر نے، میرے چہرے پر تیزی سے پھیلتی ہوئی سفاکی اور درندگی کو پڑھ لیا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر رہا۔

جہانگیر نے شہزاد سے چھینا ہوا پستل مجھ پر تانتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا ''وجدان! میں جانتا ہوں، ایک دن تم سے سامنا ضرور ہو گا لیکن یہ معلوم نہیں تھا، ان حالات میں ہماری ملاقات ہو گی۔ مرنے سے پہلے کی دعائیں دہرا لو۔ اب تمہاری زندگی کے چند لمحات باقی بچے ہیں۔''

''تمہارے لیے بھی میرا یہی پیغام ہے۔'' میں نے پستل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا ''تمہاری تلاش میں، میں نے ایک ایک لمحہ بڑی اذیت سے گزارا ہے۔''

''چلو خوش ہو جاؤ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا ''اب تمہاری اذیت کا خاتمہ ہونے والا ہے۔''

میں نے اپنی توجہ کو اس کے کندھوں پر مرکوز کر رکھا تھا۔ انسانی جسم کی حرکات و سکنات کو ٹریس کرنے کے دوران ٹرینٹل کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بالائی جسم کی حرکات کو کندھوں سے پکڑا جا سکتا ہے اور زیریں جسم کی حرکات کمر سے ظاہر ہوتی ہیں۔ کمر اور کندھے انسانی جسم کی حرکات و سکنات کے معاملے میں ''چغل خور'' ثابت ہوتے ہیں۔

اس وقت سب سے اہم شے اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کا وہ پستل تھا جو جہانگیر نے بڑے خطرناک انداز میں مجھ پر تان رکھا تھا۔ ہمارے درمیان بمشکل چار فٹ کا فاصلہ رہا ہو گا۔ اس محدود فاصلے کو میری ایک سائیڈ کک چشم زدن میں پاٹ سکتی تھی۔ میں اسی لمحے کی تلاش میں تھا جب مذکورہ کک کا استعمال انتہائی محفوظ ہوتا!

میں نے اسے باتوں میں لگاتے ہوئے پوچھا ''میرے ساتھیوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ تم نے انہیں جان سے کیوں مارا؟''

''یہ سوال تم انہی سے پوچھنا۔'' وہ پستول والے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے بولا ''میں تمہیں ان کے پاس پہنچانے والا ہوں۔''

''ہم سے تمہاری دشمنی کیا ہے؟ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔'' میں نے کہا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو!''

وہ متذبذب انداز میں اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اسی لمحے جہانگیر کی نگاہ میرے عقب میں اٹھ گئی۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں نے (YELL) کرتے ہوئے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور اگلے ہی لمحے میری رائٹ سائیڈ کک اس کے پیٹ پر کسی وزنی گولے کی مانند لگی۔ اس ضرب میں میرا بے پناہ غصہ بھی شامل تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور وہ ریورس گیئر میں سفر کرتے ہوئے عقبی دیوار سے جا ٹکرایا۔ پستل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ کے اوپر جا گرا۔ بیڈ شیٹ میں سکڑی سمٹی حسینہ نے وحشت زدہ نظر سے پستل کو دیکھا اور غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ پستل کی جانب بڑھ گیا۔

یہ ایک فطری عمل تھا۔ اس نے اپنی حفاظت کی خاطر پستل کو قابو میں کرنے کی کوشش کی تھی اس کوشش کے نتیجے میں بیڈ شیٹ نے اس کی ستر پوشی سے انکار کر دیا۔ اس کا بے لباس بدن اچانک ہی بیڈ شیٹ کی اوٹ سے باہر آ گیا۔

اس حسینہ کے ساتھ..... نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، جیسی صورتِ حال ہو کر رہ گئی تھی۔ پستل اس کے ہاتھ کی پہنچ سے چھے انچ کے فاصلے پر رہ گیا۔ وہ ''اِدھر'' اور ''اُدھر'' کے درمیان ساکت ہو کر رہ گئی۔ اس کی ندامت آمیز بے بسی کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں!

اس دوران میں شہزاد لپک کر پستل تک پہنچ گیا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر جہانگیر کا جائزہ لینا چاہا تو عقب سے ایک ٹھوکر میری کمر پر پڑی۔ میں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا، وہ فواد تھا جو سنبھل کر مجھ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ جہانگیر نے چونک کر یقیناً اسی کو دیکھا تھا اور مجھے اس پر وار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہ تمام حالات مشکل سے تین سیکنڈ میں رونما ہوئے تھے۔ انہی لمحات میں فواد نے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اپنے عقب میں موجود فواد پر بڑی سرعت سے ایک بھرپور کریسنٹ کک (CRESCENT KICK) آزمائی۔ کریسنٹ کک ہلالی شکل میں ایک قوس بناتی ہوئی جاتی ہے۔ اس قوس کے راستے میں آنے والی ہر شے کو ایک عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فواد کے تھوبڑے پر میرا دایاں پاؤں کسی ہتھوڑے کے مانند لگا اور وہ الٹ کر بیڈ پر جا گرا۔

بیڈ پر موجود ہکا بکا حسینہ کی حیرت ''چکنا چور'' ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی۔

اپنی برہنگی کا احساس ہوتے ہی اس نے جلدی سے خود کو بیڈ شیٹ میں لپیٹ لیا۔

میں نے شہزاد کو فواد کی طرف بڑھتے دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور میں نے دیکھے بغیر اپنا الٹا ہاتھ چلا دیا۔ میرا ہاتھ جہانگیر کے منہ پر پڑا۔ اس کے حلق سے خوفناک غراہٹ خارج ہوئی۔

میں اس کی جانب مڑا تو وہ اسٹانس بنا کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے انداز سے مارشل آرٹ جھلک رہا تھا۔ میرے سینے سے ایک مطمئن سانس خارج ہوئی۔ میں نے اسے غصہ دلانے والے انداز میں کہا۔

''اس رات تو تم نے خالی کلاشن کے زور پر مجھے زیر کرنے کا ڈراما رچایا تھا۔ اگر تمہیں مارشل آرٹس میں مہارت حاصل ہے تو موقع سے فرار کیوں ہو گئے تھے؟'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے چوٹ کی ''تمہارا دوسرا بھگوڑا ساتھی کہاں ہے؟''

وہ پھنکارا اور اس نے میرے سوالات کا عملی جواب پیش کیا۔ اس کی تیز رفتار راؤنڈ ہاؤس کک (ROUNDHOUSE KICK) میرے کندھے پر لگی۔ اس کک نے مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا کیوں کہ میں بلاکنگ کے لیے ہاتھ اٹھا چکا تھا۔ میرے کندھے کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میں نے جواباً اسپن ایک کک (SPIN KICK) اس کے منہ پر ماری۔

میرا وار خالی گیا۔ جہانگیر نے بروقت اپنے سر کو ایک جرک (JERK) دے کر چہرے کو بچا لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیک اسٹیپنگ کرتے ہوئے مجھ سے چند فٹ کی دوری پر چلا گیا۔ میں نے لپک کر اس کمرے کا دروازہ لاک کر دیا پھر میری نظر شہزاد کی جانب اٹھ گئی۔ وہ اپنے مدِمقابل سے بڑا شاندار سلوک کر رہا تھا۔ پسٹل کو اس نے اپنے لباس میں چھپا لیا تھا اور فواد کی مرمت کے لیے وہ صرف ہاتھ پاؤں کو زحمت دے رہا تھا۔ اس کی ضربیں بڑی جچی تلی تھیں۔

جہانگیر پلٹ کر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس نے لیفٹ فرنٹ کک کا جھانسا دے کر رائٹ فرنٹ کک میرے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ میں اس کے جھانسے پر ایک قدم پیچھے ہٹ چکا تھا۔ اس عمل کی تکمیل پر میں نے بڑی تیز رفتاری سے رائٹ بیک سوئپ (RIGHT BACK SWEEP) ماری۔ میری پنڈلی کی طوفانی ضرب اس کی ''جھانسا کک'' والی ٹانگ پر لگی۔ اسی لمحے جہانگیر کی ہائی فرنٹ کک بھی ناکام ہو کر نیچے آئی تھی۔ وہ بری طرح الجھا اور منہ کے بل کمرے کے پختہ فرش پر آ رہا۔

جہانگیر کے حلق سے ایک پُرتکلیف آواز خارج ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ہینڈ پش (HAND PUSH) لگا کر قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی خونخوار نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سانسیں بے ترتیب اور غراہٹ آمیز تھیں۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس کے حملہ آور ہونے سے قبل ہی شروع ہو گیا۔

میں نے اپنے قدموں پر اچھل کر ایک سائیڈ فلائنگ کک ماری۔ میرے پاؤں کا بلیڈ اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ یہ پاؤں چونکہ ایک فوجی بوٹ میں قیام پذیر تھا اس لیے یہ ضرب قیامت خیز ثابت ہوئی۔ وہ چہرے کو پکڑ کر زمین کی طرف جھکنے لگا۔ میں نے اسی لمحے ایک لوئر بیک کک اس کے منہ پر جڑ دی۔ بیک کک کو (REAR KICK) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کک اپنے ٹارگٹ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے، خاص طور پر (LOWER) بیک کک!

جہانگیر کے جھکتے ہوئے سر کو ایک جھٹکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں اچھل کر اس کے قریب آیا اور رائٹ پریشر کک اس کے سینے پر رسید کرنا چاہی۔ وہ تیزی سے رول ہو کر ذرا فاصلے پر چلا گیا۔ اسی لمحے اس کے اوپر دھڑام سے فواد کا جسم گرا۔ شہزاد نے فواد کو سر سے بلند کر کے دور اچھال دیا تھا۔

اس معرکے میں شہزاد بھرپور میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کی فائٹ کا انداز بڑا منفرد تھا۔ اس نے مارشل آرٹس سے چنیدہ ٹیکنیکس لے لی تھیں۔ جوڈو اور سیلف ڈیفنس کو ملا کر اس نے چند کمبینیشن تیار کر لیے تھے جو اسٹریٹ فائٹ اور روم فائٹ میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

جہانگیر اس افتاد سے جھنجلا کر رہ گیا۔ میں نے اس کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی تھی۔ وہ فواد کو اپنے اوپر سے نیچے گرا کر کھڑا ہو گیا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے ایک لات بھی فواد کو رسید کر دی جیسے وہ دانستہ اس پر اچھلا ہو۔ اس کے بعد وہ بڑے دھواں دھار انداز میں میری جانب بڑھا۔

اس نے سر کو ٹکر مارنے والے انداز میں جھکا کر اچانک دوڑ لگائی تھی۔ میں اس ارنا بھینسے کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس کا سر جیسے ہی میرے نزدیک پہنچا، میں نے دائیں گھٹنے کی ایک بھرپور ضرب اس کی کھوپڑی پر آزمائی۔ ''ٹھک'' کی آواز پیدا ہوئی اور وہ ایک مرتبہ پھر منہ کے بل زمین پر گرا۔

اس بار جب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو ایک وحشت ناک منظر دیکھنے کو ملا۔ گھٹنے کی ضرب کے باعث شاید اس کی زبان دانتوں تلے دب کر کٹ گئی تھی۔ اس کا دہانہ لہولہان ہو رہا تھا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے، منہ میں جمع ہونے والے خون کو ایک جانب تھوک دیا۔ اس تھوک میں اس کا ایک دانت بھی موجود تھا۔

جہانگیر نے وحشت زدہ نظر سے اپنے تازہ بہ تازہ اکھڑے ہوئے دانت کو دیکھا، پھر اس مقام پر ہاتھ لگایا جہاں تھوڑی دیر پہلے دانت جما ہوا تھا، اس کے بعد وہ کسی خونی درندے کی مانند میری جانب بڑھا۔

اس نے میرے نزدیک آ کر چہرے پر رائٹ پنچ مارنے کی کوشش کی۔ میں نے سائیڈ اسٹیپ لے کر اس کے بازو کو بلاک کیا۔ وہ اپنی ناکامیابی پر جھنجلایا اور باڈی کو گھما کر لیفٹ پنچ مارنے کی کوشش کی۔ یہ اس کی ایک اضطراری اور جھنجلاہٹ آمیز حرکت تھی جس کا نتیجہ اس کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ باڈی کو گھمانے کے بعد اس کی پشت میری طرف ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو کلائیوں کے مقام سے گرفت میں لے لیا اور اس کی ''تشریف'' پر ایک نیچی فرنٹ کک جڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے بازوؤں کو آزاد کر دیا۔ فرنٹ کک کے پش نے اس کے اندر میل ٹرین کا انجن فٹ کیا اور وہ تیز رفتاری سے سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں ایک لمبا اسٹیپ لے کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس شخص کی طرف سے میرا دل غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ میں میر بخش جیسے جاں نثار، امتیاز علی جیسے جاں نثار اور روبی جیسی جاں نثار ساتھیوں کی المناک موت کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا۔ ان تینوں کی بربادی کا سبب یہی شخص جہانگیر تھا۔ میں تو اس کو پہچانتے ہی وہ مقصد بھی فراموش کر بیٹھا تھا جس کی خاطر ہم یہاں گلستانِ جوہر کے دور دراز علاقے میں پہنچے تھے۔ اس شخص کی شکل دیکھتے ہی، میرے دماغ میں اپنے پیاروں کے چہرے روشن ہو گئے تھے۔ ان کی اجاگر صورتیں صرف ایک ہی لفظ کی تکرار کر رہی تھیں..... انتقام..... انتقام..... انتقام!

میں اپنے عزیز ساتھیوں کی اس پکار کو نظر انداز کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی موت کا انتقام تو مجھ پر ایک قرض کی صورت لدا ہوا تھا..... ایک ایسا بوجھ، جس کو اتارے بغیر سانس لینا بھی محال ہو۔ یہ میں ہی جانتا تھا، اب تک میں نے کس دشواری سے اپنے تنفس کو بحال کر رکھا تھا۔

جہانگیر کسی بہت ہی ڈھیٹ مٹی سے بنا تھا۔ اس کی قوتِ برداشت قابلِ ذکر تھی۔ وہ جس حد تک مجھ سے پٹ چکا تھا، اس کے بعد تو اسے لمبا لیٹ جانا چاہیے تھا لیکن وہ ایک مرتبہ پھر خم ٹھونک کر میرے سامنے استادہ تھا۔

میں نے شعلہ بار نظر سے اسے دیکھا تو وہ سنگ اٹھا پھر بڑے وحشیانہ انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے نی شاٹ (KNEE SHOT) کا ڈاج دیا اور پلک جھپکتے میں ایک فرنٹ فلائنگ کک چلا دی۔ اس کی کک میرے شانے پر لگی۔ میں ریفلیکس کے طور پر، بیک فٹ پر آ کر اپنی گردن کو پیچھے کی طرف جھکا چکا تھا، پھر اس کی کک میں کوئی خاص فورس بھی نہیں تھی۔ میں بس ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس کر کے رہ گیا۔

جہانگیر نے اپنی اس نیم کامیاب کوشش کو اوور اسٹیمیٹ کیا اور بڑے فخریہ انداز میں میری جانب بڑھا۔ اس نے تیز رفتاری سے لیفٹ راؤنڈ ہاؤس چلائی۔ میں ایک اسٹیپ پیچھے چلا گیا۔ اس نے زیادہ پُرجوش انداز میں رائٹ راؤنڈ ہاؤس ماری۔ میں نے اس کے جوش سے فائدہ اٹھایا اور سرعت سے نیچے بیٹھتے ہوئے ایک بیک سوئپ ماردی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا۔

رائٹ راؤنڈ ہاؤس کک نے اس کا توازن بگاڑ دیا تھا کیوں کہ وہ نشانے کو پنچ نہیں کر پائی تھی۔ میں اسی لمحے نیچے بیٹھ گیا تھا۔ جب کوئی کک اپنے نشانے پر نہ لگے تو حملہ آور کا توازن برقرار رکھنا بہت کٹھن کام ہوتا ہے۔ جہانگیر پر ایک وحشت سوار تھی اس لیے بھی وہ سنبھل نہ سکا۔ سوئپ ویسے بھی مدِمقابل کو زمین بوس کرنے ہی کے لیے لگائی جاتی ہے۔ خاص طور پر بیک سوئپ (BACK SWEEP) کسی جھاڑو کے مانند، اپنی راہ میں آنے والے ہر شے کا صفایا کرتی چلی جاتی ہے۔

اس مرتبہ جہانگیر نے اٹھنے میں تھوڑی تاخیر سے کام لیا۔ وہ جیسے ہی سیدھا ہوا، میں نے ایک اسٹیپ لے کر اسپیڈ کک (SNAP KICK) چلائی۔ وہ لڑکھڑایا اور ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر فرنٹ پریشر کک اس کے شانے پر جڑ دی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر زمین پر آ گرا۔ اس نے بائیں شانے کو تھام رکھا تھا اور اس کا چہرہ اذیت کی آماجگاہ کا منظر پیش کر رہا تھا..... وہ چہرہ جو پہلے ہی لہولہان ہو رہا تھا۔ اس تر بہ تر صورت میں، اذیت کے تاثرات نے ایسا بگھار لگایا کہ جہانگیر کا چہرہ بھیانک شکل اختیار کر گیا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو جھوم رہا تھا۔ اس کا مضروب بازو، شاخ پر لٹکی ہوئی کسی مُڑی کے مانند جھول رہا تھا۔ میری پریشر کک (PRESSURE KICK) نے اس کے

شانے کا کباڑا کر دیا تھا۔ بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا تھا، اس کے بائیں شانے کا جوڑا اپنی جگہ سے کھسک گیا ہو۔

جہانگیر نے کینہ توز نظر سے مجھے دیکھا پھر دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں ناکارہ بازو کو سہلاتے ہوئے بولا ''دیکھ لینا..... تمہارا حشر بہت برا ہوگا!''

''فی الحال تو میں تمہارا حشر برا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے دہاڑ کر کہا ''بتاؤ، تم نے میرے ساتھیوں کو.....؟''

وہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی پھٹ پڑا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا گٹر ابلنے لگا یہ ایک طرح سے اس کی شکست کا اعلان تھا۔ وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو مغلظات میں تولنے لگا۔ بہادر انسان ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے اور بزدل شخص کمزور پڑنے پر گالیوں کا سہارا لیتا ہے۔ وہ اب تک میرے سامنے بڑی جواں مردی سے ڈٹا ہوا تھا لیکن اس آخری مرحلے پر اس کی بزدلی اچانک ابھر کر سامنے آ گئی تھی۔

میں نے ایک لانگ اسٹیپ (LONG STEP) سائیڈ کک اس کے سینے پر ماری۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ میں اچک کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا پھر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر میں نے اس کے چہرے پر مکوں کی برسات کر دی۔ وہ مزاحمت کی پوزیشن میں تھا اور نہ ہی اس میں اتنی سکت باقی بچی تھی۔ چند ہی لمحات میں اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔

میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ''تمہاری باتوں سے یہ تصدیق ہو چکی کہ تم میرے ساتھیوں کے قاتل ہو۔ اب شرافت سے یہ بھی بتا دو کہ تم یہودی لابی کے لیے کس قسم کے خدمات انجام دے رہے ہو؟''

اس کی آنکھوں میں دہشت ہی بھر گئی، لکنت زدہ لہجے میں بولا ''مم..... میں..... کسی یہودی لابی..... کو نہیں..... جانتا!''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں کستے ہوئے کہا ''یہودی لابی اور اس کے مقاصد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم لوگ کسی ایسی مقامی تنظیم سے وابستہ ہو جو یہودی لابی کے مفاد کی خاطر ان کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ میرے سامنے تمہاری دروغ گوئی نہیں چل سکے گی۔ تم دونوں کو کافی دنوں سے واچ کیا گیا ہے۔ تم اگرچہ اس مقامی تنظیم کے آلۂ کار ہو لیکن میں تمہارے ذریعے یہودی لابی تک پہنچ جاؤں گا۔ اگر تمہارے اندر زندگی کی خواہش مر نہیں گئی تو زبان کھول دو۔''

''مم..... میں نے بتایا ہے نا، میں ایسی کسی لابی سے واقف نہیں ہوں۔'' اس نے نگاہ چراتے ہوئے کہا ''تم..... خواہ مخواہ مجھ پر شک..... کر رہے ہو۔''

میں نے اس کے دوسرے گال پر بھی ایک زور دار تھپڑ رسید کر دیا پھر غرا کر کہا ''مجھے تشدد کے لیے مجبور نہ کرو۔ میں کم وقت میں زیادہ کام نمٹانے کے موڈ میں ہوں۔ اگر تم نے میرا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کی تو مجھے مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی، میں نے پنڈلی پر موجود خنجر کو ایک جھٹکے سے باہر کھینچ لیا، پھر اس کے برہنہ پھل کو اپنے نیچے دبے ہوئے جہانگیر کی آنکھوں کے سامنے چمکایا۔ امتیاز علی کی یادگار، اس خنجر کا پھل پورے آٹھ انچ طویل تھا۔ پھل کے اختتام پر پانچ انچ کا دستہ تھا۔ تیرہ انچ طویل یہ تشنہ لب، خونخوار ہتھیار ہر وقت میری پنڈلی سے چمٹا رہتا تھا اور میرے اشارۂ ابرو پر چیر پھاڑ کے لیے پیش قدمی کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی اسے برداشت نہیں تھی!

اسی دوران میں شہزاد علی بھی ہمارے قریب آ گیا۔ اس نے اپنی ''ہنرمندی'' سے فواد کو چاروں خانے چت لٹا دیا تھا۔ وہ بے چارہ اس وقت گہری غفلت میں تھا، اس کا بے حرکت جسم کمرے کے فرش پر، بیڈ کے کنارے ہی پڑا تھا۔ بیڈ پر موجود حسینہ بڑی دہشت ناکی سے ہماری ''کارروائی'' دیکھتی رہی تھی۔ وہ خاصی ذہین اور موقع شناس معلوم ہوتی تھی۔ اس دوران میں اس نے چیخنے چلانے یا وہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی البتہ بیڈ شیٹ کے اندر سے اس کا خوفزدہ چہرہ مسلسل اس کھیل کو دیکھ رہا تھا جو پچھلے پندرہ منٹ سے وہاں جاری تھا۔

میں نے اپنے خنجر کو بڑے خوفناک انداز میں حرکت دی اور جہانگیر سے استفسار کیا ''زبان کھولتے ہو یا میں اس کی دھار کا مظاہرہ پیش کروں؟''

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کرنے لگا حالانکہ اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر پکار رہی تھیں، میں نے بالکل ٹھیک بندے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ آنکھیں بڑی چغل خور ہوتی ہیں، ہر بات بتا دیتی ہیں!

''کس قسم کی غلط فہمی؟'' میں غرایا۔

''ہم کسی..... یہودی لابی کے لیے کام نہیں کرتے۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''تم جس تنظیم کے آلۂ کار ہو وہ یہودیوں کی ٹاؤٹ ہے۔'' میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا ''بتاؤ، تم کس تنظیم سے وابستہ ہو..... اور تمہارے باس کا کیا نام ہے؟''

وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں تامل کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ مجھے ''ہاں'' اور ''نہ'' کے بیچ میں لٹکا ہوا دکھائی دیا۔

شہزاد علی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''وجدان! لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے تمہیں سختی کرنا ہوگی۔''

''یہ لاتوں کا بھوت نہیں شہزاد!'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا ''اس کے ساتھ تو لات مکا بہت ہو چکا پھر بھی خاموش ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے پہلے اس کی نصد کھولنا ہوگی! یہ بھی تو دیکھے میری فصاد زنی!''

بات ختم ہوتے ہی میں نے اپنے خنجر کی دھار کو اس کے بدن کے ایک نہایت ہی نازک حصے پر آزمایا۔ یہ ایک معمولی سا چرکا تھا لیکن میرے نیچے دبا ہوا شخص تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا۔ تیز دھار خنجر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے اس کی چلاہٹ کی پروا کیے بغیر ایک انچ کے فاصلے پر دوسرا چرکا لگایا۔ وہ ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند ہاتھ پاؤں پھینکنے لگا۔ میں نے خنجر کی نوک کو اس کی شہ رگ پر چبھوتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں تم سے آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں جہانگیر!'' میرے انداز میں سفاکی کی کوئی کمی نہیں تھی ''تمہارا تعلق کس تنظیم سے ہے؟ اور تمہارے باس کا کیا نام ہے؟ اگر میری بات کے اختتام پر تم نے ان سوالات کا جواب نہ دیا تو ہر پانچ سیکنڈ میں تمہیں ایک اذیت ناک چرکے کا تحفہ پیش کروں گا..... اور بالآخر تمہاری شہ رگ تک پہنچ جاؤں گا تم جانتے ہو، شہ رگ پر لگنے والا کٹ (CUT) کتنا جان لیوا ہوتا ہے!'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ زبان کھول دو..... یا حرام موت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!''

اس کی ایک بلند آہنگ چیخ کمرے کی فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ اس مرتبہ میرے خنجر نے کچھ زیادہ ہی (DEEP CUT) لگا دیا تھا۔ وہ بے آب مچھلی کی طرح تڑپنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوشش ان معنوں میں کہ وہ میرے نیچے بری طرح دبا ہوا تھا اور ''دبا ہوا'' شخص کسی بھی کام کی کوشش ہی کر سکتا ہے۔ وہ کام اپنی مرضی سے تکمیل تک پہنچانا اس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ جہانگیر کی بے اختیاری نے اسے تڑپنے، پھڑکنے پر مجبور کر رکھا تھا، وہ بے آب مچھلی کی مانند اچھل کود مچا کر اپنی جگہ تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اس کی آہ و بکا کی پروا کیے بغیر چرکا بازی جاری رکھی تو اسے گھٹنے ٹیکنے پڑے اور جب کوئی انسان گھٹنے ٹیکتا ہے تو پھر اسے ہتھیار پھینکنا پڑتے ہیں۔ وہ نہتا ہو جاتا ہے۔ جہانگیر نے اپنے نہتا پن کا اعلان کرتے ہوئے زبان کھول دی۔

''میں بتاتا ہوں..... سب کچھ بتاتا ہوں۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولا ''خدارا، اس موذی خنجر کو میری گردن سے ہٹاؤ۔''

میں نے گمبھیر آواز میں کہا ''یہ خنجر تمہاری گردن سے ہٹ رہا ہے..... اور صرف..... اس لیے ہٹ رہا ہے کہ تم میرے سوالات کے تسلی بخش جواب دے سکو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ اس نے اپنی وحشت زدہ آنکھوں کو بند کر کے کھول دیا۔ یہ اس کا اثباتی جواب تھا۔ میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''اگر تمہارے جوابات سے میری تشفی نہ ہوئی تو بس سمجھ لینا، تم نے زندگی بچانے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیا۔''

پھر میں اس کے سینے سے نیچے اتر آیا۔ اس کی اتنی درگت بن چکی تھی کہ وہ فرار ہونے یا حملہ آور ہونے کا خیال دل میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔ میں نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ میں نے شہزاد کو اشارہ کیا۔

''شہزاد! تم اس مردود کو اپنے پسٹل کے نشانے پر رکھ لو۔ اگرچہ مجھے امید تو نہیں کہ یہ کوئی شیطانی کرے گا لیکن پھر بھی اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس نے میرے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے گڑبڑ کی تو میں صرف تمہارا نام پکاروں گا۔ تم ''شہزاد'' کا لفظ سنتے ہی بے دریغ اسے شوٹ کر دینا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

یہ بات میں نے محض جہانگیر کو دہشت زدہ کرنے کے لیے کہی تھی تاکہ وہ کوئی منفی خیال دل میں نہ لائے اور اگر اس کا ذہن کسی سرکشی کا سگنل دے بھی تو وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا رسک نہ لے، اس سگنل کو خیال انداز کر دے۔

اس کے بعد میں نے دوسری کرسی سنبھالی اور بیڈ شیٹ میں ملوف حسینہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ خوفناک پھل والا خنجر بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ حسینہ کی وحشت زدہ نگاہ اسی خنجر کی دھار پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بغیر نام کے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ چونکی جیسے سکتے سے باہر آئی ہو پھر اس کے ہونٹ کپکپائے ''تا..... ہدہ!''

''یہ کیا نام ہوا؟'' میں نے اسے گہری نظر سے گھورا ''تا..... بندہ..... اگر تم تا..... بندہ ہو تو پھر از..... بندہ کون ہے؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی، اس الجھن میں سراسیمگی شامل تھی۔ ''یہ تو ایسی ہی بات ہوگئی..... از کراچی تا حیدرآباد۔''

میری بات ختم ہونے پر اس نے قدرے سنبھل کر کہا ''میرا نام تابندہ ہے۔ تمہیں سمجھنے میں غلطی لگی..... نہیں، نہیں۔'' اس نے بڑی سرعت میں گردن کو نفی میں جھٹکا اور لجاجت آمیز لہجے میں بولی ''مم..... میرا مطلب ہے، اپنا نام بتانے میں مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔'' وہ بری طرح ڈری ہوئی تھی اور یہ اس کا عین فطری عمل تھا۔

اس کی خوفزدگی بڑی قابلِ رحم اور مضحکہ خیز تھی۔ میں نے بے پروائی سے کہا ''تم تابندہ ہو یا شرمندہ، اس بات سے مجھے کوئی غرض نہیں اور نہ ہی اس بات سے کوئی سروکار ہے کہ تم ان دو شیطانوں کے بیچ رات کے آخری پہر کیا کر رہی تھیں۔ اگر مزید شرمندگی سے بچنا چاہتی ہو تو لباس پہن کر اپنے حواس میں آنے کی کوشش کرو۔'' پھر میں نے کمرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا ''تمہارا لباس کہاں ہے؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے واش روم کے بند دروازے کو دیکھا۔ اس کا یہ خاموش جواب میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تابندہ بصورتِ شرمندہ! تم فوراً اس بیڈ شیٹ میں لپٹی لپٹی واش روم میں پہنچو اور تسلی سے اپنا لباس پہن لو..... اور اس وقت تک واش روم سے باہر نہ آنا جب تک میں تمہیں اس بات کی اجازت نہ دوں۔''

میرا جملہ مکمل ہوتے ہی وہ چادر بردار، اپنے بدن کو سمیٹتے ہوئے واش روم کی طرف چلی گئی۔ میں دوبارہ جہانگیر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ بہت سہما بیٹھا تھا۔

''میں دیکھ رہا ہوں، تمہارے حواس بجا ہو چکے ہیں۔'' پھر میں نے شہزاد کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا ''اگر تم ریڈی ہو تو میں اس بدبخت کا ''انٹرویو'' شروع کروں؟''

''میں ایور ریڈی ہوں وجدان!'' وہ پسٹل کو ایک مخصوص جنبش دیتے ہوئے بولا ''جیسے ہی تمہاری زبان پر میرا نام آیا، میں ٹریگر دبا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

جہانگیر کی آنکھوں میں موجود وحشت کئی گنا بڑھ گئی۔ اس وحشت میں دہشت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ میں نے اس کی انہی آنکھوں میں گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

''اب تو تمہارا ذہن یہودی لابی کی کارفرمائی سے انکاری نہیں؟''

اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔ اس کا مطلب تھا، اس نے اقرار کرلیا۔

''زبان سے بولو۔'' میں دہاڑا ''بیمار بکرے کی طرح گردن کو مت جھٹکو!''

وہ بولا ''اس شہر میں یہودی لابی اپنا کام دکھا رہی ہے۔''

میں نے کہا ''یہودی لابی کسی مقامی تنظیم کے پلیٹ فارم سے اپنے مقاصد حاصل کر رہی ہے اور تم اس تنظیم کے آلۂ کار ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ کمزور آواز میں بولا۔

''تم کس تنظیم سے وابستہ ہو۔'' میں نے پوچھا ''اور تمہارے باس کا کیا نام ہے؟''

''کیا دونوں سوالوں کے جواب دینا ضروری ہیں؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

''اس میں قباحت کیا ہے؟'' میں نے غصیلی نظر سے اسے دیکھا۔

''میرا خیال ہے، ایک سوال کا جواب دوسرے سوال کو کھول دے گا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے تیکھی نظر سے اسے دیکھا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''میں جس تنظیم سے منسلک ہوں، وہ تمہارے لیے اجنبی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے تیز آواز میں کہا۔

''سی ایف کے'' وہ شکست خوردہ آواز میں بولا۔

میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا ''یہ کیا بکواس ہے؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا ''میں ''سی ایف کے'' کے لیے کام کرتا ہوں جس کا بگ باس شعیب غوری ہے۔ ہم سب اسی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ یہ اشارے ہمیں اپنے باس کی طرف سے ملتے ہیں۔ ہر ضلع میں بگ باس کا ایک نائب باس موجود ہے۔''

جہانگیر کے انکشاف نے میرے دماغ میں ہلچل مچا دی۔ میں اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شعیب غوری اور اس کی تنظیم ''سی ایف کے'' سے میں بخوبی واقف تھا بلکہ ''غیر سرکاری'' طور پر اس سے منسلک بھی تھا۔ میں نے سوچا، شاید جہانگیر مجھے غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچانا چاہتا ہو۔ میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

''میں شعیب غوری اور اس کی تنظیم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم غلط بیانی کر کے اپنی جان نہیں چھڑا سکتے۔''

''میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔'' وہ تیقن سے بولا۔

میں نے کہا ''سی ایف کے ایک اصلاحی اور مثبت طرزِ فکر کی تنظیم ہے۔ تم یقیناً کوئی گڑبڑ کر رہے ہو۔''

''میں نے کوئی گڑبڑ نہیں کی اور نہ ہی اس پوزیشن میں ہوں کہ جھوٹ بول سکوں۔'' اس نے کن انکھیوں سے پسٹل بردار شہزاد کو دیکھا ''زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے۔ میں بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں اور تم نے وعدہ کیا ہے، اگر میں سچ بولوں گا تو تم مجھے جان سے نہیں مارو گے۔''

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔'' میں نے کہا ''لیکن تمہارے جواب سے میری تسلی نہیں ہو رہی۔''

''وہ اس لیے کہ تم شعیب غوری کو ایک فرشتہ صفت انسان سمجھتے ہو۔'' وہ قدرے بہادری سے بولا ''تم اس تنظیم سے سطحی طور پر منسلک ہو اس لیے پوری طرح باخبر نہیں۔ شعیب غوری تمہیں جس طرح بے وقوف بنا رہا ہے، تم بن رہے ہو۔''

اس کی باتوں سے مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے کہا ''کیا تم یہ تمام حقائق شعیب غوری کے سامنے بھی بیان کر سکتے ہو؟''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا ''تم تو سیدھے سادے شریف آدمی ہو۔ مجھے امید ہے، تم میری جان بخشی کر دو گے لیکن شعیب غوری کو اگر اس سلسلے میں ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ میرا جو حشر کرے گا اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''پھر تمہاری باتوں کی تصدیق کس طرح ہو سکے گی؟''

''تمہیں میری زبان پر اعتبار کرنا ہوگا۔''

''تم نے جو کچھ کہا ہے، ذہن اسے تسلیم نہیں کرتا۔''

''وہ اس لیے کہ تمہارا ذہن اس وقت ''سی ایف کے'' کے کیمپ میں بیٹھا ہوا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''جب کبھی تمہاری آنکھ کھلے گی تو تمہیں میری باتوں کا یقین آ جائے گا لیکن اس وقت تک پتا نہیں، میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔ مجھے لگتا ہے، میری زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔'' وہ اچانک بے حد سراسیمہ نظر آنے لگا ''بگ باس شعیب غوری کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اس کی اتنی ہی آنکھیں ہیں جتنے اس کی تنظیم کے ورکر ہیں۔ وہ اپنے ہر بندے پر ایک نگاہ رکھتا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ اس وقت بھی مجھے دیکھ رہا ہے..... وہ میری غداری کا عینی شاہد ہے اور میری اس غلطی کو وہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ مجھے مرنا ہوگا، بہت جلد مرنا ہوگا۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ بھی دیا تو بگ باس نہیں چھوڑے گا۔'' وہ پٹڑی سے اترنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں موت کے سائے ناچتے ہوئے دیکھے۔ وہ خوفزدگی کے عالم میں بولا ''وجدان! تم اسی وقت مجھے جان سے گزار دو۔ اپنی زبان سے ''شہزاد'' کا لفظ خارج کر دو تاکہ تمہارا ساتھی مجھے شوٹ کر دے۔ یہ فوری اور کم اذیت ناک موت ہوگی ورنہ بگ باس مجھے جس طرح فنا کے گھاٹ اتارے گا اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ابھی سے میری روح فنا ہو رہی ہے۔ پلیز وجدان! میری مشکل آسان کر دو۔ اپنے ہاتھوں سے میری جان لے لو۔''

وہ باقاعدہ گڑگڑانے لگا۔ میرے لیے یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔ میں نے بہت سے لوگوں کو زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن جہانگیر عجیب بھکاری تھا۔ یہ مجھ سے موت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ منت سماجت کر رہا تھا کہ میں اسے جلد از جلد زندگی کی قید سے آزاد کر دوں۔ میں غیر یقینی نظر سے یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ گھگیایا ''وجدان! میں تمہارے تین ساتھیوں کا قاتل ہوں۔ اگرچہ میں نے اپنے ہاتھوں سے انہیں نہیں مارا لیکن گرے پجارو سے، میرے حکم ہی سے فائرنگ کی گئی تھی۔ میرے آلۂ کاروں نے کلاشنکوفز کے برسٹس سے تمہارے ساتھیوں کو بھون ڈالا تھا۔ کم از کم تم اپنے ساتھیوں کا انتقام لینے کے لیے ہی مجھے قتل کر دو۔''

اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں نے فرش پر بے سدھ پڑے فواد کو دیکھا اور جہانگیر سے پوچھا ''اس فلیٹ میں اور کتنے کمرے ہیں؟''

اس نے حیرت سے میرا یہ غیر متوقع سوال سنا اور بولا ''اس کے علاوہ ایک بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم ہے۔''

میں نے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تم یہیں رک کر اور فواد اور تابندہ پر نظر رکھو۔ میں جہانگیر کو دوسرے کمرے میں لے جا رہا ہوں۔ باقی پوچھ تاچھ وہاں ہوگی۔''

شہزاد نے کوئی سوال کیے بغیر شانے اچکا دیے۔ گویا اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔

میں نے خنجر کے اشارے سے جہانگیر کو آگے لگایا اور ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ وہ میری اس حرکت پر سخت پریشان اور الجھا ہوا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں ایک خیال یہ بھی ہو کہ میں اسے خاموشی سے ٹھکانے لگانے کے لیے وہاں لایا ہوں۔

میں نے ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ بند کیا اور ہم آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ میں فلیٹ میں داخل ہونے سے قبل ہی باہر سے بولٹ

کر چکا تھا۔ اب میں نے اپنے اچھوتے خیال پر عمل شروع کر دیا۔

وہ گہری حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا ''لوگوں کو زندگی کی خاطر گھگیاتے، روتے گڑگڑاتے تو دیکھا گیا ہے لیکن تم واحد آدمی ہو جو موت کے لیے التجا کر رہے ہو۔ اس حوالے سے تم اپنی نوعیت کے منفرد آدمی ہو۔''

''تم نے شعیب غوری کا مثبت چہرہ دیکھا ہے اس لیے یہ بات نہیں سمجھ سکو گے۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا ''میں جانتا ہوں، وہ مجھے کتنے بھیانک انجام سے دوچار کرے گا۔ یہ زندگی میرے لیے موت سے بھی زیادہ بدتر ہو جائے گی۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے جبڑوں کو بھینچا۔ وہ تکلیف کی شدت کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے باوفا خنجر کے چرکوں نے اس کی گردن کو متعدد مقامات سے خون آلود اور خونریز بنا دیا تھا۔ میں نے انسانی ہمدردی کے ناتے وہاں موجود ایک کپڑا اٹھا کر اس کی گردن پر لپیٹ دیا تاکہ خون کا اخراج رک جائے۔

اس نے تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ''تھینک یو وجدان!''

میں نے اپنے منصوبے کے تحت اس کا خوف کم کرنے کی خاطر کہا ''شعیب غوری تو تمہارے خلاف اس وقت کوئی قدم اٹھائے گا نا جب اسے یہاں کے حالات کی خبر ہوگی۔ تم اس سلسلے میں پیش بندی کر سکتے ہو!''

اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ اطمینان کی جھلک دکھائی دی مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر سراسیمہ نظر آنے لگا۔ بولا ''میں پھر یہی کہوں گا، تم شعیب غوری کی گہرائی کو نہیں ناپ سکتے۔ وہ اپنے ورکرز کے ایک ایک معاملے سے آگاہ رہتا ہے۔ یہ واقعہ جلد یا بدیر اس کے علم میں آجائے گا اور وہ میری کھال کھینچوا کر جسم میں سمندری نمک بھروا دے گا۔''

''مگر کیسے۔ اس تک یہ خبر کیسے پہنچے گی؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا ''میرے فرائض میں ایک بات یہ بھی شامل ہے کہ میں فواد کی غیر نصابی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھوں۔ اسی طرح مجھے یقین ہے، میرے بارے میں بھی فواد کو کچھ اسی قسم کے احکام ملے ہوں گے۔'' وہ ذرا توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا ''فواد تم دونوں کی یہاں آمد اور ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو من وعن ہمارے باس تک پہنچا سکتا ہے اور باس فوراً اس معاملے کو بگ باس کے پاس لے جائے گا۔''

''تمہارے باس کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ''سلیم واسطی۔ یہ ''ملیر'' کا کرتا دھرتا ہے..... اور یہ بات تم جانتے ہی ہو کہ ''سی ایف کے'' نے کراچی کے ہر ضلع میں ایک ٹھکانا بنا رکھا ہے جو اسی ضلع کے نام سے موسوم ہے۔ میں پہلے ''ساؤتھ'' میں تھا جہاں کا باس کبیر شاہ ہے۔ گورا قبرستان والے واقعے کے بعد مجھے ''ساؤتھ'' سے ''ملیر'' شفٹ کر دیا گیا تھا۔''

اس کی بات نے فوراً مجھے کلک کیا۔ خرکار چورنگی سے تھوڑا پہلے پوٹ بیسن کے علاقے میں جب کرے پجارو والوں نے ہمیں گھیرا تھا تو ایک گن بردار کو دیکھ کر میں چونکا تھا اور مجھے شک گزرا تھا کہ میں اس صورت کو پہلے ''ساؤتھ'' میں دیکھ چکا ہوں۔ وہ صورت اسی جہانگیر کی تھی۔ ازاں بعد جب میں نے شعیب غوری کی اس جانب توجہ دلائی تو وہ بڑی چالاکی سے مجھے مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جہانگیر کی بات کے اختتام پر میں نے کہا ''تمہارے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر فواد اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھے تو معاملات تمہارے ہاتھ میں رہ سکتے ہیں۔''

''مگر وہ اپنی زبان بند کیوں رکھے گا؟''

''وہ نہیں..... بلکہ تم اس کی زبان بند کر سکتے ہو..... ہمیشہ کے لیے!''

میں نے کہا ''انسان کی بقا اور فنا کا یہی دستور ہے، خاص طور پر جرائم کی دنیا میں تو یہ مسلم فارمولا ہے۔ انسان اپنی بقا کے لیے دوسرے کی فنا کا سامان کرتا رہتا ہے۔''

''لیکن تم میری بقا کیوں چاہتے ہو؟'' اس کی حیرت دور ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی ''میرے اشارے پر تمہارے تین بہترین ساتھیوں کو قتل کرنے میں.....؟''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''وہ اشارہ تمہارے دل کی آواز نہیں تھا۔ تمہیں اپنے سابق باس کبیر شاہ کی طرف سے حکم ملا تھا..... اور کبیر شاہ اپنے باس اور تمہارے بگ باس کے حکم کا پابند ہوگا۔ اس حساب سے میرے ساتھیوں کا اصل قاتل تمہارا بگ باس ہے۔ میں ان کے قتل کا انتقام شعیب غوری سے لوں گا۔ تم بے گناہ ہو، اس لیے تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔''

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات نویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ستمبر 2004 میں شائع ہوگا